عہدِ حاضر کے مقبول ترین اہلِ قلم کے تاریخی انٹرویوز

تخلیق کار

انٹرویوز

عامر بن علی

مصنف کی دیگر تصانیف

100 تخلیق کار

عہدِ حاضر کے مقبول ترین اہلِ قلم کے تاریخی انٹرویوز

عامر بن علی

نستعلیق مطبوعات

الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 0331-4489310

E-mail: nastalique786@gmail.com

نٓ والقلم وَمَا یَسطُرُونَ ٥ القران

حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : 100 تخلیق کار
عہد حاضر کے مقبول ترین اہلِ قلم کے تاریخی انٹرویوز
مصنف : عامر بن علی
بارسوم : جنوری 2025ء
کمپوزنگ : زرناب کمپوزنگ سنٹر، لاہور
سرورق : عمران شناور
مطبع : حاجی منیر پرنٹرز، لاہور
قیمت : 1000/- روپے
بیرونِ ملک : 30/- ڈالر

اپنی کتاب کی خوبصورت اشاعت کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق مطبوعات: فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0316-4195471
E-mail: nastalique786@gmail.com

انتساب

اُن

اہلِ قلم

کے نام!

جن کے انٹرویوز بوجوہ اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا

ترتیب

✦ آمنہ مفتی	11
✦ احمد ندیم قاسمی	16
✦ اشفاق احمد	22
✦ انور مسعود	26
✦ امجد اسلام امجد	30
✦ امین کنجاہی	36
✦ اعتبار ساجد	45
✦ انعام الحق جاوید	49
✦ اصغر ندیم سید	53
✦ اسد اللہ غالب	57
✦ اختر شمار	72
✦ احمد عقیل روبی	80
✦ احمد فراز	83
✦ اسلم کولسری	87
✦ انور شعور	95
✦ اے۔جی۔جوش	103
✦ اعجاز رضوی	106
✦ اعزاز احمد آذر	112
✦ ڈاکٹر انوار احمد	116
✦ اشفاق احمد ورک	120
✦ ڈاکٹر انور سجاد	126
✦ اقبال راہی	134

✧ ابرار ندیم	138
✧ اسد عباس اسدؔ	145
✧ اعجاز توکل خاں	149
✧ امجد اقبال امجد	154
✧ بشریٰ اعجاز	157
✧ بلقیس ریاض	161
✧ بیدل حیدری	166
✧ تبسم کاشمیری	169
✧ بینا گوئندی	175
✧ جاوید شاہین	181
✧ جمشید مسرور	188
✧ جواز جعفری	193
✧ جی۔اے۔نجم	199
✧ حسن عباسی	207
✧ حنیف صوفی	212
✧ ڈاکٹر حنان عواد	215
✧ خالد مسعود خاں	218
✧ خالد شریف	222
✧ خالد علیم	227
✧ خورشید مستانہ	233
✧ دالیا سٹا پانکوٹی	236
✧ راجا رسالو	241
✧ راجا نیرّ	245
✧ ریحانہ قمر	249
✧ ریاض مجید	252
✧ رخشندہ نوید	260

- سرفراز سید 266
- سلیم طاہر 272
- سیف اللہ خالد 276
- سلیمان جاذب 281
- سلیم اختر 285
- شہرت بخاری 290
- شہزاد احمد 294
- شہناز مزمل 300
- صوفیہ بیدار 303
- صغرا صدف 314
- طاہر انوار پاشا 317
- طاہر نسیم 323
- طاہر تونسوی 325
- ظفر اقبال 334
- عطاء الحق قاسمی 342
- ڈاکٹر علی محمد خاں 360
- عباس تابش 365
- علی کمیل قزلباش 370
- علی چوہدری 377
- کیپٹن عطاء محمد خاں 381
- ڈاکٹر عائشہ عظیم 386
- غلام حسین ساجد 391
- فہیم ضیاء 396
- فرحت عباس شاہ 400
- فاروق طراز 404
- فخر زمان 408

- فرحت پروین 415
- فرحت زاہد 424
- قاسم علی شاہ 428
- قمر رضا شہزاد 435
- گل نوخیز اختر 441
- لبنیٰ صفدر 445
- منشاء یاد 458
- مستنصر حسین تارڑ 460
- مشتاق صوفی 466
- منوّ بھائی 472
- مولانا اکرم اعوان 475
- منیر نیازی 480
- مشکور حسین یاد 484
- مشتاق احمد یوسفی 487
- محسن بھوپالی 492
- ممتاز راشد 494
- محسن مگھیانہ 498
- محمد حسن معراج 501
- ناز بٹ 504
- نیلما ناہید درانی 511
- نوشی گیلانی 515
- ناصر بشیر 518
- نجیب جمال 527
- وصی شاہ 534
- یاسر پیرزادہ 538
- یونس احقر 543

آمنہ مفتی

س خواتین مفتی تو عموماً نہیں ہوا کرتی ہیں، آپ کیسے مفتی ہیں؟

ج ہمارے بزرگ شہاب الدین غوری کی دعوت پر بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔ ہمارے جدّ اعلیٰ شیخ عمر الدین مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔ آٹھ صدیاں ہمارے خاندان میں یہ منصب رہا۔ شاید ناسٹلجیا ہے، چونکہ خاتون تو مفتی نہیں ہو سکتی۔ ہمارا خاندان ریواڑی، فرخ نگر کے محلہ مفتی واڑہ سے آیا تھا۔ ابھی تک اس محلے کا نام مفتی واڑہ ہی ہے۔ جہاں ہمارے آباؤ اجداد قیام پذیر رہے۔

س آپ کا بچپن کہاں اور کیسا گزرا؟

ج میرا بچپن ایک زرعی فارم پر گزرا۔ پاکپتن سے ذرا آگے دریائے ستلج کے کنارے ہمارا رقبہ تھا۔ گاؤں تو نہیں کہوں گی چونکہ صرف ہمارا ہی گھر تھا یا پھر فارم پر کام کرنے والے مزارعین و ملازمین کی رہائشیں تھی ہمارے آس پاس۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے لہٰذا گھر کے افراد سے خوب رونق لگی رہتی تھی۔ میں سب سے چھوٹی تھی۔ ہم سات بہنیں اور ایک ہی بھائی تھا مگر ہمارے والد نے کبھی ہمارے درمیان فرق روا نہیں رکھا۔ ہم بڑے جنگلی قسم کے بچے تھے ،بے حد شرارتی تھے۔ والد صاحب اس علاقے کے گیم وارڈن تھے۔ ہم نے ایک بھیڑیا پالا ہوا تھا۔ پھر ایک بجو کے بچے پالے۔ خیر دونوں بے وفا نکلے اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ کتے، بلیاں گھوڑے تاہم ہمارے ساتھ تھے۔ مضافات میں پلنے والے بچے بڑے دلیر ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس شہروں میں پلنے والے بچے خوف کا شکار ہوتے ہیں۔

س بیس ڈرامے لکھے، تین ناول، کالم نگاری، شاعری، سخن وری کے سفر کا آغاز کیسے ہوا؟

ج میری عمر نو برس تھی، جب پہلا شعر کہا۔ یہ کوئی سنجیدہ کوشش نہیں تھی۔ مگر سکول میں اس شعر کا خوب چرچا ہوا۔ شہرت بخاری میرے رشتے کے چچا ہیں۔ ان سے شعری اصلاح لیتی

رہی۔شاعری پسند ہے مگر زیادہ عرصہ شاعری نہیں کر سکی اور نثر کی جانب متوجہ ہوگئی۔میرا خیال ہے کہ شاعر شکست آرزو کا شکار ہوتا ہے۔شاید ایک وجہ شاعری سے دوری کی یہ بھی ہے کہ ابا کو پسند نہیں تھا کہ شاعری کی جائے۔اگر چہ وہ اظہار نہیں کرتے تھے۔

س شاعر کون سا پسندیدہ ہے؟

ج حافظ شیرازی اور فیض احمد فیض مجھے زیادہ پسند ہیں۔پروین شاکر اور ادا جعفری کو بھی میں نے بہت پڑھا ہے۔

س ڈراموں کے موجودہ معیار سے مطمئن ہیں؟

ج ہماری انڈسٹری میں کوئی کمال ڈراما لکھنے والا نہیں ہے۔قحط الرجال اور زبوں حالی کی جو صورت حال دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ہے، وہی ٹی وی ڈراموں میں بھی نظر آتی ہے۔ناظرین کا ذوق جیسا ہے ویسا ہی ڈرامہ پیش کیا جا رہا ہے۔آج کل ''کا تا اور لے دوڑی'' والی بات ہے، محنت نہیں ہو رہی۔المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں پڑھے لکھے لوگ بھی باذوق نہیں ہیں۔جیسا ناظرین کا ذوق ہے ویسے ہی اب لکھنے والے ہیں۔

س اسکول کا زمانہ کیسا گزرا؟ پڑھائی میں کیسی تھیں؟

ج میں اچھی طالب علم تھی مگر سکول جانا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔وجہ شاید یہ تھی کہ مجھے سب کچھ پہلے پتہ تھا جو پڑھا جا رہا ہوتا تھا، اسی لئے سوچتی تھی کہ بھئی میں کیوں یہاں بیٹھ کہ وقت ضائع کروں؟ کیا ضرورت ہے بھلا اس کی؟ بچپن تیز تھا، اب بچے ویسے نہیں ہوتے۔چار سال کی تھی جب قرآن کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تھی اور پانچ سال کی تھی جب اسکول میں داخلہ ہوا تھا۔

س ٹین ایج کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج ٹین ایج بہت بورنگ تھی۔بچپن جتنا دلچسپ تھا، ٹین ایج اتنی ہی بورنگ تھی۔بالکل ڈپٹی نذیر احمد بنی ہوئی تھی۔آٹھویں جماعت کے بعد لاہور شفٹ ہوگئی اور گرایجوایشن لاہور کالج سے ہی کیا۔پھر ماسٹرز پنجاب یونیورسٹی سے مکمل کیا۔

س لاہور میں رہائش کا کیا بندوبست تھا؟

ج ہمارا اپنا گھر تھا ماڈل ٹاؤن میں۔ہماری نانی اماں بھی پاکستان بننے کے فوراً ماڈل ٹاؤن میں ہی آ کر آباد ہوئی تھیں۔ماڈل ٹاؤن والے ایک الگ ہی کمیونٹی ہیں، دیہات سے آ کر باقی لاہور تو نامانوس لگتا تھا مگر اس علاقے سے ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا۔

س کھیل بھی کوئی کھیلنا پسند ہے؟

ج میں نے کوئی کھیل نہیں چھوڑا۔سب کھیل کھیلے۔پھر ایک فریکچر ہو گیا اور میں چھ ماہ کے لئے ان فٹ ہو گئی، زمانہ طالب علمی کی بات ہے، ٹین ایجر تھی۔ پھر کھیل چھوٹ گئے۔اسی حادثے کے سبب شاید میں کھیل کے لئے درکار فٹنس سے عاری تھی لیکن دل کو یہی سمجھاتی کہ مجھے تو کھیل کھیلنا پسند ہی نہیں ہے۔

س گھر گرہستی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟

ج شادی جلد ہو گئی تھی۔میں اکیس برس کی تھی۔میرے شوہر میرے فرسٹ کزن ہیں۔انہیں میں پسند تھی۔مگر نہ ان کی ماں راضی تھیں اور نہ ہی میری ماں شروع میں راضی تھیں،لیکن سب ٹھیک ہو گیا۔اب ہمارے دو بیٹے ہیں۔شہوار اور شہیر، دونوں پڑھائی کر رہے ہیں۔

س موسیقی سے آپ کو خاص لگاؤ لگتا ہے؟

ج جی ہاں!میں بانسری بجا لیتی ہوں اور اس کے علاوہ وائلن سیکھ رہی ہوں۔موسیقی تو ساری کائنات میں ہے، آپ بس اس میں سے شور کو الگ کر دیں۔

س دیگر مشاغل کیا ہیں؟

ج باغبانی، کھانا پکانا گلے پڑا ڈھول ہے مگر جب پکاتی ہوں تو اچھا بناتی ہوں۔جانوروں کا بھی شوق ہے اور سیاحت بھی بہت پسند ہے۔میں زندگی کو جینا چاہتی ہوں۔

س لکھنے کا مقصد کیا سمجھتی ہیں؟

ج کسی مقصد کے تحت میں نہیں لکھتی۔میں کسی کے بھلے کے لیے بھی نہیں لکھتی۔اپنے لئے بھی نہیں لکھتی۔بس کچھ کہانیاں ہیں میرے اندر جو خود کو کہلوانا چاہتی ہیں اور مجھے بے چین رکھتی ہیں۔کوئی مقصد نہیں ہے میرے لکھنے کا۔

س آپ کی کہانیوں کے کردار فرضی ہیں یا حقیقی زندگی سے ماخوذ ہیں؟

ج ہر کہانی کچھ نہ کچھ حقیقت ہوتی ہے۔میرے تخلیق کردہ کردار ارد گرد کے ماحول سے ماخوذ ہیں۔

س خواب کس زبان میں دیکھتی ہیں؟

ج خواب تو جی شدھ اردو میں دیکھتی ہوں۔میں اکثر خواب نوٹ بک میں لکھ بھی لیتی ہوں۔قسط وار، مزے مزے کے خواب آتے ہیں۔

س کس طرح کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟

ج بناوٹی لوگ اچھے نہیں لگتے۔ مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو باہر سے ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے وہ اندر سے ہوتے ہیں۔ تصنع اور بناوٹ لوگوں میں اچھی نہیں لگتی۔

س پہلی باقاعدہ تخلیق کونسی تھی؟

ج افسانہ تو میں شروع سے لکھ رہی تھی۔ ڈرامہ پہلی مرتبہ ''اک ہتھیلی پر لہو، اک ہتھیلی پر حنا'' لکھا تھا۔ اس کا موضوع بڑا ہٹ کر تھا۔ یہ ڈراما زیادہ ہٹ تو نہیں ہوا مگر مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ سکرین کیا چاہتی ہے۔ اس کے بعد ڈرامہ ''جہیز'' لکھا تو میری ایوارڈ کے لئے نامزدگی ہوگئی۔ اس سال کا ایوارڈ خلیل الرحمان قمر کو ملا تھا۔ ''الو برائے فروخت نہیں'' یہ خالصتاً ذاتی آئیڈیا تھا جبکہ ''گھگھی'' امرتا پریتم کے ناول سے ماخوذ تھا۔ اب تک بیس ڈرامے اور تین ناول لکھ چکی ہوں۔ زیادہ تر سماجی موضوعات پر لکھتی ہوں۔

س لکھنے کا کوئی خاص وقت اور ماحول ہوتا ہے؟

ج میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ کم از کم میرے ساتھ ایسا معاملہ نہیں کہ کوئی مخصوص وقت ہو۔ شائد اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے دو بچے پالے ہیں اور خاندانی مسائل کا مقابلہ بھی کیا ہے تو شاید کوئی پہر یا وقت مخصوص نہیں ہے میرے لکھنے کے لئے اور نہ ہی کوئی مخصوص جگہ میرے نزدیک ضروری ہے۔

س آج کل کیا لکھ رہی ہیں؟

ج کچھ بھی نہیں لکھ رہی۔ بس زندگی کے مزے لینے کا ارادہ ہے۔ آئندہ بھی کچھ نہ لکھنے کا ارادہ۔ میری خوش قسمتی رہی کہ مجھے بہت محبت کرنے والے قارئین ملے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری Cult Following ہے۔ ایک خاص گروہ ہے جو مجھے پڑھتا ہے۔ ہوسکتا ہے آئندہ ارادہ بدل جائے مگر ابھی یہ فیصلہ ہے کہ پچیس سال لکھ لیا، کافی ہے۔ چونکہ لکھنے والے کا کوئی پکا پتا نہیں ہوتا کہ کب سوچ بدل لے۔

س ادبی گروہ بندیوں اور دھڑوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج میری کوئی لابی نہیں ہے۔ ادب میں انجمن ستائش باہمی کا سلسلہ تو عرصے سے قائم ہے۔ کتاب ابھی چھپتی نہیں ہے اور اس پر مضامین پہلے سے لکھوا لئے جاتے ہیں۔ تقریب رونمائیاں ہوتی ہیں، فوٹو کھینچتے اور شیئر ہوتے ہیں۔ اپنی پسند کے لوگوں کو کام دلایا جاتا ہے۔ یہ میرا بندہ ہے

اور یہ نہیں ہے، سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے مگر میں صرف تماشائی بن کر دیکھتی ہوں۔

س زندگی کیا ہے؟

ج زندگی ایک وقفہ ہے۔ایک خواب ہے بہت جلد ختم ہو جائے گا۔زندگی بہت چھوٹی ہے، بڑی مختصر ہے، طویل ہونی چاہئے تھی۔ابھی سمجھتے بھی نہیں اور کہانی ختم۔

س آپ کی تحریروں میں رونا، دھونا بہت ہے، ایسا کیوں ہے؟

ج لکھنے والے خود کم روتے ہیں، دوسروں کو زیادہ رلاتے ہیں۔

س آپ کے کالموں میں قومی سیاست سے بے رغبتی نظر آتی ہے۔اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

س عموی طور پر ''اڑیں گے پرزے'' بین الاقوامی سیاسی موضوعات پر ہی تحریر کرتی ہوں۔ہنسنے ہنسانے کا دل کرے تو قومی سیاست کو کالم کا موضوع بنا لیتی ہوں۔چونکہ میں سمجھتی ہوں کہ جن لوگوں نے سیاست کو بازیچۂ اطفال بنایا ہے وہ ہم سے کہیں زیادہ سیانے ہیں۔الجھانے والوں نے گتھیاں الجھائی ہیں، ہم سلجھانے والے کون ہوتے ہیں۔جنہوں نے الجھائی ہیں، بہت سوچ سمجھ کر الجھائی ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ ان کو پتہ نہیں ہے کہ سیاست کیا ہے۔جب قافلے چلتے ہیں تو ان کے ساتھ ٹھگ بھی چلتے ہیں، سو ہمارے قافلے میں بھی ٹھگ موجود ہیں۔

س میرا جسم میری مرضی کا نعرہ آج کل خواتین کا ایک گروہ اکثر بلند کرتا ہے، کیا کہیں گی اس بارے؟

ج بڑی سادہ سی بات ہے، اگر مرد کا جسم اور اسکی مرضی درست ہے تو پھر عورت کا جسم اور اس کی مرضی کی بات بھی درست ہے۔

س آپ ماہر تعلیم بھی ہیں، پڑھ بھی رہی ہیں اور پڑھا بھی رہی ہیں، کیسا تجربہ ہے؟

ج میں پنجاب یونیورسٹی میں فلم پڑھا رہی ہوں اور ایم فل مکمل کرنے کی تیاری بھی ہے۔اسی مہینے حصول سند کے لئے مقالہ جمع کروایا ہے۔پڑھنا، پڑھانا مجھے بے حد پسند ہے۔شاید میرا سب سے پسندیدہ کام پڑھنا اور پڑھانا ہی ہے۔

OOO

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی اردو شعر و ادب اور صحافت کا ایسا روشن حوالہ ہیں جو حقیقی معنوں میں کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں۔ان کے بارے میں تعارفی جملے لکھنا تکلف زائد یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک فرد ہی نہیں عہد کا نام ہیں۔اہلِ قلم کا ایک کارواں انہوں نے اپنی زندگی میں تیار کیا جس کے نا صرف وہ میرِ کارواں تھے بلکہ استاد بھی تھے۔ان کی شاگردی ہمارے لئے ہمیشہ باعثِ اعزاز اور ''قاسمی سکول آف تھاٹ'' سے تعلق افتخار کی بات رہی ہے۔ ارژنگ ٹیم کا شماران کے نیاز مندوں اور دائرۂ شفقت میں ہوتا تھا۔ان کی 84 ویں سالگرہ کا اہتمام ہم نے لاہور کے شیزان ہوٹل میں کیا تھا۔اسی سالگرہ کی نسبت سے ان سے ہم نے انٹرویو کی فرمائش کر دی جو انہوں نے ہمارا دل رکھنے کے لئے پوری بھی کر دی۔اس موقع پر جو خصوصی ارژنگ شمارہ شائع کیا گیا اس میں یہ تاریخی انٹرویو شامل تھا۔اگر احمد ندیم قاسمی زندہ ہوتے تو ان دنوں ہم ان کی 110 ویں سالگرہ منا رہے ہوتے۔برسی کی بجائے رفتگان کو یاد کرنے کا بہتر موقع مجھے سالگرہ محسوس ہوتا ہے۔آج سے دو دہائیوں پہلے ان کی سالگرہ پر شائع کیا گیا انٹرویو ان کے جنم دن کی نسبت سے پیشِ خدمت ہے۔

س آپ برصغیر کے صفِ اول کے شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار ہیں۔آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے کیا؟

ج شاعری سے۔

س ابتداء میں کس سے متاثر تھے؟

ج شاعری میں اقبال، ظفر علی خان اور اختر شیرانی سے، اور افسانے میں منشی پریم چند سے۔

س ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں کن سے متاثر ہیں؟ چند ایک نام ضرور لیں۔

ج ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں سے کسی سے متاثر نہیں ہوں، البتہ متعدد کو پسند کرتا

ہوں مثلاًن ۔م راشد،فیض احمد فیض، احمد فراز، اختر حسین جعفری،شکیب جلالی، رضی اختر شوق اور ساقی فاروقی وغیرہ کی شاعری پسند ہے۔افسانہ نگاروں میں کرشن، منٹو، بیدی، عصمت، خدیجہ ،ہاجرہ، اشفاق احمد، منشاء یاد، رفعت مرتضیٰ اور نیلوفر اقبال وغیرہ اچھے لگتے ہیں۔

س آپ کی مادری زبان پنجابی ہے۔پنجابی میں آپ نے کچھ لکھا؟ اگر نہیں تو کیوں؟

ج میں نے پنجابی میں شاعری کی ہے۔اور ساتھ ہی پنجابی شعر ونثر کی متعدد کتابوں کے پنجابی ہی میں دیباچے لکھے ہیں۔مثلاً احمد راہی کے ''ترنجن'' اور سلیم کاشر کے متعدد مجموعے۔

س علاقائی زبانوں خاص طور پر پنجابی کا مستقبل کیا ہے؟

ج نہایت روشن مستقبل ہے۔جس زبان کو وارث شاہ، بلھے شاہ، شاہ حسین، سلطان باہو، خواجہ فرید اور میاں محمد بخش کے سے اساتذہ فن میسر ہوں اسے کیسے زوال آ سکتا ہے۔ اور پھر دور جدید میں نہایت معیاری پنجابی شاعری بھی ہورہی ہے۔پنجابی افسانے بھی لکھے جارہے ہیں اور پنجابی ادب کی تنقید بھی چھپ رہی ہے۔

س بقول منیر نیازی ''ترقی پسندوں کی ساری عمر موضوعاتی ہے'' اور موضوعاتی شاعری، گہری شاعری کی ذیل میں نہیں آتی۔آپ ان کی بات سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

ج صدفی صد اختلاف کرتا ہوں۔منیر نیازی اس طرح کے ٹوٹکے چھوڑنے کے عادی ہیں۔اگرچہ تمام تر ترقی پسند شاعری محض موضوعاتی نہیں ہے،لیکن اگر تمام موضوعاتی شاعری اس قدر مذمت کی مستحق ہے تو علامہ اقبال کی موضوعاتی شاعری کو کہاں لے جایئے گا۔خود منیر نیازی بھی صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں۔انہیں تو گہرائی میں جانے سے باقاعدہ خوف آتا ہے۔

س ترقی پسند یا فحاشی! منٹو کے افسانے کس ذیل میں آتے ہیں؟

ج بیشتر ترقی پسندی کی ذیل میں آتے ہیں۔اکا دکا افسانوں پر فحاشی کا شبہ ہوتا ہے ورنہ وہ رد شدہ انسانوں کے حالات کی عبرتنا کی واضح کر کے دراصل بہتر معاشرے کی آرزو کرتے ہیں۔

س ''معاصر'' میں فیض کے حوالے سے اپنے مضمون میں آپ نے لکھا ہے کہ فیض بورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔اور انہی میں خوش رہتے تھے۔تو آپ کی اس بات کے حوالے سے کیا کہا جاسکتا ہے کہ فیض کی ساری شاعری ترقی پسند منشور کے حوالے سے ان کا اصل چہرہ نہیں ہے؟

ج حسن اور عشق کے موضوعات ابدی موضوعات ہیں اور اگر فیض نے حسن وعشق کی شاعری کی ہے تو یہ بھی ترقی پسندی ہے۔کیونکہ حسن کی بقاء اور باہمی عشق کی فضاء پیدا کرنے سے بڑی

ترقی پسندی اور کیا ہوگی؟ دراصل عام ذہن میں ترقی پسندی کو نہایت محدود سمجھا جاتا ہے جبکہ غالب بھی اپنے دور کا ترقی پسند تھا اور اقبال بھی ترقی پسند تھا چنانچہ فیض کی شاعری بھی ترقی پسندی ہی کی عکاس ہے۔ ترقی پسندی کے منشور میں انسانی وقار کی بحالی اور عوام الناس کے افلاس کو ختم کرنے کے کا ذکر ہے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جو ہر ایماندار اور باضمیر شاعر اور تخلیق کار کے پیش نظر ہونے چاہئیں۔ اگر فیض بورژوا لوگوں میں خوش رہتے تھے یہ ان کی مجلسی مجبوری تھی۔ ورنہ انہوں ن بورژوا روایت کے حق میں ایک مصرع تک نہیں لکھا۔

س ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ ''دست صبا'' جیل سے مرتب ہو کر ناشر تک پہنچا اور فیض صاحب نے آپ کو لکھا کہ آپ اس مسودے پر ایک نظر ڈال لیں جس کے جواب میں آپ نے ''دست صبا'' کے بعض مقامات کے سلسلے میں شبے کا اظہار کیا اس کا مطلب ہے کہ فیض کے کلام میں کچھ خامیاں تھیں کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ خامیاں کس نوعیت کی تھیں؟

ج ایک عمر اور ایک مرتبے کے شعراء اپنے کلام کے سلسلے میں باہمی گفتگو کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی خامیاں تلاش کی جا رہی ہیں۔ میں نے بعض اشعار میں بعض الفاظ کے متبادل الفاظ تجویز کئے جس سے میری رائے میں مفہوم زیادہ چمک اٹھتا۔ فیض صاحب نے میرے بعض دوستانہ مشورے قبول کئے مگر بعض کو درخوراعتنا نہ سمجھا۔ ان کے کلام میں خامیوں کی نشاندہی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

س آپ کا شمار ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس کا تسلسل آج کے ادب میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

ج میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ بانی تو سید سجاد ظہیر، احمد علی اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ تھے۔ میں تو ترقی پسند ادب کی تحریک میں 1948 میں شامل ہوا۔ اور تحریک کا آغاز تو 1936 میں ہو چکا تھا۔ رہی یہ بات کہ آج کے ادب میں اس تحریک کی کیا اہمیت ہے تو معدودے چند علامت نگاروں اور تجزیہ نگاروں کو چھوڑ کر یا ان اکا دکا اہل قلم سے قطع نظر جو بڑے سے بڑے تخلیق کار کو تسلیم نہیں کرتے، باقی نوے پچانوے فیصد اہل قلم، غیر شعوری طور پر ہی سہی، اس تحریک سے متاثر ہیں اور ان کی تحریریں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

س فیض احمد فیض اور دیگر سینئرز کی موجودگی میں انجمن ترقی پسند کے جنرل سیکرٹری کے طور پر آپ نے اپنی تقرری کو کیسے لیا؟

ج مجھے دور دراز کا بھی اندازہ نہ تھا کہ مجھ پر یہ بم گرے گا۔ میں ترقی پسند تو یقیناً تھا اور ہوں مگر ساتھ ہی ایک سیدھا سادا مسلمان بھی ہوں۔ میرے بارے میں مشہور تھا کہ ملک میں اس شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے اور یہ بہت حد تک درست بھی تھا۔ میری مخالفت کا آغاز تو اس وقت ہوا جب میں نے اپنا رسالہ ''فنون'' جاری کیا۔ اس کی مقبولیت نے میرے بعض مخالف پیدا کر دیے ورنہ میں خاصا ہر دلعزیز قلمکار تھا۔ شاید اسی وجہ سے ''بڑے'' ترقی پسندوں نے طے کر لیا تھا۔ کہ مجھے جنرل سیکرٹری بنایا جائے تا کہ ترقی پسندوں کے بارے میں اپنا جو کمیونزم کا پرچار کونے والوں کی عام افواہ تھی، اسے ختم کیا جا سکے۔ جب میرا نام اتنے بڑے عہدے کے لئے تجویز کیا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ فیض احمد فیض صاحب اور سید مطلبی فرید آبادی صاحب کی موجودگی میں مجھے اس عہدے کے لئے نامزد کرنا زیادتی ہے۔ مگر ''یار لوگ'' شاید فیصلہ کر کے آئے تھے۔ اس لئے میری ایک نہ سنی گئی۔ یہ سب بڑی ذمہ داری تھی۔ جو میں نے پانچ برس تک حتی الامکان پوری تندھی سے نبھائی۔

س آپ کے مضمون کے ردعمل میں کچھ ادیبوں کا یہ کہنا ہے کہ فیض میں اگر کچھ خامیاں تھیں یا ان سے آپ کے اختلافات تھے تو ان کا اظہار ان کی زندگی میں ہونا چاہئے تھا۔ اس حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

ج معترض حضرات آئندہ ''معاصر'' میں میرا ایک مضمون پڑھ لیں جو میں نے فیض صاحب کی موجودگی میں بلکہ ان کی صدارت میں پڑھا تھا۔ انہیں تسلی بخش جوب ملے گا۔

س آپ کے مضمون میں فیض صاحب کے بارے میں جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ ہر وقت نشے میں مدہوش، شرابی غائب حاضر دماغ اور ایک لاابالی شخص کا ہے جبکہ اپنی شاعری میں فیض ایک مختلف شخص نظر آتے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ؟

ج میرے مضمون میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں میں نے فیض صاحب کو مدہوش، شرابی غائب حاضر دماغ اور ایک لاابالی شخص ثابت کیا ہے۔ اس کے برعکس میں نے تو واضح کیا کہ انہیں شراب کا نشہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ وہ شاعری، مصوری اور موسیقی وغیرہ کے موضوعات پر نہایت دل آویز گفتگو کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرا مضمون غور سے نہیں پڑھا۔ صرف بعض اخباروں کی فساد انگیز سرخیاں پڑھی ہیں۔

س اپنے حوالے سے آپ نے فیض احمد فیض کے جس تعصب کا ذکر کیا ہے کیا آپ اس کی کچھ

مثالیں بیان کریں گے۔اب جبکہ اس بات کو ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے۔آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کو اس تعصب نے کس حد تک متاثر کیا؟

ج مجھے اس ضمن میں جو کچھ کہنا تھا میں اپنے مضمون میں کہہ چکا ہوں۔اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

س دوران قید حکومت نے آپ کو قومی ترانہ لکھنے کی دعوت دی جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حکومت کو آپ کے مرتبے اور اہمیت کا خیال تھا۔دوسری طرف آپ کے لئے بھی اعزاز کی بات تھی کہ تمام تر اختلافات کے باوجود حکومت کی طرف سے آپ کو ملک کا ترانہ لکھنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔آپ نے اس دعوت کو کیوں ٹھکرایا، کیا بعد میں اس حوالے سے کوئی پچھتاوا ہوا؟

ج میں کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل میں ایک سی کلاس میں نظر بند تھا۔تب مجھے جیل کے حکام نے چھاگلہ کی اس ٹیون کا ریکارڈ بھیجا۔جو میرے نام قومی ترانہ لکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر وہاں خنجر گاڑ دیا گیا ہے۔مجھے اس دعوت نامے کا شدید دکھ ہوا۔اور میرے اندازے کے مطابق مجھے دکھ پہنچانے کے لئے چھاگلہ کی ٹیون مجھے جیل کے اندر بھیجی گئی تھی۔اس صورت میں ترانہ کیوں لکھتا اور اگر لکھتا تو اس میں حکمرانوں کے مظالم کے سوا کیا ہوتا؟

س فیض صاحب کی وفات کے حوالے سے بطور خاص آپ نے لکھا ہے کہ ''20 نومبر کو ان کا انتقال ہو گیا، 20 نومبر کو جو میری پیدائش کی تاریخ ہے،ان کی تاریخ وفات قرار پائی'' ان جملوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج صرف دکھ مراد ہے۔فیض صاحب سے بعض شکایات اپنی جگہ،مگر وہ میرے محترم تھے۔20 نومبر کو ان کی وفات سے مجھے گہرا دکھ ہوا۔دس پندرہ روز قبل میں نے اپنے احباب کو اپنی سالگرہ کی دعوت میں بلا رکھا تھا۔مگر 20 نومبر کو یہ سانحہ ہو گیا میں فیض صاحب کے جنازے کے بعد ان کی تدفین تک اور ان کے مزار پر دعا کرنے کے بعد ہی ہوٹل میں اپنے مہمانوں کے پاس پہنچا۔ان سے معذرت کی اور چائے کی ایک ایک پیالی پیش کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

س فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے آپ نے لکھا کہ ''ان کے ہاں فکری گہرائی نہیں ہے'' یہ فکری گہرائی کیا ہے اور فیض کے ہاں اس کی عدم موجودگی کا کیا سبب ہے جبکہ فیض صاحب ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور ان کی شاعری اور دانشوری کا بھی ایک عالم معترف ہے؟

ج ’’یہ فکری گہرائی کیا ہے؟‘‘ کے الفاظ سن کر میں حیران رہ گیا کہ کیا آپ جو مجھ سے سوال پوچھ رہے ہیں، اتنا بھی نہیں جانتے کہ فکری گہرائی کیا ہوتی ہے۔ غالب اور اقبال کا مطالعہ کیجئے ،آپ کو فکری گہرائی کا مفہوم مل جائے گا۔ میں نے بھی اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ فیض بہت پڑھے لکھے تھے۔ اور اگر وہ چاہتے تو فکری شاعری کو اپنی دوسری شاعری کی طرح شیریں اور مترنم بنا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور مجھے حیرت ہے کیوں نہیں کیا۔

س دنیا کے عظیم انقلابات کے حوالے سے فیض صاحب کا انقلاب ایران کو عظیم قرار دینا اور پھر اس پر جیلانی کامران کا فیض کو اسلامی تاریخ کے عظیم دانشوروں میں شامل کرنا، آپ کے نزدیک حیران کن کیوں ہے؟ کیا آپ کے خیال میں بطور مسلمان فیض کی حیثیت مشکوک ہے؟

ج مجھے اگر فیض کے جواب پر حیرت ہوتی ہے تو اس طرح ان کے مسلمان ہونے پر میرے شک کرنے کی گنجائش کیسے پیدا ہو گئی؟ اگر میں یہ کہوں کہ ایران کا انقلاب، روس اور چین کے انقلابوں سے فروتر تھا تو کیا میں کافر ہو جاؤں گ؟ اور ایران کے انقلاب کو عظیم ترین انقلاب قرار دینے سے کوئی دانشور کیسے ہو جاتا ہے؟ جبکہ اس کے سامنے انقلاب ایران سے پہلے مصر اور لیبیا کے انقلاب بھی موجود ہیں اور یہ دونوں بھی مسلمان ملک ہیں اور وہاں بھی بادشاہت ختم کی گئی تھی۔

OOO

اشفاق احمد

بابا جی اشفاق احمد خاں پاکستانی ادب اور میڈیا کا ایسا معتبر اور لازوال حوالہ ہیں جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مزید روشن اور نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ پچیس برس قبل ماہنامہ ''ارژنگ'' نے ان کے اعزاز میں ایک شام کا اہتمام کیا۔ مال روڈ پر واقع شیزان ہوٹل جو کبھی ادیبوں اور فنکاروں کا کنج عافیت ہوا کرتا تھا، ان کے دوستوں اور عقیدت مندوں سے بھرا ہوا تھا۔ ''بابا جی اشفاق احمد کے ساتھ کچھ قیمتی لمحات''، قلم قبیلے سے اظہار خیال کرنے والوں کی ایک کہکشاں تھی جو اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ اس موقع کی مناسبت سے ہم نے ان کا ایک خصوصی انٹرویو بھی شائع کیا جو قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر کرنا چاہوں گا۔

س لکھنا کیسے شروع کیا؟

ج کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ لکھنا کب شروع کیا۔ میں پڑھنے لکھنے سے بڑی جان چھڑاتا تھا کیونکہ میں اچھا سٹوڈنٹ نہیں تھا۔ مشکل سے پاس ہوتا، بلکہ میٹرک میں فیل بھی ہو گیا تھا۔ جب میں ایف اے میں کالج میں داخل ہوا تو پھر میں نے اپنے اردگرد پروفیسرز اور اساتذ کو نئے روپ میں دیکھا۔ وہ کچھ ایسے شفیق لوگ تھے اور اپنا آپ نچھاور کرنے میں تھوڑے سے ''شیخی باز'' بھی تھے۔ ان کی اس تعلّی کا ہمیں بڑا فائدہ ہوا کہ وہ اپنا علم ہم پر نچھاور کرنا چاہتے تھے۔ فلسفے میں ایک پروفیسر لالہ دیس راج بڑی عمر کے استاد تھے ان کی معرفت میں بلھے شاہ سے متعارف ہوا۔ جو کچھ پروفیسر صاحب نے ہمہ اوست کے فلسفہ کے بارے میں بتایا وہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ البتہ بلھے شاہ کی شاعری کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو گیا۔ پھر بلھے شاہ کی شاعری سے پھسلتا پھسلتا اس عہد کی اردو شاعری، جو زیادہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھی کی طرف جا نکلا اور پھر مجھ سے پوچھے بغیر اور مجھ کو بتائے بغیر میرے اردگرد لکھنے لکھانے کا عمل شروع ہو گیا۔

س ابتداء میں کن سے متاثر تھے؟

ج ابتداء میں انگریزی کے وہ مصنف جن کی نظمیں اور نثر ہمارے کورس میں شامل تھیں ان

سے متاثر ہوا پھر اردو نظم ونثر میں ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے بڑا ''ہانٹ'' کیا لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب میں خود لکھنے لگا تو میں ترقی پسندی کے ''ہانٹڈ ہاؤس'' سے نکل کر قریب ہی چھوٹی چھوٹی جھگیاں بنانے لگا۔ جو دیکھنے میں تو شاید اتنی خوبصورت نہیں تھی لیکن ان کے اندر کی رہائش بڑی پر فضا اور پرسکون تھی۔

س بقول منیر نیازی ترقی پسندوں کی تمام شاعری موضوعاتی ہے اور موضوعاتی شاعری گہری شاعری کی ذیل میں نہیں آتی۔ آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق کریں گے؟

ج میں بھی بالکل سو فیصد یہ سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو ایک پرچہ ترکیب استعمال دیا گیا ہے۔ جس کے مطابق وہ اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے اور بعض اوقات بڑی خاصے کی چیزیں پیش کر جاتے۔ جنگ ختم ہو رہی تھی، انگریز جا رہا تھا، آزادی قریب تھی۔ ایسے میں ترقی پسندی کا لٹریچر طرارے بھر رہا تھا اور موجیں مار رہا تھا۔

س احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض ایسے بڑے شعراء اور ترقی پسندوں کی موجودگی میں منیر نیازی کی شاعرانہ حیثیت کیا بنتی ہے؟

ج اصل میں ان کا مقابلہ ایک عجیب سی بات ہے اور کسی کو کسی سے بڑا شاعر قرار دینا بھی کافی مشکل ہو جاتا ہے لیکن شاعری کے اعتبار سے تینوں ہی بڑے توجہ طلب شاعر ہیں اور سننے والے کی نگاہیں اٹھ اٹھ کر ان کی طرف جاتی ہیں۔ منیر بلاشبہ ان میں مختلف شاعر ہیں۔ فیض میں جو رومانیت ہے وہ دوسرے دونوں شاعروں میں کم درجے پر ہے۔ لیکن ندیم میں موضوعات کا جو تنوع ہے وہ فیض اور منیر کے ہاں کم ملتا ہے۔ منیر کی شاعری کا بڑا وصف اس تحیر میں پنہاں ہے جو اسے اپنی ذات پر ہے کہ، ہیں!! میں تو اپنے آپ کو بڑا اچھا سمجھتا ہوں۔

س آپ کا کہنا ہے کہ کالم نگاری نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نقصان کی کچھ وضاحت کریں؟

ج کالم نگاری نے بہت اچھے ادیبوں کا اتنا وقت لے لیا کہ وہ ادیب نہ بن سکے۔

س کیا ابن انشاء اور عطاء الحق قاسمی کے کالم بھی اسی ذیل میں آتے ہیں؟

ج یہ دونوں اور ان جیسے کچھ اور تخلیقی ادیبوں کو مستثنیات میں رکھا جا سکتا ہے۔

س کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ قدرت اللہ شہاب کو بابا بنانے میں ممتاز مفتی اور آپ کا بڑا ہاتھ ہے؟

ج لوگوں کا میں دل نہیں توڑنا چاہتا تھا، کہ شائد ایسے ہی ہے۔ اصل میں قدرت اللہ شہاب

ایک دو ٹکے کا آدمی تھا۔ نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ کوئی شہرت، نہ ہی کوئی معاشرتی مقام۔ چنانچہ میں نے اور ممتاز مفتی نے سوچا کہ اس کو ایک بزرگ کی حیثیت سے مشہور کردیتے ہیں۔ ہمارا دوست معروف ہوجائے گا چنانچہ ایسے ہی ہوا، لوگوں نے اس کی عزت شروع کردی۔ پھر دس پندرہ لکھنے والوں نے مل ملا کر شہاب نامہ لکھنا شروع کیا۔ ایک ایک باب اپنے ذمے لیا اور اسے مکمل کر کے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب کے نام سے شائع کرایا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے چشم زدن میں قدرت اللہ بابا بھی بن گیا اور ادیب بھی۔

س شہاب نامے میں شامل چند مافوق الفطرت واقعات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج شہاب نامے میں جن مافوق الفطرت واقعات کا ذکر ہے وہ میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے لیکن میں ان کا بطلان نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہے تو میں اسے تسلیم کرلیتا ہوں کہ ایسا ہوا ہوگا۔ اس دلیل سے اسے نہیں کاٹتا کہ چونکہ میرے ساتھ ایسا واقعہ نہیں گزرا اس لئے غلط ہے۔

س ایک بابا جی آپ کے بھی تو ہیں؟

ج جی ہاں! وہ میرے مرشد ہیں، ان کا نام حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نوروالے ہیں۔ ان کا ڈیرہ میاں میر صاحب کے دروازے کے عین سامنے انفنٹری روڈ پر ہے۔ اب وہ اس جہان سے پردہ کرچکے ہیں۔

س کیا ان بابا جی سے شہاب صاحب کا بھی ملنا تھا؟

ج بالکل میری وجہ سے شہاب صاحب ان سے بہت دفعہ ملے اور وہ بابا جی کا بڑا احترام کرتے تھے۔

س تو کیا قدرت اللہ شہاب اور آپ دونوں ایک ہی سلسلے سے منسلک ہیں؟

ج شہاب نامے میں ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہاب صاحب کا سلوک کے راستے سے گہرا تعلق تھا۔ لیکن میں علم تصوف کا جرنلسٹ ہوں۔ میں اس علم کے بارے میں متعلقہ ریفرنس اکٹھے کر کے فراہم کرسکتا ہوں لیکن خود صوفی نہیں ہوں نہ ہی میں اس راستے کا مسافر ہوں۔ جس طرح ایک مالدار اور آسودہ حال آدمی کمیونزم کا قائل ہوتا ہے۔ کچھ ایسی کیفیت میری ہے۔ میں دل وجان سے تصوف کا قائل ہوں لیکن بدقسمتی سے اس راہ کو اختیار نہ کرسکا۔

س آپ کی اس راہ میں کیا رکاوٹ حائل ہے؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ میری راہ میں خوف اور خواہش حائل ہیں اور یہی دو انسانی راستے کے سب سے بڑے دو خوفناک بھیڑیے ہیں۔

س ان سے چھٹکارے کی کوئی راہ؟

ج جس طرح جسمانی عارضے کے لئے کسی حکیم طبیب یا ڈاکٹر کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔اسی طرح روحانی عارضے کے لئے ایک بادل کی تلاش دامن گیر ہوتی ہے۔ڈاکٹر حکیم کی تلاش پر تو لوگ معترض نہیں ہوتے لیکن کسی بابے کی حضوری میں جانے کی راہ میں سب سے بڑا پتھر لوگ ہی ہوتے ہیں۔جن کا مریض کے ساتھ کوئی ذہنی، جسمانی، عقلی یا روحانی تعلق بھی نہیں ہوتا۔

س کیا ہمارے مسائل کا حل صرف روٹی ہے؟

ج ہمارے ہاں کسی کو روٹی، کپڑا اور مکان کی ضرورت نہیں ہے۔ہمارے چودہ کروڑ لوگ کسی ایسے کندھے کی تلاش میں پھر رہے ہیں جس پر وہ سر رکھ کر رو سکیں مگر بدقسمتی سے وہ کندھا نہیں ملتا۔

س کیا ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں؟

ج یہ پیشین گوئی تو نہیں کی جا سکتی یہ سوال صحافیوں سے کیا جانا چاہیئے، وہ اس کی بہتر نشاندہی کر سکتے ہیں۔

س بڑے اخبارات کے ادبی ایڈیشن ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ج وہ بھی ادب کے فروغ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جتنا کہ بڑے ادبی مجلّے یا پرچے۔

○○○

انور مسعود

شعروسخن کے آسمان پر کچھ ستارے ایسے ہیں جن کا رسمی تعارف کروانا اضافی گفتگو محسوس ہوتا ہے۔کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔انور مسعود عہد حاضر کے ان معدودے چند اہل قلم میں سے ایک ہیں۔جن کی وجہ سے قرطاس وقلم کی آبرو قائم ہے۔میاں چنوں مشاعرے کے سلسلے میں میرے گھر ان کا قیام تھا تو میں نے موقع غنیمت جانا۔ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

س ذریعہ اظہار شاعری کو کیوں منتخب کیا؟ لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج بات یہ ہے کہ میں جس گھر میں پیدا ہوا وہاں شاعری کا ماحول موجود تھا۔میری نانی اماں شاعرہ تھیں اور تایا بھی شاعر تھے۔جس شہر میں پرورش پا رہا تھا وہاں بھی شاعری کا دور دورہ تھا۔شاعری میں مجھے شروع سے ہی دلچسپی تھی۔آپ دیکھیں کہ میں فارسی کی شاعری پڑھتا تھا حالانکہ مجھے فارسی کی بالکل سمجھ نہیں تھی۔میری والدہ کو لٹریچر سے بہت دلچسپی تھی۔والد صاحب نے بچپن میں ہی مجھے حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' لا کر دیا۔اب بھی اس کے کئی شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔یہ وہ ماحول تھا جس میں شوق پروان چڑھا اور لکھنے کا خیال آیا۔یہاں میں اپنے شفیق اساتذہ چوہدری فضل حسین اور سید حامد حسین کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔انہوں نے بھی اس بابت بہت رہنمائی فرمائی۔

س آپ کہاں پیدا ہوئے؟ بچپن کہاں گزرا؟اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے گا؟

ج پیدائش تو میری سوہنی مہینوال کے چناب والے گجرات میں ہوئی۔مگر والد صاحب کاروبار کے سلسلے میں لاہور ہجرت کر گئے۔پرائمری سکول یعنی پانچویں جماعت تک کی تعلیم میں نے لاہور میں حاصل کی۔بعد ازاں والد صاحب واپس لاہور آ گئے اور ہم لوگ بھی ان کے

ساتھ۔میٹرک میں نے پبلک ہائی سکول گجرات سے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔FSc میں زمیندار کالج میں داخلہ لے لیا۔والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔مگر میری طبیعت شاید ڈاکٹری کے لئے موزوں نہیں تھی۔جب لیبارٹری میں لڑکے مینڈک وغیرہ کی Disection کر رہے ہوتے تو میں غزل لکھ رہا ہوتا تھا۔

س تعلیمی سلسلہ پھر آگے کیسے بڑھا؟۔

ج آرٹس کی تعلیم کی طرف آ گیا تھا۔ایف اے میں میں نے سکالرشپ حاصل کیا۔بی اے میں سلور میڈل لیا اور زمیندار کالج گجرات سے گریجوایشن کے بعد میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔یہ سکول کنجاہ میں تھا۔میری مشہور نظم ماں گجرات کے قریبی علاقے کنجاہ میں تدریسی زمانے کی یادگار رہے۔یہ وہاں ہی لکھی گئی تھی۔دو سال پڑھانے کے بعد میں لاہور آ گیا۔اورینٹل کالج میں ایم اے میں داخلہ حاصل کیا اور ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔میری پنجاب میں پہلی پوزیشن تھی۔اس کے بعد میں نے گورنمنٹ سروس جوائن کر لی۔

س آپ فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔تدریسی زمانہ کیسا گزرا؟فارسی سے آپ کے خاص لگاؤ کی وجہ کیا ہے؟

ج فارسی تو ہمارے گھر کی روایت بھی ہے۔یوں کہ میری بیوی بھی فارسی پڑھاتی تھی،میں نے بھی فارسی پڑھائی اور اب میری بیٹی بھی کالج میں فارسی پڑھا رہی ہے۔تدریسی زندگی بڑی بھرپور رہی۔کئی شہروں میں پڑھایا،ڈیرہ غازی خان،بہاولنگر،پنڈی کھیپ،گجر خان،راولپنڈی، مری میں بھی پڑھاتا رہا۔اسی دوران ۱۹۷۶ میں چالیس اساتذہ کے وفد کے ہمراہ چار مہینے کے لئے ایران کے سرکاری دورے پر بھی گیا۔مجھے اس وفد کی سربراہی کرنے کا موقع بھی ملا۔

س آپ نے اپنی بیگم اور بیٹی کا تذکرہ کیا۔اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں گے؟

ج میرے تین بیٹے اور دو بچیاں ہیں۔سب شادی شدہ ہیں۔ایک بیٹا لاہور میں عمار مسعود ٹی وی میں ملازم ہے،جس نے پی ٹی وی کا مشہور پروگرام ''رات گئے'' شروع کیا تھا۔اس نے ایک نابینا لڑکی سے شادی کی تھی اب تو وہ بیچاری فوت ہوگئی ہے۔باقی چاروں بچے یہاں اسلام آباد میں ہی رہتے ہیں۔

س ادب کی ترویج کے لئے قائم اداروں کی کارکردگی سے آپ مطمئن ہیں؟

ج کارکردگی ٹھیک ہی ہے۔اپنی سطح پر وہ کوشش کر رہے ہیں۔بعض لوگوں کو شکایات بھی ہیں۔ہر چیز سے ہر کوئی تو مطمئن نہیں ہوسکتا۔مجھے ذاتی طور پر تو کوئی شکایت نہیں ہے۔میری پہلی کتاب ''میلہ اکھیاں دا'' پر مجھے پاکستان رائٹرگلڈ کی طرف سے انعام ملا۔پھر اکادمی ادبیات نے مجھے میری کتاب ''ہن کیہ کریئے'' پر ایوارڈ دیا۔مجھے صدارتی ایوارڈ بھی ملا ہے۔میری نظر میں تو یہ ادارے دستیاب وسائل میں اپنا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔سب کو مطمئن کرنا تو ویسے بھی ممکن نہیں ہے۔

س کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہیئے؟

ج ادیب جس ماحول میں رہتا ہے اس سے جدا نہیں ہوسکتا۔سماجیات اور سیاست سے الگ ہونا ممکن ہی نہیں اور نہ ہی یہ مستحسن عمل ہے۔کیا علامہ اقبال نے مسلم لیگ میں حصہ نہیں لیا تھا؟ کیا قائداعظم کے ساتھ ان کا مکمل تعاون نہیں تھا؟ علامہ اقبال نے تو نہ صرف مقامی سیاست میں حصہ لیا بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔اقوام متحدہ کی والدہ لیگ آف نیشنز کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ کفن چوروں کا ٹولہ ہے۔جس ماحول میں ادیب رہتا ہے اس کی سماجیات وسیاسیات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔میرے خیال میں شاعری وہ جو نیکی کے ساتھ دلچسپی پیدا کرے اور برائی کے ساتھ نفرت دلائے۔یہ فرض تو میں اپنی حد تک ادا کرتا رہتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

س آپ نہیں سمجھتے جب سے پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا چرچا ہوا ہے ادبی سرگرمیوں کی کوریج دب سی گئی ہے؟

ج میں تائید کرتا ہوں آپ کے خیال کی۔ادبی کارروائیاں ہمارے ٹی وی چینلز پر کم ہوگئی ہیں۔کمرشلزم ٹی وی پر چھایا ہوا ہے۔اب تو بس جب محرم آتا ہے تو ایک سلام کا مشاعرہ ہوجاتا ہے یا پھر عید میلاد النبیؐ پر نعتیہ مشاعرہ کر دیا جاتا ہے۔پہلے زمانے میں ادب کی ترویج تھی اب نہیں ہے۔ہاں اخبارات میں ادب سے متعلق مواد مل جاتا ہے۔جو اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیتا ہے۔

س قومی اخبار کے ادارتی صفحہ پر روزانہ آپ کا قطعہ چھپتا ہے۔کبھی صحافت بھی کی ہے؟ کالم نگاری کے بارے میں کبھی نہیں سوچا؟

ج یہ سوال اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔کئی شعراء کرام اچھے کالم نگار ہیں۔ان میں امجد اسلام

امجد اور عطاء الحق قاسمی بہت اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور انتہائی اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ مگر میری طبیعت کچھ کالم نگاری کی طرف نہیں آئی۔ میں نے ایک دفعہ ایک جگہ لکھا تھا کہ میرے قطعہ کو ہی میرا کالم سمجھ لیجئے۔

س نوجوان ادیبوں کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج ان کو پیغام صرف یہ ہے کہ شعر و ادب لفظوں کا کھیل ہے۔ جب تک لفظ سے آگاہی نہ ہو تب تک معیاری شعر و ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں میں پائی جانے والی موسیقیت اور معنویت کے ادراک کے بغیر لفظ کا مناسب استعمال نہیں آ سکتا۔ نوجوان نسل کی گرفت لفظ پر ڈھیلی ہو گئی ہے۔ لفظ کا فنکارانہ استعمال نہیں ہو رہا نوجوان ادیبوں کو چاہیئے کہ وہ سینئرز کو خوب پڑھیں میر تقی میر، مرزا غالب، فیض احمد فیض، مجید امجد سمیت سینئرز ادیبوں کا بھرپور مطالعہ کریں۔

OOO

امجد اسلام امجد

بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا تعارف کروانا تکلف زائد محسوس ہوتا ہے، جنہیں عرف عام میں سلیبرٹی کہا جاتا ہے، جو درحقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی ہیں۔ امجد اسلام امجد شعروادب کا ایسا ہی ایک روشن ستارہ ہے۔ آپ ہمارے ملک کے ان چند گنے چنے خوش قسمت تخلیق کاروں میں سے ہیں جنہیں کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں۔ ان کے ساتھ پچھلے دنوں ڈیفنس لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر شام کی چائے کے ساتھ ہونے والی گفتگو قارئین کے لئے من وعن پیش کی جا رہی ہے۔

س شاعری سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ فقط نظموں پر مشتمل تھا، حالانکہ آپ غزل کو بھی بھرپور کہتے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت رہی ہے کہ نئے لکھاری اپنے فنی سفر کا آغاز غزل سے کرتے ہیں۔ آپ کے اس باغیانہ رویے کی کوئی خاص وجہ تھی؟ اس وقت آپ کے ذہن میں کیا تھا جب آپ نے اس قدیم روایت سے بغاوت کی؟

ج آپ نے بالکل صحیح کہا۔ اصل میں غزل اردو ادب میں شاعری کی فطری صلاحیت رکھنے والے حضرات کا نیچرل ذریعہ اظہار ہے۔ آپ اس میں نیٹ پریکٹس کر سکتے ہیں، فری فار آل ہے۔ اس جیسی سہولتیں کسی اور صنف میں نہیں۔ غالباً میں نے بھی شاعری کا آغاز غزل سے ملتی جلتی صنف سے کیا تھا، لیکن ہوا کچھ یوں کہ جب میں یونیورسٹی کے سالوں میں تھا اور کہنا چاہئے کہ لوگ ہمارے نام سے آشنا ہوئے، اس دور میں کچھ نظمیں شائع ہوئیں جن کو بہت مقبولیت ملی۔ دوسری وجہ جب مڑ کر میں دیکھتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے نظم کے انتخاب کی وجہ میری فطرت کا بنیادی رجحان بھی تھا۔ میں فطری طور پر چیزوں کو Totality میں دیکھتا ہوں۔ میرے ڈراموں میں بھی یہی چیز نظر آئے گی۔ آزاد نظم سے میں بہت بعد میں Hook ہوا۔ 1967ء میں میں نے پہلی آزاد نظم لکھی تھی۔ اس سے پہلے میں بھی یہی سمجھتا رہا کہ یہ کوئی بے وزن چیز ہے پھر آج کل جیسے نثری نظم ہے تو یہ اس ٹائپ کی کوئی چیز ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے شعور ہونا شروع ہوا کہ یہ اس طرح کی

چیز نہیں ہے بلکہ ہماری فارمل (Formal) شاعری ہے جو کسی خاص بحر میں کی جاتی ہے۔

یہ اس طرح کی چیز ہے اور اسی کی Extended شکل ہے۔ میں کالج کے زمانے میں کرکٹ کھیلنے کا بہت شوقین تھا۔ انہی دنوں مجھے کسی نے بتایا کہ کوئی شاعر مجید امجد ہیں۔ انہوں نے کرکٹ سٹار فضل محمود پر ایک نظم لکھی ہے۔ میں نے کرکٹ کے حوالے سے اس نظم میں دلچسپی ظاہر کی کہ دیکھیں شاعر نے کیا لکھا ہے۔ اس نظم نے جس کا عنوان آٹو گراف تھا، مجھے انگریزی محاورے کے مطابق خرید لیا۔

مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ شاعری میں اتنا ترنم ایسی مختلف صنف میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، کہ نہ اس میں قافیے کی قید ہے نہ ردیف کی قید ہے۔ مگر مزہ قافیے اور ردیف سے بھی زیادہ آرہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ Turning Piont تھا جب میں آزاد نظم کی طرف آ گیا۔ اس نے مجھے ایسا کیا کہا کہ میں نظم کا ہو کر رہ گیا۔ اس وقت جو میرے سینئرز تھے خاص طور پر احمد ندیم قاسمی صاحب ان کا مجھے بہت تعاون حاصل رہا۔ جب میری کتاب ''برزخ'' کی اشاعت کا وقت آیا اس وقت تک میری بہت سی غزلیں چھپ چکی تھیں۔ ''فنون'' کے جریدے غزل نمبر اس کے آخر میں جدید ترین شعراء کے حصے میں پہلے نمبر پر میری غزلیں شائع کی تھیں لیکن میں نے خود سے سوال کیا کہ جو میرا اپنا نیچرل اظہار ہے، جس میں میری اپنی شخصیت جھلکتی ہے، چونکہ غزل میں ایسے بڑے بڑے اساتذہ ہیں کہ آپ کو اپنی پہچان اور ناک نقشہ بناتے ہوئے اک عمر لگ جاتی ہے۔ چونکہ غزل میں مشق زیادہ ہے، غزل میں ہنر زیادہ ہے اور آرٹ پیچھے رہ جاتا ہے۔ نظم کے اندر مجھے یہ آسانی لگی کہ جو میرے اندر کا آرٹسٹ ہے اس کے لئے زیادہ گنجائش ہے۔ جب میری پہلی کتاب چھپنے کے قریب آئی تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ یہ میرا بہت بولڈ فیصلہ تھا بلکہ اس وقت کے بعض دوستوں کے نزدیک تو بہت احمقانہ فیصلہ تھا۔ اس زمانے میں غزل بہت ''اِن'' تھی اور نظم میں راشد صاحب اور میرا جی اور فیض صاحب کا دور اپنے ''فیگ اینڈ'' پر تھا اور نئی نظم میں کوئی نیا نام اس وقت تک تھا ہی نہیں۔ اصغر گونڈوی کا ایک شعر ہے جو میں اکثر کوٹ کرتا ہوں۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے تو میں نے ایک مشکل راستہ لیا اور پہلی کتاب میں کوئی غزل نہیں رکھی لیکن باقی سب کتابوں میں غزل بھی ساتھ ساتھ رکھی۔

س: ڈرامے کے حوالے سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ڈرامے ''وارث'' کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا ڈرامہ قرار دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب ویسے ڈرامے کیوں نہیں بن رہے؟

ج اصل میں یہ بڑی الجھتی ہوئی سی بات ہے۔اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہے اور جن عوامل کا آپ نے ذکر کیا وہ سب کسی نہ کسی حد تک ذمہ دار ہیں۔1964ء میں جب ٹی وی آیا تو ہمارے پاس پرفارمنگ آرٹ میں فلم تھی، تھیٹر تھا اور ریڈیو تھا۔ یہ تین شعبے تھے اور تینوں میں بوجوہ جو تخلیقی لوگ تھے یا بڑی اچھی اور نئی سوچ والے، ان کے لئے ان میں گنجائش نہیں تھی یا کم گنجائش تھی۔ٹی وی آیا تو اس میں تینوں جمع ہو گئے اور تینوں بیک وقت اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے۔جس کے سبب ٹی وی ڈرامہ بہت جلد نیشنل چینل بن گیا تھا اس لئے ملک کے تمام شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کی نمائندگی کرنے گا۔امیر، غریب، کسان، شہری، دیہاتی، ہوا یہ کہ ہمارے ڈراموں میں گلدستہ سا بننا شروع ہو گیا جس میں ہماری پوری قومی زندگی کی جھلک نظر آنے لگی۔شروع شروع میں مڈل کلاس کا غلبہ رہا۔آؤٹ ڈور کے لئے وسائل نہیں تھے اور Set Designing کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔تو زیادہ تر ڈرامے گھروں میں، ڈرائنگ روموں میں، جیسا کہ حسینہ معین نے بہت اچھا ڈرامہ اس زمانے میں لکھا، مگر وہ سارے کے سارے شہری مڈل کلاس کے گرد گھومتے تھے مگر باہر اور خاص طور پر دیہاتی زندگی کی طرف تو بالکل بھی نہیں جاتا تھا۔منو بھائی کے ''جھوک سیال'' اور اکا دکا دوسرے ڈراموں کو چھوڑ کر ''وارث'' سے پہلے آپ کو بہت کم گاؤں کی زندگی Project ہوتی نظر آئے گی۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ساٹھ ستر فیصد خاموش اکثریت جسے پچھلے دس بارہ سال میں ٹیلی ویژن پر ڈرامے کی مقبولیت کے باوجود جگہ نہیں ملی تو ایک تو وہ اس میں شریک ہوئی۔دوسرا یہ کہ ان کے مسائل سامنے آئے کہ ہمارے ملک میں لوگ اس طرح سے بھی رہتے ہیں اور یہ جو وڈیرے جو کہ شہروں میں پارٹیوں میں یا کہیں اور نظر آتے ہیں کیا وہ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں؟ پھر اس میں ایکٹنگ بہت اعلیٰ ہوئی۔اس سے قطع نظر کہ یوں کہتے ہیں کہ وہ لکھا ہی بہت اچھا تھا یقینا میں نے لکھا بھی اچھا ہو گا۔ٹی وی تاریخ رہی تھی کہ ہر ڈرامے میں دو تین کردار ہی بہت ہوتے ہیں۔ یہ واحد ڈرامہ تھا جس میں چھ سات کردار بہت ہٹ ہوئے تھے۔ یعنی لوگ چودھری حشمت کو تو دیکھنا چاہتے ہی تھے مگر وہ پانیاز، چودھری انوار، دلاور، مولا داد، عظمیٰ گیلانی، طاہر نقوی اور ثمینہ احمد کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر جیسا میں نے کہا اس زمانے میں معاشرے کے ہر طبقے کو نمائندگی کرنی تھی۔ پی ٹی وی کا دور جب ختم ہوا اور پرائیویٹ چینل آئے تو ان چینلز کی آمد سے یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی چیز ٹی وی پر چلنی چاہئے، یہ فیصلہ غلط لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔غلط لوگ اس سینس میں یہ ایڈورٹائزر کے ہاتھ میں چلا گیا۔اب ایڈورٹائزر جو ہے وہ

اپنے کام کو تو یقیناً اچھی طرح جانتا ہے مگر اس کام کو وہ کیسے جان سکتا ہے کہ ڈرامے کا مرکزی خیال کیا ہونا چاہیئے؟ فنکاروں کے کردار کیا ہونے چاہئیں۔ ہوا یہ کہ ایڈورٹائزر نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے فلاں اداکار چاہئیں۔ اب اس سے پہلے ٹی وی کریکٹر کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا۔ اب ایکٹر کے حوالے سے دیکھا جانے لگا۔ پھر یہ ہونے لگا کہ مجھے اس معاشی طبقے کی کہانی چاہیئے، پھر یہ کہ عورتوں پر جو ظلم ہے یہ اگر دکھائیں تو گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتیں متاثر ہوتی ہیں اور اس سے ریٹنگ بڑھتی ہے۔ اب مڑتے مڑتے وہ ڈرامہ جو پورے معاشرے کو دکھایا کرتا تھا، اب صرف مخصوص طبقے کو دکھانے لگا اور سارا ہی ڈرامہ ان کے گرد گھومنے لگا۔ اس سے آہستہ آہستہ جو ڈرامے کی یونیورسل اپیل تھی وہ متاثر ہوتی ہے لیکن یہ کہنا تھوڑی زیادتی ہوگی کہ یہ جتنا ڈرامہ بھی پندرہ بیس سال میں بنا یہ سارے کا سارا بڑا فضول اور بے معنی تھا، ایسا نہیں ہے۔ کئی نئے پروڈکشن ہاؤسز اور اچھے مصنف واداکار آئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جو پی ٹی وی کی روایت تھی اور کولیکٹر نئے ٹرینڈز کا ایک بلینڈ بناتے تو وہ یقیناً لوگوں کے دل و دماغ میں اپنا گھر ضرور بناتے۔ پرابلم یہ ہے کہ ڈرامے بنتے ہیں، چلتے ہیں اور لوگ دیکھتے ہیں مگر ایک ہفتے کے بعد کسی کو نہ اس کی کہانی یاد رہتی ہے، نہ کردار۔ سوسائٹی کے سبھی شعبوں کی نمائندگی ہونی چاہیئے۔ اب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا ڈرامہ ہے جسے سب لوگ دیکھنے پر مجبور ہیں۔

س ہمارے معاشرے کا بڑا حصہ اور اس کے مسائل تو ٹی وی پر نظر ہی نہیں آتے۔ کیا لوگوں کی غالب اکثریت ٹی وی ڈرامے کے لئے غیر متعلق نہیں ہے؟

ج میں سمجھتا ہوں آپ کے سوال کا بنیادی جواب یہی ہے۔

س آپ کے گیت بھی بہت مقبول ہوئے، آپ کے گیت پاکستان کے زندہ گیتوں میں سے ہیں۔ گیت نگاری کا تجربہ کیسا رہا؟

ج اصل میں گیت نگاری ہماری شاعری کا حصہ تو شروع سے ہی رہی ہے لیکن پاکستان بننے سے قبل گیتوں پر پابندی الفاظ کا غلبہ رہا۔ بنیادی طور پر تو یہ گیت کی صنف بھی ہندی سے آئی ہے، اس لئے یہ غلبہ بھی درست تھا لیکن پھر آرزو لکھنوی کے زمانے سے لے کر ساحر لدھیانوی آئے اور قتیل شفائی۔ میں نے دراصل گیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے لکھنے شروع کئے تھے۔ شروع شروع میں جب ہم شاعر بننے کی کوشش کر رہے تھے تو سب سے آسان رستہ یہی تھا کہ آپ کا کوئی گیت ہٹ ہوجائے۔ پھر میں نے ٹی وی پر بچوں کے لئے بہت گیت لکھے۔ ''ہم کلیاں ہم تارے

ہیں'، خلیل احمد کے ساتھ میں نے بہت گیت لکھے۔ اب میری تین گیتوں کی کتابیں ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ ہر ایک میں سپنے کا لفظ' 'آنکھوں میں تیرے سپنے، سپنے بات نہیں کرتے، سپنے کیسے بات کریں' 'اور پھر ان کا جو کلیات چھپا ہے وہ بھی' 'سپنوں سے بھری باتیں' '۔ غنائیت چونکہ گیت کا بنیادی حصہ ہے اس لئے میں اب بھی گیت لکھتا رہتا ہوں۔ فلموں کے لئے بھی لکھا لیکن بہت کم۔ کچھ ہندوستانی فلموں کے گیت بھی لکھے ہیں لیکن زیادہ تر پاکستانی ٹیلی ویژن اور ریڈیو۔

س: کتاب کے زوال کے متعلق سوال ہے کہ ہمارے ہاں کتابیں کم تعداد میں شائع ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ بکتی ہیں۔ مغرب میں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور ہمارے ہاں ہزار یا پانچ سو کی تعداد میں ایڈیشن چھپتا ہے۔ کیا اس کی وجہ ادب سے معاشرے کی دوری ہے یا پھر آن لائن مفت ڈاؤن لوڈ یا پھر ایس ایم ایس وغیرہ کی وجہ سے لوگ مفت چیزیں پڑھ لیتے اور کتابیں نہیں خریدتے ہیں۔ آپ کس نظر سے اس صورت حال کو دیکھتے ہیں؟

ج: ان ساری چیزوں نے مل کر یہ صورت حال پیدا کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ تھی، تقسیم سے پہلے بھی اردو شاعری کی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار کتاب کا ہی چھپتا تھا۔ یہ جو ہمارے بڑے بڑے استاد شعراء کرام ہیں، ان کی کتابیں بھی بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک زبان اتنے زیادہ لوگ جانتے ہوں اور پھر بھی یہ صورت حال ہو، حالانکہ اس وقت تو ادب سے دلچسپی بھی تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارے نظام تعلیم کی وجہ سے بچوں کے اندر پڑھنے کی عادت ختم ہوتی چلی گئی۔ فنون جو ہیں وہ علوم پر حاوی ہونا شروع ہو گئے۔ پھر انگلش میڈیم نے آ کر رہی سہی کسر پوری کر دی۔ جن لوگوں میں کتاب خریدنے کی استطاعت تھی وہ سارے کے سارے ادھر چلے گئے۔ اس پر مستزاد یہ ٹیکنالوجی کی طرف آپ نے اشارہ کیا۔ لائبریری کلچر ختم ہونے لگا۔ بچے کو اردو پڑھانے کی عادت ہی نہیں ڈالی جاتی اور جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اس میں یہ عادت Develop نہیں ہوتی۔ باقی رہی شعر و شاعری کی بات تو شعر و شاعری پہلے بھی کم ہی لوگ پڑھتے تھے۔ زیادہ تر یہ سننے کی چیز ہے۔ اب اگر آپ اپنی پسندیدہ چیز پڑھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے کتاب خریدنا ضروری نہیں رہا۔ آپ کے پاس دس اور طریقے ہیں جس سے آپ وہ چیز پڑھ سکتے ہیں۔ اس میں سنگ دلی ہماری حکومتوں کی بھی ہے کہ سب سے زیادہ ٹیکس کاغذ اور پرنٹنگ میٹریل پر ہیں۔ کتاب ہم نے مہنگی کر دی اور پڑھنے کی عادت ختم کر دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی اگر سکولوں کی سطح پر بزم ادب کے پیریڈ، لائبریری کے پیریڈ وغیرہ بحال

کئے جائیں تو بچوں کی اس سے ایک بنیاد بن جائے گی۔ پھر وہ ادب کے ساتھ ساتھ زندگی بھر کتاب سے منسلک رہیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر مجھے اس سے بھی تاریک تر مستقبل نظر آتا ہے۔ اردو شاعری ادب اور اس کی کتابوں کا۔

س اپنی نئی آنے والی کتابوں کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں؟

ج اصل میں جیسا آپ کے علم میں ہے، زیادہ تر میری کتابیں شاعری اور ڈرامے کی ہیں۔ اب ماشاءاللہ کالموں کی بھی آٹھ نو کتابیں ہوگئی ہیں اور سفرنامے بھی چار شائع ہو چکے ہیں، تراجم کی تین کتابیں ہیں۔

میرے تعزیتی کالم ''کوئی دن اور'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور شاعری کی کتاب ''شام سرائے'' ابھی پچھلے برس شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح ڈراموں کا مجموعہ ''خواب جاگتے ہیں'' وہ بھی انہی دنوں شائع ہوا ہے۔ بہت سی کتابیں پائپ لائن میں ہیں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ ایک دو برس میں کوئی چار پانچ کتابیں اور آئیں گی۔

س نیا ڈرامہ بھی کوئی لکھ رہے ہیں؟

ج ہمیں فیڈ بیک اس حوالے سے بھی لینی چاہئے کہ کون سی چیز کتنے لوگوں تک پہنچتی ہے۔ پھر ان کی اوسط فیڈ بیک سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامہ ایسی چیز ہے جو لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ دیکھتے ہیں۔ شاعری ایک مختلف چیز ہے، میرا نہیں خیال کہ کوئی چار پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ ملا جلا کر پڑھتے ہیں۔ شاعری کی فیڈ بیک ہمیں کئی چار پانچ لاکھ لوگوں سے لینی چاہئے۔ اگر ہم جنرل کریں گے تو......!

تو پھر معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ ڈرامہ میں نے پچھلے آٹھ دس سال سے لکھا ہی نہیں۔ سوائے ایک ایئر فورس کے متعلق۔ ''شیر دل'' کے ڈرامہ لکھنا تو میں نے بند ہی کیا ہوا ہے۔ اب میں شاید لکھوں گا۔ کیونکہ اب یہ احساس پیدا ہوا کہ ایک دائرے کے ڈراموں سے انہوں نے بہت سارے ناظرین کھو دیئے ہیں اور اب لوگ اس طرح کے ڈرامے نہیں دیکھنا چاہتے اور بیزار ہیں۔ اب کچھ لوگ واپس آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا اسی اور نوے کی دہائی کا کلاسیکی ڈرامہ۔

صرف میں ہی نہیں، منو بھائی نہیں لکھ رہا۔ حسینہ معین اور بانو قدسیہ نہیں لکھ رہیں۔ یونس جاوید نہیں لکھ رہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تھوڑی سی جگہ بنی ہے اور میں بھی ایک ڈرامہ سیریل لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔

OOO

امین کنجاہی

س سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج عامر یہ جو تو نے سوال مجھ سے پوچھا ہے اب یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔کوئی پل دو پل کی بات نہیں ہے۔قصہ یہ ہے بھائی کہ 18 فروری 1961 کو گجرات کنجاہ میں پیدا ہوئے،ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ہمارے پورے خاندان میں دوافراد نے میٹرک کی،ان میں سے ایک میرے دادااورایک ان کے بھائی،باقی سب جو چار بھائی تھے،وہ لوگ آٹھویں،پانچویں یا بالکل ہی سکول نہ گئے۔میرے بابا نے میٹرک کی اور 1939 میں کیا اور 1940 میں ایم ای ایس کوئٹہ میں ملازمت اختیار کر لی،مگر تین سال ملازمت کرنے کے بعد نوکری سے استعفیٰ دے دیا،کیونکہ ذہن زمینداروں والا تھا،اور جی حضوری کرنا بڑا مشکل تھا۔کوئٹہ سے واپس گاؤں آگئے ،اور پھر گجرات میں سکونت اختیار کر لی۔جب میں پیدا ہوا تو میرے بڑے بھائی ڈاکخانہ میں کلرک تھے اور پہلے گجرات سے ان کی ٹرانسفر لائل پور ہوئی اور پھر 1965 میں ان کی ٹرانسفر راولپنڈی جنرل پوسٹ آفس میں ہوگئی۔میری عمر اس وقت چار برس کی تھی۔ یہاں راولپنڈی آ کر ایک گلی محلے کے سکول میں مجھے والد صاحب نے داخل کروادیا۔پڑھائی کا مجھے زیادہ شوق نہیں تھا۔خاص طور پر سکول کی پڑھائی۔مجھے سکول جانے سے سخت چڑتھی؛بچپن سے ہی۔مگر ہمارے گھر میں علامہ اقبال کی شاعری کی کتابیں،بانگ درا،بال جبریل اورضرب کلیم ہوا کرتی تھیں اوراس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں جو کہ فارسی کی تھیں،جن میں دیوان حافظ اور مثنوی معنوی مولانا روم جو کہ فارسی میں تھی اور فارسی ہمیں پڑھنی نہیں آتی تھی۔مگر ہمارے والد صاحب پڑھاتے تھے اور ہمیں رات سونے سے پہلے ان میں سے کہانیاں اور حقائق بتادیا کرتے تھے۔یہ میری ادب کی طرف ایک پہلی شعوری یا لاشعوری کوشش تھی کہ مجھے یہ باتیں سننااور یہ واقعات اچھے لگتے تھے،جب میں پرائمری کلاس میں پہنچا،تو پتنگ بازی کرتے ہوئے میں چھت پر سے گر گیا اور میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ٹانگ

ٹوٹنے سے یہ ہوا کہ ٹانگ کا جوجوڑ ڈاکٹر صاحب نے لگایا تھا وہ غلط لگ گیا۔ جس کی وجہ سے میری دائیں ٹانگ دس انچ چھوٹی ہوگئی۔ میری دوسری ٹانگ سے میرا چلنا پھرنا سکول جانا ختم ہو گیا۔ یہ 1972 کی بات ہے، دس برس تک میں بستر پر رہا۔ دس برس منہ سے ادا کرنا شائد کم لگیں۔ مگر جو شخص دس برس بستر پر اپنی کم عمری میں گیارہ برس کی عمر سے لے کر 21 برس کی عمر تک بستر پر رہا ہو، اس کا کھانا پینا، اس کا سیدھے لیٹے رہنا، کروٹ تک نہ بدل سکنا، اس کا واش روم وغیرہ سب کچھ بستر پر ہوتا ہو، آپ سوچو اس کی زندگی کیا ہوگی۔ مگر اللہ پاک نے ہمت دی اور میرے گھر والوں نے میرے ماں باپ، بہن بھائیوں نے مجھے کسی طرح کی کمی محسوس نہ ہونے دی کہ میں معذور ہو چکا ہوں۔ عام ان دس برسوں میں، گو سکول چھوڑ دیا اور مجھے اندر سے خوشی ہوئی تھی۔ کہ میری پڑھائی سے جان چھوٹ گئی۔ مگر پھر میرے استاد پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان بن گئے۔ میں نے پاکستان ٹیلی ویژن سے بہت کچھ سیکھا۔ ان دس برسوں میں میں نے تعلیم سیکھی، میں نے معلومات حاصل کیں، موسیقی پر، کھیلوں پر، یہ سمجھو کہ زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ اور اس دوران میں لڑکپن سے نوجوانی میں داخل ہو گیا۔ پھر میں نے اردو ادب پڑھنا شروع کر دیا۔ اردو ادب میں مجھے نثر میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، انتظار حسین پسند تھے مگر وہ مشکل لکھتے تھے۔ مجھے ان کی سمجھ بہت کم آتی تھی۔ اس کے علاوہ رابندر ناتھ ٹیگور کے ترجمے، لیکن میرا پسندیدہ اردو کا جو فکشن رائٹر تھا، وہ سعادت حسن منٹو ہی رہا، گو کہ میں نے شہاب صاحب کو پڑھا۔ ممتاز مفتی صاحب سے بہت متاثر ہوا۔ بابا جی اشفاق احمد سے بہت متاثر ہوا۔ بانو قدسیہ سے میں نے بہت زیادہ حاصل کیا۔ ادب کے حوالے سے اور روحانیت کے حوالے سے کہہ لو، اور شاعروں میں مجھے اس دور میں کلاسیکی شاعروں کے علاوہ، ناصر کاظمی، ابن انشاء، جون ایلیاء، فیض صاحب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اور احمد فراز کی رومینٹک شاعری جس سے مجھے عشق تھا۔ عشق ہے اور عشق رہے گا۔ خواتین میں پروین شاکر وہ واحد شاعرہ تھیں جو میں سمجھتا ہوں نسوانی طور پر اپنے جذبات کو بڑے کھلے انداز میں پیش کرتی ہیں۔ وہ اردو ادب میں ایک بہت بڑا نام تھیں۔ میرے خیال میں خواتین کے حوالے سے باقی خواتین میں فہمیدہ ریاض، اور کشور ناہید اہم ہیں۔ مگر یہ اس پائے کی نہیں اور نہ میں ان کو اس پائے کا سمجھتا ہوں۔ شائد بہت سے لوگ میری اس بات سے اختلاف کریں مگر میں اس بات پر قائم ہوں۔ دس برسوں کے بعد میں وہیل چیئر پر آیا۔ پھر میں بیساکھیوں

پر آیا۔ 1984 میں میٹرک کیا۔ 1986 میں ایف اے کیا۔ 1988 میں بی اے کیا۔ بی اے جنرلزم کیا۔ 1990 میں ماسٹر ہسٹری کیا۔ یہ وہ سارا خاکہ ہے جس کی بدولت میں ادب، موسیقی اور کھیلوں کی طرف متوجہ ہوا۔

س: ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج: ادب سے شوق کی ابتداء تو جیسے میں نے آپ کو بتایا کی 75-1974 میں شروع ہوگئی تھی، جبکہ میں بستر پر تھا۔ میں اس عمر میں خان صاحب مہدی حسن صاحب کی غزلیں سنا کرتا تھا۔ اورامانت علی اوراستاد فتح علی خان کی سیمی کلاسیکل چیزیں جن میں غزلیں اور ٹھمریاں تھیں۔ وہ بڑے شوق سے سنتا تھا۔ بیگم اختر کی آواز مجھے اس وقت پسند تھی، فریدہ خانم کی غزلیں، جب میں نے میٹرک کرلیا۔ تو میں نے سوچا کہ یار ریڈیو پر آڈیشن دیا جائے۔ چونکہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ریڈیو پر اشفاق احمد کا انٹرویو چل رہا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ ریڈیو واحد ادارہ ہے جہاں پر آپ پینٹ شرٹ پہن کر بھی شہزادہ سلیم بن سکتے ہو مجھے ان کی یہ بات بہت اچھی لگی۔ اور بنیادی طور پر مجھ میں خامی تھی جسمانی خامی تھی تو میں نے کہا ریڈیو کا رخ کرتے ہیں۔ اور پھر میں 1985 میں ریڈیو پاکستان راولپنڈی 303 پشاور روڈ آڈیشن دینے چلا گیا۔ میرا آڈیشن جن پروڈیوسر نے لیا وہ میرے لئے بہت ہی محترم اور قابل عزت ہیں۔ جناب سید سلمان المعظم۔ انہوں نے مجھے دیکھا میں بیساکھیوں پر تھا اور کہنے لگے ہاں بھئی کدھر آئے ہو۔ میں نے کہا سر آڈیشن دینا ہے آواز کا۔ انہوں نے کہا چلو اور وہ مجھے ریڈیو پاکستان کے روم میں لے گئے۔ اور انجینئر کے ساتھ شیشے کے ایک طرف بیٹھ گئے اور مجھے سکرپٹ کی ایک کاپی دے دی کہ اس کو دیکھو اور جب سرخ بتی آن ہوجائے تو پڑھنا شروع کر دینا۔ یہ کسی ریڈیو ڈرامے کا سکرپٹ تھا میں نے وہ سارا پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں جتنے کردار تھے وہ سارے میں پڑھتا چلا گیا۔ پھر سرخ بتی بند ہوگئی۔ اور پھر مجھے انہوں نے باہر بلایا اور کہا کہ بیٹا ہم تمہیں ایک ہفتے کے اندر بذریعہ ڈاک اطلاع دے دیں گے۔ کہ تمہاری آواز ریڈیو کے لئے قابل قبول ہے کہ نہیں۔ میں نے ان سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ سر کیا کوئی چانس ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ خیر کرے گا۔ ہاں اب تم گھر جاؤ۔ پھر تقریباً دس پندرہ دن بعد ریڈیو پاکستان سے ایک خط آیا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ آپ کی آواز ریڈیو پاکستان کے اردو پروگراموں کے لئے اے کیٹیگری میں پاس کر دی گئی ہے۔ اور جب

چاہیں آ کر ریڈیو پاکستان میں کسی بھی پروڈیوسر سے مل کر پروگرام حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ میری زندگی کی بہت بڑی خوشی تھی اور پھر ریڈیو پر میری پہلی پروڈیوسر بشریٰ نور خواجہ، عابد حسین اور شمع خالد جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔شمع خالد نے مجھے ہفتہ وار پروگرام دے دیا جس کا نام تھا باہمت لوگ۔اس پروگرام میں میں معذور لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ ان لوگوں کا انٹرویو کرتا ان پروگراموں میں، میں نے ڈاکٹر سلمٰی مقبول، صائمہ نیاز کا انٹرویو کیا۔اور بڑے بڑے لوگ تھے۔جن کے میں نے انٹرویو کئے۔کوئی ہاتھ سے معذور تھا۔کوئی ٹانگ سے معذور تھا جن کے میں نے انٹرویو کئے۔کچھ بصارت سے محروم تھے۔ مجھے زندگی کا ریڈیو پاکستان سے پہلا چیک جو ملا وہ 35 روپے کا تھا۔اور جس کے لئے بینک میں مجھے اپنا اکاؤنٹ کھلوانا پڑا۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج ہر ادیب جو شاعر ہوتا ہے،اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ صاحب کتاب ہو۔ اور مجھے صاحب کتاب بننے میں تقریباً 27 سال لگے۔میری سب سے پہل کتاب شاعری کی شائع ہوئی۔جس کا نام ہے باحیا سی لڑکی۔اس نام کے پیچھے بھی قصہ یہ ہے کہ یہ ساری شاعری رومینٹک ہے۔میں بنیادی طور پر رومینٹک آدمی ہوں۔اور میں نے جتنے بھی رومانس کئے ہیں بڑی ایمانداری سے کئے ہیں۔مگر آج تک کوئی بھی رومانس مکمل نہیں ہو سکا۔شاید میرے عشق میں، میرے پیار میں، میرے اعتماد میں یا میرے ٹرسٹ میں کوئی کمی تھی یا ہے۔کہ میں مسلسل ناکام عاشق رہا۔میری کتاب جیسے آپ کو بتایا 2012 میں شائع ہوئی۔شاعری کے ساتھ ساتھ میں ریڈیو ڈیوائس بھی بن چکا تھا۔اور نوائے وقت میں میں نے کالم بھی لکھنے شروع کر دیئے اور کالموں کی ضخامت اتنی بڑھی کہ مجھے اپنی دوسری کتاب دو سال بعد ایمانداریاں کے نام سے شائع کروانی پڑھی۔اور اس کا ٹائٹل میں نے اپنے بہت ہی پیارے دوست اور سینئر ز، پینٹرز، آرٹسٹ جناب اسلم کمال سے بنوایا۔اس کتاب کی پذیرائی پہلی کتاب سے زیادہ ہوئی۔اس لئے کہ شائد اس کتاب میں میں نے عام آدمی کے مسائل پر کھل کر لکھا۔میں اردو شاعری کے ساتھ پنجابی شاعری بھی کرتا ہوں۔اور پنجابی شاعری میرے خون میں ہے۔گجرات اور کنجاہ کے حوالے سے ہمیں فخر ہے۔کہ ہمارے پاس فارسی کے بہت بڑے شاعر غنیمت کنجاہی اور پنجابی کا بہت بڑا نام شریف کنجاہی، اس کے علاوہ روحی کنجاہی اور میرے جیسے کم علم خاکسار امین کنجاہی جیسا شاعر بھی کنجاہ سے تعلق رکھتا ہے۔کنجاہ گجرات میں واقع ہے۔ مجھے اپنی پنجابی شاعری، اردو شاعری سے

زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جو ماں بولی میں لکھا جائے اس کی تاثیر بہت طاقتور ہوتی ہے۔ میری تیسری کتاب پنجابی شاعری کی کتاب، جس کا نام ''اکلاپا'' ہے اور اس کا ٹائٹل بھی میرے دوست اسلم کمال نے بنایا ہے۔ میری تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور تین ابھی اشاعت پذیر ہیں۔ ایک اردو کی کتاب ہے جس کا نام ہے تیرے بغیر زندگی، ایک کتاب راز زندگی کے نام سے۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں شاعر بھی۔۔۔۔شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج آپ نے یہ بہت اچھا سوال کیا ہے۔ دیکھو شاعری میں، خاص طور پر اردو شاعری میں محدود رہنا پڑتا ہے۔ وزن میں ادب اور آداب میں رہنا پڑتا ہے۔ جہاں مجھے تھوڑی گھٹن محسوس ہوتی ہے، اردو شاعری میں، مگر پنجابی شاعری میں میں اپنے آپ کو بہت کمفرٹ زون میں محسوس کرتا ہوں۔ جیسے کہ میں نے بتایا ہے کہ یہ میری ماں بولی ہے اور مجھے پنجابی شعراء سے عشق ہے۔ جن میں خاص طور پر میاں محمد بخش، سید وارث شاہ، بلھے شاہ، شاہ حسین ہیں۔ شاکر شجاع آبادی کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔ اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے ان کی تعلیمات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج یہ بات سو فیصد درست ہے اور میں اس سے اتفاق بھی کرتا ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا نے جہاں ہمیں آسانیاں دی ہیں، خاص طور پر میں برصغیر کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ وہاں ہم سے کتب بینی چھین لی ہے۔ ہمارے ہاں کتاب پڑھنے کا رواج پہلے بھی بہت کم تھا۔ مگر جب سے الیکٹرانک میڈیا آیا ہے۔ اس نے تو ہماری نئی نسل کو نہ صرف کتاب ہاتھ میں پکڑنے سے روکا ہے۔ بلکہ یہ رجحان بالکل ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ جو ہمارے بچپن میں گلی محلوں میں لائبریریاں ہوا کرتی تھیں وہاں سے ہم بہت زیادہ کتابیں لایا کرتے تھے پڑھنے کے لئے۔ مگر اب یہ رجحان ناپید ہو چکا ہے۔ وہ جو کتاب کا تعلق ہاتھوں سے تھا، اور ہاتھوں کے لمس سے کتاب کے صفحات کو پلٹنے کا جو ذوق تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ وہ کتاب کے کاغذ کی خوشبو ختم ہو گئی ہے۔ جس کے ہم لوگ عادی تھے۔ اب تو کچھ لوگوں نے شوق کے طور پر اپنی الماریوں میں کتابیں سجا کر رکھی ہوتی ہیں۔ شائد انہوں نے ان میں سے کبھی دو کتابیں بھی نہ پڑھی ہوں۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج میں ادب برائے زندگی کو مانتا ہوں چونکہ ادب برائے ادب میرے نزدیک کوئی حیثیت

نہیں رکھتا چونکہ ادب برائے زندگی اور تخلیقیت جو ہے وہ ہم زندگی سے سیکھتے ہیں، مشاہدے سے سیکھتے ہیں، وہ اپنے دوستوں، انسانوں اور رشتہ داروں سے سیکھتے ہیں۔ اچھا تخلیق کار وہ ہے جو زندگی لکھے اور اپنے رنگ میں لکھے۔ دوسروں سے متاثر ہوئے بغیر انہیں پڑھے، ان سے انفارمیشن حاصل کرے ان سے نالج حاصل کرے مگر اپنی انفرادیت کو قائم رکھے۔ اپنی تخلیقات میں تاکہ جب بھی قاری اس کی تخلیقات کو پڑھے تو اسے یہ احساس ہو کہ یہ فلاں تخلیق کار کی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ تخلیق کار جو بھی لکھے وہ خالص اس کا اپنا ہو۔

س: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج: اچھا تخلیق کار جو ہوتا ہے وہ کبھی بھی آسودگی کے دور میں اچھا ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہ جتنا تنگ اور دربدر رہے گا اس کے اندر کا فنکار اتنا ہی پھلے گا، پھولے گا، نکھرے گا، اور وہ اپنے قاری کو بہترین ادب دے سکے گا۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو جتنے بھی ادیب اور بڑے شعراء ہوئے ہیں، غالبؔ لے لو، میرؔ لے لو، اقبالؔ لے لو، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آسودگی میں نہیں لکھا، مگر بے چینی کے طور پر لکھا۔ جب معاشرہ انحطاط کا شکار تھا، اور پھر یہ لوگ ابھرے ان کے نام بنے اور پھر پاکستان بننے کے بعد، ان کی شاعری میں جو عروج اور زوال آیا وہ آپ دست صبا میں دیکھ سکتے ہیں۔ پھر جب فیض صاحب جلاوطن ہوئے تو ان کی کتاب میرے دل میرے مسافر میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان پر کیا گزری، اور انہوں نے اسے کس طرح سے پیش کیا۔ گو کہ ظاہری اور مالی طور پر آسودہ تھے۔ آپ ابھی جالب کو دیکھ لو، لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ حبیب جالب جلسوں کا شاعر تھا مگر میں سمجھتا ہوں حبیب جالب فیض صاحب سے بڑا شاعر تھا۔ اور یہ بات کہ جالب نے ساری عمر غربت میں گزار دی، کیونکہ اسے وہ چالاکیاں اور وہ پینترے نہیں آتے تھے، جو کہ جالب کے ہم عصروں کو آتے تھے۔ میرے خیال میں تخلیقی عمل اسی صورت ہو سکتا ہے جب انسان ناسودگی کی حالت میں ہو، اور بے چینی کے عمل میں مبتلا رہے۔ اور مسلسل ہجر اور فراق میں رہے۔

س: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج: اس سوال کے دو حصے ہیں پہلے حصے کا میں جواب دے رہا ہوں۔ مشاعروں پر زوال کیوں آیا یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ ہمارے معاشرے میں ہمارے دین کو دوکانداری کی سطح پر لے

آیا گیا ہے۔ کہ ہر مذہبی شخص جس کا دین سے تھوڑا بہت تعلق ہے اس نے اپنی ڈیڑھ انچ کی علیحدہ مسجد بنالی ہے۔اسی طرح ہمارے شاعروں اور مشاعروں کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ کہ جس نے تھوڑا بہت ادب پڑھ لیا ہے کوئی ایک آدھ کتاب لکھ لی ہے۔ان میں خواتین وحضرات سب شامل ہیں وہ اپنے آپ کو صاحب ادب اور صاحب قلم سمجھنے لگ پڑے ہیں اور انہوں نے بھی اپنی ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی ادبی عمارتیں بنانا شروع کردی ہیں،اور خود کو اقبال فراز فیض اور احمد ندیم قاسمی ناصر کاظمی اور ساغر صدیقی جیسے لوگوں سے اونچا خیال کرنا شروع کردیا۔جس کی بناء پر ہمارے مشاعروں کا جو رواج اور رجحان تھا وہ نہ صرف ختم ہونا شروع ہوگیا، بلکہ غیر معیاری اور غیر ادبی ہوگیا، کچھ اس میں کاروباری حضرات شامل ہوگئے۔انہوں نے مشاعروں کو ملک سے باہر لے جا کر پیسہ کمانے کا وسیلہ بنالیا ہے۔ جو کہ میں سمجھتا ہوں کہ غیر معیاری اور غیر ادبی عمل ہے۔جس نے ہمارے مشاعروں کو زوال پذیر کیا۔آج کے مشاعروں کا حال آپ دیکھ لو چند دو چار میں تو ان کو شاعر نہیں کہتا میں نہیں سمجھتا وہ شاعر ہیں۔وہ مشاعروں میں اپنے دو دو یا تین تین شعر پڑھ کر لوگوں سے داوصول کرتے ہیں۔اور ہمارا سوشل میڈیا اس کو بہت زیادہ پروموٹ کرتا ہے۔میں کہوں گا کہ ادب کا جو معیار ہوتا ہے اس میں معاشرے کا عکس ہوتا ہے۔اور آج کے دور کا جو ہمارا معاشرہ ہے وہ انتہائی کمزور معاشرہ ہے ادبی لحاظ سے گو ٹھیک ہے ادب تحریر ہو رہا ہے۔اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔آج کا لکھا ہوا ادب آج سے پندرہ بیس سال بعد پتہ چلے گا کہ اس کے حروف میں کتنی طاقت تھی۔کہ وقت کی چھلنی سے جب وہ نکلے گا۔اور جو کچھ باقی بچ جائے گا۔اس میں موجود شاعروں اور ادیبوں نے اچھا کام کیا ہوا تو وقت اس کا فیصلہ کرے گا۔اگر وہ اچھا ہوا تو وہ آئندہ نسلوں تک قائم رہے گا۔مگر آج کے جو شاعر اور ادیب اور جو ادب میں دیکھ رہا ہوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ پاپ ادب ہے۔جس کی کوئی زیادہ عمر نہیں لگتی۔یہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔عام شاعروں ادیبوں کی طرح بالکل مٹی کی طرح مٹی ہو جائے گا۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے۔معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ خالص لکھنے والا تخلیق کار ہوتا ہے،اس کو اندر سے یہ طاقت ملتی ہے، یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے ہر آدمی کے بس کا کام اور روگ نہیں ہوتا۔چونکہ جو تخلیق کار ہوتا ہے اس کی آنکھ کا دیکھنے کا اینگل عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے۔وہ بھلے شاعر ہو ادیب ہو، پینٹر ہو یا موسیقار ہو، ڈانسر ہو، گائیک ہو، فنون لطیفہ سے اس کا کسی بھی طور سے تعلق ہو۔اس کو سب سے

پہلے تحریک اندر سے ملتی ہے۔ پھر اس کا مطالعہ اور مشاہدہ جو وہ معاشرے سے حاصل کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں مل کر اس کو تخلیق کار بناتی ہیں۔ اور ہر تخلیق کار دوسرے تخلیق کار سے مختلف ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر تخلیق کار کی کینوس دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کے رنگ اپنے ہوتے ہیں، اس کی سوچیں اپنی ہوتی ہیں۔ اس کے مشاہدے اپنے ہوتے ہیں، اس کے رویے اپنے ہوتے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب سے پہلے اندر سے تحریک اٹھتی ہے اور پھر یہ باہر کے مشاہدات اور تجربات سے ایک مکمل تخلیق کار بنتا ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج میرے خیال میں سوشل میڈیا نے کچھ بہتر کام بھی کیا ہے۔ مگر بہت زیادہ ادب کے حوالے سے تنزلی بھی ہوئی ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے کے اندر دو شعبے مکمل طور پر ٹھیک ہو جائیں تو ہمارا معاشرہ جنت نظیر بن سکتا ہے۔ اور یہ دونوں شعبے جو ہیں وہ بد قسمتی سے ہمارے سوشل میڈیا کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ ایک تو ہمارے ادیب اور شاعر جن کو میں سمجھتا ہوں کہ وہ معاشرے کی کریم ہیں، ان کا ایک معیار ہوتا ہے۔ ان کا ایک ویژن ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ہمارے مذہبی لوگ ہیں جو کہ ہماری قوم کے لئے ہمارے دین کے لئے بہت زیادہ قابل احترام ہیں۔ ان کے دل سے عزت اور احترام کرتا ہوں۔ اگر یہ دو طبقے اپنے کردار کو پاکیزہ اور ایماندار اور قابل تقلید بنالیں تو پوری قوم اور پورا ملک سنور سکتے ہیں اور میں قوم سے بھی یہی کہوں گا کہ وہ دو طبقوں اور دو شعبوں کے حضرات جو کہ ادبی طور پر اور دینی طور پر جو کہ بہت قابل احترام لوگ ہیں۔ ان کی عزت اور احترام کیا کریں اور ان حضرات کو بھی چاہیئے کہ وہ سوشل میڈیا پر کوئی ایسی چیز مت شیئر کریں جو کہ عام آدمی اور ادب اور دین کو نقصان دے۔ کیونکہ آج کے دور میں میں سمجھتا ہوں الیکٹرانک میڈیا ان دونوں شعبوں کو اچھی طرح سے پیش نہیں کر رہا۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کہ ان دونوں شعبوں کو بہت اچھی طرح سے پیش کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج ایک فنکار کی اصل اساس جو ہوتی ہے اس کے ذاتی تجربات اور مشاہدات ہی ہوتے ہیں۔ جو کہ اس کی تخلیقات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کو اپنے اندر سے عام لوگوں میں شیئر کرتے ہیں۔ اور پھر جب عام لوگ جب فنکاروں کے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے لکھی ہوئی تخلیقات پڑھتے ہیں تو وہ پھر ان مشاہدات اور تجربات کو اپنی زندگی سے میچ کرتے ہیں اور قاری کو فنکاری

کی جو چیزیں اپنی ذاتی زندگی سے ملتی جلتی نظر آتی ہیں وہ انہیں یاد رہ جاتی ہیں، وہ انہیں پسند آتی ہیں اور وہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج میں سمجھتا ہوں زندگی کھونے کا نام ہے۔اس میں انسان اور خاص طور پر تخلیق کار ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔اور خاص طور پر وہ تخلیق کار جو کہ بزنس مائنڈ نہ ہو سچا اور کھرا ہو، جس کی جیب سے ہمیشہ اس کی تخلیقات کے کاغذ ہی نکلتے ہوں، پیسے اور نوٹ نہ نکلتے ہوں۔مگر اللہ کا بڑا شکر ہے کہ میں نے شائد مالی طور پر کوئی فائدہ نہیں پایا، مگر اچھے دوست بنانے میں ضرور کامیاب ہوا ہوں، مگر ایک گلہ مجھے زندگی اور دنیا والوں سے ہمیشہ رہے گا۔کہ زندگی میں میں نے چند عشق کئے مگر ان میں سے کوئی بھی مکمل نہیں ہوسکا۔میں نے جس سے بھی عشق کیا ہے بڑی ایمانداری سے کیا ہے۔اور ابھی بھی میں آجکل جس سے عشق کرر ہا ہوں بڑی ایمانداری، خلوص اور بے لوث ہو کر کر رہا ہوں۔مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید یہ عشق میری زندگی لے لے گا۔

OOO

اعتبار ساجد

اعتبار ساجد پاکستان کے نامور شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ 60 سے زائد کتب نظم ونثر کے خالق ہیں۔ پیدائش اورابتدائی تعلیم ملتان، بعدازاں بلوچستان، پھراسلام آباد اوراب لاہور میں مقیم ہیں۔تعلق سادات گھرانے سے ہے۔انہوں نے خاصا نثری کام کیا لیکن شہرت شاعری سے پائی اورایسی پائی کہ ساری اردو دنیا ان کی معترف ہوگئی۔ان کی ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔بالخصوص ''مجھے کوئی شام ادھار دو'' کواتنی پذیرائی حاصل ہوئی کہ پے درپے اس کے ایڈیشن دھڑا دھڑ شائع ہوگئے۔حال ہی میں اس کتاب کا 18واں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

س سب سے پہلے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج 1963ء کی دہائی میں باقاعدہ لکھنے اور چھپنے کا آغاز ملتان سے کیا۔متعدد عمومی اور پاکستان کے مؤقر جریدے افکار، کارچی، نقاد، نقش اور عکس لطیف کراچی کے علاوہ ہفت روزہ ''قندیل'' لاہور میں بھی ہفتہ وار کالم ''چہرے'' کے عنوان سے لکھتے رہے۔ملتان میں ہونے والے ان تمام کل پاکستان مشاعروں اور محافل میں شریک ہوئے جن میں برصغیر کے نامور شعراء اورادباء شامل ہوتے تھے۔مثلاً جوش ملیح آبادی، احسان دانش، فیض احمد فیض اور بے شمار ایسے نامور لوگ جواب اس دنیا میں نہیں رہے۔تب فضا میں ایسی آلودگی، ایسی کثافت اور ایسی آپا دھاپی نہیں تھی۔ وہ زمانہ برق رفتار نہیں، آہستہ رو تھا لیکن برصغیر میں جتنے بڑے ادیب و شاعر پیدا ہوئے وہ 50، 60 اور 70 کی دہائی میں پیدا ہوئے۔ 80ء کی دہائی میں بھی یہ سلسلہ جیسے تیسے جاری رہا۔البتہ 90ء کی دہائی کے بعد فضائی آلودگی بڑھنے لگی۔جب کام کی جگہ نام کی خواہش پروان چڑھنے لگے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

س ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج ادب سے شوق کی ابتداء تو اوائل عمر میں ہی ہو چکی تھی۔بعد میں تو محنت اور ریاضت تھی یا ان

بزرگوں کی صحبت جن سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ جوں جوں عمر آگے بڑھی مطالعے کے شوق میں بھی شدت پیدا ہوئی۔اب تک ہم مطالعے کے بغیر سو نہیں سکتے۔یہ ضرور ہوا ہے کہ موبائل مطالعے میں رخنہ انداز ہو گیا ہے۔سوشل میڈیا ہم دیکھ رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ پرنٹ میڈیا پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیں؟

ج تصانیف کی تعداد 60 سے زائد ہے۔صرف ان کے نام لکھنے بیٹھیں تو پڑھنے والے بھی اکتا کر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ دفع کرو جی اتنی ڈھیر ساری کتابوں کے نام کون پڑھے اور کیوں پڑھے۔ہوگا کوئی اعتبار ساجد تو ہوگا۔ہم کیا کریں۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج ظاہر ہے اب شاعر کی حیثیت سے لوگ جاننے ماننے لگے ہیں تو شاعری بالخصوص غزل پہ ہی توجہ مرکوز رہتی ہے۔نثر بھی لکھتے ہیں۔متعدد اخبار و جرائد میں باقاعدگی سے کالم بھی شائع ہوتے ہیں۔لیکن دل ہے کہ غزل ہی کی طرف مائل رہتا ہے۔

بقول غالب:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

یہ واحد صنف سخن ہے جو فل ٹائم ورکر مانگتی ہے۔پارٹ ٹائم وقت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ان کا رشتہ فن سے وقتی رشتہ ہوتا ہے۔یہ بات سب کے لئے نہیں ہے صرف ان کے لئے ہے جو پارٹ ٹائم شاعر ہیں اور لطف یہ ہے کہ فل ٹائم کی طرح اعزازات، انعامات اور بونس کے طلبگار رہتے ہیں۔

س لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟

ج یہ تحریک اندر سے بھی ملتی ہے، باہر سے بھی۔جو شاعر یا ادیب خارجی عوامل کو سامنے رکھ کر وقتی، ہنگامی یا لمحاتی چیزیں لکھتے ہیں وہ خارجی مناظر کی تبدیلی کے ساتھ منظر میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔اندرونی تحریک سے اٹھنے والی کوئی موج سخن تلاطم بپا کر سکتی ہے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج ایک اچھا تخلیق کار ہم اسے سمجھتے ہیں جس کی تحریر آنکھ کے ذریعے دل میں اترے اور تخت دل پر برسوں براجمان رہے۔وقتی واہ واہ کوئی چیز نہیں نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔نہ اس میں حقیقی

تخلیق کار کے لئے کوئی راحت ہوتی ہے۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج پتہ نہیں۔ آسودگی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ بہر حال ایک شعر سے شائد ہم اپنا موقف جان سکیں۔

سورج ہے ظلمات کا قیدی، ہر تازہ زنجیر بہ پا ہے
ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، ہم کو یہ ماحول ملا ہے

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ ہورہا ہے کیا اس سے آپ مطمئن ہیں؟

ج مشاعرے پہلے انسٹی ٹیوٹ ہوتے تھے۔ اب فیشن شوز یا گیٹ ٹوگیدر قسم کی چیز بن گئے ہیں۔ ایک دور ایسا بھی تھا کہ مشاعروں پر ٹکٹ لگتے تھے۔ لوگ ٹکٹ خریدتے تھے۔ کم پڑھے لکھے لوگوں کی بھی داد و تفریح نوٹنکی کے بعد مشاعرہ تھا۔ ''ارے جگر مراد آبادی آرہا ہے، خرید لے ٹکٹ۔ پھر ایک گورکھ پوری بھی آرہا ہے۔ جوش ملیح آبادی بھی آرہا ہے''۔ اب یہ عالم ہے کہ اگر مشاعروں کے منتظمین نقد رقم دے کر بھی سامعین جمع کریں تو وہ بھی ایک دو شاعروں کو سنتے ہی بھاگ نکلتے ہیں۔ اب شعراء کرام بھی اپنا کلام سناتے ہی بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت کم ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو دوست نوازی، گروہ بندی اور انتشار کے اس گرد و غبار سے زیادہ سے زیادہ دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں کوئی سنجیدہ محفل ہو تو اس میں جانے سے کوئی حرج نہیں۔

س آپ ادب کے فروغ کے لئے سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج اس سوال کا جواب تو غالباً ہم عرض کر چکے ہیں پھر بھی اعادہ کئے دیتے ہیں کہ سمندر میں طغیانی باہر سے نہیں اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ زلزلے اندر سے اوپر آتے ہیں۔ اوپر سے واٹس ایپ پر خاموش تصویریں اور تحریریں ہوتی تھیں اب آندھی چلی ہے آڈیو ویڈیو اپ لوڈ کرنے کی۔ ہم جو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے اس آندھی کی زد میں آ گئے ہیں سوچا ہے کہ اب لازمی آلات عکاسی کے ذریعے ان تک بھی اپنے کام کو تھوڑا بہت پہنچا سکیں جنہوں نے ہمیں دیکھا نہیں صرف پڑھا ہے۔ مراد شہرت نہیں فروغِ سخن ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج کیا کھویا؟ کیا پایا؟ الحمدللہ! آپ جیسے پیاروں کی محبتیں پائی ہیں۔ چاہتوں کے پھول

پائے۔آٹھ نو سے زائد بی اے آنرز،ایم اے اور ایم فل کے مقالات ہمارے ناچیز کے تخلیقی کام پر لکھے گئے۔مزید لکھے جا رہے ہیں۔آدمی کو تھوڑی سی زندگی میں تھوڑی سے پذیرائی مل جائے تو اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔اور ہم یہی کرتے ہیں۔البتہ یہ بھی کہنا بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے رفتگاں اور اپنے موجودگان کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ان کی عزت کرتے ہیں۔ان سے محبت کرتے ہیں۔ہم نے 60 کی دہائی سے اب تک ادب کے بہت ادوار دیکھے ہیں۔برصغیر پاک وہند کے تقریباً تمام عظیم المرتبت شعراء ادبا اور قائدین سے نہ صرف ملاقاتیں رہیں بلکہ ان کے تحریری توصیفی کلمات بھی نصیب ہوئے۔آدمی کو اور کیا چاہیے؟

OOO

ڈاکٹرانعام الحق جاوید

س آپ نے سنجیدہ شاعری بھی کی لیکن اس میں آپ کو وہ شہرت و کامیابی نہ مل سکی جو بطور مزاحیہ شاعر کے ہے؟

ج اگراس سوال سے آپ کی مراد یہ ہے کہ میں اپنی سنجیدہ شاعری سے مایوس ہوکر شعوری طور پر ادھر آیا تو شاید یہ الزام درست نہیں کیونکہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے فنون جیسے وقیع ادبی جریدے سے چھپنے کا آغاز کیا، اور یہ گزشتہ صدی کے ساتویں دہائی کے وسط کی بات ہے آج کی بات نہیں، جب سینکڑوں ادبی پرچے ادبی رزق کی تلاش میں ادیبوں سے ان کی تخلیقات کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اسی طرح اس وقت بھی دوسرے شہروں میں ملفوف مشاعرے پڑھا کرتا تھا اوراپنی سنجیدہ شاعری سے مطمئن تھا لیکن ساتھ ہی کہیں ایک مزاح نگار بھی کسی کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ڈرا ہوا، سہا ہوا اور چپ چاپ اندر ہی اندر منمناتا ہوا۔ پھر جب میں اسلام آباد آیا اور یہاں جنرل شفیق الرحمن، سید ضمیر جعفری، سرفراز شاہد اور انور مسعود کی رفاقت میسر آئی تو اس مزاح نگار نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور جب اسے تھاپڑا ملا تو یہ اور شیر ہوگیا۔ لاہور میں بھی مجھے عطاء الحق قاسمی جیسے صاحب طرز مزاح نگار کی قربت حاصل رہی بلکہ یوں سمجھئے کہ انہوں نے ہی ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے میری ساری ٹریننگ کی اور میں آج جو کچھ ہوں انہی کے طفیل ہوں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سنجیدہ شاعری کا اپنا مقام ہے مزاحیہ شاعری کا اپنا تاہم یہ درست ہے کہ جو شہرت مجھے مزاحیہ شاعری کے باعث حاصل ہوئی وہ شاید سنجیدہ شاعری سے نہ ملتی کیونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار شعراء میں اپنا الگ اور منفرد مقام بنانا آسان کام نہیں۔

س مزاحیہ شاعری کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

ج مزاحیہ شاعری کی ادبی حیثیت وہی ہے جو ادب میں شاعری کی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص سنجیدہ شاعری کر رہا ہے، کوئی قومی شاعری کر رہا ہے، کوئی مذہبی شاعری کر رہا ہے، کوئی موضوعاتی شاعری کرتا ہے اور کوئی مزاحیہ شاعری کر رہا ہے۔ مزاح دراصل بات کرنے کا ایک

انداز ہے۔ موضوعات تو مزاح کے بھی وہی ہیں جو سنجیدہ کے ہیں، بس ان موضوعات کی ٹریٹ منٹ اور انہیں استعمال کرنے کا انداز مختلف ہے۔ دونوں طرح کے شاعر، دوغلے پن، ظاہرداری ظلم، زیادتی، معاشرتی تفاوت، امیروغریب کے فرق اور طبقاتی تفریق کو طنز وتنقید کا نشانہ بناتے ہیں اوراس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ایک ایسے خوشحال معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں جو مساوات اور عدل پر مبنی ہو۔ دونوں طرح کے شاعر لطیف جذبات کے ابھار کے لیے معاملات من وتو بیان کرتے اور وصل وفراق کے رونے روتے ہیں بس اس فرق کے ساتھ کہ سنجیدہ شاعر اپنی شاعری میں محبوبہ کے اردگرد جب کہ مزاحیہ شاعر منکوحہ کے اردگرد دکھائی دیتا ہے۔

س ہم عصر مزاحیہ شاعروں میں کون سے پسند ہیں؟

ج حاضر سروس شعراء میں سے انور مسعود، امیر اسلام ہاشمی، سرفراز شاہد، اطہر شاہ جیدی، ضیاء الحق قاسمی، خالد مسعود اور زاہد فخری خاص طور پر پسند ہیں کہ یہ لوگ اپنی اپنی جگہ مزاحیہ شاعری کو نئے آہنگ اور نئے رنگ سے روشناس کرا رہے ہیں۔ وفات شدگان میں سے سید ضمیر جعفری نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا یعنی اردو کی مزاحیہ شاعری میں سلسلہ ضمیریہ اور پنجابی کی مزاحیہ شاعری میں سلسلہ مسعودیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔

س بقول منیر نیازی ادبی ایڈیشن، اخبارات و رسائل پراگندگی پھیلا رہے ہیں، ایک ادبی اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ کیا کہیں گے؟

ج منیر نیازی ایک فقرے باز شخص ہیں۔ ترنگ میں آکر کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ خود منیر نیازی کو بھی تو پورے ملک میں انہی ادبی ایڈیشنوں نے ہی پھیلایا ہے حالانکہ وہ پراگندگی نہیں ہیں بلکہ سرتاپا حسن اور خوبصورتی ہیں۔ 77-1967ء کے زمانے میں عطاء الحق قاسمی نے نوائے وقت کے اکلوتے ادبی ایڈیشن کے ذریعے منیر نیازی کے چست اور تیکھے انٹرویوز کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔ اس لیے ایک ہی سانس میں سب کو لپیٹ لینا موزوں نہیں۔ ادبی اخبار اور ادبی ایڈیشن ادب اور فروغ ادیب کے ابلاغ کا ایک موثر بلکہ موثر ترین ذریعہ ہیں تاہم کبھی کبھی کہیں ایسی باتیں بھی چھپ جاتی ہیں جنہیں پڑھ کر گھن آتی ہے اور لکھنے والوں کی شودرانہ ذہنیت کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں بھی منیر نیازی سے متفق نہیں ہوں کیونکہ ایسے لوگ پراگندگی نہیں بلکہ براہ راست گندگی پھیلا رہے ہیں۔

س آپ بیک وقت استاد، نقاد اور شاعر ہیں، آپ کے نزدیک آپ کی اصلی پہچان کس حوالے سے ہے؟

ج میرا خیال ہے کہ میری اصل پہچان شاعری ہی ہے۔ باقی اضافی شوق ہیں تاہم یہ شوق بھی ادبی ہی ہیں جو تخلیقی سفر کو آسان بنانے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ مثلاً ٹی وی کے صبح کے لائیو پروگرام سخن رنگ کی کمپیئرنگ کے باعث ہر ہفتے آٹھ دس کتابیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں اور ایک دو ادیبوں سے تفصیلی ملاقات ہو جاتی ہے۔

س ہمارے ہاں کارکردگی اور ایوارڈز کا آپس میں کس حد تک تعلق ہے؟

ج ایوارڈز کا تعلق، تعلق سے ہے کارکردگی سے نہیں۔ جس سے کوئی تعلق ہوتا ہے یا جس کا کوئی تعلق ہوتا ہے وہ ایوارڈ لے جاتا ہے۔ بعضوں کی کار دیکھی جاتی ہے، بعضوں کی کارکردگی، تاہم جینوئین ادیبوں کو بھی بعض اوقات کوئی ایوارڈ مل جاتا ہے۔ صرف ادب میں ہی نہیں ہر معاملے میں صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں پوری دنیا میں اور صرف آج سے ہی نہیں بلکہ آدم سے ہی عدلیہ کے کردار سے کوئی مطمئن نہیں رہا۔ چنانچہ ادبی عدلیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں حتیٰ کہ نوبل ایوارڈ کے پیچھے آپ کو کئی کئی کہانیاں ملیں گی۔

س ادبی گروہ بندیوں کی کیا اہمیت ہے اور آپ کا تعلق کس ادبی گروہ سے ہے؟

ج ادبی گروہ بندیوں میں بندیوں کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت بندوں کے اور گروہ کے گرو کا اس میں ایک خاص کردار ہوتا ہے۔ میں ادب کے فرقہ قاسمیہ کے ندیموں میں سے ہوں اور عطاء الحق قاسمی کے حوالے سے حق پرست گروپ سے تعلق رکھتا ہوں۔

س ملکی و بین الاقوامی مشاعرے ادب کی ترویج میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ج بہت مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ شاعروں اور مشاعروں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ مشاعروں کی وجہ سے شاعروں میں مسابقت اور شاعری میں جدت ہے۔ ان اکھاڑوں میں اتر کر پہلوانانِ سخن اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گویا یہ مشاعرے دراصل شاعری کے مظاہرے ہیں۔

س ہمارے نقاد کس حد تک غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں؟

ج ان کے غیر جانبدار رہنے کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ جب چاہتے ہیں غیر جانب دار ہو جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں غیر ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو ادب خاصا بدقسمت ہے ہر

گروہ کا اپنا نقاد ہے۔ ہر بڑے شاعر کا اپنا اپنا نقاد ہے جو نوحہ خواں کی حیثیت سے اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ دو تین نقاد میری نظر میں تھے جنہوں نے اپنی بڑی ساکھ بنا رکھی تھی مگر افسوس کہ وہ بھی شاعرات کے ہاتھوں مات کھا گئے۔ ہمارے نقاد بے چارے مجبور نقاد ہیں ان سے تو عربی شاعر ابونواس ہی بہتر تھا جسے خلیفہ وقت نے اپنی شاعری کے بارے رائے دینے کے لیے کہا اور سچی رائے دینے کے بدلے میں اسے جیل بھیج دیا گیا۔ جب سزا کاٹ کے واپس آیا اور خلیفہ وقت نے پھر اسے تازہ کلام سنا کر رائے چاہی تو ابونواس اٹھ کر چل پڑا خلیفہ نے پوچھا کدھر؟

ابونواس بولا جیل اور کدھر۔

س لاہور اور اسلام آباد کی ادبی فضا میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج وہی جو لاہور اور اسلام آباد کی آب و ہوا میں ہے۔ لاہور کے بڑے شاعر عہد کے لحاظ سے بڑے اور اسلام آباد کے بڑے شاعر عہدے کے لحاظ سے بڑے ہیں۔

س آج کل کس کام میں مصروف ہیں؟

ج آج کل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے چھ پاکستانی زبانوں (بلوچی، براہوئی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، سندھی) میں ایم فل پاکستانی زبانیں کے کورس کے اجزاء میں مصروف ہوں۔ خیال ہے کہ اس سال اگست سے یہ کورس شروع کرا دیا جائے اور اس سلسلے میں موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر انوار حسین صدیقی خود بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ تاہم خاصا کٹھن مرحلہ ہے اور آج کل ہمارے شعبے کی پوری ٹیم دن رات اس کٹھن مرحلے کو سر کرنے میں مصروف ہے۔ قومی یکجہتی کے فروغ اور کثیر اللسانی ماہرین کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ کورس یقیناً ایک سنگ میل ثابت ہوگا اور اسی لیے آج کل میری ساری توجہ اس طرف ہے۔

س روداد نکالنے کا خیال کیسے آیا؟

ج بس بیٹھے بیٹھے دسمبر 1999ء میں جنون سوار ہوا اور جنوری 2000ء میں پہلا شمارہ نکال باہر کیا۔ ایک سال تک تو یہ سلسلہ ریگولر چلتا رہا مگر اب دیگر مصروفیات نے اس کو تعطل میں ڈال دیا ہے۔

س اب تک کے تخلیقی سفر سے مطمئن ہیں؟

ج اللہ کا شکر ہے جس نے لفظوں کو برکت دی اور ان میں تاثیر کی قوت پیدا کی۔

OOO

اصغرندیم سید

شاہ عبدالطیف بھٹائی کی درگاہ پران کا صوفی کلام گانے کے لئے جیسے سات سور مائیں ہوتی ہیں، ویسے ہی اگر پاکستان میں ڈرامہ نگاری کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں بھی سات سور ماہیں، ان سات سور ماؤں میں سے ایک اصغرندیم سید ہیں۔اردوزبان میں ڈرامہ نویسی کا تذکرہ ان کے ذکر کے بغیر ادھورا ہی رہتا ہے۔نصف صدی سے مسلسل قلم کے ذریعے ہمارے معاشرے کوایک بہتر سماج بنانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔صف اول کے کالم نگار ہیں، خوبصورت لہجے میں شاعری کرتے ہیں، عمر کا بہترین حصہ تدریس میں گزارا ہے۔ایسے سخن ور جنہوں نے ایک پوری نسل کی ادبی تربیت کی ہے اور ہمیشہ ایک جداگانہ طرزتحریر اپنایا ہے، جوانہی کا خاصہ ہے۔مزید تعارفی کلمات سے اس لئے بھی گریز کروں گا کہ وہ واقعی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، بہتر ہوگا کہ ان سے کی جانے والی گفتگو قارئین کرام کے ذوق مطالعہ کی نذر کی جائے۔

س زندگی کی ابتداء سے بات شروع کرتے ہیں۔بچپن کہاں اور کیسے گزرا، ابتدائے سخن کیسے ہوئی اوراس کا ارتقاء کیسے ہوا؟

ج میرا بچپن ملتان میں گزرا۔ابتدائی تعلیم ملتان سے حاصل کی۔گورنمنٹ کالج ملتان ہمیشہ سے عمدہ روایت کاامین رہاہے۔میری ابتدائی تربیت ادب اورفنون لطیفہ کے ماحول میں ہوئی۔میں نے ایم اے کے زمانے سے لکھنا شروع کیا۔بعد میں وہاں کالج میں کچھ عرصہ پڑھایا۔پھر لاہور کی طرف آ گیا۔یہاں لاہور میں اشفاق احمد، کشورناہید، امجد اسلام امجد جیسے ارباب ذوق موجود تھے۔پھر ادبی ماحول میں حلقہ ارباب ذوق کے ساتھ منسلک رہااور گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گیا۔بعد میں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے لگے اس دور میں ادبی ماحول کا رجحان تھا۔محفلوں میں ادبی گفتگو، مکالمہ، ڈائیلاگ کا رواج تھا۔1980 میں ٹی وی سے منسلک ہوا، اسی دوران کنور آفتاب نے ڈرامہ لکھوایا پھر رموز، دریا، آسمان، پیاس، خواہش، چاندگرہن اور یہ سلسلہ چلتا ہی گیا۔

س ایک ڈرامہ نویس کے لئے تحقیق اور مشاہدہ کیوں ضروری ہے؟ کیا ایک اچھا ڈرامہ نویس اپنے عام مشاہدے کو سامنے رکھتے ہوئے ڈرامہ تحریر کرتا ہے یا تجرباتی مشاہدے یا تجرباتی تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے؟

ج ڈرامہ نویس ہوا میں بیٹھ کر ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔ ڈرامہ صرف فن ہی نہیں آگہی و بصیرت بھی ہے۔ ڈرامہ نویس کا معاشرے، ملک اور دنیا کے بارے میں وژن ہونا چاہیے۔ جب تک مخصوص رویوں اور Dialectic کو نہ سمجھا جائے، ڈرامہ نویس مخصوص معاشرتی مسائل اجاگر نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ڈرامہ نویس کا مطالعہ مشاہدہ، تجربہ لکھنے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ڈرامہ نویس کو علم کی روایات، سیاست، معاشیات اور ثقافت سے جڑنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں کئی کلچرل یونٹس ہیں۔ مختلف زبانیں، لہجے اور انداز ہیں ان تمام کو سمجھے بغیر ڈرامہ نویس ڈرامہ نہیں لکھ سکتا۔

س معاشرتی تبدیلی Social Change اور ثقافتی نفوذ Cultural Diffusion نے جہاں تیسری دنیا کے ممالک پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ وہاں تیسری دنیا کے ممالک میں ڈرامہ نویسی بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ لہٰذا ایک ڈرامہ نویس کی حیثیت سے آپ اپنی سماجی اقدار و روایات کو معاشرتی تبدیلی اور ثقافتی نفوذ سے بچانے میں کس طرح کامیاب ہوں گے؟

ج پہلے ہماری نظر اپنے معاشرتی مسائل تک محدود تھی۔ پھر ہم لندن اور امریکہ یا دوسرے حوالوں کا موازنہ اپنے معاشرتی مسائل کے ساتھ کرنے لگے۔ ڈرامہ دوسرے ملکوں میں بنایا بھی گیا۔ دراصل اب ڈرامہ نویس ایک جدوجہد کررہا ہے۔ بہت سارے چینلز کے آنے سے بھی ڈرامہ نویس کے لئے مشکل ہو رہی ہے۔ تاہم ڈرامہ نویس Content اور فن کی مدد سے ان مسائل سے نبرد آزما ہوسکتا ہے۔ اگر اپنی اقدار، روایات اور ثقافت کو دیانت داری سے بیان کرے اور منفی ترغیبات کا تاثر تحریر پر غالب نہ آنے دے، گلیمر یا کوٹھیاں، کاریں دکھانے کی بجائے معاشرے کے مسائل کی ترجمانی کرے تو مطلوبہ نتائج حاصل ہوسکتے ہیں۔

س موجودہ دور کے ڈراموں کا المیہ یہ ہے کہ ان میں نئی نسل کو منطقی حقائق کی بجائے افسانوی زندگی سے متعارف کرایا جارہا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟

ج یہ اس لئے ہے کہ اب ہر کوئی ڈرامہ نویس بنا ہوا ہے۔ اکثر افراد ڈرامے پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ جن کا تخلیقی تجزیہ و معاشرتی تناظر وسیع نہیں ہے۔ ان کا کوئی ادبی پس منظر نہیں ہے۔

جب یہ نہیں ہوگا یعنی انہیں اگر یہ معلوم ہی نہیں کہ مخصوص معاشرتی تضادات کیا ہیں تو وہ نئی نسل کو کیا منطقی حقائق دکھائیں گے؟ ظاہر ہے خواب ہی دکھائیں گے۔ بات وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ لکھنے والے کی گرومنگ کیسے ہوئی ہے۔

س آج کل جو ڈرامے بنائے جا رہے ہیں، لکھے جا رہے ہیں۔ وہ بسا اوقات ہمارے معاشی، معاشرتی، نظریاتی اقدار و حالات کی عکاسی نہیں کرتے اس حوالے سے بتایئے کہ ڈرامے کا مستقبل کیا ہے؟

ج دراصل اب بہت سے چینلز ہیں اور سب کی اپنی ترجیحات ہیں۔ اور ان ترجیحات کو ایڈورٹائزر طے کر رہا ہے۔ اگر میں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس وجہ سے ڈرامہ فلاپ ہو رہا ہے۔ ڈرامے کی روح ختم ہو رہی ہے۔ اس کا Content اور اسکرپٹ تباہ ہو رہا ہے۔ اگر ایڈورٹائزر ڈرامے کو اپنی ضرورت کے مطابق باقاعدہ گائیڈ کرنا شروع کر دے تو ڈرامہ فلاپ تو ہوگا ہی، مثلاً ڈرامے کا اہم سین چل رہا ہے اور درمیان میں وقفہ آ گیا یا اشتہار چلنا شروع ہو گیا۔ اور پھر ایڈورٹائزر کا یہ تقاضا کہ مخصوص اداکار ڈرامے میں ہوں۔ تو جب اسکرپٹ کی ڈیمانڈ اور ڈائریکشن ہی کو نظر انداز کیا جائے تو ڈرامے کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے۔

س آپ نے بہت سے ڈرامے تحریر کئے، آپ اپنے کن ڈراموں کو اپنی نظر سے دیکھتے اور جانچتے ہوئے بہترین کاوش قرار دیتے ہیں؟

ج دیکھیں جی۔ ڈرامے کا معیار سننے یا دیکھنے والا متعین کرتا ہے، البتہ میں سماجی طبقوں کے اختلاف اور طبقاتی استحصال کے حوالے سے پیاس ڈرامے کو اپنی اچھی کوشش سمجھتا ہوں۔

س کیا آپ ڈرامے تحریر کرتے ہوئے کسی مخصوص نکتے اور فلسفے کو مدنظر رکھ کر ڈرامہ تحریر کرتے ہیں؟ یا مختلف پہلوؤں کے مطابق تخلیقی عمل میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟

ج عموماً بنیادی فکر و فلسفہ ذہن میں ہوتا ہے۔ اس کے مطابق موضوعات اور مسائل پر لکھتا ہوں، کس ایشو کو کس طرح سامنے لانا ہے اور کس بنیادی فلسفے کو سامنے رکھا جائے، تاہم مختلف فلسفہ حیات کے تضاد اور ادغام سے جو مسائل سامنے آتے ہیں ان کے مابین کشمکش کو سامنے رکھتے ہوئے دو تین ایشوز پر اکٹھا لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر مشروط مسائل آ جاتے ہیں، جیسے کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ساتھ ہیومن رائٹس، معاشیاتی مسائل وغیرہ۔

س عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ڈرامہ کرنے والا خود کو جس حد تک ڈھالنے میں کامیاب ہوتا ہے وہ کردار اتنا جاندار ہوتا ہے۔ تو کیا ڈرامہ نویس بھی کردار تحریر کرتے ہوئے خود کو متعلقہ کردار میں ڈھالتا ہے؟

ج جی ایسا اکثر ہوتا ہے، جو کردار ہم معاشرے میں دیکھتے ہیں تخلیقی عمل کے دوران اسے خود پر طاری کر کے تحریر کرتے ہیں۔ جس طبقے کا کردار ہے ان کے رویے، اس کی زبان اور اس کے مسائل کے مطابق تحریر کرتے ہیں۔

س آپ نے بہت سارے ڈرامائی کردار تحریر کئے، کوئی ایسا کردار جس نے حقیقی کردار کے قریب تر پرفارم کیا ہو؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ سہیل اصغر کا پیاس ڈرامے کا کردار فطرت کے نزدیک تر تھا۔ جبکہ شفیع محمد نے چاند گرہن اور فریال گوہر نے بھی چاند گرہن والا کردار بہت اچھی طرح پرفارم کیا تھا۔ یعنی جیسا میں نے تحریر کرتے ہوئے سوچا تھا۔

س تاثر کے لحاظ سے کامیڈی ڈرامہ لکھنا زیادہ مشکل ہے یا ٹریجڈی ڈرامہ لکھنا مشکل ہے؟

ج اصل میں بات یہ ہے کہ فن فن ہے اور وہ مشکل ہے، چاہے کامیڈی ہے یا ٹریجڈی ہے۔ بات لکھنے والے کی تربیت کی ہے۔ اگر اس میں جوہر ٹریجڈی لکھنے کا ہے تو وہ ٹریجڈی لکھے گا۔ اگر جوہر کامیڈی لکھنے کا ہے تو کامیڈی لکھے گا۔ پہلی بات ٹیلنٹ کی ہے، اور پھر اس کی گرومنگ کی ہے۔

س کیا آپ نے ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ڈرامے کے علاوہ دوسری اصناف کے حوالے سے بھی تخلیقی کام کیا ہے؟

ج شاعر کی حیثیت سے کیا ہے، جدید نظم میں میرا ایک رویہ اور مزاج ہے افسانے، تنقید، مضامین اور کالم لکھ رہا ہوں ناولٹ بھی لکھا ہے۔

س آج کل کس موضوع پر لکھ رہے ہیں؟ قارئین ارژنگ کو اپنے تخلیقی سفر کے آئندہ پڑاؤ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں؟

ج میرا چوتھا ناول مکمل ہو چکا ہے اور جلد شائع ہونے کے بعد قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہوگا۔

OOO

اسداللہ غالب

س لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ قلمی سفر کے ابتدائی دنوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا، یہ ایک کھوج لگانا پڑے گا۔ کیونکہ اس کا سرا بڑا اُنجھلک ہے۔ اور ایک دور زمانے کی بات ہے، میرا خیال ہے، جب میں نویں اور دسویں جماعت میں تھا تو اس وقت میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کا بہت زیادہ مداح تھا۔ ان کی کوئی چیز بھی ملتی تھی تو میں اسے ضرور پڑھتا تھا۔ اور ان کے اندازِ تحریر کو بھی میری خواہش تھی کہ میں اپناؤں۔ بہرحال نویں اور دسویں جماعت میں ہی میں نے ''ساربان'' نام سے ایک قلمی میگزین شروع کیا۔ اس کا ایک شمارہ بنایا یا دو بنائے۔ اس میں ایڈیٹوریل بھی ہوتا تھا، میری نظم بھی ہوتی تھی، میرے ایک دوست کلاس فیلو محمد علی تھے، میرے ساتھی تھے، ان کی بھی ہوتی تھی۔ کوئی سیاسی تبصرے بھی ہوتے تھے۔ پھر ایک پنجابی میگزین بھی میں نکالا جو شائد اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھا اور وہ دیہات میں اور میرے ہی گاؤں میں جو عورتیں لڑتی ہیں، ماشاءاللہ، اور ایک جمِ غفیر جمع ہو جاتا ہے۔ دوشیزیوں کو لڑتے بھڑتے ہوئے دیکھنا جو ایک دوسرے کو بڑی کلاسیکل قسم کی گالیاں دیتی ہیں۔ اللہ معاف کرے وہ سارا کچھ میں بھی سنتا تھا۔ اور پھر اس کو بڑی تفصیل سے اپنے اس پنجابی رسالے میں لکھتا تھا۔ یہ سلسلہ باقاعدہ نہیں تھا۔ بس ایک ایک دو دو پرچے، وہ بھی نامکمل بنائے۔ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آیا تو سب سے پہلے جب داخلہ ہو جاتا ہے اور بندہ لائبریری کارڈ بنانے جاتا ہے۔ ایک کام یہ بھی ہوتا ہے جیسے ایک شناختی کارڈ بھی بنایا جاتا ہے، یا کالج کا آئی ڈی کارڈ۔ لائبریری کارڈ جب میں بنانے گیا تو جو اس وقت راوی شائع ہوا تھا۔ جو گورنمنٹ کالج کا میگزین ہے۔ محمود شام اس کے ایڈیٹر تھے۔ کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھی تھے۔ جن کے نام شاید میرے ذہن میں ہوں۔ بہرحال محمود شام جو اس کے ایڈیٹر تھے اور قیوم نظر ادارتی بورڈ کے چیئرمین تھے یا نگران تھے تو میں نے سب سے پہلے سب سے اوپر اپنے پن سے اپنا نام لکھا۔ چیف ایڈیٹر اسداللہ غالب۔ یہ میرے اندر کا ایک انسان تھا، یہ میرے اندر کا ایک لکھاری

تھا، اندر کا ایک صحافی تھا یا ادیب تھا یا ایڈیٹر تھا اور میری ایک عرض تھی کہ میں بھی کبھی اس کے ایڈیٹوریل کا چیف بنوں گا۔ اس خواہش کی تکمیل میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ مگر اس سے پہلے تھوڑا سا ایک اور سفر بھی، اسلامیہ پارک چوبرجی کے پاس سمن آباد کے درمیان ایک چھوٹی سی آبادی ہے، میں اس میں رہتا تھا۔ اور یہیں پر سمن آباد گول چکر کے پاس اردو ڈائجسٹ کا دفتر تھا۔ اردو ڈائجسٹ کے ساتھ بچوں کا ڈائجسٹ اور ہفت روزہ ایشیا۔ ہفت روزہ ایشیا کے ایڈیٹر ملک نصراللہ خان صاحب تھے۔ بزرگ تھے۔ ان کے پائے کا اور کوئی ایڈیٹر نہیں تھا اس زمانے میں میرے نزدیک۔ یا میں نہیں جانتا تھا۔ کہ اتنا بڑا وکیل، علمی لحاظ سے معتبر، تحریر اور اس کی شگفتگی اور اس کی تمہیدگی تو میں نے ان کو ایک چھوٹا سا پیراگراف لکھ کے دیا تو بالکل وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کا ایک عکس تھا۔ وہ ہفت روزہ تھا تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ اگلے ہی ہفتے وہ جو ایڈیٹوریل جہاں وہ ایڈیٹوریل چھاپتے ہیں اس کے نیچے انہوں نے میری وہ تحریر ایک حاشیے میں اور میرا نام۔ اس وقت اسد حجازی میں نے اپنا نام رکھا ہوا تھا۔ شاید نسیم حجازی سے بڑا متاثر تھا، ناول شاول پڑھ رکھے تھے ان کے۔ سوچا اسداللہ غالب بہت لمبا نام ہے۔ قلمی لحاظ سے اسد حجازی نام استعمال کیا میں نے پہلے پہلے، اول اول اس تحریر کے چھپنے سے مجھے بہت حوصلہ ملا۔

س آپ پاکستان کے پہلے War Correspondent ہیں۔ جنگ کا آنکھوں دیکھا احوال تحریر کرنے اور رپورٹ کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟ اس کی تفصیلات بتانا پسند کریں گے؟

ج یہ 1971 کی جنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے کا واقعہ ہے۔ محسوس یہ ہو رہا تھا کہ بس جنگ شروع ہونے ہی والی ہے۔، میرا تعلق چونکہ قصور سے ہے اور ہمارا گھر سرحد سے قریب ہی تھا، اس لئے فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اب جنگ ٹلنے والی نہیں ہے۔ میں نے فوج کے تعلقات عامہ سے رابطہ کر کے اس خواہش کا اظہار کیا کہ جنگ کی براہ راست رپورٹنگ کے لئے مجھے فوج کے ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔ میں ان تفصیلات میں نہیں جاتا جو میں نے اپنی جان بھی جوکھوں میں ڈالی، اور اس ٹریک پہ میں نے سفر کیا میدان جنگ میں جہاں جہاں سے وہ رات کو گزرے۔ میں تو دن میں گزرتا تھا۔ اس تفصیل میں نہیں جاتا۔ میں نے اپنے مشاہدات، جب فیچر میں اردو ڈائجسٹ کے لئے چھ قسطوں میں لکھا۔ پھر الطاف صاحب بھی کہنے لگے کہ بھئی یہ تو بہت لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ آپ اس پر کتاب لکھ دیں تو میں نے انہی کو تھوڑا سا پھیلا کے جو میری پہلی کتاب ہے "قلم کی آنکھ سے"۔ کی صورت میں

چھپی ہوئی تھی اس کی ہم نے کچھ تقریب رونمائی قصور پریس کلب میں کی۔جس میں اداکار محمد علی، سینیٹر میاں احسان الحق جو بعد میں وزیر اطلاعات بھی بنے پنجاب کے، یا شائد اس وقت بھی تھے،اس میں انوشہ رحمان بھی شامل ہوئیں،اس میں نسیم حجازی بھی تھے،حفیظ جالندھری بھی تھے، مجیب شامی بھی تھے،قصور کے کچھ مقامی لوگ بھی تھے،انہوں نے بھی تقریریں کیں، بڑی اچھی تقریریں کیں، ایک صاحب نے تو پنجابی میں کی اور کمال ہی کر دیا۔میں نے ان کا مقالہ بڑی دیر محفوظ رکھا۔لیکن بھائی لاہور میں کوئی بیس، بائیس رہائیشیں بدلی ہیں۔اب پتہ نہیں کہاں نظر ہو گیا،لیکن وہ بہت ہی عظیم تحریر تھی۔جو پنجابی کی تھی۔

س صحافت کی طرف کب اور کیسے آئے؟اس سفر کے پیچ وخم بارے بتایئے؟

ج صحافت کے سفر میں تھوڑی سی بریک آئی، کیونکہ اردو ڈائجسٹ اور جو ہفت روزہ زندگی تھا، بھٹو صاحب کے عتاب کا نشانہ بنا، جیسے ہی انہوں نے 1971 میں اقتدار سنبھالا۔انہوں نے ڈاکٹر اعجاز اسلم قریشی، ڈاکٹر الطاف اسلم قریشی اور مجیب الرحمان شامی کو گرفتار کر لیا۔اور ایک مختصر سا فوجی ٹرائل ہوا،اس میں ایک میجر صاحب تھے یا کیپٹن صاحب تھے،وہ نہ کوئی بات کرتے تھے اور نہ سنتے تھے۔بس ایک دن انہوں نے بلا کر سزا سنا دی، لاکھوں کا جرمانہ اور بڑی لمبی قید کی سزا۔ دوسری طرف انہوں نے پنجاب کا ایک پنج رسالہ تھا،مظفر قادر تھے جو شاید مالک تھے اور حسین نقی اس کے ایڈیٹر تھے،ان کو بھی، دائیں اور بائیں یعنی بھٹو صاحب نے دو بڑے اخباری گروپوں پر ہاتھ ڈالا۔اس طرح جو ہمارا ادارہ تھا وہ بحران کا شکار ہو گیا۔بعض اوقات کبھی تنخواہ ملتی تھی، کبھی نہیں بھی ملتی تھی۔ایک دو سال کے لئے لیکچرارشپ کر لی، گوجرانوالہ میں رہا اور پھر ڈسکہ میں رہا،مگر یہ مجھے راس نہیں آئی۔میں واپس پھر ان کے پاس آ گیا۔اس وقت شامی صاحب ان کو خیر باد کہہ چکے تھے۔میں زندگی کا دو برس تک ایڈیٹر بھی رہا۔

س آپ روزنامہ نوائے وقت کے طویل عرصہ تک مدیر رہے، پھر جنگ کی بھی ادارت کی، یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج یہ 1980 کی بات ہے کہ مجھے کسی نے کہا کہ نوائے وقت والوں کو ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔یہ ضرورت بھی اس لئے پڑی کہ جنگ اس وقت لاہور میں اپنی اشاعت کا آغاز کر چکا تھا۔ نوائے وقت کے ہی قدرت اللہ چوہدری اور قیوم احسانی جنگ میگزین کے ایڈیٹر بن گئے تھے۔تو ادھر ان کا خیال ہو گا کہ شائد اسی طرح کا کوئی بندہ آئے مگر جب میں وہاں گیا تو وہاں ضیاء شاہد بھی

تھے۔ اور عبدالقادر حسن بھی۔ انہوں نے کہا کہ میگزین ایڈیٹر میں ہوں۔ لیکن بہر حال میں نے اسے بڑی محنت سے چلایا۔ یہ جو دو اخباروں کا مقابلہ تھا۔ اس میں جو نوائے وقت تھا اس میں تن کے کھڑا رہا اس مقابلے میں، جنگ کے مقابلے میں زیادہ چیزیں ہم نے دیں، ان سے زیادہ دلکشی ہم نے پیدا کی، مواد میں بھی، پیشکش میں بھی، بڑی محنت کی میں نے اور اس محنت کا صلہ یہ ملا کہ مجھے سب ایڈیٹر یا چیف ایڈیٹر کے طور پر رکھا جاتا، مجھے انہوں نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر رکھا۔ حالانکہ مجید نظامی صاحب کہہ رہے تھے کہ ہم کسی کو ایڈیٹر رکھتے نہیں لیکن ہم آپ کو سب سے بڑا عہدہ سب ایڈیٹر کا دے دیتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے میں دو تین برس تک نوائے وقت کے میگزین کا ایڈیٹر رہا۔ وہاں سے پھر شکیل الرحمان مجھے اپنے اخبار میں لے گئے۔ کیونکہ ان کے اخبار کا جو میگزین تھا وہ کمزور پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے وہاں پھسا دیا۔ وہاں پھر ایک جمگٹا تھا، کچھ سازشیں تھیں، وہاں سے بھاگا اور مجید نظامی صاحب کے پاس پہنچا، ان کے پاس دفتر بالکل خالی پڑا تھا۔ تو یہ بھی خالی ہاتھ، انہوں نے کہا ٹھیک ہے بھئی، آپ آ جائیں مگر تنخواہ وہی ملے گی جو آپ چھوڑ کر گئے ہیں، وہ نہیں دیں گے جو شکیل الرحمان نے دی تھی۔ میں نے کہا آپ کام تو دیں۔ اس طرح واپس نوائے وقت میں آ گیا۔ مگر اسی سال میں جو نوائے وقت کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ بشیر احمد ارشد صاحب۔ تو مجید نظامی صاحب نے ایک نیا تجربہ کیا۔ ایک میگزین ایڈیٹر کو ہی انہوں نے ڈپٹی ایڈیٹر کے عہدے پر ترقی دے دی۔ اور میں نوائے وقت کا اداریہ نویس بن گیا۔ مگر جو میری تربیت گاہ تھی وہ اردو ڈائجسٹ ہی تھا۔ وہاں جو محنت کی گئی ہے ہاں محنت ہی میں کہوں گا۔ مشقت تو نہیں کہوں گا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت کوئی ڈنڈا لے کے کام نئی کراتا تھا۔ تو اصل جو میری تربیت ہے وہ اردو ڈائجسٹ کے ادارے میں ہی ہوئی۔ اس کا ثمر جو ہے یا اس کے جواہر نوائے وقت میں آ کر کھلے۔ مگر یہاں اداریہ نویس کی حیثیت سے جو سیاسی رموز ہیں، جو پیچ وخم ہیں، حکومتی راہداریوں کے، عالمی معاملات کا مطالعہ کرنے میں اور ان کو سمجھنے کا جو تجربہ ہے وہ مجھے حاصل ہوا، نوائے وقت میں 1996 میں جس روز شوکت خانم ہسپتال میں دھماکہ ہوا۔ اس روز کوئی اختلاف ہوا میرا اور نظامی صاحب کا، اور انہوں نے چند سیکنڈ کے اندر ہی مجھے فیصلہ کرنے کا حکم دیا، میں نے کہا ٹھیک ہے، آپ مجھے چائے پلائیں میں آپ کا مہمان ہوں تو انہیں نہیں سمجھ آئی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، وہاں سے اٹھتے ہی میں نے اپنا داریہ جو لکھا ہوا تھا ظاہر ہے وہ سب شوکت خانم کے اوپر ہی لکھنا تھا، اس وقت یہ

سب سے پہلی کسی اسپتال میں تباہی تھی۔شہباز شریف وزیراعلیٰ تھے،اور نواز شریف وزیراعظم تھے،تو اس پہ میں نے اداریہ لکھا۔اداریہ لکھنے کے بعد میں نے شکیل الرحمان صاحب کو فون کیا۔میں نے کہا کہ مجھے یہاں سے تو تنگ کر کے نکلنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی میں نے پہلے غلطی کی تھی آپ کو نکالنے کی تو اس کا ازالہ ہو جائے گا۔آپ کوئی کالم لکھیں اور میرے پی اے کو دے آئیں۔آج تو وقت گزر گیا اور ہمارا آج کا اخبار بھی بن گیا ہے۔ایڈیٹوریل کا صفحہ،کل آپ کا لگادیں گے اور پرسوں جو اخبار چھپے گا اس کے اشتہار میں اعلان بھی ہوگا اور آپ کا کالم بھی چھپے گا اور یوں میں پھر ان کے جنگ کے ادارے میں واپس چلا گیا۔اس مرتبہ ایڈیٹوریل کا چیئرمین تھا اور جو جنگ کا ایڈیٹوریل کا بورڈ ہے وہ لاہور سے ہی کام کرتا ہے،ان کا مرکز لاہور میں ہے اگرچہ کراچی میں بھی ایک آدمی انہوں نے رکھا ہوتا ہے۔لیکن لاہور والے جو ہیں وہ لاہور،پنڈی کا اخبار بناتے ہیں۔جو بھی بناتے ہیں وہ یہیں بنتا ہے۔کراچی والے اپنی تھوڑی سی تحریریں کراچی والوں کے ذوق کے پیش نظر الگ بناتے تھے۔مگر جو مین پالیسی اور اس کا اداریہ ہے وہ لاہور ہی سے کنٹرول ہوتا تھا۔اس حیثیت سے چھ سات برس میں نے پھر جنگ میں گزارے ہیں۔

س آپ کو پاکستانی صحافت میں ''ریموٹ اخبار'' کا بانی اور موجد کہا مانا جاتا ہے،اس تجربے کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ج جنگ میں ہوتے ہوئے مجھے امریکی سینٹر جسے USIS کہا جاتا ہے،محکمہ اطلاعات ہوتا ہے ان کا،قونصل جنرل کے ماتحت لاہور میں تو انہوں نے مجھے ایک مطالعاتی دورے پر امریکہ بھیجا۔گیارہ دن کے لئے۔لیکن جو میرا ویزہ تھا وہ ان لیمیٹڈ کا تھا۔تو میں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور میرے ذہن میں ایک سکیم تھی کہ کوئی اردو کا ایسا اخبار بنایا جائے کہ جو بنے تو لاہور لیکن چھپے کسی دوسرے ملک میں۔تو اس مقصد کے لئے میں دو،تین ماہ میں لوگوں سے ملتا جلتا رہا۔بالآخر مجھے ایک ٹیم میسر آ گئی۔میں اپریل میں گیا تھا اور اگست میں واپس آیا۔چودہ اگست کے قریب لگ بھگ واپس آ کر ہم پہلا ریموٹ اخبار،یعنی بنے کسی اور جگہ اور چھپے کسی اور جگہ سے۔یہ اردو صحافت کا پہلا تجربہ تھا کہ اخبار پاکستان میں بنے اور وہ مکمل پیج میکنگ ہو کے اس کی PDF کی شکل میں یا پھر جس مرضی شکل میں کسی دوسرے ملک یا نیو یارک کے پریس میں جائے۔نیو یارک میں جو پریس منیجر تھا مسٹر لنک،یا لنکو پریس تھا اس کا۔ایک چینی منیجر تھا۔اس نے

کہا تھا مسٹر غالب'' Just write down page number, date & dear and i I will see only and I will recognise Urdu language so I will place the paper page number 1, 2, 3.....'' یہ سولہ صفحوں کا اخبار تھا۔ کیوں کہ اس نے کہا کہ آپ رات کو یہ بھیجیں گے تو اگلے دن میں یہ چھاپ کے اس کا بنڈل باہر رکھ دوں گا جو بندہ آئے گا، پیسے دے گا وہ اٹھا کے لے جائے گا۔ اس طرح ہم نے یہ اخبار اوور سیز ملت کے نام سے میری ملت ڈاٹ کام پہلے سے چل رہی تھی۔ اوور سیز کے نام سے ہم نے پہلا ایک کامیاب تجربہ کیا۔ جیسے Distance Learnig ہوتی ہے، کہ لیکچر دینے والا کہیں بیٹھا ہے اور لیکچر سننے والے کہیں بیٹھے ہیں، Distance Publishing آپ اسے کہہ سکتے ہیں کہ بنے کسی اور جگہ اور چھپے کہیں اور سے۔ اردو صحافت میں یہ پہلا تجربہ تھا اس وقت اور پبلشنگ کا بھی۔ یہ مجھے خیال آیا تھا یو ایس اے ٹوڈے کو دیکھ کر۔ وہ اخبار جو تھا وہ امریکہ کے بھی کئی شہروں میں چھپتا تھا۔ ہانگ کانگ یا سنگاپور سے بھی چھپتا تھا۔ تو میں نے کہا اگر انگریزی کا اخبار جا سکتا ہے تو اردو کا اخبار بھی جا سکتا ہے۔ وہ بعد کی بات ہے کہ اردو کے اخبار کو بیچنے میں مشکلات کتنی پیش آئیں۔ وہ ایک الگ کہانی ہے۔ بہر حال لیکن اللہ کا شکر ہے کہ 14 اگست 2000 کو ہم نے پہلا تجربہ کیا۔ جب تاریخ لکھی جائے گی تو یہ بنیاد بنے گی اس تجربے کی جس پر آج اردو صحافت آب و تاب دکھا رہی ہے۔ جو بھی اخبار ہے، وہ رحمت علی رازی کا ہو، جنگ ہو، نوائے وقت ہو، وفاق ہو، تجارت ہو، ایکسپریس ہو تو دس دس بارہ بارہ صفحوں کا کئی کئی ملکوں میں چھپتے ہیں، بنتے وہ ایک جگہ پہ ہیں۔ جب میں نے یہ وہاں سے نکالا تو اسوقت ایکسپریس تھا وہ اپنی اشاعت کا اعلان کر چکا تھا۔ اور یہ بھی اعلان کر چکا تھا کہ وہ بیک وقت کئی شہروں سے چھپے گا کسی کو انہوں نے جنگ سے لے کے ایڈیٹر بھی بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک سال سے وہ صاحب تنخواہ لئے جا رہے تھے ان کو معلوم نہیں تھا کہ اخبار بنا کر دوسری جگہ بھیجنا کیسے ہے۔ حالانکہ یہ جو ایکسپریس لیکسن ٹبیکو کمپنی والے ہیں ان کی اپنی ایک انٹرنیٹ کی کمپنی ہے۔ ان کے لئے تو بہت آسانی ہونی چاہئیے۔ جو انجینئر تھے وہ ان کو بنا سکتے تھے کہ آپ اخبار بنائیں ایک جگہ، ہم دوسری جگہ منتقل کر دیں گے جہاں آپ کہیں گے۔ ان کے ذہن میں یہ نسخہ کیمیا نہیں آیا۔ پھر وہ جو ایڈیٹر بنے ہوئے تھے وہ میرے پاس آئے اور پھر مجھ سے انہوں نے سمجھا۔ پھر بھی انہوں نہیں نکالا، پھر بھی نہیں کر سکے۔ اتنی دیر میں ضیاء شاہد صاحب میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا کہ بھئی جو آپ

نے وہاں تجربہ کیا تھا وہ بند ہو گیا۔ جو آپ نے تجربہ کرنا ہے وہ آپ میرے اخبار میں کر لیں۔ میں اخبار چار پانچ جگہ سے نکالتا ہوں۔ دو تین سو بندے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے لاہور کو پروڈکشن یعنی ایڈیٹوریل مرکز کے طور پہ بنا دیں اور ملتان سے، اسلام آباد سے، پشاور سے، مظفر آباد سے کراچی میں وہ بنا بنایا اخبار منتقل ہو جائے۔ تو پاکستان میں اردو کے اخباروں میں خبریں وہ پہلا پرچہ تھا۔ جس نے پروڈکشن ہاؤس یعنی ایڈیٹوریل مرکز تو لاہور ہی کو رکھا۔ یہاں سے رات کو ڈھائی بجے فنشڈ اخبار جو دیگر مراکز ہیں جیسے لاہور، اسلام آباد، پشاور، کراچی، ملتان وہاں کے پرنٹنگ پریسز میں پہنچ جاتا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ وہاں جو دو دو سو بندے تھے ان کو فارغ کرنا پڑا۔ پرنٹنگ میں جو کام دے سکتے تھے ان کو رکھا باقی سب کو فارغ کر دیا گیا۔ پھر مجھے خبریں سے بڑی جلدی نوکری سے نکال دیا گیا۔ یہ تجربہ ان کا میں نے مکمل کر دیا تھا۔ یہ ایک نہیں سب نے اسی تجربے کو اپنایا اور آج بھی بڑا حیران کرتے ہیں کہ بارہ شہروں سے چھپ رہے ہیں، تین ملکوں سے چھپ رہے ہیں۔ لیکن جو میرا اُریجنل منصوبہ تھا وہ میں جنگ کی ملازمت کے دوران روزانہ کی بنیاد پر جس کی میٹنگ کرتے تھے۔ وہ میرا منصوبہ یہ تھا کہ ایک چار صفحوں پر مشتمل اخبار ہو، بلیک اینڈ وائیٹ ہو اور وہ ہر ضلع سے مارننگ پیپر کے طور پہ چھپے اور جتنے بھی اخبار ہوں کراچی کے ہوں یا اسلام آباد کے ہوں یا لاہور کے ہوں۔ وہ صبح کی ڈاک نمبر ایک دو تین، لیکن جو لوکل اخبار ہوتے ہیں وہ صرف لاہور کے لئے ہی رہ جاتے ہیں، تو دور دراز کے لوگوں کو تیسرے دن کی خبریں پڑھنی پڑتی تھیں۔ پچھلے دن کی بھی نہیں تو پھر وہ رائٹر سے ترجمہ کر کے یا اے ایف پی سے، ویت نام کے، کموڈیا سے یہ خبریں پڑھنی پڑتی تھیں، ایک دفعہ میں نے نظامی صاحب سے کہا بھی کہ میاں والی کے لوگ، جھنگ کے لوگ، وہ سی ایس پی کئے ہوئے ہیں اور ان کو عالمی معلومات بڑی ضروری ہیں ہمیں وہاں اپنا یہ ایڈیشن بھیجنا چاہیئے۔ بہر حال اس وقت نہ میرے ذہن میں کوئی ترتیب تھی اور نہ انہوں نے مجھے کچھ کہا کہ اس پر کچھ سوچیں۔ میرے منصوبے کی بھنک شکیل الرحمان کے کان میں پڑ گئی تھی۔ جب میں یہ میٹنگیں کرتا تھا تو انہوں نے مجھے ضرور کہا تھا کہ آپ کا جو تجربہ جس کی آپ روز اواری میں میٹنگ کرتے ہیں، مجھے ان کی خبر مل جاتی ہے۔ تو آپ یہ تجربہ جنگ میں کریں۔ میں نے کہا کہ جنگ میں تو میں آپ کا ایڈیٹر ہوں۔ میں آپ کا کوئی پراجیکٹ ڈائریکٹر نہیں ہوں یا آپ مجھے پراجیکٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی دیں۔ تنخواہ دیں پانچ لاکھ روپے یا پھر میرے

ساتھ ایک معاہدہ کریں ورنہ پچاس لاکھ روپے مجھے دیں اور مجھے ایک ٹائم فریم دے دیں۔اس ٹائم فریم کے اندر میں آپ کو اس وقت انہوں نے اعلان کیا ہوا تھا ملتان اور پشاور کو شامل کرنے کا کہ وہاں سے۔جب انہوں نے میرے منہ سے بڑی بڑی رقمیں سنی تو انہوں نے کہا کہ بس ٹھیک ہے میں تمہارے دماغ میں ایک چپ لگا دی ہے ۔تم جو بھی پلان کرو گے وہ پلان خود بخود ہی میرے ذہن میں آجایا کرے گا وہ میں خود ہی کرلیا کروں گا۔وہ بھری مجلس تھی میں نے کہا کہ شکیل صاحب اگلے چھ سال (چھیانوے،ستانوے،اٹھانوے،ننانوے،دوہزار) میں فیصل آباد اور ملتان میں موجودہ نظام کے تحت بھی اخبار شروع کرلیں۔جس میں میرے والا کلیہ اپلائی نہیں ہوتا شروع کرلیں تو میں صحافت چھوڑ دوں گا۔تو بھائی فیصل آباد سے تو آج تک نہیں نکلا۔پچیس سال ہو گئے ہیں اسکو۔ملتان سے نکلا وہ بھی 2002 میں اور بڑا ماٹھا سا اخبار۔یہ وہیں بنتا تھا۔یہ نہیں کہ وہ کوئی لاہور سے بن کے جاتا تھا۔یہ ہے میرا صحافتی تجربہ۔یہ وہی تھا جس کے پیچھے ملت ڈاٹ کام والی سوچ تھی۔

س ملت ڈاٹ کام اردو کی پہلی اخباری ویب سائیٹ ہے۔آن لائین اخبار کے اجراء کے محرکات کیا تھے؟ یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج اب یہ جو صحافت کی پبلشنگ کا یہ نیا تجربہ ہے کہ آپ پاکستان کے دوردراز علاقوں میں بھی وہی خبر دیں جو آپ لاہور کے گلبرگ کو دیتے ہیں یا ڈیفنس کو دیتے ہیں موچی دروازے کو دیتے ہیں۔اس کے اردگرد رہنے والوں کو دیتے ہیں۔آپ کو دوردراز کے علاقے کو لوگوں کو جاہل رکھنے کا حق کس نے دیا۔آپ اس کو صحافت کہتے ہیں نہیں بھائی، یہ ردی کا ایک ڈھیر ہے۔یہ ان لوگوں کو فروخت کرکے پیسے کماتے تھے۔ان کے لئے اس میں کوئی نئی معلومات نہیں بلکہ تین دن پرانی خبریں ہوتی تھیں۔ایک تو پہلے ہی اخبار میں پرانی خبریں، جو ڈاک ایڈیشن ہوتا ہے۔اس میں تین دن پرانی خبریں ہوتی تھیں۔یعنی جو دھماکہ آج صبح لاہور میں ہوگا تو دھماکے کی خبر تیسرے دن دوردراز کے علاقے میں ہم پہنچائیں گے۔کیا کمال ہے۔میں تو اسے صحافت نہیں سمجھتا۔سو خبر کو دوردراز تک پہنچانے کا ایک وسیلہ میرا جو بیرونی سفر ہے ان کی وجہ سے میرے ذہن میں ہے میں نے دیکھا کہ پہلے جو زیادہ تر میرے ٹورز ہیں تفصیلی ٹورز ہیں وہ برطانیہ کے تھے تو وہاں جنگ اخبار ضرور چھپتا تھا۔یہ بھی اسی طرح کا اخبار تھا، جیسے یہاں کے ڈاک ایڈیشن تھے۔ان میں بھی تازہ خبر نہیں ہوتی تھے جنگ میں بھی۔تو میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ میں ایک ویب سائیٹ

لانچ کروں۔جس پر ہر تازہ خبر موجود ہو۔ ہر تازہ تصویر موجود ہو۔ ہر تازہ ویڈیو موجود ہو۔ ہر تازہ کتاب موجود ہو۔ایک لحاظ سے ایک مکمل معلومات کے مرکز کے طور پر اسے میں نے لانچ کیا۔تو سب سے پہلے 1997 میں میں نے غیر رسمی طور پر اور 1998 میں اپریل سے ملت کے نام سے ملت ڈاٹ کام کے نام ویب سائٹ سے رجسٹر کی۔اور تب سے لے کر آج تک کتنے سال ہو گئے ۔بیس سال یہ اور تین سال وہ بھی تیئس سال ہو گئے ہیں تو یہ سلسلہ جاری ہے۔میرے ذہن میں یہ تھا کہ جو ہمارے پاکستانی بھائی اپنے ملک کے حالات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔کہ کس وقت کیا ہوا۔ یہ نہیں کہ جو ہو گیا وہ کب ہوا تھا۔جس وقت ہو رہا ہے۔انہیں اسی وقت پتہ چلنا چاہیئے ۔جو Latest ہے وہ معلومات جاننے کا ان کو بنیادی حق ہے ۔میری عرض یہ ہے کہ وہ Latest مال بیچیں۔اپنا پرانا ردی مال نکال کرنہ بیچیں۔تو میں نے ملت ڈاٹ کام کا جو اجراء کیا۔اس کے ذریعے جو دور دراز علاقوں تک بلکہ پوری دنیا تک جو خبریں ہیں پہنچتی تھیں۔اس تجربے نے مجھے یہ سکھایا کہ کم از کم پاکستان کے اردو اخبار کو اس نہج پر لاؤں اس راستے پہ لاؤں جس وہ اپنے قارئین کو تازہ ترین خبریں فراہم کر سکیں۔

س زمانہ طالب علمی سے آپ ادارت کے شعبے سے وابستہ ہیں،طویل عرصہ بطور ایڈیٹر کام کرنا کیسا لگا؟اس بارے میں کچھ یادیں شیئر کریں گے؟

ج ایک ایڈیٹر کے طور پہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے آج کہ میرے تجربے کا اور اتنی کم عمر کا آدمی۔میں بہتر سال کا ہوں آج، پاکستان میں 90 کو پہنچنے والے اخبار نویس بھی موجود ہیں،اچھا لکھنے والے بھی ہیں۔لیکن میرا یہ منفرد اعزاز ہے کہ میرے اپنے زمانے کے جو دو بڑے اخبار تھے، جنگ اور نوائے وقت ان دونوں کا ایڈیٹر رہا ہوں۔اور میری ایڈیٹری کے دوران مجھے جن سے واسطہ رہا، یا جن سے میرا ورکنگ ریلیشن شپ قائم ہوئی۔جن کا میں ایڈیٹر رہا۔ پاکستان کے نامی گرامی کالم نویس اور تجزیہ کار شامل تھے۔ارشاد احمد حقانی ،وہ کالج میں میرے پروفیسر تھے۔ میرے استاد تھے۔لیکن جنگ میں ایڈیٹر میں تھا اور وہ میرے کالم نویس تھے۔عبدالقادر حسن آج پچاسی، چھیاسی برس کے ہو گئے ہیں۔میں ان کا بھی ایڈیٹر تھا۔منو بھائی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بہت اچھا لکھتے تھے۔میں ان کا بھی ایڈیٹر تھا۔ نئے آنے والے جاوید چوہدری ہیں،حامد میر ہیں۔ پرانے لکھنے والے عطاء الحق قاسمی ہیں۔ڈاکٹر صفدر محمود ہیں۔مجیب الرحمان شامی ہیں۔ پاکستان کا کوئی بھی لکھنے والا ہو جو اس وقت جنگ یا نوائے وقت میں لکھتا

ہوتو میں بھائی ان کا ایڈیٹر تھا۔ میرے حق ایڈیٹری کو چیلنج کرنے والے بہت تھے۔لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے اپنے ایڈیٹری کے فرائض کس طرح انجام دینے ہیں۔اس کی میں ایک مثال دوں گا۔ایک مرتبہ ہارون رشید نے بحریہ ٹاؤن کے اوپر کالم لکھ کے بھیج دیا۔کالم بہت خوبصورت تھا۔انداز بیان کے سبب ہم تو ان کو استاد ہارون کہتے ہیں، انداز بیاں ادیبانہ، رواں دواں، شاعرانہ، وہ تو ایک کھلا اشتہار تھا۔میں نے اسے روک لیا۔وہ ساری رات میرا سر کھاتے رہے کہ اسے چھاپو، اسے چھاپو، میں نے کہا بھئی آپ اسے چھپوالیں، صفحہ اول پہ چھپوالیں۔اپنے لوگو کے ساتھ چھپوالیں۔لیکن نیچے اشتہار لکھا ہوگا۔انہوں نے کہا کہ میں شکیل الرحمان سے بات کرتا ہوں، میں نے کہا کہ ضرور کریں۔وہ مالک ہیں۔وہ کہیں گے تو چھپ جائے گا۔لیکن اگر وہ کہیں گے کہ اسے بطور کالم چھاپو تو میں انکار کردوں گا۔کیونکہ کہ یہ کالم نہیں ہے۔یہ اشتہار ہے۔اور میں شعبہ اشتہار کو مارک کردوں گا۔یہ اشتہار میں شمار ہوتا ہے۔وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔شکیل الرحمان صاحب کے پی اے نے کہا کہ صاحب کا حکم ہے۔میں نے کہا کہ میں بات کرلیتا ہوں تم کون ہوتے ہو؟ میرے پاس آج بھی کہیں کاغذات میں ان کی تحریر پڑی ہوگی۔میں نے ان کا کالم نہیں چھاپا۔جاوید چوہدری صاحب کے اکثر کالم میں روکتا تھا۔اور وہ جھگڑا کرتے تھے کہ یہ کیوں روکے۔میں نے کہا کہ آپ نے جو کہانی لکھی ہے کہ وہ آئن سٹائن تھا۔وہ پیدا ہوا۔اس کو کھانے کو نہیں ملتا تھا۔وہ اٹھتا تھا۔بیٹھ جاتا تھا۔وہ لڑکھڑا جاتا تھا۔میں نے کہا کہ کہانی اچھی ہے۔لیکن جو اس کا آخری پیراگراف آپ نے لکھا ہے، میں اس کو نہیں چھاپ سکتا۔کہانی یہی رہے گی لیکن آپ اس کا نتیجہ دوسرا نکال لیں۔تو چھپ جائے گا۔وہ بھی سر پٹختے رہے۔لیکن میں تو ایڈیٹر تھا۔اور اگر بندہ ایڈیٹر ہو تو وہ ایڈیٹر ہی ہوتا ہے۔اگر بندہ جنگ کا سپہ سالار رہے تو وہی سپہ سالار رہے۔اگر کوئی بندہ کسی ملک کا وزیراعظم ہو تو وہی وزیراعظم ہوتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو استعمال کرنا نہ جانتا ہو یا اپنے فرائض منصبی کو نہ جانتا ہو۔تو اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں جتنے بھی کالم نویس ہیں میں ان کی دائی ہوں۔جو بچے پیدا کرتی ہے۔میں نے کئی نئے کالم نویس پیدا کئے ہیں۔مجیب الرحمان شامی بھی ان میں شامل ہیں۔اور صابر اعوان بھی ان میں شامل ہیں۔سہیل وڑائچ بھی میرے پاس آئے کہ میں کالم لکھنا چاہتا ہوں اور سفارش لے کے آئے۔میں نے کہا آپ ضرور لکھیں، چھاپیں گے۔انہوں نے ایک کالم لکھا لیکن وہ کالم نہیں تھا۔پھر انہوں نے نہیں لکھا۔کئی برس تک نہیں لکھا۔اب بھی لکھتے

ہیں تو اگر شائد اس میں کوئی سیاسی بات ہو تو سیاسی ہوتا ہے۔لیکن اس میں جو کالمانہ بنت ہوتی ہے وہ اس میں نہیں ہوتی۔اور شائد آج بھی نہیں ہوتی۔افتخار فتنہ بھی میرے پاس آئے ،وہ خود ہی آئے ،کسی کے ذریعے نہیں آئے۔کہ میں بھی چاہتا ہوں کہ میری تصویر چھپے۔میں نے کہا کہ تصویر چھپ سکتی ہے لیکن آپ کالم لکھیں۔کہنے لگے کہ وہ تو مجھ سے نہیں لکھا جاتا،آپ کسی اور سے کہیں کہ لکھ دے۔میں نے کہا کہ آپ کے نام پہ کون لکھے گا؟ ملیحہ لودھی نے کہا مجھ سے فون کر کے کہ میں ڈیلی میل میں لکھتی ہوں۔اس کو ہزار پانچ سو بندہ پڑھتا ہے۔آپ کے کالم کو لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں،اردو میں کالم کو۔کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میرا کالم اردو میں چھپ جائے؟ میں نے کہا کہ چھپ جائے گا آپ مجھے پیسے دے دیں۔کوئی ترجمہ کردے گا اور چھپ جائے گا۔انہوں نے پیسے دیئے اور میں کسی سے ترجمہ کروا کے چھاپتا تھا۔شفیق مرزا ساتھ تھے،ایڈیٹوریل بورڈ میں۔ اللہ جنت نصیب کرے ان کو۔وہ فوت ہو گئے تھے۔نیچے سڑک پہ پڑے فوت ہو گئے ہیں۔اسی دوران ان کے اوپر سے دو تین موٹر سائیکل بھی گزر گئے۔ان کے بازو اور ٹانگیں بھی توڑ دی شائد۔اللہ کو جیسے منظور تھا۔اور بڑے باوقار بھی تھے۔ہنس مکھ بھی تھے۔تو انہوں نے تعاون کیا اور چھاپتے تھے۔اور بی بی ان کو کوئی پیسے بھی دیتی تھی یا نہیں دیتی تھی۔میں نے تو ان کو یہی کہا تھا کہ یہ آدمی ترجمہ کردے گا۔اور آدمی بھی تھے۔پھر ظفر اقبال صاحب،جب میں زندگی کا ایڈیٹر تھا،وہ وہاں لکھتے تھے۔نوائے وقت میں آیا تب وہاں چھپتے تھے،جب میں جنگ میں آیا،تب وہاں آ گئے۔بعض کالم ایسے بھی ہوتے تھے جو وہ کہتے تھے کہ نئے ہیں۔میں کہتا تھا ظفر صاحب یہ فلاں سن فلاں ہفتے زندگی میں چھپے تھے۔مجھے پرانے سب چھپے ہوئے کالم یاد ہیں۔اس طرح بھائی میں تو صحافیوں کی دائی ہوں۔اور آیا بھی ہوں جس نے ان کی پرورش بھی کی۔ان کو پیدا کیا۔اور جوان کا مناسب مقام ہونا چاہئیے ،وہ دیا ان کو۔جیسے ماں باپ اپنی اولاد میں سے ہر ایک کو مناسب مقام دیتے ہیں۔اس طرح ان کو مناسب مقام بھی دیا۔اب شامی صاحب کا آپ ملاحظہ کریں جب حادثہ ہوا بہاولپور کا 1988 میں،انہوں نے فوراًاس پر کالم لکھ بھیجا اسی شام۔وردی میں شہادت۔اب اصولی طور پر ان کا جو کالم تھا۔وہ ہمارے ایڈیٹوریل پیج پر چھپتا تھا۔آج جو آئے گا وہ کتابت ہو جائے گا۔صفحہ بن جائے گا۔وہ صفحہ اگلے دن سارے سٹیشنوں کو بھیجیں گے۔وہ اپنے طور پر اس کی کتابت کرتے تھے۔پھر اسی ترتیب سے وہ اس کی کتابت کر لیتے تھے۔بطور ایڈیٹر یہ میرا فیصلہ تھا کہ یہ ایک تازہ ترین واقعہ تھا۔اس کو اگلے دن ہی

چھپنا چاہیئے ۔میں نے اس کو سارے سٹیشنوں کو بھیجا کہ اس کو صفحہ دو پر چھاپیں۔اگلے دن پھرانہوں نے اسی پر لکھا۔حالانکہ جنرل ضیاء کونوائے وقت کی پالیسیوں سے سخت دشمنی تھی۔اور وہ کہہ چکا تھا مجید نظامی صاحب کے حوالے سے ایک جلسے میں ۔واپڈا ایڈیٹوریم میں، کہ جوان کے دماغ میں جمہوریت کا کیڑا ہے۔مجید نظامی بھی وہیں بیٹھے تھے۔یعنی ایک دوسرے سے دشمنی تھی۔دشمنی کہہ لیں یا اختلافات کہہ لیں۔مگر جب بات آئے گی،تبصرے کی،وہ ایک واقعہ تھا۔ایک حادثہ تھا۔اس کے بعد وہ پھر آنے والی جگہ پر آ گئے۔یعنی تیسرے صفحے پر آ گئے۔ان کا کالم تیسرے دن چھپتا تھا۔مگر یہ مجیب الرحمان شامی کے پاس ڈیلی پاکستان میں جب میں ملازمت کرنے لگا تو کوئی ایسا کالم میرا نہیں تھا۔جس کے اوپر اختلافی نوٹ نہ لکھا جاتا ہو۔یعنی ایک مرتبہ نہر پر پل بن رہا تھا۔میں نے لکھا کہ جو ایف سی کالج کا انڈر پاس ہے،اس کی کیا ضرورت ہے۔ایک طرف فیروز پور کا انڈر پاس ہے دوسری طرف جیل روڈ کا انڈر پاس ہے۔ہوسکتا ان کو اس کی ضرورت ہو۔اگر ایسا ہے تو پھر مسلم ٹاؤن کا پل انہوں نے گرا دیا۔شامی صاحب نے لکھا کہ فیروز پور والے جیل روڈ والا پل استعمال کر لیں۔کوئی بھی میرا کالم انہوں نے بغیر اختلافی نوٹ کے نہیں چھاپا۔تو یہ ایڈیٹری، ایڈیٹری کی بات ہے۔جب آپ کوئی چیز شائع کرتے ہیں۔آپ اس کو اون کرتے ہیں۔میں اس بات کو مانتا ہی نہیں،ہر اخبار کے اوپر نوٹ لکھا ہوتا ہے کہ کالم نگار کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔قانون اس بات کو نہیں مانتا۔قانون کہتا ہے کہ آپ اس کو اون کریں گے۔آپ ہی اس کے پبلشر ہیں۔یہ تو خیر اس کی بنیادی باتیں ہیں۔مگر میں نے آپ کو بنیادی نقطہ بطور ایڈیٹر جو ٹاپ کے لکھنے والے ہیں۔میرا واسطہ رہا ہے۔میری ان کی ورکنگ ریلیشن شپ رہی۔بہت اچھی بھی رہی۔لیکن پاکستان میں کسی دوسرے بندے کو یہ کریڈٹ حاصل نہیں ہے مگر شامی صاحب کو میں سینئیر ضرور سمجھتا ہوں۔نذیر ناجی کو یا کسی دوسرے کو نہیں سمجھتا۔وہ مجھ سے بڑے ہیں۔کافی بڑے ہیں۔مگر ناجی صاحب نہ نوائے وقت کے ایڈیٹر رہے اور نہ جنگ کے۔اگر کہیں ایڈیٹر تھے وہ روزنامہ آزاد کے تھے۔اس کے علاوہ میں نہیں جانتا۔اگر صحافت میں ان کا نام آئے گا تو صرف ایک سرخی کے طور پر''ادھر ہم،ادھر تم'' پر۔یا جس میں مولانا مودودی کا کارٹون چھاپا تھا کسی رقاصہ کا، نیچے ننگا دھڑ تھا اور اس کے اوپر مولانا مودودی کا سر لگا دیا۔یہ دو کنٹری بیوشن ہیں ان کے صحافت میں۔مگر محمود شام سینئر ضرور ہیں ۔بہت اچھا لکھتے ہیں۔نثر میں بھی،نظم میں بھی،لیکن وہ ایڈیٹر نہیں رہے۔نوائے

وقت اور جنگ اپنے اپنے دور کے دو بڑے اخبار، دو بڑے ادارے جن میں میں ایڈیٹر تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے مجھ پر۔اس اعزاز کو تاریخ میں محفوظ کیا جانا چاہیئے ۔ یہ اعزاز اور کسی کو نہیں جاتا۔

س آپ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستند ادیب بھی ہیں۔اپنی ادبی زندگی کے بارے میں قارئین کو کچھ بتایئے؟

ج میرا ادب سے رشتہ صرف وہی ہے جو میں تین سال گورنمنٹ کالج کے مجلہ راوی میں اس کا مدیر رہا۔وہ خالصتاً ایک ادبی پرچہ تھا۔جسے پاکستان کے ہر ادبی پرچے کے برابر رکھا جاسکتا تھا۔اتنا ہی وقیع تھا۔جتنا اوراق اور فنون تھا،میرا خیال ہے کہ اور تو کوئی بڑا میگزین ان دنوں نہیں تھا۔تو اس میں میں نے نثر نہیں لکھی۔اس میں جب بھی کوئی میری چیز چھپی تو وہ نظم ہی تھی۔آزاد نظم بھی تھی۔زیادہ تر آزاد طرز میں تھی۔غزل میں نے نہیں لکھی۔مگر جو ادبی سرگرمیاں ہیں وہ لاہور میں پاک ٹی ہاؤس میں ہوتی تھیں۔وہاں پنجابی کی محفل بھی ہوتی تھی اور اردو بھی ہوتی تھی۔ادھر کافی ہاؤس میں بھی ہوتی تھی۔میں جاتا تھا ادھر۔لیکن میں دیکھتا تھا کہ وہاں طبقاتی کشمکش کی باتیں ہوتی تھیں۔کوئی لٹریری رمق ان میں نہیں تھی۔کسی غزل میں کوئی جان نہیں ہوتی تھی۔ہوسکتا ہے میں ایسی مجلسوں میں شریک نہ ہوا، جہاں منو بھائی آتے ہوں، جہاں انتظار حسین آتے ہوں یا جہاں اشفاق احمد آتے ہوں۔میں جن جگہوں پر گیا۔وہاں پر تو لولے دبٹے لوگ تھے۔کسی نے غزل پڑھی یا کسی نے افسانہ پڑھا۔تو اس پر دھواں دھار،تنقید، یا اس کے جو نقائص ہیں ان پر بات ہوئی۔ہم نے تو انگلش لٹریچر میں ایم۔اے کیا۔خواہ اس کا فہم کم ہی ہے۔مگر یہ کہ تخلیق کو سراہا جاتا ہے۔تنقید نہیں کی جاتی۔Appriciation میں تنقید بھی آتی ہے۔تنقید کا عنصر بھی اس میں شامل ہے۔یہ نہیں کہ صرف تنقید ہے۔یہ تو صرف تنقیص کے لئے تینوں چاروں ادارے تھے جہاں ان کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔میرا دل ان سے اچاٹ ہی رہا۔

س اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں لکھنے کا اتفاق ہوا؟

ج میں نے پنجابی میں قلمی میگزین کا اجراء کیا جب میں سکول میں زیر تعلیم تھا غالباً نویں، دسویں،مگر راوی کے لئے جو دیہات کی لڑکیاں ہیں یا جو بڑی بوڑھیاں ہیں ان سے پوچھ پوچھ کے۔ایک تو عام دوہڑے ہوتے ہیں۔لیکن کچھ ایسے بھی میں نے ڈھونڈے، جو پہلے کبھی نہیں چھپے تھے۔مثلاً میرے گاؤں میں سوسال سے زیادہ ایک بوڑھی عورت تھی۔میں نے اس سے کہا کہ اماں جی! کوئی ٹپہ سناؤ،تو یقین جانیں کہ اس کے اندر سے ایک الڑ دوشیزہ نے انگڑائی

لی۔یعنی وہی سوسوا سوسال کی جوعورت تھی،اس کا وہی لب ولہجہ ہوگیا،اس کی وہی کھنک۔ایک جو دیہاتی دوشیزہ ہوتی ہے،مٹیار ہوتی ہے،اس لہجے میں اس نے مجھے وہ ٹپہ سنایا۔

گوری ساں چٹی، داغ لگ گیا تیرا
نہ دھوتیاں ای لہیندا، نہ دھون داویلا
ہور مل مل دھونی آں، کھلر گیا بہتیرا

کمال کاٹپہ ہے جی،اور کمال کا اس میں میسج دیکھیں،معاشرتی رویہ ہے۔جیسے سکینڈل پھیلتے ہیں،اور مل مل دھونی آں، کھلر گیا بہتیرا،اگر میں کہوں کہ سکینڈل جیسے پھیلتے ہیں،یہ ایک گندے الفاظ ہیں۔مل مل دھونی آں، کھلر گیا ودھیرا،بڑی چاشنی ہے بھائی اس میں ایک خاتون بولتی ہے،ایک باعظمت اور باحیاء۔ایک لڑکی بولتی ہے اور اورایک الڑمٹیار۔جوعورت ہے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے۔تواس طرح میں نے وہ بھی چھاپے۔لیکن ادب سے میں پھر میں نے اپنی صحافتی مصروفیات کی وجہ سے رشتہ نہیں جوڑ سکا۔ویسے بھی جب میں صحافی بن گیا تو میں لکھتا گیا۔اور جب آپ زیادہ لکھتے ہیں تو وہ ادب کے پیمانے پر پورا نہیں اترتا۔یہ میرا ایک شدید احساس ہے۔یہ جو اخباری تحریر ہے۔یہ آدمی کو لٹریری تحریر سے بہت دور لے جاتی ہے۔جیسے جسے سمندر کی لہریں جھاگ کو کنارے پر پھینک دیتی ہے۔یہ ایک لکھاری کو باہر پھینک دیتی ہیں۔بھائی آپ ادیب نہیں ہیں۔تخلیق کار نہیں ہیں۔آپ نے لکھا لوگوں نے پڑھا۔وہ گزر گیا۔مگر پھر بھی کئی چیزیں ایسی لکھی ہیں میں نے۔جن کو لوگ نہیں بھول سکتے۔ان میں سے چند میری تحریریں ڈیفنس کے اوپر ہیں۔ان کو میں نے دفاعی کتاب ضرب عضب کی شکل میں چھاپا۔اورایک کتاب اے وطن کے سجیلے جوانو کے اوپر چھاپا۔آپ نے میری کتابوں کے بارے میں پوچھا تو میری ایک کتاب ہے’’فرار کی کہانیاں‘‘۔اب آپ کہیں گے کہ یہ کیا کتاب ہوئی بھئی۔یقین جانیں جب یہ کہانیاں اردو ڈائجسٹ میں چھپی تھیں۔اوران میں سے ایک کہانی میں قسط وار لکھ رہا تھا۔چوتھی قسط لکھ رہا تھا تو ڈاکٹر اعجاز حسن اوپر ان کی رہائش تھی۔نیچے میرے کمرے میں آ گئے۔انہوں نے کہا کہ غالب صاحب اسی طریقے سے اس کہانی کو انجام تک بھی پہنچایئے۔پھر مجھے تنگ کرتے ہیں کہ آگے کیا ہوا۔آگے کیا ہوا۔میں نے پھر چار پانچ کہانیاں ایک کتاب کی شکل میں شائع کیں۔تو میری سب سے بڑی Appriciation ہے۔آپ شاید اسے مانیں یا نہ مانیں۔جب میں عمرے پہ گیا تو اپنے دوست سعید احمد چمن جو پاکستان میں ڈپٹی

گورنر سٹیٹ بنک بنے۔اور بعد میں پنجاب بنک کے صدر بنے۔اب وہ حدیبیہ کیس میں ECL میں پاکستان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ان کا خاندان قطر میں ہے۔تب وہاں یہ جدہ میں کسی کمپنی کے صدر تھے تو میں وہاں رات گیارہ بارہ بجے پہنچا ان کے پاس۔تو میرے پاس وہ کتاب موجود تھی۔فرار کی پانچ بڑی کہانیاں۔تو وہ ان کے ڈرائیور نے لے لی۔جب میں صبح اٹھا تو انہوں نے اٹھایا کہ چائے پی لیں اور عمرہ کرنے چلیں۔تو وہ کہتا تھا کہ میں نے ساری رات جاگ کر یہ کتاب پڑھی۔وہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔عام دیہاتی آدمی،تھا پاکستانی،میرے لئے یہ بہت بڑی تحسین تھی اور بہت بڑی توصیف۔کہ کوئی آدمی اتنی دلچسپی سے اس چیز کو پڑھ سکے کہتا تو اسکو ادب ہے۔بہرحال کچھ فقرے اس میں ایسے ہیں،جن سے میرے اندر کا ادیب جو ہے وہ جاگ جاتا ہے۔اور کچھ فقرے سرزد ہو جاتے ہیں۔جنہیں ادب کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔لیکن پھر بھی میں اپنے آپ کو لٹریری آدمی نہیں کہتا۔ادب کا شوقین ہوں اور آپ کا پرستار بھی۔

OOO

اختر شمار

چیئر مین شعبہ اردو ایف سی کالج یونیورسٹی ڈاکٹر اختر شمار کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ ایک منجھے ہوئے شاعر، محقق، استاد ادب، کالم نگار کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اردو شعری روایت میں ''دلیری'' سے مکالمہ کرنے اور محنت کی عظمت کو اجاگر کرنے کے ساتھ، کیفیات دل کی ''کوملتا'' کو شاعری سے ہمکنار کرنے میں ایک انفرادی لب ولہجہ متعارف کرایا۔ اب تک ان کے 8 شعری مجموعے ادبی حلقوں اور بین الاقوامی سطح پر قارئین میں متعارف ہو چکے ہیں اور ان کے لاتعداد اشعار زبان زد خاص وعام ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی شاعری کے دو، کہانی اور اردو پنجابی کالموں کے چار مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ سفرنامہ، تحقیق، تصوف پر بھی ان کی کتب مقبول ہوئیں۔ مختلف قومی روزناموں میں ان کے کالم شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت روزنامہ نئی بات میں کالم کے علاوہ ادبی ایڈیشن بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ادب میں آپ کی بھرپور کنٹری بیوشن ہی کے سبب ہم آج ڈاکٹر اختر شمار سے ایک بھرپور مکالمہ آپ کی نذر کر رہے ہیں جس میں زندگی کو بالکل نئے انداز میں ڈسکس کیا گیا ہے۔

س جی ڈاکٹر صاحب! بہت شکریہ وقت دینے کا، ہمیں علم ہے آپ کی بے پناہ مصروفیات ہیں، پہلے مختصراً اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بیان کریں تاکہ قارئین مکمل آپ سے متعارف ہو سکیں؟

ج جی بسم اللہ...... میری ولادت راولپنڈی میں 17 اپریل 1960ء کو ہوئی۔ والد صاحب پاک فوج میں صوبیدار تھے۔ بنیادی طور پر ہمارا گھرانہ کاشتکار تھا مگر بارانی زمینوں کی فصلوں کا دارومدار بارشوں پر ہوتا ہے، سو اس علاقے کے لوگ زیادہ تر فوج جوائن کر لیتے ہیں، ویسے بھی آرمی کی سروس کو اس علاقے میں باعثِ عزت سمجھا جاتا ہے۔ میرے بھائی بھی آرمی میں رہے ہیں۔ باقی اب بھی اس علاقے میں ہمیں اچھا خاصا زمیندار خیال کیا جاتا ہے مگر بنجر اور پتھریلی

زمینوں کا۔ دادا جان نے کچھ زمین کاشت کے قابل بنائی تھی جو اس وقت میرے بھانجوں کی نگرانی میں ہے۔ میں نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے سکول میں حاصل کی پھر ہم ملتان آ گئے کہ والد صاحب آرمی سے سبکدوش ہو کر کھاد فیکٹری میں جاب کر رہے تھے۔ سو بی اے تک ملتان میں پڑھتا رہا۔ اسی زمانے میں شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا، بیدل حیدری صاحب اس دور میں نوجوان شعراء کی ادبی تربیت کرتے تھے۔ اپنے پہلے ادبی دوست اطہر ناسک کی وساطت سے میں بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوا۔ الحمدللہ اب تک انہیں شاعری میں استاد سمجھتا ہوں جبکہ کتنے ہی شاعر ان سے تربیت لینے کے باوجود بھی انہیں اون نہیں کرتے۔ شوک مہدی میں اور اطہر ناسک باقاعدہ بیدل صاحب کے فارغ التحصیل شاگرد ہیں۔

س بیدل حیدری صاحب کے حوالے سے ایک نوجوان فیس بک پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے؟ آپ کا تذکرہ بھی کرتا ہے کہ آپ نے بیدل صاحب کا مجموعہ اب تک دبا رکھا ہے جو انہوں نے شائع کرنے کی غرض سے آپ کو دیا تھا، آپ کیا کہتے ہیں؟

ج جی مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک نوجوان اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اسے کبھی کوئی جواب نہیں دیا، صرف ریکارڈ کی درستی کے لئے چند باتیں ضروری سمجھتا ہوں۔

سارا ملتان گواہ ہے کہ اس نوجوان کی شعری تربیت کس نے کی۔ اسے سکول کی پہلی کلاس میں انگلی پکڑ کر داخل میں نے کرایا، وہ جو چوتھی کلاس سے بھاگا ہوا تھا، اپنے ہیڈ ماسٹر دوست سے کہہ کر اسے نئے سرے سے پہلی جماعت میں داخل کرایا، اسے شاعری کی سدھ بدھ سکھائی، رضی الدین، شاکر حسین شاکر، نوازش ندیم، شفیق آصف سے لے کر ناصر بشیر تک سبھی ماشاءاللہ حیات ہیں اور سب گواہ ہیں کہ اسے کس طرح تعلیم و تربیت دی۔ محلے دار ہونے کے سبب، اس کی ہر طرح کی مدد کی۔ محلے دار سبھی کچھ جانتے ہیں۔ میں اسے لے کر بیدل صاحب کے پاس بھی جایا کرتا۔ اسی دوران بیدل صاحب نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ وہ ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ اصلاح بھی لیتا رہا لیکن افسوس یہ ہے کہ آخر کار اس نے بیدل صاحب ہی کو ڈس لیا۔ انہوں نے بھگا دیا۔ اب وہ ہر پل نہ صرف یہ کہ بیدل صاحب بلکہ مجھے بھی یاد کرتا رہتا ہے۔ بیدل صاحب کی سب ڈائریاں ان کے گھر والوں کے پاس موجود ہیں۔ ان کا کوئی مجموعہ لے کر کہاں بھاگ سکتا ہے۔ پھر میرا کون سا اشاعتی ادارہ تھا کہ ان سے مجموعہ لے کر آتا اور پھر دبا کر بیٹھ جاتا۔ اب تو ان کے سارے مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ کلام کی تدوین بھی ہو چکی ہے بلکہ کل کلام کتابی صورت میں بھی شائع

ہو چکا ہے۔ کلیات بھی خود ان کے جانشین شکیل سروش نے چھپوا دیا ہے لہٰذا یہ انتہائی لغو بات ہے کہ بیدل صاحب کا کوئی غیر مطبوعہ کلام کسی کے پاس ہے۔ مجھے کوئی متشاعر کہتا پھرے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر جب بیدل صاحب کی صاحبزادی کے حوالے سے وہ بدبخت بے سروپا باتیں کرتا ہے تو دکھ ہوتا ہے۔ اللہ اسے ہدایت دے۔ مجھے یقین ہے ایک دن وہ اس سارے پروپیگنڈے پر پشیمان ضرور ہوگا کہ میں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا۔ میں اس کی ساری کوتاہیوں کو ہمیشہ کے لئے معاف کرتا ہوں۔

س پانچ برس ملک سے باہر، ادبی حلقوں سے دور (مصر میں) تجربہ کیسا رہا اور اس کے آپ کے ادبی کیریئر اور ذات پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

ج وطن سے دوری کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ والدین، بہن، بھائی، عزیز و اقارب اور احباب کو انسان Miss کرتا ہے لیکن ظاہر ہے انسان اپنے مسائل اور مجبوریوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسے کبھی تعلیم اور کبھی رزق کے معاملات میں سفر بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میرے لئے بھی یہ ایک اعزاز تھا کہ میں اردو چیئر پرسن منتخب ہوا۔ بیرون ملک یونیورسٹیوں میں پڑھانے کا تجربہ حاصل ہوا۔ کیریئر میں اس کی اپنی اہمیت بھی ہے۔ اس سے معاشی طور پر بھی قدرے تبدیلی آئی ہے۔ میں نے ان برسوں میں جمع پونجی سے لاہور میں اپنے لئے ایک ''چھت'' کا بندوبست کیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی بہتری آئی۔ اس کے علاوہ وطن سے دور رہ کر وطن سے محبت کے جذبے بھی تقویت اختیار کرتے ہیں۔ میں نے بیرون ملک قدرے تنہائی سے ایک اور فائدہ بھی حاصل کیا۔ یعنی خود احتسابی اور ذات و حیات پر غور و فکر کے لمحوں سے اپنی تطہیر پر بھی توجہ دی۔

اگرچہ ایف سی کالج یونیورسٹی میں آنے کے بعد وہ ''بجنگ آمد'' کا ادارتی رویہ خود سے منہا کرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر مصر میں مطالعے اور تفکر نے مجھے انسان کی اصل تک رسائی حاصل کرنے کے راستے پر ڈال دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنی شخصیت کی تعمیر پر توجہ دینی چاہئے۔ اس میں شخصیت کی باطنی صحت و شفافیت کو خاص طور پر مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ مصر میں رہ کر اپنے طالب علموں خاص طور پر نوجوان قارئین کے لئے ایک مختصر سی کتاب ''آداب خود آگاہی'' بھی تیار کی۔ اب اس سے آگے کا سفر جاری ہے اور آنے والے دنوں میں انسان کی پریشانیوں سے نجات کے حوالے سے میری کتاب آنے والی ہے جس میں تصوف کے حوالے سے آج کے انسان کی بے چینی کا کسی حد تک حل تلاش کرنے کی کوشش شامل ہے۔ آج اپنے معاشرے پر نظر ڈالیں تو

ایک عجیب افراتفری، بے سکونی، حرص وہوس کا دوردورہ ہے۔ معاشی مسائل بھی اپنی جگہ ہیں۔ نظام کی خرابیاں اور ناانصافیاں بھی ہیں مگر ان مسائل پر تفکر اور تدبر سے قابو پایا جاسکتا ہے۔

ہم میں برداشت کیوں کم ہوگئی ہے۔ انسانوں میں رواداری، محبت اور اخوت ناپید کیوں ہو رہی ہے؟ ان ایشوز پر غور وفکر کی ضرورت ہے مگر بدقسمتی سے دانشور بھی جنہیں اپنے کردار اور تحریر وتقریر سے لوگوں کو ''ایجوکیٹ'' کرنا تھا، وہ بھی زندگی کی حقیقت سے دور نکل چکے ہیں اور اسی زندگی کی آسودگی کو سب کچھ سمجھ کر اپنے آپ کو ''خوشحال'' کرنے کے لئے ہانپتے نظر آتے ہیں۔

س: اس تناظر میں ادیب، شاعر کہاں کھڑے ہیں؟

ج: میں نے کہا ناں آج ہر شخص جلدی میں ہے۔ وہ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ اس ''میں'' نے ہمیں دانش سے دور کردیا ہے۔

ہمارے سماج میں ادب کو کارِ فضول سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی شخص اولاد میں سے کسی کو ادیب شاعر بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہمارا سارا دھیان صرف اور صرف بہترین ''ملازمت'' کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ ہماری درس گاہوں میں بھی اچھے کیریئر کے لئے ایسے ہی مضامین میں ڈگریاں حاصل کرنے کی دوڑ جاری ہے۔ کسی زمانے میں والدین اپنے بچوں کو ڈاکٹر انجینئر بنانے کا شوق رکھتے تھے۔ اس سے بے روزگار ڈاکٹروں کی کھیپ تیار ہوئی۔ آج کل آئی ٹی کے گریجوایٹس میں اضافہ ہورہا ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں ہیومینیٹیز کے شعبوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ سائنس کے شعبے میں تنخواہیں اور مراعات زیادہ ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا صرف سائنس اور ٹیکنالوجی سے انسان سچی خوشی اور طمانیت حاصل کرسکتا ہے۔ رات دن مشینوں سے وابستگی نے انسان کو بھی مشین بنا دیا ہے جبکہ ہمارے قومی شاعر کہتے ہیں دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت ایسے ماحول میں انسان، انسان سے کٹ گیا ہے۔ ایک عجیب سا ''مفاداتی کلچر'' تشکیل پارہا ہے۔ سوشل میڈیا خاص کر الیکٹرانک میڈیا نے ہماری زندگی پر خاص اثرات مرتب کئے۔

کتاب کلچر ناپید ہورہا ہے۔ اس سے انسانی دل ودماغ متاثر ہورہا ہے۔ جسمانی اور روحانی صحت تباہ ہورہی ہے۔ ہم میں آسائش اور آسودگی کے لئے ایک بھاگ دوڑ جاری ہے۔ ہر شخص راتوں رات دولت مند بننے کی فکر میں ہانپ رہا ہے۔ دولت کی اہمیت سے انکار نہیں مگر بہت سے دولت مند اپنی صحت کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہیں سو طرح کے امراض، خدشات اور خطرات نے گھیر رکھا ہے۔ نیند جیسی نعمت کے لئے بھی انہیں دواؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ حقیقی

سکون اور خوشی صرف دولت سے حاصل نہیں ہوتی۔ دولت سے اچھا بیڈ روم تیار ہو سکتا ہے، نیند اور سکون نہیں خریدا جا سکتا۔

س دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا سماجی منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟

ج وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں تو آتی ہیں لیکن ہمارے ہاں سادگی، قناعت اور محبت، اخوت ختم ہو رہی ہے۔ لوگ سادہ کاغذ کے عادی تھے۔ مرغی گھروں میں کبھی کبھار پکائی جاتی، وہ بھی کسی مہمان کے آنے پر۔ مرغی کی اس ترکاری میں ذائقہ بھی ہوتا تھا۔ آج ہر گھر کی فریج میں برائلر کے پیکٹ رکھے ہوئے ہوتے ہیں، جب دل چاہا، نکال کر استعمال کر لیا۔ گوشت خوری کی عادت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔

اور خالص گوشت کا تصور ماند پڑتا جا رہا ہے۔ مردہ جانوروں کے گوشت اور اس کی چربی سے کھانے کا تیل بنایا جاتا ہے۔ برائلر مرغیوں کی خوراک میں بھی مردہ جانوروں کی آنتیں آلائشیں استعمال ہوتی ہیں۔ بیکری، مٹھائیوں میں کیمیکل والا دودھ استعمال کیا جاتا ہے۔ خالص پانی تک نایاب ہو رہا ہے۔ ایسی دونمبر خوراک سے انسان کی صحت کیا گزرے گی؟ بیماریوں میں اضافہ ہو چکا ہے لیکن دواؤں میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے۔ بندہ کہاں جائے؟ نئی نسل کا ''آئی کیو'' متاثر ہو رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خوراک کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ جیسا ہم کھاتے پیتے ہیں ویسی ہی ہماری سوچ پنپتی ہے۔ یوں سمجھ لیں بندے ڈنگر ہوندے جاندے نیں۔

س 2018ء کے حوالے سے آپ نے کوئی ادبی منصوبہ بندی کی ہے؟

ج منصوبے تو ذہن میں بہت سے ہیں لیکن اصل معاملہ ان کی تکمیل ہے۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے، بہر حال ارادے تو ہوا کرتے ہیں، آنے والے دنوں میں میری دو کتب تو سمجھیں پبلشرز کے پاس ہیں جن میں ایک کتاب مرحوم شعراء ادباء کے حوالے سے ''خاکے'' ہیں۔ میرے روزنامہ نئی بات میں شائع ہونے والے کالموں کا انتخاب بھی شائع ہونے والا ہے۔ یہ کالم خاص طور پر تصوفانہ انداز لئے ہوئے ہیں اور ان میں درویشوں، ملنگوں کے ساتھ گزرے حالات و واقعات ہیں۔

میرا تازہ شعری مجموعہ نعتیہ آہنگ میں بھی لکھی گئی غزلیات پر مبنی ہے جو اس برس ان شاء اللہ ضرور قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ویسے میں ذاتی طور پر نثر کی طرف زیادہ توجہ دے رہا ہوں۔

س کیا نثری تحریروں کے ذریعے آپ لوگوں کی تربیت کا منصوبہ رکھتے ہیں؟

ج کسی حد تک آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری نثری تحریروں میں نئی نسل کو سکون سے زندگی گزارنے کے ڈھب بیان کرنے کی کوشش ہے۔ مقصدیت سے عاری تحریر وقت کا ضیاع ہے۔ میں اپنے طالب علموں اور نوجوان قارئین کی تربیت کے بارے میں اپنے حصے کا کردار ادا کرنا چاہتا ہوں۔ خاص طور پر نوجوانوں کی باطنی صحت، کردار اور شخصیت سازی پر توجہ دینے کا ارادہ ہے۔

س اس سلسلے میں آپ نے ڈرامے جیسے میڈیم کا سہارا کیوں نہیں لیا؟ کسی زمانے میں آپ نے ٹی وی کے لئے ڈرامے بھی تو لکھے تھے؟

ج ہاں وقت ملا اور کوئی مناسب اور ذہین پروڈیوسر میسر آیا تو میں ڈرامہ ضرور لکھوں گا۔ اس حوالے سے میرے پاس چند اچھوتے آئیڈیاز موجود ہیں۔ ٹی وی ڈرامے جیسا میڈیم یکسانیت کا شکار ہے۔ عہد حاضر میں عملی تصوف سے لوگوں کی ذہنی، قلبی اور روحانی تربیت ڈراموں سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک مؤثر ہتھیار ہے۔ اس کے اثرات بھی گہرے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی ہمارے ہاں بیڈرومز تک رسائی ہے۔ اس سے لوگوں میں فکر و شعور عام کیا جا سکتا ہے مگر اس میں سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے۔

س ڈرامہ سے ہمارے معاشرے پر اور زندگیوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

ج اس وقت ہمارا ڈرامہ نئی نسل کو بگاڑنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔ نوجوان جو کچھ دیکھتے ہیں، اثر لیتے ہیں۔ زبان، عادات، رسم و رواج سب کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ اخلاقیات پر قطعی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ ہر کہانی ٹیلی ویژن پر نہیں دکھائی جا سکتی۔ معاشرے کو مثالی بنانے کے لئے منفی کرداروں کے بجائے مثبت کہانیوں اور کرداروں کو رواج ملنا ضروری ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے اشتہار تک بے تکے، غیر سنجیدہ اور مضحکہ خیز بنائے جانے لگے ہیں۔ اس پر کوئی توجہ دینے والا نہیں...... اب دیکھیں ناں ''داغ تو اچھے ہوتے ہیں'' جیسا جملہ نئی نسل پر کیا اثرات مرتب کرے گا، بھلا داغ اچھے کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ واشنگ پاؤڈر کی طرف مائل کرنے کے لئے کوئی اور مکالمہ بھی تو تحریر کر سکتے ہیں۔ ڈراموں میں ماں کو یار کہہ کر مخاطب کرنا کہاں کی روشن خیالی ہے؟

س دانشور اور تخلیق کار کی آواز مؤثر کیوں نہیں رہی؟ آپ کی رائے؟

ج آج دانشور بھی میڈیا ''پرسن'' کو سمجھا جانے لگا ہے۔ جو کوئی پندرہ دن سکرین پر نظر آنے لگتا ہے، خیر سے دانشوروں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ صحافت میں ادیب شاعر بھی ہوتے ہیں

مگر محض رپورٹنگ کرنے والے جب ٹی وی کے اینکر بن کر دانشوری بگھارتے ہیں تو معیار کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں، اب تو دانشوری بھی آٹھ دس اینکر پرسنز کا نام ہے۔ وہ جس موضوع کو اچھال دیں، ہمارا میڈ یا ادھر دوڑ پڑتا ہے۔ زندگی کے سنجیدہ، اہم اور بہت سے عوامی مسائل پر بات کرنے والے خال خال ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب راہ دکھانے والے بندے خود ہی حرص وہوس کے بندے بن جائیں تو راستے متعین کون کرے گا۔

س لیکن اہل قلم میں حبیب جالب جیسا کردار ادا کرنے والے کہاں ہیں؟

ج حبیب جالب جیسی قناعت، برداشت، صبر اور استقامت اب اہل قلم میں عنقا ہو چکی ہے۔ اب ادب وثقافت میں ایسے سچے کھرے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں کیونکہ یہ ایک کٹھن راستہ ہے اور اس راہ میں چند کڑے مقامات آیا کرتے ہیں۔ آج کی نئی نسل کو بہت جلدی ہے۔ وہ شارٹ کٹ سے جلد ہر منزل حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ نئے تخلیق کار تو راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور ہر حال میں چاہے اس میں ان کی عزت نفس کا جنازہ نکل جائے، شہرت اور دولت کی منزلیں طے کرنے کی فکر میں ہیں۔ جیسا ہمارا معاشرہ ہے، اہل قلم بھی ویسے ہی ہوں گے۔ قومی سطح پر سنجیدہ روایات، اخلاقیات اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔

س لیکن ایسا نہیں ہے، بہت سے لوگ ادب میں نام کما رہے ہیں، کیا وہ عزت دار نہیں؟

ج دراصل میں کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو اجتماعی زوال کے حوالے سے گفتگو کر رہا ہوں۔ دیکھیں عزت اور شہرت میں باریک سا فرق ہے۔ اس کا ادراک ہو جائے تو یار لوگ گم نامی کو زیادہ ترجیح دیں لیکن یہ شعور بھی تو رب ذوالجلال کی دین ہے۔ جس شاعر کو ہوٹنگ اور داد کا فرق سمجھ نہیں آتا اسے شاعر کون کہے گا؟ شاعری باشعور لوگوں کا کام ہے۔ اگر فہم وادراک کی طرف سے ہاتھ تنگ ہو تو محض شہرت کے لئے تو کوئی بھی میدان اختیار کیا جا سکتا ہے۔ سو ادب وشعر میں اپنی انا اور عزت نفس کو داؤ پر لگائے، خواتین وحضرات کی کمی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لوگ اپنی خودداری اور عزت نفس پر توجہ دینے کی بجائے آسائش وآسودگی کے لئے ہانپ رہے ہیں۔

س آج کل نظم، آزاد نظم سے اگلے پڑاؤ...... نثری نظم تک جا پہنچی ہے؟ آپ اسے کیسے لیتے ہیں؟

ج نظم ایک بھرپور صنف سخن ہے۔ نثری نظم بھی کہنے والے موجود ہیں مگر میری رائے میں نثری نظم کہنے کا حق اسے حاصل ہونا چاہئے جو پابند نظم کہہ سکے یا غزل بھی کہہ سکتا ہو۔ صرف شاعری میں نثری نظم کا لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے مگر بہت

سے لوگ وزن میں ایک مصرعہ نہیں کہہ سکتے مگر وہ نثر میں اپنے آپ کو شاعر کہلوانے پر مصر ہیں۔

س شمار صاحب کیا انسان اپنی ذات سے بھرپور مکالمہ کر سکتا ہے؟

ج ذات سے مکالمہ بالکل ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے ایک ''حواس بیدار'' انسان کی ضرورت ہے۔ جو شخص اپنی آواز خود نہیں بن سکتا کہ اس کی زبان سے کیا ادا ہو رہا ہے، وہ بیدار مغز کیسے ہو سکتا ہے، خود سے مکالمے کے لئے اپنے آپ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے اپنے شب وروز، اپنے کردار اور افعال پر غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ باطنی تربیت کے لئے روزمرہ معمولات کے علاوہ خوراک پر بھی ''فوکس'' کرنا لازم ہے۔

س مشاعرہ کلچر کس مقام پر ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

ج مشاعرے شعر و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن مشاعرے کو صرف اور صرف تفریح کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے شاعر کو مصرعوں سے ''گدگدی'' کرنا پڑتی ہے جس سے ماحول میں ایک غیر سنجیدگی جنم لیتی ہے۔

مشاعرے کے فروغ میں ٹی وی چینلز خاص کردار ادا کر سکتے ہیں اور پرائم ٹائم میں ایسے مشاعروں کی کوریج سے لوگوں میں شعر و ادب کی دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سے کتاب کلچر کے فروغ میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

OOO

احمد عقیل روبی

شاعر فلمی کہانی کار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، نقاد اور سوانح نگار احمد عقیل روبی کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ اگر ہم یہ سوال پوچھیں کہ احمد عقیل روبی کو پہچان کسی خاص حوالے سے ملی تو اس کا جواب ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ احمد عقیل روبی نے ادب کی جس صنف میں بھی لکھا، پوری دیانتداری اور محنت سے اور اس معیار کا لکھا کہ فلمی گیت نگاری سے لے کر ناول نگاری اور تنقید تک ان کا ہر کام ان کی پہچان بن گیا۔ احمد عقیل روبی کے اب تک شاعری کے پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ناولوں میں چوتھی دنیا، جنگل کتھا، بنجر دریا اور کچھ اور نام ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار فلموں کی کہانیاں، گیت اور ٹی وی کے لئے ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خاص اعزاز بخشا ہے وہ ان کا قرآن پاک کے تیسویں پارے کا ترجمہ کرنے کا شرف ہے۔ احمد عقیل روبی اپنے کام کے معیار اور مقدار دونوں کے حوالے سے آج ادب میں ایک معتبر نام سمجھے جاتے ہیں۔

س شاعری کی ابتداء کب اور کیسے کی؟

ج شاعری کا آغاز 1952ء میں ایک نظم لکھنے اور گرفتار ہونے سے ہوا۔

1952ء میں اعظم خان کا مارشل لاء لگا تو میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سکول میں دعا ترنم سے پڑھتا تھا۔ خانیوال جامع مسجد کے امام نے میری آواز سن کر ختم نبوت کے جلوس میں کچھ پڑھنے کے لئے مجھے بلوایا میں نے ساری رات جاگ کر ایک نظم لکھی:

آ ہوش میں ذرا تو گولی چلانے والے
پیچھے نہیں ہٹیں گے جانیں لڑانے والے

جلسے میں نظم پڑھی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ مجھے بھی پکڑ لیا گیا ایک رات جیل میں رکھا۔ دوسرے دن سب کو ٹرک میں ڈال کر شہر سے 20 میل دور جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ پیدل چل کر روتے روتے شہر میں آیا۔ میری والدہ سخت پریشان تھیں۔

پریشانی میں میری پٹائی کی اور وعدہ لیا کہ آئندہ کسی جلوس میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے جلوس میں نہ جانے کا تو وعدہ کرلیا لیکن شاعری ترک نہ کرنے کی قسم نہ کھائی اور پھر شاعری کی طرف قدم مسلسل بڑھتے گئے۔

س شاعری میں آپ کن سے متاثر ہوئے؟

ج میں شاید ابھی تک کوئی اچھا مصرعہ یا سطر نہیں کہہ سکا لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اچھی سطریں اور اچھے شعر ضرور پڑھے ہیں۔ میں نے ہر زبان کے بڑے شاعر اور ادیب سے فیض حاصل کیا ہے۔ ہومر، ورجل، دانتے، ملٹن، شیکسپیئر، فردوسی، میر، غالب، حسرت موہانی، فراق، ناصر کاظمی اور مجید امجد سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔

س آپ کو ڈائریکٹر کی ڈیمانڈ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے جبکہ شاعری آمد کی کیفیت میں ہوتی ہے۔ کیا ایسی شاعری جو توارد کے زمرے میں آئے اسے شاعری کہنا درست ہے؟

ج جی ہاں میں نے فلم کے گانے لکھے ہیں۔ سید نور کی فلم چوڑیاں کے گیت بھی میں نے ہی لکھے، چونکہ میری سید نور کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی تھی اس لئے میں نے اس فلم کے گیت لکھے اور اس میں کامیاب بھی ہوا لیکن مجموعی طور پر فلموں میں ناکام ہوا ہوں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے مجھے تخلیقی ذہن دیا ہے اور وہ گروہ جو آج کل فلمیں بناتا ہے تخلیقی باتیں سمجھنے سے قاصر ہے۔ مجھے فلمی گیت لکھنے کا شوق اس زمانے میں ہوا تھا۔ جب آرزو لکھنوی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی اور گلزار جیسے نامور تخلیق کار فلموں کے گیت لکھتے تھے۔ یہ لوگ تخلیقی شاعری کرنے میں ایک اچھا مقام رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے فلمی مصرعے بھی ادبی طاقت واہمیت رکھتے ہیں۔

س کیا فلمی گیت لکھنا مشکل ہے؟

ج جو لوگ گیت کو سمجھتے ہیں ان کے لئے لکھنا مشکل ہے اور جو نہیں سمجھتے ان کے لئے آسان ہے۔

س آپ کے ہاں اردو میں دیگر زبانوں خاص طور پر ہندی کے کافی الفاظ ملتے ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج آپ باغ لگانے والے کو یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہی قسم کے پودے لگائیں۔ اگر زمین ذرخیز ہے تو آپ اس میں ہر قسم کا پودا لگا سکتے ہیں۔ زبان کا دامن اسی طرح ہی وسیع ہوتا ہے۔ جارج اسٹائل اپنی تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب میں جب بحث کرتا ہے تو کہتا ہے لفظ کچھ اجنبی، کچھ غیر ملکی، کچھ غیر زبان کے ہوتے ہیں۔ آپ وہ لفظ استعمال کرنے میں پرہیز نہ کریں لیکن ان کو

اس طرح استعمال کریں کہ وہ آپ کی زبان میں آ کر اجنبی محسوس نہ ہوں چنانچہ میں نے جو لفظ استعمال کئے ہیں لوگوں نے یہ تو کہا کہ آپ نے ہندی کے لفظ استعمال کئے ہیں لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ بہت برے طریقے سے استعمال کئے ہیں۔

س آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ آپ شاعر، ڈرامہ نگار، فلمی کہانی کار، نقاد اور سوانح نگار ہیں۔ آپ کو اپنا کون سا پہلو اچھا لگتا ہے؟

ج بدل بدل کر لباس پہننا انسانی فطرت ہے۔ گلیشیئر کی طرح آدمی کی مختلف سطحیں ہیں۔ شاید میں ان تمام راستوں پر چلنا چاہتا ہوں جو میرے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید کسی دن منزل تک پہنچ جاؤں۔

س کامیاب اور مشہور ادیب یا شاعر بننے کا گر کیا ہے؟

ج اچھا کھلاڑی وہ ہے جو کھیل کے تمام اصول وقواعد جان کر میدان میں اترے۔ چنانچہ شاعر کو شاعری شروع کرنے سے پہلے شاعری کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہئے۔ وہ شاعری جو بغیر کسی علمی پس منظر اور ریاضت کے کی جائے اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے۔ برا شعر کہنے والا شاعر جونک کی طرح ہوتا ہے جو قاری کا خون چوستی رہتی ہے۔

س کیا یہ کہہ کر آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کر رہے؟

ج نہیں، بلکہ میں نئے لوگوں کو شاعری کرنے کا گر سکھا رہا ہوں۔ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نہ کاغذ ضائع کریں اور نہ وقت۔ جب ورکشاپ کے چھوٹے دس بارہ سال کی ٹریننگ کے بعد مستری بنتے ہیں تو شاعری کے لئے ریاضت ممنوع کیوں ہے۔ یہ مفت میں ہی فیض کی برابری کرنا چاہتے ہیں۔

س ہمارے ہاں ناقدین عدل سے کام لیتے ہیں یا تعصب سے؟

ج ہمارے نقاد ان چیزوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ کہیں اتنا عدل برتتے ہیں کہ دس غزلوں کے شاعر کو فیض کے برابر لا کھڑا کرتے ہیں اور کہیں اس قدر تعصب سے کام لیتے ہیں کہ شاعر اگر اپنے گروپ کا نہ ہو تو اس میں انہیں کوئی خوبی سرے سے نظر ہی نہیں آتی۔ ہمارے ہاں تنقید اور تخلیق کی بربادی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

OOO

احمد فرازؔ

فرازؔ صاحب کا انٹرویو میں نہیں کر سکا، گرچہ ان سے قریبی تعلق اور قلبی لگاؤ تھا۔ ان سے کئی بار اپنے ادبی ماہنامہ ارژنگ کے لئے خصوصی گفتگو کی فرمائش کی اور ہر بار انہوں نے حامی بھری کہ ''بہت ضروری ہے، ضرور کریں گے'' وقت بھی طے پایا، موقع بھی تھا مگر ایسا ہو نہ سکا۔ ان سے بنیادی طور پر عقیدت مندی کا رشتہ تھا۔ اپنی شاعری کی صورت میں تو وہ ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے مگر پھر بھی ان کے داغ مفارقت کا دکھ بڑا ہے۔ اسی غم کا اظہار ان کی برسی پر شائع ہونے والے اس تعزیت نامے میں کیا گیا تھا۔ زیر نظر کتاب 100 تخلیق کار جب مکمل ہو گئی تو ایک انٹرویو کی گنجائش باقی تھی، یہ سوچ رہا تھا کہ کس سخن ور سے بات کی جائے ؟ دل میں خیال آیا کہ فرازؔ صاحب کے ذکر کے بغیر تو یہ کتاب نامکمل رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عہد کا کوئی بھی تذکرہ ان کے ذکرِ خیر کے بغیر ادھورا ہے، انٹرویوز کی کتاب میں شخصی خاکے کی اس بدعت کا بنیادی محرک بھی یہی خیال ہے۔ پاکستان اور اردو زبان کی ادبی تاریخ کے متعلق کوئی بھی دستاویز ہو فرازؔ صاحب کا ذکر میری نظر میں لازم ہے۔

یقین اب بھی نہیں آتا کہ عہد ساز شاعر احمد فرازؔ کو ہم سے بچھڑے آج کئی برس ہو گئے ہیں۔ پاکستانی معاشرے کی ایک خوبصورت روایت ہے کہ برسی کے دن مرنے والے کی شخصیت اور اس کی زندگی کے واقعات کا محبت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ احمد فرازؔ سے دوستی کا دعویٰ تو مجھے ہرگز نہیں مگر ان سے نیاز مندی ضرور رہی، ان کی میزبانی کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ ان کی شاعری تو شعروادب سے شغف رکھنے والے حضرات پڑھتے ہی رہتے ہیں، آج ان کی شخصیت کے بارے میں گپ شپ کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں ان سے متعلق کئی واقعات گردش کر رہے ہیں، رسم دنیا، موقع اور فقط دستور زمانہ نبھانے کے لیے نہیں بلکہ اسلیے قلم بند کر رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ باتیں دلچسپی کا سبب ہوں گی۔ فراز صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تو یہ تھا کہ وہ اپنی شاعری میں جس محبت اور وفا کا پرچار کرتے تھے، وہ خود بھی اس کا عملی نمونہ تھے۔

میرے نزدیک یہ بات یوں اہم ہے کہ محبت اور وفا کی باتیں تو سبھی شاعر کرتے ہیں مگر ذاتی زندگی میں بعض اوقات ان کے ہاں یہ اجناس ناپید ہوتی ہیں۔فراز صاحب سراپا محبت شخص تھے۔

سید احمد شاہ علی کے نام سے 1931ء میں پیدا ہونے والے اس خوش نوا شاعر نے 77 سال کی عمر پائی ،لیکن تا مرگ جوان رہا۔میں اکثر حیران ہوتا تھا کہ کوہاٹ میں پیدا ہونے والا لمبا، تڑنگا،سرخ وسفید یہ پٹھان کیسے ایسی مرصع اردو بولتا ہے کہ اہل زبان عش عش کر اُٹھتے ہیں۔صرف اردو کا تو ذکر ہی کیا،میرے گھر تشریف لائے تو نیا انکشاف ہوا،رات کو فراز صاحب دیر سے سوئے تھے،میاں چنوں میں ہم نے عالمی مشاعرے کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں پاکستان کے تمام بڑے شعراء تشریف لائے تھے،رات کو تین بجے مشاعرہ ختم ہوااور مہمان شعراء میرے گھر آئے، وہاں بھی دیر تک محفل چلتی رہی۔صبح ہوئی تو مجھے عطاء الحق قاسمی صاحب نے احمد فراز کو جگانے کے لئے کہا جو میرے بھائی کے کمرے میں محوخواب تھے۔فراز صاحب کی بذلہ سنجی تو ادبی حلقوں میں مشہور ہے مگر وہ جلالی بھی بہت تھے،ان کی طبیعت کے جلال کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے قاسمی صاحب سے گزارش کی کہ آپ ذرا میرے ساتھ آئیں اور خود ہی انہیں نیند سے جگائیں۔احمد فراز سے قاسمی صاحب کی بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی،قاسمی صاحب نے بیڈروم کا دروازہ بڑے دھما کہ خیز انداز میں کھولا اور با آواز بلند علامہ اقبال کا یہ مصرع پڑھا۔

''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو''

فراز صاحب نے نیم خوابی کے عالم میں کروٹ بدلی اور کمبل اوڑھتے ہوئے ٹھیٹ پنجابی میں کہا''تے فیر غریباں نوں جگاؤ جا کے،سانوں کیوں چھیڑ دے او۔۔۔!!''(تو پھر غریبوں کو جگاؤ نا،کیوں ہمیں تنگ کر رہے ہو)ان کی گوجرانوالہ،سیالکوٹ لہجے کی رواں، دواں پنجابی نے مجھے ایک حیرت میں ڈال دیا۔

فراز صاحب مشاعرہ باز شاعر نہیں تھے مگر جب کبھی کوئی دوست بلا لیتا تو انکار بھی نہیں کرتے تھے۔ہمارے ہاں تشریف لائے تو مجھ سے کہنے لگے کہ میں مشاعرے پڑھنے کے لئے کبھی نہیں گیا،بس دوستوں سے ملاقات کے لیے چلا جاتا ہوں۔لاہور سے عطاء الحق قاسمی کے ساتھ ایک ہی گاڑی میں آئے تھے،قاسمی صاحب نے گھر پہنچتے ہی اپنے بیگ سے کچھ کپڑے نکال کر مجھے دیے اور کہا کہ وہ مشاعرہ میں انہیں پہننا چاہتے ہیں اس لیے ذرا استری کروالاؤ، پھر میں لباس تبدیل کرتا ہوں۔فراز صاحب نے سیاہ رنگ کے شیونگ بکس میں سے بنت انگور کی بوتل نکالی

اور مجھ سے کہا کہ باورچی خانہ سے ایک گلاس اور تھوڑی سی برف لاؤ، اس کے بعد قاسمی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ''آپ اپنا بیرون بدلیں، ہم اپنا اندرون بدلتے ہیں''

امریکہ میں میرے دوست عامل راجپوت سے روایت ہے کہ اس کی خصوصی دعوت پر فراز صاحب سینٹ لوئیس تشریف لائے، ائیر پورٹ سے گھر کی جانب جاتے ہوئے فراز صاحب نے کہا کہ پیاس لگی ہے!! میرے دوست نے کہا کہ کسی بھی فونٹین سے پیاس بجھالیں، امریکہ میں پا نی پینے کے لیے جگہ جگہ فوارے لگے ہیں۔ پچاس سال پہلے تک کالے اور سفید فام لوگوں کے لیے الگ الگ فوارے تھے، فراز صاحب نے میرے دوست کی بات سن کر کہا کہ ''یہ تو سنا تھا کہ امریکہ میں شراب بہت عام ہے، لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ یہاں فوارے لگے ہوئے ہیں''۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر شاعری تو کی جاسکتی ہے مگر نثر میں بات چیت کا رواج نہیں ہے، ہمارے ہاں بادہ نوش عموماً بہک جاتے ہیں اور عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگتے ہیں، عوامی زبان میں بات کریں تو پی کر ''بندر'' بن جاتے ہیں۔ احمد فراز لیکن قرینے والے آدمی تھے، محفل کے آغاز میں اگر انہوں نے آپ کو ''صاحب'' کہہ کر مخاطب کر لیا تو پھر صہبا کی مقدار جو بھی رہی، آخر دم تک ''صاحب'' کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتے تھے۔

پاکستان میں جمہوریت کے قیام اور اس کے فروغ کے لیے انہوں نے بڑی جدوجہد کی، شدید صعوبتیں اٹھائیں، ضیاء الحق کی آمریت کا کچھ عرصہ انہوں نے جیل میں گزارا اور زیادہ تر عر صہ جلاوطنی میں گزارا۔ جلاوطنی کے چھ سال میں سے وہ زیادہ تر برطانیہ اور کینیڈا میں مقیم رہے۔ میرے بڑے بھائی رانا بابر حسین جو کہ آجکل پارلیمانی سیکرٹری برائے خزانہ پنجاب ہیں طویل عر صہ انگلستان میں مقیم رہے، وہ بتاتے ہیں کہ جلاوطنی کا وقت برطانیہ میں فراز صاحب نے بڑی کسمپر سی کے عالم میں گزارا تھا۔ یہ غالباً ان کی زندگی کا سب سے سخت وقت بھی تھا، ذاتی طور پر احمد فراز نے ورنہ آسودہ زندگی بسر کی تھی، مگر وہ ایک سچے ترقی پسند شاعر تھے، صرف نعرے بازی کی حد تک نہیں تھے، اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی ہم نے انہیں جنرل پرویز مشرف کی آمرانہ حکو مت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے، اسلام آباد کی سڑکوں پر دیکھا۔ فراز صاحب کے تینوں بچو ں کے نام بھی بڑی حد تک ان کے نظریات کے آئینہ دار ہیں جو کہ سعدی، شبلی اور سرمد ہیں۔ فراز صاحب کی شخصیت بڑی بارعب تھی، پاٹ دار آواز میں بڑا طنطنہ تھا مگر غرور وتکبر ان کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ ورنہ جتنی شہرت اور عزت ومحبت انہیں نصیب ہوئی ایسی شہرت وعزت کسی کم ظرف کو مل

جائے تو متکبر ہو جاتا ہے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ فراز صاحب کی شاعری زیادہ خوبصورت ہے یا پھر ان کی شخصیت۔ اپنے دوستوں اور ارد گرد کے لوگوں کا وہ خاص خیال رکھتے تھے، نئے لکھنے والوں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے، ذاتی کام کے لیے کسی سے درخواست کرنا ان کی غیرت کے منافی تھا، مگر انجان لوگوں کی سفارش کر دیا کرتے، جن سے کوئی صلے کی بھی امید نہ ہو تی تھی۔

معاصرانہ چشمک اور حسد کے سبب بعض ادیب احمد فراز کے متعلق کچھ منفی باتیں بھی منسوب کرتے رہتے ہیں، مگر ان سے محبت کرنے والوں نے کبھی انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا، ایسے ہی ایک نقاد دوست جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، اور میں نہیں چاہتا کہ ان کی شہرت پانے کی آرزو پوری ہو اس لیے نام تحریر نہیں کروں گا، مجھے بتانے لگے کہ میں احمد فراز کو بہت پرانا جانتا ہوں، اس آدمی نے زندگی کے رس کی ایک ایک بوند کو نچوڑ کر لطف کشید کر کے پیا ہے۔ زندگی کے لطف و کرم سے مستفید ہونے والا شخص میرے نزدیک خوش قسمت ہے اور یہ کوئی زیادہ بڑا جرم نہیں ہے۔ احمد فراز وہ شخص ہے جس نے کسی لابی کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالصتاً اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر اردو ادب میں اعلیٰ وارفع مقام پایا۔ یوں تو ہلال امتیاز، ستارہ امتیاز، نگار ایوارڈ سمیت بے شمار قومی اور عالمی اعزازات اس عظیم شاعر کے حصے میں آئے مگر اس کا اصل تمغہ اس دھرتی کے لوگوں کی اس سے والہانہ محبت ہے، جو کم کم ہی کسی اور شاعر کے حصے میں آئی ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تمہیں
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

OOO

اسلم کولسری

موجودہ دور میں مشاعرہ ڈرامہ بنتا جا رہا ہے، جدت اور ندرت اچھی بات ہے لیکن تجربات مسلمہ حدود میں رہتے ہوئے کرنے ہوں گے۔ یہ بات نامور شاعر اور کالم نگار اسلم کولسری نے ارژنگ کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہی مزید گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں صاحب کتاب کا تعارف اور کتاب کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں

س شاعری کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟

ج میٹرک کے بعد جب گاؤں سے اوکاڑہ آیا تو جہاں میں رہتا تھا وہاں قریب ہی کالج کے چند طالب علم بھی رہتے تھے۔ انہی میں سید ناصر بھی تھے۔ میں ان دنوں پرائیویٹ کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔ سید ناصر سے میری دوستی کالج مشاعروں میں حصہ لینے تک تھی۔ وہ غزل کہتے تھے میں ان کی غزل میں کبھی کبھی رائے دیا کرتا تھا۔ انہی دنوں ستلج کاٹن ملز میں مشاعرہ ہوا۔ صدارت ڈپٹی کمشنر ساہیوال نے کی۔ مہمان خصوصی ناصر شہزاد تھے۔ سید ناصر جمعے کو میرے پاس آئے کہ مشاعرے میں شرکت کرنی ہے۔ اور میرا نام بطور شاعر دے دیا ہے۔ میں نے پریشان ہو کر کہا کہ میں نے کبھی شعر کہا نہیں۔ سید ناصر نے بہت اصرار کیا تو میں نے غزل کہنے کی کوشش کی اس طرح میں نے اپنا پہلا باقاعدہ شعر یہ کہا۔

سوئے مقتل چل رہے ہیں پھر بھی محو رقص ہیں
ساز سے کچھ کم نہیں زنجیر کی چھنکار بھی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

ہم بھی تنکے چن رہے ہیں آشیانے کے لئے
گو نظر آتے ہیں طوفان کے آثار بھی

پہلی بار جب سٹیج پر گیا تو ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن سامعین کی حوصلہ افزائی پر دوسرے

شعر کے بعد سنبھل گیا پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔اوکاڑہ میں پندرہ روزہ ادبی نشست ہوتی تھی وہاں راؤ جمشید علی خاں لے گئے۔وہاں ایچ غلام صادق اور محمد اقبال۔راؤ تحسین،سیف اللہ صاحب،اور کچھ اور دوست کافی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔اسی طرح وہاں پروفیسر ممتاز محی الدین صاحب بھی تھے۔ان کے ہاں محفل ہوتی تھی۔جس میں اسلم نجمی،انور چوہدری ،یونس خان اور دوسرے دوست شریک ہوتے تھے۔وہاں یہ شاعری پروان چڑھتی رہی۔اس کے بعد ٹیچنگ چھوڑ کر عرفان فارمیسی میں آ گیا۔جہاں ایڈوکیٹ حفیظ جاوید مرحوم،ڈاکٹر ضیاء الحق ،ڈاکٹر سید خالد جو آج کل ارجنٹائن میں پاکستان کے سفیر ہیں۔منور جاوید اور صوفی عبدالباری صاحب جو خود بھی شاعر تھے وہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔میں نے اپنی پہلی غزل اوراق کو بھیجی۔ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے واپس کر دی کہ یہ انداز بہت پرانا ہے۔تب تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔لیکن بعد میں غور کرتا رہا ذہن اس طرف آمادہ ہو گیا۔اس کے بعد شاعری کا رنگ بدلا اور غزل سامنے آئی جس کے دو شعر دوستوں نے پسند کئے۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
میں نے اپنے سارے آنسو بخش دیئے
بچے نے تو ایک ہی پیسہ مانگا تھا

اس کے بعد اقبال صلاح الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے بڑی شفقت اور مہربانی کا ثبوت دیا۔اور مجھے مجموعہ کلام ترتیب دینے پر آمادہ کیا۔مجموعے کی ترتیب وتزئین میں پروفیسر ابو اعجاز اور حفیظ صدیق نے بہت معاونت کی۔اس طرح اقبال صلاح الدین صاحب کے توسط سے میرا پہلا مجموعہ نخلِ جاں" کے نام سے سامنے آیا۔1981 میں لاہور آ گیا یہاں مکتبہ تعمیر انسانیت کے سعید اللہ صدیق صاحب سے سعد اللہ شاہ صاحب نے متعارف کرایا۔ سعید صاحب بہت مہربان ثابت ہوئے۔میرے باقی مجموعے انہوں نے ہی شائع کئے ہیں۔

س اب تک آپ کے کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج اب میرے سات شعری مجموعے آ چکے ہیں۔ان میں چھ اردو اور ایک پنجابی میں ہے۔جن کے نام بالترتیب یوں ہیں نخل جاں،کاش،ویرانہ،پنچھی (پنجابی)،نیند،جیون، اور برسات اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد اکرم چغتائی کے توسط سے آسٹریا کی جدید شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔جو"ایک

نظر کافی ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔نثر کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لیکن روزنامہ مشرق میں ''روشنیوں سے دور'' کے عنوان سے کالم لکھ رہا ہوں۔

س کبھی ٹی وی ڈرامے فلمی کہانیاں یا گیت وغیرہ لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

ج سوچتا تو ہوں لیکن یہ فلم اور ٹی وی کا راستہ مجھے بہت دشوار نظر آتا ہے۔وہاں تک پہنچنے کا جو ایک خاص انداز ہے وہ مجھے نہیں آتا۔کبھی اتفاق ہوا تو ضرور کوشش کروں گا۔جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے تو ریڈیو، ٹیلی ویژن کے لیے میں نے گیت لکھے ہیں لیکن فلم سے رابطے کا اتفاق نہیں ہوا۔موقع ملا تو ضرور لکھوں گا۔بلکہ میری خواہش ہے کہ کوئی اچھی ٹیم ملے تو میں فلم کے گیت اور کہانی لکھوں۔

س اب تک آپ کو کسی کہانی پر ایوارڈ ملا۔اور اگر نہیں تو اس کی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

ج ابھی تک مجھے کسی کتاب پر ایوارڈ نہیں ملا۔شاید اس لیے کے ان میں سے کوئی کتاب ایوارڈ کے قابل نہیں ہوئی۔

س ہمارے ناقدین ادب اور انصاف سے کام لیتے ہیں؟

ج میرے خیال میں تو انصاف سے یہ کام لیتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہماری فطرت میں وضع داری بھی ہے۔اس لیے لحاظ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

س دیباچہ اور فلیپ نگاری کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

ج دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اس میں صرف کتاب کی خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔اس کے بارے میں مثبت رائے ہی بھلی لگتی ہے۔یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کتاب کا دیباچہ نگار یہ لکھے کہ کتاب پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔

س موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار رہ گیا ہے؟

ج مشاعرے ہونے چاہئیں۔تاکہ سامعین اور ناظرین کو تھیٹر ڈرامے اور کھیل کے علاوہ بھی کچھ تو میسر ہو۔حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ دوسری تینوں چیزیں تھیٹر ڈرامہ اور کھیل اس قدر غالب ہو گئے ہیں کہ مشاعروں میں سامعین تھیٹریکل موڈ لیکر آتے ہیں اور زیادہ تر ہوٹنگ انجوائے کرتے ہیں۔لیکن یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے، اور بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔بیرون ملک مشاعروں کی فضاء نسبتاً بہتر ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے پردیسیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔وطن سے آنے والوں کو سننے کا موقع ملتا ہے۔یہ ایک خالص دیسی تقریب ہوتی ہے۔جسے وہ پردیس میں خوب انجوائے کرتے ہیں باقی رہا یہ سوال کہ مشاعروں میں جو سیکھنے اور سکھانے کی کی

روایت تھی باقی ہے یا نہیں تو میں کہوں گا کہ مشاعرے کی روح اب سامعین کے دل و دماغ میں نہیں ہوتی نہ ان کا مقصد کوئی سیکھنے کا ہوتا ہے۔ وہ صرف ہوٹنگ کرنے آتے ہیں۔

س کسی شاعر کی کامیابی کا معیار مشاعروں میں اس کی مقبولیت کو قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج مشاعروں میں وہ لوگ بھی جاتے ہیں جو کسی اور حوالے سے مقبول ہوتے ہیں، یہاں میں ایک واقعہ بیان کروں گا قطر کے ایک مشاعرے میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو بہت داد ملی۔ مشا عرے کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگے کہ بعض لوگوں، کا خیال ہے کہ ہمیں ادبی ایڈیشنوں کی وجہ سے مشاعروں میں بلایا جاتا ہے۔ ایسا نہیں، آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے مجھے کتنی محبت سے سنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ مختلف حوالوں سے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کسی کو میرے کالم نگاری پسند ہے کسی کو میرے ڈرامے اچھے لگتے ہیں۔ اسی طر ح وہ میری شاعری کو بھی پسند کرتے ہیں۔

س جدت پسندی کے نام پر ہمارے ہاں ادب میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے مطمئن ہیں؟

ج جدت اور ندرت اچھی بات ہے۔ لیکن ہمیں سارے تجربات مسلمہ حدود کے اندر رہتے ہو ئے ہی کرنے ہو گئے۔ تبھی وہ مقبول ہوں گے۔ جدت کے نام پر غزل میں ردیف کو پہلے، قافیہ کو درمیان میں رکھ دینا اس سے بات نہیں بنے گی۔

س ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب میں سے کس پر یقین رکھتے ہیں؟

ج دونوں ضروری ہیں ادب برائے اصلاح بھی اور ادب برائے ادب بھی۔ مگر ان میں تنا سب ہونا ضروری ہے۔ ادب برائے ادب بھی ادب برائے زندگی ہے۔

س ہم عصر شعراء میں کون کون پسند ہیں؟

ج سبھی پسند ہیں اور سبھی بہت اچھا شعر کہتے ہیں۔ بزرگ بھی حق ادا کر رہے ہیں۔ اور نوجوان بھی حیران کر رہے ہیں۔ ان میں میں شامل نہیں ہوں۔

س نامور ادیب ظفر اقبال کا تعلق بھی آپ کے شہر اوکاڑہ سے ہے۔ آپ ان کو بطور شاعر معتبر سمجھتے ہیں۔ یا بطور کالم نگار؟

ج میں تو ظفر اقبال کو بطور شاعر زیادہ معتبر سمجھتا ہوں لیکن ان کی کالم نگاری بھی اچھی ہے۔ جس طرح انہوں نے شاعری میں نئی سمتیں روشن کی ہیں۔ وہی کوشش وہ کالم، نگاری میں بھی کرتے ہیں۔ لیکن اہمیت ان کی شاعری کو ہی حاصل ہے۔

س کس صنف ادب میں لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتے ہیں؟

ج یوں تو سب کچھ لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتا ہوں۔ تاہم میں نے تیر کسی فن میں بھی نہیں مارا۔ اپنی سی جو کوشش کرتا ہوں وہ اگرچہ ناکام ہوتی ہے۔ لیکن میرے لیے وہ دشوار نہیں ہوتی۔ اور یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطاء ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ ناکامی البتہ اپنی محنت سے حاصل کرتا ہوں۔

س شعر کیوں کہتے ہیں؟

ج قدرت نے یہ صلاحیت عطاء کی بعد میں ایسا ماحول ملا۔ کہ میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوتا گیا یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

س اگر یہ خداداد صلاحیت ہے تو پھر سینئر، جونیئر کا جھگڑا کیسا؟

ج دیکھیں صلاحیت بھی تو کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔ اور پھر اس میں انسان کی محنت اور ریاضت اس درجہ بندی کا باعث بنتی ہے۔

س شاعری میں ''محنت اور ریاضت'' سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اس کی وضاحت کریں گے؟

ج میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں۔ بعض اوقات شعر کہنے کا موڈ ہوتا ہے۔ اسی دوران میں کوئی کام یا مجبوری سامنے آجاتی ہے میں شاعری کے موڈ کا بیڑہ غرق کرکے اس کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں یہ میری غفلت ہے یا بے نیازی ہے۔ اگر ایسی کیفیت میں میں کام کو خواہ کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو نظر انداز کرکے اپنی اس کیفیت سے استفادہ کروں اور شاعری یا ذہن میں آئی ہوئی غزل کو مکمل کروں تو اسے محنت کہیں گے۔ میں ایک مدت سے ایسی کیفیت کو ہوا میں اڑا رہا ہوں سو محنت نہیں کررہا ہوں۔ جہاں تک ''ریاضت'' کا تعلق ہے اس میں مطالعہ شامل ہے۔ علم عروض پر مکمل دسترس حاصل کرنے کی کوشش شامل ہے اور میرے مرحوم دوست حسن رضا خان کا مشورہ شامل ہے کہ روزانہ شاعری کرو بیشک وہ غزلیں پھاڑتے چلے جاؤ۔ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی آپ ایسی غزل کہنے میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔ جس سے آپ مطمئن ہوں گے۔

س اور ان شعراء کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو روزانہ اس ریاضت سے تو گزرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ اب تک لاتعداد مجموعوں کے مصنف ہیں۔ مگر ان کی شاعری سے نہ تو قاری مطمئن ہے اور غالباً نہ وہ خود ہی مطمئن ہیں؟

ج اگر وہ خود مطمئن نہ ہوتے تو کبھی بھی مجموعے شائع نہ کرتے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ان کے جتنے

مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ان سے کہیں زیادہ انہوں نے انتخاب کرتے وقت ضائع کردئے ہوں۔

س: غالباً آپ طنز کررہے ہیں؟

ج: (مسکراتے ہوئے) ہرگز نہیں۔

س: اب تک آپ کے جتنے بھی انٹرویوز چھپے ہیں ان میں آپ نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے۔کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو،ایسا آپ مزاجاً کرتے ہیں یا احتیاطً؟

ج: زیادہ مزاجاً کم کم احتیاطً

س: اس احتیاطً کو ہم ''بزدلی'' بھی کہہ سکتے ہیں؟

ج: ضرور۔

س: بیشک آخرت میں اس کا حساب دینا پڑے گا؟

ج: اللہ معاف کرنے والا ہے۔

س: گویا آپ ایسے شعراء کے حوالے سے ڈنڈی مارنے کا اعتراف کررہے ہیں؟

ج: اب مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی پڑے گی۔دیکھیں ایک تو میری طبیعت میں لڑائی جھگڑا نہیں دوسرا مجھے اس کا تجربہ بھی نہیں اور تیسری بات اگر آپ غور کریں جس شخص نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے اس نے کبھی نہ کبھی آپ کو سکھ بھی پہنچایا ہوگا۔میں ارادتاً ان خوشگوار لمحوں کو اپنے ذہن میں ہمیشہ زندہ رکھتا ہوں۔اس طرح دکھ کی اذیت کم ہو جاتی ہے۔اور میں اس سطح پر نہیں آتا کہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاؤں۔اس کیفیت کو میں نے ایک شعر میں بھی بیان کیا ہے۔

بہم صورت ستم سہنا کسے مرغوب ہے لیکن
کوئی احسان کر دیتے وہ بیداد سے پہلے

س: کیا شاعری میں بسیار گوئی شاعری کے معیار پر اثر انداز نہیں ہوتی؟

ج: نہیں میرے بھائی اچھا شاعر جتنا بھی زیادہ لکھے اچھا لکھے گا جیسے مولانا روم اور علامہ اقبال، اور کئی دوسرے شعراء کرام اور کم تر صلاحیت رکھنے والا شاعر ساری زندگی میں تین بھی شعر کہے تو تینوں بیکار ہوں گے۔

س: یہاں ''کئی دوسرے شعراء'' سے آپ کا اشارہ کن کی طرف ہے؟

ج: میں نے مولانا روم اور علامہ اقبال کا ذکر کرکے ان شعراء کی جانب اشارہ کردیا ہے جو اس سطح کے ہیں۔

س: کبھی نثر لکھنے کا خیال آیا؟

ج میں نے لکھنے کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔اور ایک انتہائی دردناک افسانہ لکھا۔ دردناک پر واوین لگا لیجئے۔اس وقت میرے واحد سامع اور میرے دوست سعید ناصر تھے۔ان کو سنایا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔یادر ہے کہ انتہائی دردناک افسانہ تھا۔چنانچہ میں نے افسانے کے اس دردناک انجام پر کانوں کو ہاتھ لگالیا۔شاعری کے سلسلے میں ایسا نہ ہو سکا بلکہ شاعری پر مجھے انہوں نے ہی اکسایا تھا۔اور پہلی غزل پر خوب داد دی تھی۔لیکن سنجیدگی کے ساتھ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا روزنامہ مشرق میں رہتے ہوئے کالم نگاری کی کوشش کی ،کچھ لکھے وہ ''اینویں'' سے تھے۔آج کل تو شاعری بھی بہت کم کم ہو رہی ہے۔

س اب تک آپ کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج اب تک میرے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان میں سے ایک پنجابی شعری مجموعہ ہے اور باقی سات اردو مجموعے ہیں۔

س آٹھ مجموعوں کی اشاعت کو باوجود آج تک آپ کے کسی مجموعے کی تقریب رونمائی نہیں کی خبر سننے میں نہیں آئی۔حالانکہ آپ کے دوستوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے؟

ج میں جب اوکاڑہ میں تھا تب میری پہلی کتاب ''نخل جاں'' شائع ہوئی تھی۔اس کی تقریب لاہور میں ہوئی تھی۔اور اس کا اہتمام نعیم اظہر مرحوم،انوار قمر اور یوسف مثالی نے کیا تھا۔پھر میں لاہور آ گیا باقی کتابوں کی تقریب رونمائی نہیں ہوئی۔کیونکہ مجھے اس کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ ہاں البتہ پچھلے دنوں خبریں اور ادبی تنظیم ''روش'' کو زیر اہتمام میرے ساتھ ایک تقریب ہوئی جس کا اہتمام ممتاز نوجوان شاعر ثناءاللہ شاہ نے کیا بلکہ انہوں نے مجھے اس تقریب کے لئے مجبور کیا اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی پرخلوص کوششیں کی اور آپ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔مجھے حیرت ہوئی کہ روزنامہ ''خبریں'' کے طاہر انجم اور عفت علوی نے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں انتہائی جدوجہد کی۔

س اس تقریب میں ملک کے ممتاز نقاد خواجہ ذکریا نے آپ کو عصر حاضر کے دس بہترین شعراء میں شمار کیا۔آپ کے خیال میں باقی نو کون سے ہیں؟

ج اصل میں جب کسی کے ساتھ تقریب منعقد کی جاتی ہے تو اس کی کارکردگی کی تعریف کی جاتی ہے۔خامیوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔خواجہ صاحب نے بھی میری حوصلہ افزائی کی جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

س کیا ایسا ممکن ہے کہ خواجہ صاحب جیسا سنجیدہ نقاد برسرعام اتنی بڑی رائے محض کسی کی عزت

افزائی کے لئے دیدیں؟

ج پھر میں عرض کروں گا کہ ایسی تقریب کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اس بات کو ان کی حتمی رائے نہیں سمجھنا چاہئے۔

س آپ اتنے مردم بیزار کیوں ہیں؟

ج ایسی بات نہیں میں فطری طور پر کم آمیز ضرور ہوں۔ خلوت کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔

س آپ لاہور جیسے شہر میں ایک عرصہ سے رہ رہے ہیں۔لیکن مزاجاً ابھی تک آپ اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکل سکے۔ کیوں؟

ج واقعی مجھے گاؤں بہت یاد آتا ہے۔ خاص طور پر اسلئے کہ اب اس کا وجود باقی نہیں رہا۔ مجھے وہ آنگن بہت یاد آتا ہے۔ جس میں میرے ماں باپ کے قدموں کے نشان ہوا کرتے تھے۔ وہ درخت بھی یاد آتے ہیں۔ جن کے نیچے کھیلتے ہوئے میرا بچپن گزرا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اور ہمجولی بہت یاد آتے ہیں۔ میں انہیں بھلا نہیں سکتا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں۔

س آپ کا ایک شعری مجموعہ ''کاش'' کے نام سے چھپا ہے۔ کسی حد تک آپ کی ساری شاعری اس ایک لفظ کے گرد گھومتی ہے اس ''کاش'' کی وضاحت کریں گے؟

ج کاش اپنی وضاحت خود ہے۔ اور اس کی تفصیل میری شاعری میں بھی موجود ہے۔

س میں نے تفصیل کی نہیں محرک کی بات کی ہے؟

ج اصل میں، میں زندگی کو جس طرح بسر کرنا چاہتا تھا۔ ویسے نہیں کر پایا حالات بھی موافق نہیں تھے اور انتھک جدوجہد بھی نہ کر سکا یوں کہیے:

''سدا آنکھیں رہیں برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے پر
اچانک راستے پر کوئی دریا بھی نہیں آیا''

س دوحہ/قطر میں منعقد ہونے والی تقریبات کے روح رواں ملک مصیب آپ کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ ان تقریبات کے سلسلے میں آپ ان سے کس حد تک تعاون کرتے ہیں؟

ج مجلس فروغ اردو ادب کے بانی ملک مصیب الرحمن صاحب اور ان کے رفقاء بلاشبہ فروغ ادب کے سلسلے میں بے مثال خدمات انجام دے رہے ہیں اس سلسلے میں اگر وہ کوئی چھوٹی موٹی خدمت میرے ذمے لگاتے ہیں تو اسے میں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا زیادہ تر تعلق مجلّے کی ترتیب و تدوین سے ہوتا ہے۔

OOO

انور شعور

س سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر کے بارے میں آگاہی دیجئے؟

ج آبائی تعلق فرخ آباد کے یوسف زئی خاندان سے ہے۔ولادت 11اپریل 1943 کو غالباً سیونی میں ہوئی، یہ بھارتی صوبے مدھیا پردیش کا ایک شہر ہے۔1947ء میں ہم لوگ پاکستان بنتے ہی ممبئی سے کراچی آ گئے۔کراچی اور میں ساتھ ساتھ بڑے ہوئے۔یعنی بچپن کے دوست ہیں۔شروع میں کچھ عرصہ بوہرہ پور کے علاقے میں قیام کیا۔پھر ناظم آباد کی بنیاد پڑی تو ہم وہاں منتقل ہو گئے۔کھیل کود کا زمانہ ناظم آباد میں ہی گزرا۔گھر کا ماحول مذہبی تھا۔والد کے ساتھ نماز کے لئے مسجد میں جانا ہوتا تھا۔وہاں نعت خوانی کی محفلیں ہوتی تھی۔ان میں شرکت کے باعث مجھے بھی نعت خوانی کا شوق ہو گیا۔اس شوق میں اردو اور فارسی کی بے شمار نعتیں یاد کرنے کا موقعہ ملا۔اس لئے طبیعت خود بخود یعنی خواہ مخواہ موزوں ہوگئی اور میں تک بندی کرنے لگا۔بچوں کے تقریباً تمام رسالے نظر سے گزرتے تھے۔حمد و نعت کے علاوہ بچوں کی نظمیں بھی مجھ سے سرزد ہونے لگیں اور یہ کلام بچوں کے پرچوں میں تواتر سے چھپنے بھی لگا۔ان دنوں میرا شعرانہ نام انور افسری تھا۔ویسے اعلیٰ نام انور حسین ہے۔افسر میرے استاد کا نام تھا۔ان کی نسبت سے میں خود کو افسری لکھتا تھا۔بعد میں یہ نام بدلنا پڑا۔دوست مزاق اڑاتے تھے کہ یہ افسری تو نسوانی نام ہوتا ہے۔بات صحیح تھی اس لئے میں افسری کی بجائے افسر بن گیا۔پھر شعور تخلص رکھا تو انور افسر شعور بن گیا۔اس کے علاوہ کچھ دنوں شعور انور کے نام سے بھی لکھا۔میں نے تین استادوں سے شاعری پر اصلاح لی۔مولانا اختر صابری، حضرت تابش دہلوی اور حضرت سراج الدین ظفران کے علاوہ بے شمار لوگوں سے فیض اٹھایا اور سب سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ادبی دنیا کے لاتعداد مشاہر نا صرف دیکھے بلکہ اکثر سے نیازمندی بھی رہی۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج عملی زندگی تو خیر کیا ہاں بے عملی کا آغاز ہوش سنبھالتے ہی ہو گیا تھا

کوئی پوچھے کہ کیا کرتے ہو دن بھر
تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں ہنس کر

لکھنے لکھانے کا شوق کاربیکاراں سمجھا جاتا تھا اور جاتا ہے۔ ادیب وشاعر سے تعارف کے وقت عموماً یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ اور کیا کیا کرتے ہیں؟ یہ سوال ڈاکٹر، وکیل یا پروفیسر سے نہیں کیا جاتا۔ بہر حال اسی کاربیکاراں سے میری گزراوقات ہوتی تھی۔ چھوٹے موٹے ناشرین کے لئے چالو قسم کی کہانیاں گھسیٹنے کے علاوہ اخبارات اور ریڈیو وغیرہ کے لئے بھی کچھ لکھ لکھا لیتا تھا۔ کم عمری میں کسب معاش کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ میں بے وجہ بچپن میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

نہ پوچھ کیسے گزرتی ہے زندگی اے دوست
بڑی طویل کہانی ہے، پھر کبھی اے دوست

(صادق القادری)

ایک شعر سنیے یہ دربدری کے اسی زمانے میں کہا تھا:

بازاروں میں پھرتے پھرتے دن بھی بیت گئے
کاش ہمارا بھی گھر ہوتا، گھر جاتے ہم بھی

چار اداروں، انجمن ترقیات اردو، ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' ماہنامہ ''سب رنگ'' ڈائجسٹ اور روزنامہ ''جنگ'' سے باقاعدہ معاشی وابستگی رہی۔ ''جنگ'' میں قطعہ نویسی آج بھی جاری ہے۔

س پہلا شعر کب کہا؟ کچھ یاد ہے؟ ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج پہلا شعر تو یاد نہیں رہا ''شاعری'' گیارہ بارہ سال کی عمر سے شروع ہوگئی تھی۔ لڑکپن کے اشعار ذہن میں رہ گئے ہیں۔

کوئی راہ اپنے لئے ڈھونڈ لوں گا
ہر اک راہ پر گام وگام چک کے

....

خلد میں کیوں مے پلائی جائے گی
کیا وہاں بھی گردشِ ایام ہے

....

نام ہی سن کر مجھے ان سے محبت ہوگئی
رفتہ رفتہ فسانہ بن گئی اک چھوٹی سی بات

....

دیکھے گا کون اب میرا چہرہ جلا ہوا
میں اک دیا ضرور ہوں لیکن بجھا ہوا
کسی نے کہا کہ نالۂ دل میں اثر نہیں
جس جس نے سن لیا وہ میرا ہمنوا ہوا

....

اس حال میں بنا لوں کہیں اپنا آشیانہ
نہ ٹھہر سکے گی کبھی گردش زمانہ

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج غزلوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔اندوختہ 1995،مشق سخن 1994،می رقصم 2006،دل کا کیا رنگ کروں 2014،آتے ہیں غیب سے 2017، پہلے چار مجموعوں پر کلیات انور شعور اور پانچواں مجموعہ رنگ ادب پبلی کیشنز اردو بازار کراچی سے شائع ہوا ہے۔کسی نے کہا تھا۔

ماتم کی انجمن ہو کر بزم نشاط ہوں
شامل ہے اک ادائے کنارہ کشی سے ہم

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟

ج کسی تحریک میں باقاعدہ حصہ نہیں لیا۔ ہر حلقے سے برابر کے تعلقات رہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا کون دائیں ہے،کون بائیں۔یعنی عرف عام میں کون رجعت پرست ہے،کون ترقی پسند۔جس سے بھی جو کچھ حاصل ہوا۔مومن کی گمشدہ میراث کی طرح شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سب اپنی جگہ

س کیا یہ تاثر درست ہے الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام

ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج اپنی قوم صاحب کتاب ضرور ہے، مجموعی طور پر کتاب خواں نہیں ہے۔ کتاب سے جتنی دوری برقی ذرائع ابلاغ آنے سے پہلے تھی۔ اتنی ہی آج بھی ہوگی۔ برقی ذرائع ابلاغ سے پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کتاب ہی کانعم البدل ہے۔ کتاب نے ہمیں جو علم دیا ہے اسی سے ہم اتنی انتہائی کار آمد مفلوج اور حیرت انگیز ایجاد تک پہنچے ہیں۔ پرانی چیز کوئی چیز کے لئے بے رضا و رغبت جگہ خالی کر دینا چاہیے۔ سنا ہے وزیر آغا مرحوم نے کہا تھا کہ پچیس سال بعد کتاب ختم ہوجائے گی۔ گویا ''جارہی ہے کتاب عجائب گھر، مر رہا ہے کتاب کا قاری''لیکن خوشی کی بات ہے کہ آغا صاحب کا اندازہ غلط نکلا، مطالعے کا رواج آج بھی ختم نہیں ہوا۔ کتاب خوب چھپ رہی ہے۔ خوب بک رہی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اس کا پھل ناشر اکیلا چٹ کر جاتا ہے۔ افسوس ڈاکوؤں جتنا بھی اخلاق نہیں ہے۔ کہ ایمانداری سے مل جل کر کھاؤ۔ ویسے سب ناشر ایسے نہیں ہیں۔ مستثنیات بھی ہیں۔ ایک بار ویلکم بک پورٹ کراچی میں منیر نیازی پروفیسر سحر انصاری اور ڈاکٹر فاطمہ حسن کے سامنے کہا تھے۔ کوئی پبلشر غریب نہیں ہوتا۔

س کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے؟

ج کہیں پڑھا تھا کہ کوئی پاکستانی ادیب فرانس میں سارتر سے ملے۔ تو سارتر نے ان سے کوئی سیاسی سوال کیا۔ موصوف نے جواب دیا کہ ہم تو قلم کار ہیں۔ ہمارا سیاست سے کیا تعلق؟ یہ سنتے ہی سارتر نے الوداعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ کوئی شخص سیاست میں حصہ لے یا نہ لے، سیاست اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آج کل وطن عزیز کی سیاست کچھ اور ہی ہو کے رہ گئی ہے۔ اس کچھ اور نے اسے مخلصانہ سرگرمی کے بجائے مجرمانہ سرگرمی بنا دیا ہے۔ پھر بھی ادیبوں کے علاوہ دوسرے اہل اور حق دار لوگوں کو ہی سیاست میں حصہ لینا چاہیئے۔ ماحول خراب سہی، ہر شخص کو اپنے حصے کی شمع ضرور جلانا چاہیئے۔ برے لوگوں کے لئے میداان خالی کیوں چھوڑا جائے۔ ویسے لکھنے والے چاہے عملاً سیاست نہ کریں، اپنی تحریروں کے ذریعے وہ یہ خدمت سرانجام دیتے ہیں۔

س تخلیقیت سے کیا مراد ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیقیت کا لفظ استعمال کر کے آپ شاید یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ تخلیق کیا ہے؟ یہاں جواباً میں ایک سوال کا ذکر کروں گا کیونکہ سوال یہ ہے کہ کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں؟ اس

سوال کے عموماً دو جواب دیئے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ دوسرا یہ کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ دونوں جوابات صحیح ہیں،لیکن پہلا جواب سیدھا سادھا بیانیہ ہے۔ دوسرا جواب تخلیقی ہے۔ اب ایک مزے کی بات سنئے۔ ایک بار میں نے احمد ندیم قاسمی مرحوم سے پوچھا کہ آپ شراب کیوں نہیں پیتے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چپ ہو گیا۔ معقول جواب تھا۔ یہی سوال میں نے بعد میں کراچی کے نقاد اور شاعر قمر جمیل سے کیا کہ آپ شراب کیوں نہیں پیتے؟ انہوں نے بے ساختہ کہا کہ میرا ناشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اس جواب پر میں جھوم گیا۔ کیا عمدہ تخلیقی جواب ہے۔

اچھا تخلیق کار غالباً وہ ہوتا ہے جو اپنا خیال سچائی اور تازگی سے پر اثر پیرائے میں پیش کرنے پر قادر ہو۔ نیز دیگر خوبیوں کے علاوہ ادب کا دلچسپ ہونا بھی ضروری ہے اور فنی نقائص سے پاک ہونا بھی۔

س آپ کی زندگی کا کوئی یادگار مشاعرہ؟

ج مشاعرے عموماً یاد نہیں رہتے۔ رات گئی بات گئی۔ ہاں ایک مشاعرہ میں آج بھی نہیں بھولا۔ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ آرٹس کونسل میں مشاعرہ ہو رہا تھا، پیرزادہ قاسم نظامت کر رہے تھے۔ اچھے اچھے شاعر بیٹھے تھے۔ شاہدہ حسن بھی موجود تھیں۔ اپنی باری پر میں نے ایک غزل کے علاوہ تین شعر بھی پڑھے:

کیا بادلوں میں سفر زندگی کا
زمیں پر بنایا نہ گھر زندگی بھر
سبھی زندگی کے مزے لوٹتے ہیں
نہ آیا ہمیں یہ ہنر زندگی بھر
محبت رہی چار دن زندگی میں
رہا چار دن کا اثر زندگی بھر

ہال بھرا ہوا تھا۔ میں تحت اللفظ پڑھ رہا تھا۔ سامعین ذوق وشوق سے سن رہے تھے۔ یکا یک مجمع میں ایک شخص جھومتا جھامتا اٹھا اور جذب ومستی میں کے عالم میں تیزی سے گھوم گھوم کر حال کرنے لگا۔ اسے اپنا بالکل ہوش نہیں تھا۔ مشاعرے میں یہ بالکل نئی بات تھی۔ مجمع حیران تھا۔

نہ چھیڑ آشفتگان شوق کو یہ بھی تو سوچ آخر
نہ جانے کون کس عالم میں کس دیوانہ پن سے ہے

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج مشاعرہ اردو تہذیب کی ایک مقبول اور منفرد سرگرمی ہے۔اس میں سنانے والے اور سننے والے دونوں برابر کا حصہ لیتے ہیں۔ایک اچھا مشاعرہ شاعر کے کلام کے علاوہ سامعین کی داد بھی مانگتا ہے۔داد ضرور دینی چاہیئے۔ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں جوش ملیح آبادی کسی بے تکے شعر پر زور زور سے داد دے رہے تھے۔کسی نے سرگوشی میں پوچھا! حضرت یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ انہوں نے زیر لب جواب دیا کہ منافقت۔

ایک اور واقعہ سنئے۔کراچی کے ایک بڑے مشاعرے میں انڈیا کے مہمان شاعر خمار بارہ بنکوی غزل سنا رہے تھے۔کوئی شعر سنانے کے بعد رک کر انہوں نے کہا کہ سامعین مجھے اپنا یہ شعر بہت عزیز ہے۔مجمع سے آواز آئی کہ ذرہ نوازی ہے آپ کی۔لوگ لوٹ پوٹ ہو گئے۔یعنی داد ہی سے نہیں، اچھی ہوٹنگ سے بھی مشاعرے کا لطف دوبالا ہوتا ہے۔

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لائی قناعت واستغنا کے باعث بالعموم آسودگی ہی رہی۔جو شخص کبھی بھوکا نہ سویا ہو اور جسے کبھی فٹ پاتھ پر رات نہ گزارنی پڑی ہو۔اسے زمانہ محروم مجبور معاشرے میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنا چاہیئے۔ویسے بے چینی اور بے اطمینانی ہمیشہ ہر وقت رہتی ہے۔

یہ کشمکش الگ ہے کہ کسی کشمکش میں ہوں
آتا نہیں سمجھ میں بہت سوچتا ہوں میں

اس کے علاوہ وقت اچھا ہی گزرتا ہے۔

قوی بھی ہے ضعیف بھی ہمارا حافظہ شعور
مزے تمام یاد ہیں عذاب ایک بھی نہیں

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج جہاں تک تخلیقی آسودگی کا تعلق ہے جس زبان میں میرؔ، غالب، انیس، اقبال، فیضؔ اور دیگر قابل رشک شعراء موجود ہوں وہاں ہم جیسے کسی شمار قطار میں نہیں۔مجھے اپنی

کاوشوں پر اطمینان کبھی نہیں ہوا۔ ہاں! جب اپنی دانست جب کوئی اچھا شعر کہہ لیا ہو تو سکون اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ شائد دنیا کا کوئی شاعر شرط باندھ کر اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ شاعر صرف کوشش کر سکتا ہے۔ اچھا شعر ہو گیا تو ہو گیا ورنہ ٹائیں ٹائیں فش۔ منیر نیازی کہتے ہیں کہ شاعری کی دیوی مجھ پر مہربان ہے۔ گویا اچھے شعر کے لئے ضروری ہے کہ شاعری کی دیوی مہربان ہو۔

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

تہذیبی علامات اور مظاہر میں ضرور تبدیلی ہوئی ہے۔ لیکن غالباً شاعروں پر کوئی زوال نہیں آیا۔ معیاری اور غیر معیاری مشاعرے پہلے بھی ہوتے تھے، اب بھی ہوتے ہیں۔ جس طرح اداکار فلم یا ڈرامے سے منظر عام پر آتا ہے۔ اسی طرح شاعر مشاعرے سے روشناس خلق ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ بعض شعراء مشاعروں کے بغیر بھی معروف و مقبول ہوتے ہیں۔ مثلاً اقبال، ابن انشاء اور احمد مشتاق وغیرہ۔ اب شاعر کو داد و تحسین کے علاوہ معاوضہ بھی ملتا ہے۔ دنیا بھر کی سیر و سیاحت بھی نصیب ہوتی ہے۔ معاوضہ شاعری کی پیشکش کا ملتا ہے، شاعری کا نہیں۔ شاعری کا معاوضہ کیا ہو سکتا ہے اور کوئی کیا دے سکتا ہے۔ مانا کہ مشاعرہ ایک غیر نصابی سرگرمی ہے۔ مگر ہے بہت مزے دار، منفرد، شگفتہ تفریح۔ اسے جاری رہنا چاہیئے۔ یہ زبان و ادب کے فروغ کا باعث بھی ہے۔ اگر اس میں کچھ خامیاں در آئی ہیں تو انہیں دور کیا جا سکتا ہے۔

س ایک شاعر کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

ج لکھنے کی تحریک کا منبع، ماخذ متعین نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی کلیہ نہیں ہے۔ یہ اپنی اپنی افتاد طبع پر منحصر ہے۔ پھر ادب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لئے معاشرہ بنیادی عنصر ہے۔

نہ ہوں آنکھیں تو پیکر کچھ نہیں ہے
جو ہے باہر ہے، اندر کچھ نہیں ہے

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج آپ چھری سے امرود بھی کاٹ سکتے ہیں اور انگلی بھی۔ سوشل میڈیا کا کردار اسے استعمال کرنے والے کی کارگزاری پر موقوف ہے۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج فنکار کی شخصیت اس کے مشاہدے اور تجربے، فن پر پوری طرح اثرانداز ہوتے ہیں۔ بیشتر لکھنے والوں کے مختلف رنگ، مختلف فنکار کی ذات فن پر کس قدر اثر ڈالتی ہے۔ اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ فیض نے اقبال پر جو نظم لکھی ہے۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوشنوا فقیر

یہ نظم شاید اقبال سے زیادہ خود فیض پر صادق آتی ہے۔ اسی طرح صادقین کی اکثر تصویروں میں اس کی اپنی جسمانی ہیئت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج دنیا تو ایک مہمان خانہ ہے۔ بے باغ بہار دنیا چند دن۔ یہاں سکندر بھی خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ جاتا ہے۔

جینے میں کچھ گھاٹا نہیں کچھ
پایا ہی پایا، کھویا نہیں کچھ

....

تھا کیا ہمارے پاس جو دیتے زمانے کو
ہم نے تو بس کہا ہی کہا ہے جہان سے

س اردو زبان و ادب کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

ج اردو ہماری بے توجہی اور غفلت کے باوجود ہر طرف پھیل رہی ہے۔ اردو فلمیں کثرت سے بن رہی ہیں۔ اور مقبول ہو رہی ہیں۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم نے اردو کی تعلیم و ترویج پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ اس لئے اب زبان کی غلطیاں بڑھ گئی ہیں۔ جیسے لوگوں میں غلط زبان بولنے کا مقابلہ جاری ہو۔ یہ صورت حال ختم ہونی چاہئے۔ اس کے لئے ہم سب کو خصوصاً لکھنے والوں کو زبان کی صحت و اصلاح کے لئے آواز اٹھانی چاہیے۔ زبانی اظہار افسوس کافی نہیں، اس مقصد کے لئے اجتماعی جدوجہد کی اشد ضرورت ہے۔

OOO

اے جی جوش

س شعر کیوں اور کس لئے کہتے ہیں بالکل سچ سچ بتائیں؟

ج سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کیوں اور کس لئے شعر کہتا ہوں اتنی بات ضرور ہے کہ میرا کوئی تصوراتی محبوب ہے میں جس کے لئے شعر کہتا ہوں وہ جس دن سامنے آ گیا آپ کو بھی بتادوں گا۔

س آپ کی شگفتہ طبیعت کے برعکس آپ کی شاعری میں ہجر وفراق کی جو کیفیات نمایاں ہیں اس کا کوئی خاص پس منظر ہے؟

ج شاعر کا مزاج کے ساتھ کم اور دل کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ میں شاعری دل کے موسم سے متاثر ہو کر کرتا ہوں۔ اس لئے میری شاعری میں ہجر وفراق کا تاثر زیادہ ہے۔ کیونکہ میرے دل کو اکثر ایسے جذبات سے واسطہ پڑتا ہے بقول غالب دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔

س کاروبار یا شاعری میں سے آپ کو کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو؟ ایمانداری سے جواب دیں۔

ج یہ سوال آپ ذرا دیر کے بعد پوچھ رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے میں 72 سال کا ہو گیا ہوں آپ مجھے بے تکلفی سے سترہ بہترہ کہہ سکتے ہیں۔ اس عمر میں کیا خاک انتخاب کروں گا۔

س اگر آپ کو جوگ کے لئے کہا جائے کس ہستی کے لئے آپ ایسا کرنے کو تیار ہوں گے؟

ج جو الزام جوانی میں لئے جاتے ہیں وہ آپ بڑھاپے میں میرے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ میں اس عمر رانجھا بننے کی کوشش بھی کروں تو کونسی ہیر میرے انتظار میں ہوگی۔ یہ وہ عمر ہے جس میں اللہ کا ورد کیا جا سکتا ہے۔ اس کار نیک کے لئے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔

س خوبصورتی سے کس حد تک متاثر ہوتے ہیں؟

ج خوبصورتی ہر انسان کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن کائنات میں تو حسن کے ہزاروں روپ ہیں۔ اگر آپ کی مراد صنف نازک کی خوبصورتی ہے تو میں انسان ہوں۔ فرشتہ نہیں۔ اس لئے جس

حد تک کوئی انسان صنف نازک کے حسن سے متاثر ہوسکتا ہے میں بھی ہوتا رہتا ہوں۔اور جب تک آنکھوں میں دم ہے ہوتا رہوں گا۔

س ادبی رسالہ نکالنے کا خیال کیسے آیا؟

ج ادبی رسالہ نکالنے کا خیال خاص طور پر نہیں آیا تھا لیکن دماغ میں خلل سا ضرور رہا جس نے آہستہ آہستہ ارادے کی شکل پائی اور یکم جنوری 1995 کو میں نے ماہنامہ ''دوست ادب'' کا پہلا شمارہ نکال کر اللہ کے فضل سیاس ارادے کو تقویت دی۔ہاں یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات ابتک بنی ہوئی ہے۔

س بطور مدیر آپ کو کن مشکلات سے گزرنا پڑا؟

ج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں۔

س ہم عصر شعراء میں سے کن سے متاثر ہیں؟ چند ایک کے نام ضرور لیں۔

ج کچھ شعراء کے بعض اشعار بہت پسند آتے ہیں اوران کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔قتیل شفائی، ناصر کاظمی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق بطور خاص پسند ہیں۔

س خواتین کیسی شاعری کر رہی ہیں اور آپ کن خواتین کی شاعری سے متاثر ہیں؟

ج صدیوں سے خواتین پر شاعری کی جاتی ہے۔اب خواتین کی شاعری پر تبصرہ کرنا پل صراط سے گزرنے کی بات ہے۔اب میں کس کو خوش اور کس کو ناراض کرنے کی کوشش کرسکتا ہوں۔بہر حال میں پروین شاکر کے بعد شبنم شکیل۔ریحانہ قمر اور یاسمین حمید کی شاعری سے کافی متاثر ہوں۔

س آپ نے بیرون ملک میں کافی ادبی دورے کئے ہیں۔وہاں کی ادبی صورت حال کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج بیرون ملک دوروں کے لئے میں اتنے کم وقت کے لئے گیا کہ وہاں مجھے ادبی صورتوں سے آشنائی ہوئی مگر وہاں کی ادبی صورت حال کو جاننے کیلئے وہاں جتنے قیام کی ضرورت ہوتی ہے اس کا مجھے موقع نہیں ملا۔

س ادبی گروہ بندیاں کیا ہیں اور آپ کا تعلق کس گروہ سے ہے؟

ج میری دانست میں شعبہ تخلیق میں گروہ بندی کا تصور ہی بد نیتی پر مبنی ہے۔لہذا میں ادب میں گروہ بندی کی مکمل نفی کر رہا ہوں۔اگر ادیب اور شاعر بھی گروہ بند ہیں تو پھر مذہبی تفرقہ بازی

پیدا کرنے والوں سے اہلِ قلم کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

س: نئے لکھنے والوں سے مطمئن ہیں؟

ج: نئے لکھنے والوں سے پرانے کبھی مطمئن نہیں ہوئے لیکن اس عدم اطمینان کے باوجود نئے لکھنے والوں نے اپنا سفر جاری رکھا یہی وجہ ہے کہ شعروادب کا کارواں بدلتی زندگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔اور چلتا رہے گا۔

س: شاعری میں اصلاح کے عمل کو کس حد تک جائز سمجھتے ہیں؟

ج: میں شاعری میں خیال کی حد اصلاح کا قائل نہیں ہوں۔ہاں کچھ لگے بندھے قوائد کی حد تک اصلاح لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

س: ادب میں کیا کارنامہ سرانجام دینے کی خواہش رکھتے ہیں؟

ج: کارنامے سرانجام دینے کی امنگ بھری عمر سے گزر چکا ہوں۔اب کارنامے سرانجام دیتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر خوش ہونا اور جینا چاہتا ہوں۔

س: کاروباری مصروفیات میں ادب کے لئے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟

ج: ایک عمر ہوتی ہے جب آدمی کاروبار کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔پھر ایک ایسی عمر ہوتی ہے کہ جب کاروبار آدمی کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔آج کل میں اس عمر میں سے گزر رہا ہوں کہ جب چاہوں اپنے شوق کو کاروبار پر ترجیح دوں اور کاروبار کا کچھ بگاڑے بغیر اپنا ادبی رانجھا راضی کرسکتا ہوں۔

OOO

اعجاز رضوی

س اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج میں 6 نومبر 1959ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ لاہور کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ ایم اے او کالج میں اور اقراء میگزین کا ایڈیٹر رہا۔ ایم اے او کالج میں ہی عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، تحسین فراقی عارف عبدالمتین، حفیظ صدیقی اور محمد نواز خان سے محبت کا رشتہ قائم ہوا۔

س شاعری کی ابتداء کیسے ہوئی؟

ج شاعری کی ابتداء فورتھ ایئر کی کلاس کے لئے الوداعی نظم لکھ کر کی۔ اس زمانے میں آفتاب حسین اختر مجوکہ، ضیاء الحسن، امجد طفیل بھی ایم اے او کالج میں زیر تعلیم تھے۔

س خاندان میں اور بھی کوئی شاعر ہے؟

ج خاندان میں ہر شخص شاعر ہے کیونکہ سب ہی وزن میں لکھتے ہیں۔ ویسے والد صاحب کے علاوہ مرے چچا سلمان رضوی بہت ہی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور میرے استاد بھی ہیں۔

س آپ صرف نظم لکھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

ج میں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور اب تو نثری نظمیں بھی لکھ رہا ہوں۔ ویسے نظم لکھنے کی کوئی خاص وجہ ہے نہ ہی مجبوری، بس موڈ کی بات ہے۔ شاید میں نظم میں بہتر طور پر بات کہہ سکتا ہوں۔

س سنا ہے آپ اختر حسین جعفری مرحوم کو نظم کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں؟

ج کسی کو سب سے بڑا شاعر ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی سب سے چھوٹا بھی ہوگا۔ اختر حسین جعفری نظم کے بہت ہی خوبصورت شاعر ہیں بلکہ وہ راشد اور مجید امجد کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ نظم کا سفر ابھی بہت مختصر ہے، مگر اس سفر میں اختر حسین جعفری راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔

س آپ نے احمد ندیم قاسمی صاحب اور فیض صاحب کا نام نہیں لیا؟

ج فیض صاحب کا مقام و مرتبہ تو غزل کی وجہ سے ہے اور فیض صاحب کے لئے بالکل ضروری نہیں کہ ان کو ہر خانے میں فٹ کیا جائے، فیض صاحب بڑے شاعر ہیں اور ندیم صاحب بڑے شاعر اور افسانہ نگار۔

س قاسمی صاحب نے فیض احمد فیض کے بارے میں رسالہ ''معاصر'' میں ایک مضمون لکھا ہے، آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ج قاسمی صاحب اور فیض صاحب ایک تحریک اور ایک نظریے اور ایک ہی وقت کے شاعر ہیں ، بس فرق اتنا ہے کہ فیض احمد فیض کے رابطے قاسمی صاحب سے زیادہ تھے۔ باقی رہی شراب یا گورنر سے دوستی، یا وڈیرے سے یاری تو ان چیزوں سے فیض صاحب کی شاعری کو کوئی فرق نہیں پڑتا، ندیم صاحب کی ہر بات سچی ہے، مگر یہ بات کرنے کے لیے وقت غلط چنا گیا۔ یہ باتیں فیض صاحب کی زندگی میں کرتے تو بہت ہی اچھا ہوتا، اس طرح چند نئی باتیں سامنے آتیں اب تو صرف مخالفت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آیا اور پھر ایسے مضمون کی حفاظت اور حمایت کرنے کے لیے جن لوگوں کی ندیم صاحب کو ضرورت تھی۔ وہ افرادی قوت ندیم صاحب کے پاس نہیں رہی، ویسے اس طرح کے مضمون سامنے آنے چاہئیں تا کہ صرف شاعری نہیں شخصیت بھی سامنے آئے۔

س ادبی گروہ بندی سے کیا مراد ہے؟

ج ادبی گروہ بندی کی بات ہی بیکار ہے کیونکہ یہاں ادبی گروہ بندی نہیں ہے۔ یہاں تو مطلب پرستی یا مفادی گروہ بندی ہے۔ کاش ادبی گروہ بندی ہو اور کچھ نئے مسائل، نئی نظمیں یا ادب سامنے آئے۔

س آپ تو یہ بات نہ کریں کیونکہ آپ خود احمد ندیم قاسمی کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں؟

ج احمد ندیم قاسمی اردو ادب کی واحد شخصیت ہیں جن کے مشہور و معروف گروہ کا روئے زمین پر کہیں وجود نہیں، یہ گروہ سینہ بہ سینہ چل رہا ہے اور اس کی ہر خبر سدید سنٹر اقبال ٹاؤن سے نکلتی ہے اور اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہے۔ اس گروہ کا کوئی ٹھکانہ ہے نہ آشیانہ......

س سننے میں آیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی سے آپ کا کچھ اختلاف ہے؟

ج جناب عالی! اختلاف تو برابر کے لوگوں میں ہوتا ہے، میرا اور ندیم صاحب کا اختلاف عجیب سی بات ہے۔ کہاں ندیم صاحب جیسا بلند شاعر، ادیب، دانشور اور کہاں میں۔ وہ تو میرے لیے سرپرست کا درجہ رکھتے ہیں۔

س آپ نے رسالہ فنون میں کام کیا یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج میرا یہ تجربہ بہت ہی خوشگوار رہا، اس تمام عرصہ میں مجھے ندیم صاحب کی جو قربت اور محبت میسر آئی، وہ میری زندگی کا خوبصورت اور اہم حصہ ہے، ندیم صاحب میرے استاد محسن اور بہت ہی شفیق بزرگ ہیں۔

س ادبی پرچوں کی حالت کیسے بہتر بنائی جاسکتی ہے؟

ج بہت سے ادبی پرچوں کی حالت تو اس کے مدیر ہی بہتر بنا سکتے ہیں، ہاں کچھ ادبی پرچوں کو مالی امداد دے کر بہتر بنایا جا سکتا ہے اور یہ امداد ان پرچوں کا حق ہے، یہ امداد اشتہارات کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے، خریداری کی صورت میں بھی۔

س آپ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری رہے، یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج حلقہ ارباب ذوق سے تعلق کا عرصہ بہت زیادہ ہے۔ سیکرٹری یا جوائنٹ سیکرٹری تو کچھ عرصے کے لیے بنا، حلقہ ارباب ذوق ہی نہیں کسی بھی ادبی تنظیم کے کسی بھی عہدے پر کام کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ ہر شخص دوسرے کو شرمندہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے اور میں کسی کی فرمائش پر کسی کو شرمندہ، ذلیل یا پریشان نہیں کر سکتا تھا...... اس لیے کچھ پریشان رہا مگر اس تمام عرصہ میں دوستوں کا تعاون اور سینئر احباب کی محبت نے بہت سہارا دیا...... سو میں اس کو بھی اچھا تجربہ ہی کہہ سکتا ہوں مگر کہیں کہیں مشکلات کا سامنا رہا۔

س آپ شاعری میں کس سے اصلاح لیتے ہیں؟

ج ابتداء میں اپنے چچا سلمان رضوی کو نظمیں دکھاتا تھا۔ پھر خالد احمد، اشرف جاوید، عباس تابش سے مشورہ کرتا رہا، یوں ندیم صاحب کی اصلاح اور مشورہ حرف آخر ہے، ویسے باقاعدہ استادی شاگردی کا زمانہ گزر چکا ہے۔

س نثری نظم کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج نثری نظم پوری دنیا میں لکھی جارہی ہے، اس لیے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا مگر شاعری کی ابتدا ہی بے وزن شاعری سے کرنا اور ان کو نثری نظم کہنا سراسر غلط ہے، غزل اور نظم میں کچھ لکھنے کے بعد اگر نثری نظم لکھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔

س آپ کی گفتگو بہت پرمزاح ہوتی ہے، مگر نظمیں بہت سنجیدہ ہوتی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

ج عام گفتگو اور نظم لکھنے میں بہت فرق ہے، گفتگو وقت گزاری ہے اور نظم لکھنا ایک سنجیدہ کام

ہے اس لیے اس میں سنجیدگی کا ہونا ضروری ہے۔

س آپ شاعری کرتے ہیں، مزاح لکھتے ہیں اور اب ڈرامہ بھی لکھ رہے ہیں، سب کچھ کیسے کرتے ہیں؟

ج پہلے بات تو یہ کہ میں ٹیلی وژن کے لیے اب سے پہلے صبح کی نشریات میں بھی چلتے چلتے کے عنوان سے ڈرامے لکھ چکا ہوں اور اب پھر لکھ رہا ہوں۔لیکن بات وہی ہے کہ شاعری اپنے لیے، مزاح دوستوں کے لیے اور ڈرامہ پیسوں کے لیے لکھتا ہوں اور یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا ہے یہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا، بس اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ ہمت دیتا ہے۔

س مشاعرہ کسی شاعر کے قد میں کس قدر اضافہ کر سکتا ہے؟

ج مشاعرہ شاعر کے قد میں نہیں اکاؤنٹ میں اضافہ کرتا ہے، شاعر کا قد صرف اس کے کام سے ہوتا ہے اور وہ بھی ٹوٹل کام ایک غزل سے ایک لاکھ کمایا جا سکتا ہے مگر قد میں ایک انچ کا اضافہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

س آپ مشاعروں میں کم جاتے ہیں کیا وجہ ہے؟

ج مشاعرہ میں جانے کا مالی فائدہ مجھے بھی اچھا لگتا ہے، مگر مجھے دعوت ہی کم ملتی ہے، دعوت وصول کرنے کا ہنر مجھے نہیں آتا۔

س آپ کے بہت سے کالم ادب کے دائرے سے باہر نظر آتے ہیں، آپ کیا کہتے ہیں؟

ج میں نے کچھ ردعمل کے کالم ضرور لکھے ہیں شاید آپ کا اشارہ اس طرف ہے، ویسے میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو ادب کے دائرے سے باہر ہو۔

س عدیم ہاشمی، ظفر اقبال، اجمل نیازی اور منیر نیازی سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟

ج عدیم ہاشمی، ظفر اقبال، اجمل نیازی یا منیر نیازی سے میری کوئی دشمنی نہیں بلکہ میری اس پوری کائنات میں کسی سے بھی کوئی دشمنی نہیں، ہاں اختلاف ضرور ہے اور وہ بھی اتنا اختلاف کہ جو بات آپ دوسروں کے لیے کہتے ہیں وہ اپنے لیے بھی پسند کریں۔ یہ عجیب دانشوری ہے کہ آپ اپنے انداز تحریر، اپنی زبان، اپنی حرکات سے دوسروں کو پریشان کریں اور پھر فخر کریں کوئی ہمارا جواب نہیں دے سکتا بس اتنی سی بات ہے کوئی بھی شخص میرے کسی پیارے کو چھیڑ کر یہ سمجھے کہ اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ میں کسی بھی اختلافی بات کا جواب بہت تفصیل سے اور بہت بے خوفی سے دے سکتا ہوں، یہ میری خوبی ہے یا خامی اس کا فیصلہ دوست ہی کر سکتے ہیں؟

س آپ خاکہ لکھتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟

ج خاکہ ہو یا کوئی اور چیز اگر اخلاق سے گری ہوئی ہے تو وہ بڑی نہیں ہو سکتی، ہاں خاکہ لکھتے ہوئے میں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اس شخصیت کے بیڈروم سے دور رہوں۔ اور صرف اتنا ہی پینٹ کروں جتنا وہ نظر آتا ہے یا نظر آ سکتا ہے، فرضی خاکہ نگاری۔ فحش نگاری ہے، اس میں خاکہ والی کوئی بات ہے نہ ہی اخلاقیات۔

س آپ کے پہلے مجموعہ ''سفر واجب ہوا'' اور دوسرے مجموعہ ''بہت سے دکھ ہیں'' میں بہت واضح فرق ہے......اس کی کیا وجہ ہے؟

ج کسی شاعری کی کتابوں میں فرق ہونا تو اچھی علامت ہے، ایک ہی طرح لکھتے جانا کوئی اچھی بات نہیں......پہلی کتاب ہو یا دوسری یا اور کوئی آنے والی، میں نے باقاعدہ بیٹھ کر شعوری کوشش سے کبھی کام نہیں کیا۔ بس آہستہ آہستہ کتاب تیار ہو جاتی ہے۔

س آپ کیا چیز شوق سے پڑھتے ہیں؟

ج پڑھنے کے معاملے میں بڑا ابدنیت ہوں، ہر چیز پڑھنے کو دل کرتا ہے مگر آٹو بائیوگرافی اور ناول شوق سے پڑھتا ہوں۔

س اردو میں ناول بہت کم لکھا گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج ناول بہت فرصت میں لکھا جاتا ہے اور آج کل کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ ناول لکھے۔ اب ناول پر ٹائم برباد کرنے سے بہتر ہے ڈرامہ لکھا جائے......اور پیسے کمائے جائیں، ویسے پاکستان میں بہت ہی بڑے ناول موجود ہیں، پاکستان کے حوالے سے انتظار حسین، انیس ناگی، عقیل روبی، مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، عبداللہ حسین کے ناول قابل قدر ہیں۔

س کمپیوٹر دور میں کتاب کس طرح زندہ رہ سکتی ہے؟

ج سائنس کتنی بھی ترقی کر جائے کتاب زندہ رہے گی، کیونکہ پڑھنے کا ایک اپنا مزہ ہے

س آپ کسی ادارے کے لیے اردو ویب سائٹ بنا رہے ہیں، وہ کیا کام کر رہے ہیں؟

ج اردو ادبی ویب سائٹ دنیا کی بہت بڑی ویب سائٹ ہے، اس میں میر تقی میر سے لے کر آج تک کے لوگ شامل ہیں۔ یہ ایک بڑا کام ہے اور بہت محنت طلب بھی، یہ کام میٹا کرافٹ کیلیفورنیا کالج کے چیئرمین نثار احمد شیخ کی سرپرستی میں بہت تیزی سے مکمل ہو رہا ہے۔ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ میں ادیبوں، شاعروں کا نمائندہ بن کر ان کے ساتھ اس کام میں شامل ہوں، یہ ویب

سائٹ بہت جلد آن لائن ہو جائے گی اور پاکستانی ادیبوں، شاعروں کے لئے باعث فخر ہو گی......

س آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

ج میں آج کل بچوں کا پروگرام سیر داستاں لکھ رہا ہوں، جو اگلی سہ ماہی میں پاکستان ٹیلی وژن سے نشر ہو گا، دوسری بڑی مصروفیت ویب سائٹ ہے جس کے لئے مجھے بہت پڑھنا پڑتا ہے...... اور ساتھ ساتھ اپنی لکھائی پڑھائی بھی جاری ہے۔

س آپ کی آنے والی کتابیں کون سی ہیں؟

ج میری آنے والی کتابوں میں ''یہ مجھ سے کون بچھڑا ہے'' شاعری اور بندہ بشر خاکہ اور ایک کتاب خوف اور اداسی کی نظمیں، انگلش ترجمے کے ساتھ آ رہی ہیں، اس کتاب میں صرف ایٹمی موضوع پر نظمیں ہیں۔

OOO

اعزاز احمد آذر

س: شعر و ادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج: پتہ نہیں۔ قدرت نے یہ کوئی سزا دے کے ہی بھیجا تھا۔ مجھ پر اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب میں عام شاعر بن چکا تھا۔

س: شاعر ''بن چکے'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: شعر کہنے کی جو صلاحیت ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ شعر تو میں کافی عرصہ سے کہتا چلا آ رہا تھا، طبیعت ابتداء سے ہی موزوں تھی اور اسی دوران میں شاعری کی باریکیاں کافی حد تک سیکھ چکا تھا۔ جس کا احساس میرے شعر پڑھ کر لوگوں نے مجھے دلایا۔

س: شاعری کی طرف خاص طور پر کیسے راغب ہوئے؟

ج: یہ رجحان تو فطری طور پر تھا۔ ہمارے ایک سینئر دانشور مرحوم مشتاق بٹ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں دو قومیں ایسی ہیں جن میں کوئی بھی ماں جب کسی بچے کو جنم دیتی ہے تو وہ شاعر ہی کو جنم دیتی ہے۔ ایک عرب ماں اور دوسری پنجابی ماں۔ اب یہ بعد کی بات ہے کہ کوئی اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے یا اس کی پرورش کرتا ہے لیکن پیدائشی طور پر اس میں رجحان موجود ہوتا ہے اور اب میں ایک طویل تجربے اور مشاہدے کے بعد ان کے اس نظریے کی تائید کرتا ہوں۔ رجحان تو ظاہر ہے یہ فطری تھا۔ اب رہی بات کہ کسی شاعر سے متاثر ہونے کا سوال تو میں ابتداء سے ہی شاعروں سے کم متاثر ہوا ہوں۔ میں جب متاثر ہوا شعر سے متاثر ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے اپنے سینئر اور اپنے ہم عصر شعراء کو ان کے کلام کو خاصا توجہ سے سنا اور پڑھا ہے۔ ان کے ساتھ نشست و برخاست کا جب سے موقع ملنا شروع ہوا ہے، ان لمحات سے بھی پورا استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سو عین ممکن ہے کہ ان سب چیزوں نے مل کر میری فنی اور فکری تربیت میں اپنا رول ادا کیا ہو۔

س: گویا آپ نے باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی؟

ج: جی بالکل نہیں کی اور میں نہیں سمجھتا کہ شاعری میں خاص طور پر استادی شاگردی ہو سکتی ہے کیونکہ میرے نزدیک شاعر ہونے کی شرط اول خیال اور فکر کی دولت سے مالا مال ہونا ہے اور خیال تو قدرت کی عطا ہے۔ شاعری کا دوسرا حصہ کرافٹنگ ہے۔ شعر کی بنت کاری کہہ لیں اسے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو کسی بھی عمر میں کہیں سے بھی سیکھا جا سکتا ہے اور اس کے لئے شاعر ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارے نقاد حضرات ہوتے ہیں۔

س: آپ نے شعر میں کرافٹنگ کا عمل کہاں سے سیکھا؟ اور اگر کسی نے نہیں سکھایا تو کیا آپ نے یہاں تک کا سفر اکیلے ہی طے کیا ہے؟

ج: جی ہاں۔ ان معنوں میں، میں نے شاعری میں کسی کی خاص شاگردی نہیں کی۔ میرا استاد زمانہ، وقت اور حالات رہے ہیں اور اس سے پہلے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں دراصل مطالعے، مشاہدے اور اپنے سینئرز کے علاوہ اپنے ہم عصروں کی ہم نشینی اور ہم مجلسی کو بھی اس ضمن میں اپنا استاد سمجھتا ہوں کہ ان سب باتوں سے مجھے شعر اور فن شناسی کا موقع ملا۔

س: اب تک آپ کے کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج: میرے اب تک چار شعری مجموعے اور ایک کتاب بچوں کی نظمیں چھپ چکی ہے۔ دھیان کی سیڑھیاں، محبت مشغلہ تھی، موسم سی برسا تاں دا، کب صبح ملن ہو گی اور تتلی پھول اور چاند۔ اس کے علاوہ چھٹا مجموعہ زیر طبع ہے ''تم ایسا کرنا''۔ اس کے علاوہ ایک انتخاب کیا تھا میر تقی میر سے اعزاز احمد آذر تک۔ کوئی دو سو پچیس شاعروں کی ساڑھے چار سو غزلیں۔

س: یہ انتخاب میر سے اعزاز احمد آذر تک ہی کیوں رہا؟ کیا آپ کے بعد اور کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ہے؟

ج: میں نے یہ دانستہ کیا ہے، اعزاز احمد آذر تک اس انتخاب میں، میں نے سب سے آخر میں اپنی غزل رکھی ہے۔ یہ ایک میرا سوچا سمجھا اقدام تھا۔ دراصل میں اس انتخاب میں اپنے ہم عصروں اور اپنے سے جونیئر شعراء کو بھی جن کا کلام میں نے منتخب کیا ہے، انہیں احترام دینا چاہتا تھا اور ان سب کا کلام پہلے نمبروں پر رکھا ہے۔

س: آپ نے لفظ جونیئر کا انتخاب کیا ہے۔ شعر و ادب میں اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج: اس میں بنیادی بات ماہ و سال کی ہے۔ یہ فطرت کا ایک اصول ہے دنیا میں بعد میں آنے والا شخص اپنے پہلے آنے والے کا جونیئر ہے۔ یہ وضاحت میں نے آپ کے سوال میں موجود

مخصوص یعنی سینئر جونیئر کی بنیاد پر کی ہے۔ اچھے برے کی نہیں جبکہ مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کا حوالہ معیار کلام بھی ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ماہ و سال کے حوالے سے جونیئر اور سینئر ہونے کو ملحوظ رکھنا ضروری بھی ہے اور مناسب بھی۔

س آپ کالم نگاری بھی کرتے ہیں لیکن آپ کو بطور کالم نگار وہ شہرت نہ مل سکی جو آپ کی شاعری کے حصے میں آئی؟

ج اصل میں کالم نگاری کو نہ تو پیشہ ورانہ طور پر اختیار کیا اور نہ میں نے اپنے آپ کو ہمہ وقت کالم نگار کے طور پر اسٹیبلش کیا ہے۔ یہ دراصل افتادِ طبع کی بات ہے کہ زندگی میں سماج میں اور ہمارے اردگرد کے عمومی ماحول میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو اپنی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ان پر ذہنی اور فکری سطح پر ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔

س آپ کی نظر میں ہمارے ہاں پیشہ ور کالم نگار کون سے ہیں؟

ج ایک طویل فہرست ہے اور ممکن ہے کہ نام لکھے جائیں تو بہت سے نام فوری طور پر ذہن میں نہ بھی آئیں اور یہ بھی ہے کہ معاشرے کے مختلف طبقے کے لوگ مختلف طرح کے اخبارات اور کالم نگاروں کے قارئین ہوتے ہیں جو ضروری نہیں کہ سب کالم نگاروں سے واقف ہوں لیکن اگر چیدہ چیدہ برسبیل تذکرہ نام لیا جائے تو ان میں ارشاد احمد حقانی، نذیر ناجی، عبدالقادر حسن، عطاء الحق قاسمی، حسن نثار، منو بھائی، خالد حسن، ارشاد عارف، عباس اطہر، ظفر اقبال وغیرہ وغیرہ۔

س آپ بیک وقت شاعر، کالم نگار اور ڈرامہ نگار ہیں، اگر آپ کو ان تینوں شعبوں میں اپنے پسندیدہ ایک ایک بندے کا نام لینے کو کہا جائے؟

ج کالم نگار منو بھائی، شاعر احمد فراز اور ڈرامہ نگار بھی منو بھائی ہی ٹھیک ہیں۔

س کسی بھی شاعر اور ادیب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

ج شاعر اور ادیب کا معاشرے میں وہی کردار ہوتا ہے جو قدرت نے اسے تفویض کر کے دنیا میں بھیجا ہے اور اس کردار کی یا اس مطلوبہ کردار کی نشاندہی اس کی فکر اور اس کا کلام کرتا ہے۔ شاعر کسی بھی زمانے کا ہے اور کسی بھی زبان کا، زندگی، معاشرے اور عموماً انسانی ماحول میں وہ جس خوبصورتی، خیر، بھلائی کا، جمالیات کی علامت ہے اور یہی سب کچھ یا اس سب کچھ کا اگر اس کے عملی کردار میں بھی اپنی جھلک دے تو آپ کے سوال کا جواب مجسم صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔

س آپ کے ہاں غمِ روزگار کی نسبت غمِ جاناں کی کیفیات نمایاں ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج یہ محض اتفاق ہے کہ آپ کی نظر سے زیادہ ایسا کلام گزرا ہے لیکن اگر یوں بھی ہو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ جو میرے بارے میں اے بی اشرف نے لکھا ہے کہ میں محبت کا شاعر ہوں تو میں واقعی محبت کا شاعر کہلانا پسند کرتا ہوں لیکن یہ محبت ہمہ جہت محبت ہے۔

س پنجابی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے کس حد تک سوچتے ہیں؟

ج میں بنیادی طور پر پنجابی ہوں اور میری فنی اور فکری پرورش میں پنجاب کی ثقافت اور پنجابی زبان نے ایک مرکزی کردار ادا کیا ہے چنانچہ میں اصولی طور پر بات کا قائل ہوں کہ پنجاب میں نہ صرف پنجابی زبان کو بلکہ پاکستان کے تمام باقی خطوں میں باقی زبانوں کو سرکاری غیر سرکاری اور عمومی سطح پر وہ حیثیت حاصل ہو جو ان کا حق ہے اور یہی ساری ثقافتیں پاکستان کی مجموعی ثقافت کو ''رچ'' بنانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں یہاں یہ وضاحت ضرور کر دوں کہ عالمی پنجابی کانگریس کے حوالے سے اب نہیں بلکہ اعزاز احمد آذر 1968ء اور 1969ء سے مرحوم مشتاق بٹ کے فورم دیس پنجاب محاذ سے پنجابی زبان زبان ادب اور ثقافت کا کارکن ہے۔

س آپ نے پنجابی زبان وادب کے لئے اب تک جو جدوجہد کی اس کا کوئی نتیجہ نکلا؟

ج بہت زیادہ تفصیل میں جائے بغیر جس کا میں تذکرہ اپنے بہت سے مضامین، کالموں اور مختلف تقریبات میں کر چکا ہوں محض یہ بات کافی ہے۔ میں جس جدوجہد کرنے والے قافلے کا رکن ہوں یہ دراصل اس کی تگ ودو کا حاصل ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے پنجابی ایم اے کی کلاسز کا اجراء کر دیا ہے اور ریڈیو پر پنجابی میں خبریں اور دوسرے پروگرام نشر ہونے لگے اور ان میں کافی حد تک اضافہ بھی ہوا ہے۔

س کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پنجابی زبان وادب کے فروغ کے لئے عالمی پنجابی کانگریس صحیح سمت سفر کر رہی ہے؟

ج یہ ایک ایسی بات ہے جس پر متضاد آراء دی گئی ہیں اور میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ عالمی پنجابی کانگریس کے چیئرمین فخر زمان کو چاہیے کہ بہت بنیادی اور مختصر ایجنڈے کو اپنے منشور کی بنیاد بنائیں اور بہت واضح، دوٹوک اور قطعی قسم کی سوچ رکھنے والے افراد کو اپنا ہم سفر بنائیں لیکن محض عددی گنتی بڑھانے کے خیال میں ان لوگوں کو اپنا رفیق نہ سمجھیں جو محض نام ونمود اور دیگر مفاد کی خاطر ہر قافلے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ہمیں بے شمار نادان دوستوں کی نسبت محض گنتی کے چند کمٹڈ ساتھیوں کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد

افسانہ نگار، محقق، مترجم کالم نویس و مدیر ڈاکٹر انوار احمد ان چند اہل قلم میں سے ہیں جنہوں نے تمام زندگی ادب کی خدمت کرنے میں گزاری ہے۔ ساری عمر طالب علموں کو الفاظ کی حرمت سیکھانے اور زندگی کا شعور دینے میں بسر کی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کے چیئر مین اور دیگر کئی اہم مناصب پر فائز رہے مگر اپنا تعارف ہمیشہ ایک استاد کے طور پر کرنے میں نازاں اور مصر رہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ان جیسے اساتذہ دیکھے ہیں جنہیں معلم ہونے پر نا صرف فخر ہو بلکہ اسے مقدس فرض سمجھتے ہوں۔

س ابتدا سے بات کا آغاز کرنا چاہوں گا۔ کہاں پیدا ہوئے؟ بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج میں ملتان میں پیدا ہوا قیام پاکستان سے کوئی آٹھ ہفتے پہلے (11 جون 1947) میرے دادا جھنڈا محمد کہا جاتا ہے کہ ضلع ہوشیار پور کی تحصیل سہجو وال سے قیام پاکستان سے ڈیڑھ دو عشرے پہلے ڈاکخانے کی ملازمت کرتے تھے۔ پہلے وہ جیل خانے میں ملازم ہوئے پھر سب پوسٹ ماسٹر ہو گئے گو یا وہ میٹریکولیٹ تو ہوں گے۔ میرے دادا کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھے ان کے پہلے دولڑکے شادی سے پہلے فوت ہو گئے اس لئے میرے تایا مشتاق احمد اور پھر میرے والد مختار احمد تھے ان دونوں نے بھی دسویں تک تعلیم پائی تھی میری دادی غلام فاطمہ کو میں نے اپنے ہم مکتبوں سے سنا کہ وہ کسی سکھ کی بیٹی تھیں جو ظاہر ہے مسلمان ہو گئی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے دادا نے میرے والد کی شادی روایتی ملتانی گھرانے میں کیوں کی؟ میری ماں بیگم بی بی نے تعلیم نہیں پائی تھی مگر ان کا رنگ گورا تھا ممکن ہے کہ میرے دادا اپنے کنبے کے کالے رنگ کو بدلنا چاہتے ہوں میرے نانا حسین بخش کی تعلیم تو شاید مسجد مکتب کی تھی مگر ان کے گھر میں کتابوں کا ذخیرہ تھا، وہ شکار، سیاحت اور شاید شاہد پرستی کا شوق رکھتے تھے اس لئے موسیقی سے واقف تھے اور میری نانی (دولت بی بی) ایک دو معروف مغنیاؤں یا طوائفوں کا نام لے کر روتی رہتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ

اس شخص نے ہزاروں کمائے اور سب کے سب اسی بازار میں لٹائے۔ میرے نانا کی بعض وکیلوں سے بھی دوستی تھی اس لئے مقدمہ باز کی شہرت تھی اور بعض لوگ انہیں اسی حوالے سے حضرت جی کہتے تھے۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ کی وائس چیئر مینی کے لئے گیلانی خاندان کے کسی بڑے کے مقابلے میں الیکشن میں کھڑے ہوگئے، ہار گئے مگر شاید اسی کی وجہ سے قتل کا مقدمہ بنا اور کسی انگریز 'منصف '' نے نقد پیسے شراب کی چار بوتلوں اور پھلوں سے بھری ہوئی ٹوکری (جسے ڈالی کہتے تھے) لے کر مقدمہ خارج کیا۔

س ادب سے شوق کی ابتدا کیسے ہوئی ؟

ج میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا جب ناک کے معمولی آپریشن میں میرے والد کی وفات ہوئی میں پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ مجھے جب پگڑی باندھی گئی تو اس کے مقابلے میں میرا سر چھوٹا تھا اس حادثے کے بعد مجھے استادوں کی شفقت ملی مگر بہت قریبی عزیزوں کے تکلیف دہ رویئے بھی سامنے آئے، تاہم اپنی ماں کے ساتھ گل ٹیکس کے کارخانے میں مزدوری کا موقعہ ملا (ایک چادر کے کونے کی ترپائی کرنے کے چار آنے ملتے تھے اور تکیہ یا میز پوش کا ایک آنہ) یہی وجہ ہے کہ مجھے ان مصنفوں کو پڑھنے کا شوق ہوا جنہوں نے غریبوں اور مزدوروں کے بارے میں لکھا یعنی پریم چند، کرشن چندر بعد کے زمانے میں منٹو۔ یوں میں سوشلزم کے بارے میں کچھ پڑھے بغیر سوشلسٹ یا ترقی پسند ہو گیا۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج میرا نصب العین میٹرک تک تعلیم پانا تھا تا کہ محکمہ ڈاک اپنے وعدے کے مطابق مجھے اپنے والد کی جگہ نوکری دے، مگر میرے 781 نمبر آ گئے اور دو برس کے لئے وظیفہ مل گیا، یہی کچھ ایف اے اور بی اے میں ہوا اور پھر بی اے میں بھی بہت اچھا رزلٹ آیا کہ ایمرسن کالج میں ایم اے اردو میں ایک روپیہ فیس دے کر داخلہ مل گیا۔ میرے اردو کے استاد سید ریاض حسین زیدی نے پرنسپل میاں محمود احمد کو لکھ کے دیا کہ اگر اسے وظیفہ نہ ملا تو اس کے واجبات میں ادا کروں گا۔ ایم اے کے دوران مجھے ملتان میں ہی بہت مشفق استاد ملے، پروفیسر خلیل صدیقی، سید افتخار حسین شاہ، سید صفدر امام، سید اقبال عباس نقوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اے بی اشرف اور پھر پی ایچ ڈی کے نگران ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

س بلوچستان میں بھی آپ کا قیام رہا، یہ عرصہ کیسا گزرا؟

ج گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں میرا بطور ایڈہاک لیکچرار تقرر 4 مئی 1971 کو ہوا اور یوں مجھے ایک ایسے صوبے میں کام کرنے کا موقع ملا جہاں زبانوں اور ثقافتوں کا جال بچھا تھا، کوئٹہ میں مجھے سیکھنے کا موقع ملا میری ایم اے کی کلاس میں عبدالخالق بلوچ تھا، جس نے بعد میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا اور بلوچستان یونیورسٹی میں صدر شعبہ رہا۔ دو طالب علم پٹھان تھے رشید اور عبدالحمید، اسی طرح ڈاکٹر عطا میراں (معاشیات) حافظ جلیل (فلسفہ) سید خلیل احمد (انگریزی، نامور افسانہ نگار) سعید احمد رفیق (فلسفہ) اور اپنے استاد خلیل صدیقی سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ بے شک میں ملتانی ہوں مگر میں جہاں کہیں گیا اندرون پاکستان (رحیم یار خان، فیصل آباد، سیالکوٹ، اسلام آباد) اور بیرون ملک (انقرہ، اوسا کا) اسے درس گاہ خیال کیا۔

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟

ج ملتان یونیورسٹی سے میں 1976 میں وابستہ ہوا یہاں بھی اپنی دانست میں سماجی تبدیلی کے خواب کا تعاقب کیا، ترقی پسند مصنفین کی صف بندی میں رہے۔ یونیورسٹی میں میرا شعبہ اردو کا تھا مگر میرے نظریات کی وجہ سے دوسرے شعبوں کے نوجوان میرے قریب آتے تھے اور جو باتیں وہ بسا اوقات اپنے استادوں یا والدین سے نہیں کہہ سکتے تھے مجھ سے کہہ لیتے تھے اور میں ہر ممکن حد تک ان کی مدد کرتا تھا یہی وجہ ہے انگریزی شعبے کا روف کلاسرا، تاریخ کی ڈاکٹر عصمت ناز اور سیاسیات کا ڈاکٹر فاروق زین اب بھی تعلق نباہتے ہیں بہت سے میرے دیگر شاگردوں کی طرح۔

س کالم نگاری کیوں ترک کر دی؟ آپ کا کالم وعدہ خلافی تو مقبول ترین تھا؟

ج روزنامہ دنیا میں کالم لکھتا تھا، اس بہانے اپنے پرانے سکول کالج یا سیالکوٹ میں علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی کے نام پر یادگاری فنڈ یا ملتان میں خلیل صدیقی یادگاری فنڈ یا فیصل آباد میں ابن حنیف یادگاری فنڈ قائم کرنے میں مدد ملتی تھی، اور مجھے ان کالموں کا معاوضہ بھی ملتا تھا مگر میرا ایک آدھ کالم روک دیا گیا، ادھر سہیل وڑائچ میرے ایک شاگرد جمشید رضوانی کے ساتھ آیا اور کہا روزنامہ جنگ میں ہفتے کے دو دن کالم لکھیں ممکن ہے اس نے پیشہ ورانہ داؤ آزمایا ہو یا خلوص سے کہا ہو بعد میں وہ انتظامی طور پر ویسے طاقت ور نہ رہے ہوں، بہرحال جب چھوڑ دیا روزنامہ دنیا میں لکھنا تو چھوڑ دیا۔

س تمام زندگی تدریس سے منسلک رہے۔ جاپان میں بھی اردو پڑھائی، یہ تجربہ کیسا تھا؟

ج بیرون ملک جاپان میں میرا قیام کئی اعتبار سے یادگار تھا، یا مانے پاکستان میں آئے تو ملنے کی کوشش کرتا ہوں

س آپ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین رہے۔اس ادارے کی سربراہی کرتے ہوئے آپ نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کافی کام کیا۔کیا آپ کو اپنی اس محنت کے کوئی اثرات آج محسوس ہوتے ہیں؟

ج مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں کی پوسٹ مشتہر ہوئی تھی ، میں تب اوسا کا میں دو برس پورے کر چکا تھا مجھے ایک سال کی توسیع کی پیش کش کی گئی تھی مگر میں نے مقتدرہ کے منصب کے لئے اپلائی کیا میرا انٹرویو ہوا اور میرا تقرر تین برس کے لئے ہوا مگر افتخار چودھری کا فیصلہ آ گیا کہ 65 برس ریٹائرمنٹ کے لئے حتمی ہے۔ڈیڑھ برس میں میں نے اپنی دانست میں کچھ کام کئے ۔ملازمین کی پنشن کے لئے اضافی گرانٹ لایا، 36 کتب شائع کیں اور کچھ اور کام بھی کئے، اخبار اردو کے ذریعے یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ مقتدرہ صرف صدر نشیں کا نام نہیں۔

س آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

ج مستقبل قریب میں اردو کے 36 ناول نگاروں پر ایک کتاب لانے کا ارادہ ہے۔

OOO

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کی تمام زندگی لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے کے نیک عمل میں بسر ہوئی ہے۔یوں تو ان کی شاعری صف اول کے کلام میں شمار کی جاتی ہے اور تحقیق وتنقید کی کتب معتبر حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں مگر ان کا حقیقی تخلیقی جوہر مزاح نگاری میں کھلتا ہے۔ان کی تین درجن کے قریب کتب اب تک شائع ہو چکی ہیں یا پھر اشاعت کے مراحل میں سے گزر رہی ہیں۔ایک مؤقر روزنامے میں کالم لکھتے ہیں اور ایف سی کالج لاہور میں شعبہ اردو کے استاد بھی ہیں۔اول درجے کے تکمیل پسند ہیں،اسلوب نگارش میں تحقیقی خنکی اور علمی جرأت رچی بسی ہے۔تحقیق،تخلیق اور تجزیہ کا ایسا خوبصورت امتزاج عہد حاضر کے کسی اور سخنور کے ہاں ہمیں کم ہی نظر آتا ہے۔

س آپ کا بچپن کہاں اور کیسے گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج بچپن میں نے روایتی معنوں میں تو دیکھا ہی نہیں ہے۔میرا گاؤں شیخوپورہ سے بیس کلومیٹر کی مسافت پر حنیف کوٹ ہے، جو کہ میرے دادا کا آباد کیا ہوا ہے اور انہی کے نام سے موسوم ہے۔ان کے سات بیٹے تھے۔جن میں میرے والد کا دوسرا نمبر تھا۔بدقسمتی سے وہ 34 سال کی عمر میں ہی ایک حادثے میں وفات پا گئے۔میری عمر اس وقت دو،اڑھائی سال کی تھی۔بچپن کی وہ عیاشی جس کا واحد سہارا باپ ہوتے ہیں،خاص طور پر دیہاتی تمدن میں جہاں شریکہ، برادری کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے،میں بچپن کی اسی عیاشی سے تو محروم ہی رہا۔بچپن کی شرارتیں مجھ سے چھن گئیں،جن کو میں اب بھی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔میری مزاح نگاری بھی شائد اسی کوشش کا شاخسانہ ہے۔ہمارے گاؤں کا پرائمری سکول جہاں سے میں بھی پڑھا ہوں،وہ 1921 میں قائم ہوا تھا۔میرے دادا کے بھائی ذیلدار تھے،انہوں نے اس سکول کو اپ گریڈ نہیں ہونے دیا،ان کا موقف تھا کہ اس طرح تو شریکوں کے بچے بھی پڑھ جائیں گے اور کمیوں کے بچے بھی پڑھ کر ہمارے برابر آنے کی کوشش کریں گے۔یہی وجہ ہے کہ

وہ سکول آج سوسال بعد بھی پرائمری سکول ہی ہے۔میں نے میٹرک شیخوپورہ شہر سے کیا،گاؤں سے میرا نکل آنا معجزہ تھا،چونکہ گزارہ کرنے کے لئے زمینیں تھیں اور ماحول بھی تعلیمی عمل کے لئے درست نہیں تھا،ایف اے اور بی اے کرنے کے بعد میں پنجاب یونیورسٹی لاہور آ گیا جہاں سے ایم اے پاس کیا۔

س آپ مقبول مزاح نگار ہیں،کالم نویس اور شاعر ہیں،نقاد،خاکہ نویس اور دیگر اصناف سخن میں بھی تخلیقی کام کیا ہے،ان اصناف میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی صنف ادب ہے؟

ج میری اب تک دو درجن سے زائد کتب مختلف ادبی اصناف پر شائع ہو چکی ہیں،اس کے علاوہ مستقل کالم نگاری بھی ربع صدی سے جاری ہے مگر میری پسندیدہ صنف سخن مزاح ہے۔چونکہ مزاح نگاری کو مشکل صنفِ ادب سمجھا جاتا ہے۔میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ مزاح نگاری معاشرے میں گری پڑی جزیات کو پلکوں سے اٹھا کر ہونٹوں پر سجانے کے عمل کا نام ہے۔مزاح تحریر کرتے ہوئے مجھے بہت مزہ آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں ہوم گراؤنڈ پر کھیل رہا ہوں۔اس کے علاوہ خاکہ نگاری مجھے بہت محبوب ہے۔خاکہ لکھتے ہوئے میری دانست میں حواس ہشتہ درکار ہوتے ہیں۔اس میں کامن سینس،سینس آف ہیومر اور جمالیاتی حس کو بھی شامل کر لیں تو حواس خمسہ سے جب یہ حواس ملتے ہیں تو ہی اعلیٰ درجے کا مزاح تخلیق پاتا ہے۔حواس ہشتہ سے کسی شخص کی روح نچوڑ لینے کا نام ہے خاکہ نگاری۔میں نے اپنے دوستوں،محبوب شخصیات اور فرضی کرداروں کے علاوہ مہینوں تک کے خاکے تحریر کئے ہیں۔مزاح نگاری ایک صنفِ سخن سے زیادہ ایک رویہ،ایک ہتھیار اور سہارا ہے جو چیزوں کو خوشگوار بناتا ہے۔

س ادب وصحافت سے شوق کی ابتداء کیسے ہوئی؟

ج صحافت سے تعلق کی ابتداء تو بادلِ نخواستہ یوں ہوئی کہ 1997 میں روزنامہ دن ایک بڑے اخبار کی صورت میں شائع ہونا شروع ہوا۔اس کے مدیر ہاجرہ مسرور کے بھائی توصیف احمد خان تھے۔انہوں نے کالم لکھنے کی دعوت دی تو میں نے یہ صحافتی سفر شروع کر دیا۔وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اخبار میں لکھا ہوا اپنا نام بچپن سے بھلا لگتا تھا،یہ پڑھ کر خوشی اور انجانی سی طمانیت محسوس ہوتی تھی۔پھر نوائے وقت اور آج کل 92 نیوز میں لکھ رہا ہوں اس کی وجہ شوق بھی ہے،چونکہ ادیب اسی معاشرے کا حصہ ہوتا ہے،وہ جو محسوس کرتا ہے اسے قلم کی زبان سے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کالم نگاری باقاعدہ ادب کا حصہ

نہیں ہے۔مگر یہ اپنے عہد کی تاریخ ہے۔ ہمارے اردگرد آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اخبارات کے کالموں کے ذریعے تاریخ کا حصہ بن رہا ہے، اگر گزشتہ ماہ سال کی تاریخ جاننا چاہیں تو یہی کالم مستند ترین تاریخی حوالہ ہیں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو شاید وہ بچپن سے ہی طبیعت کی موزونیت کی صورت میں میری دلچسپی کا سبب رہا اور ہمیشہ ہی حرفوں سے ایک رومانوی تعلق محسوس کیا ہے۔جن دنوں میں ایم اے کرنے پنجاب یونیورسٹی میں آیا تو سالانہ تقریب میں مجھے اپنا ایک مزاحیہ مضمون ''آج جمعرات ہے'' پیش کرنے کا موقع ملا۔

یونیورسٹی کے طلباء کی کثیر تعداد کے علاوہ اس تقریب میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، رفیع الدین ہاشمی، سہیل احمد خان کے علاوہ سجاد باقر رضوی جیسے مستند ادیب اور اساتذہ شریک تھے۔ سب لوگوں نے مجھے بہت داد دی۔ بلکہ سجاد باقر رضوی نے تو مجھے اپنے دفتر میں بلا کر چائے پلائی اور وعدہ لیا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں ایسا ہی ایک اور مضمون لاؤ گے۔اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور لکھتا ہی رہا۔ آغازِ سخن تو کالج کے ابتدائی دنوں میں ہی ہو گیا تھا مگر باقاعدہ سنجیدگی سے ایم اے کے دوران بزمِ ادب کی مذکورہ تقریب ہی قرار دوں گا۔

س اہلِ قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے یا نہیں؟

ج ادیب معاشرے کا سب سے حساس طبقہ ہیں۔ سیاست اور مذہب کے متعلق ان کی رائے بھی ہوتی ہے اور جذبات و احساسات بھی موجود ہوتے ہیں مگر میں کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ بفرضِ محال اگر حالات اس طرح کے پیدا ہو جائیں کہ وہ کسی سیاسی جماعت کا حصہ بن بھی جائیں تب بھی، اپنے سیاسی قائد کا جس طرح وہ دفاع کر رہے ہوتے ہیں وہ قابلِ قبول نہیں۔ میں نے لکھا تھا کہ

صحافی سے بنتا ہے کیسے صحافہ
لفافہ، لفافہ، لفافہ، لفافہ

کسی زمانے میں جن صحافیوں کے کالمز لوگ محفلوں میں بطور دلیل پیش کیا کرتے تھے آج ان کے شرمناک کردار کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے، پتہ نہیں انہیں اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے پر یقین نہیں ہے یا پھر لالچ کی ہر حد کو عبور کر چکے ہیں یہ لوگ۔

س کبھی کسی ادبی تحریک کا بھی حصہ رہے ہیں؟

ج میں نے پاکستان کی تمام ادبی تحریکوں کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔

بائیں بازو، دائیں بازو کی ادبی تنظیمیں، ترقی پسند، اسلامی ادب، میں نے جب ان تحریکوں کو قریب سے دیکھا تو میرا ان سے ایمان ہی اٹھ گیا۔ یہ لوگوں کے اپنے اپنے ہتھیار ہیں۔ وہ کسی سے سوال کیا گیا، شاید ان کی داڑھی دیکھ کر کہ آپ کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے؟ تو جواب آیا کہ نہیں میرا جماعت اسلام سے تعلق ہے۔ میرا بھی کسی ادبی تحریک سے نہیں، ادب سے تعلق ہے۔ ایسا نہیں کہ میں کسی کو ناپسند کرتا ہوں، میری نظر میں اس سے ادب متاثر ہوا ہے۔ مجھے پچھلی نشستوں پر بطور سامع بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ میں گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مشاعروں کی بات کی جائے تو آج کل مشاعرہ اداکاری کا نام ہے، اپنی اس طبیعت کے ساتھ میں شائد کسی ادبی تحریک کا حصہ بن ہی نہیں سکتا، میں پینڈو سا آدمی ہوں اور اس پینڈو ہونے پر مجھے یقین کریں بڑا فخر ہے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیق بڑی خوبصورت چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ خود خالق ہے اور اس نے ہمیں بھی یہ وصف عطا کیا ہے کہ ہم تخلیق کر سکیں۔ اچھا شعر تو ہوتا ہی وہ ہے جس کی گونج صدیوں تک سنائی دے۔ ہم آج بھی یہ کہتے ہیں کہ

ع   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

تخلیق ہی ادب کا حسن ہے۔ جو عدم کو وجود میں لا کر سرشار کر دیتی ہے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے جب میرے معاصر ادیب کرسیوں اور چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے دھکے کھاتے پھرتے ہیں، اپنی انا تک کی پرواہ نہیں کرتے۔ اس دور میں خود کو نیوٹرل رکھنا بہت مشکل ہے۔ ادیب تخلیقی عمل کو پس پشت ڈال کر لڑائیوں میں مشغول رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج میں نے بڑا مشکل وقت گزارا ہے۔ بچپن یتیمی میں گزرا۔ اسکول جانے کے لئے بھی دس دس کلومیٹر پیدل چلنا۔ ایم اے تک تو میرے پاس سائیکل بھی نہیں تھی۔ زمینیں تھیں مگر انہیں دیکھنا بھالنا ایک بیوہ عورت کے لئے آسان نہیں تھا۔ میری والدہ نے 48 سال بیوگی کاٹی ہے 2014، میں فوت ہوئیں۔ میں تو ان کی ہمت، استقامت اور صبر کو سلام کرتا ہوں جیسے انہوں نے اپنے پروں تلے ہمیں محفوظ رکھا۔

1989 میں مجھے لیکچرار کی نوکری ملی اور اگلے سال میں نے سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خریدی جس پر انیس سال نوکری کی ہے۔ کبھی بھی مگر محرومی محسوس نہیں کی ہے۔ اب تو لاہور میں

اپنا گھر ہے، گاڑی بھی ہے، سب کچھ ہے۔ کتاب پڑھنا میرے لئے سب سے بڑی عیاشی ہے۔ لکھتے رہنا میرا کام بھی ہے اور تفریح بھی ہے۔ مطالعے کے بغیر تو مجھے نیند نہیں آتی ہے۔

یتیم ہونے کی بات کروں تو یتیم ہونا میرے نبیؐ کی سنت ہے۔ بڑا مشکل جملہ ہے مگر میں کہوں گا کہ یتیم ہونے نے میرے لئے زندگی آسان بنادی۔ یہ دکھ اس قدر بڑا اور شدید تھا کہ اس کے سامنے کوئی پریشانی پریشانی نہیں لگتی تھی، ہر مشکل اس کے سامنے ہیچ تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ زمانے بھر کے غم یا اک تیرا غم، وہی کیفیت تھی کہ سارے غم ہی اس غم کے نیچے دب گئے۔ آج میں دیکھتا ہوں کہ جن کے باپ زندہ تھے وہ وہیں کے وہیں رہ گئے، لاڈ پیار میں، سکول سے آگے نہیں گئے۔ اپنے سکول کے تمام دوستوں میں سے، میں پہلا کالج میں جانے والا، پہلا ایم اے کرنے والا، پہلا لیکچرار اور پہلا پی ایچ ڈی ہوں، اپنی کلاس کے طالب علموں میں سے صاحب کتاب تو اور کوئی بھی نہیں ہے۔ مشکلات جس طرح انسان کو حساس بناتی ہیں عیش و عشرت میں پلے بچے اس سے محروم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاڑیاں، بنگلے ہونے کے باوجود ان کے چہروں پر وہ طمانیت نظر نہیں آتی ہے۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج جیسے ہی میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا تو مجھے لیکچرار کی نوکری مل گئی۔ میں ان دنوں فارسی میں ایم اے کر رہا تھا جب مجھے فیڈرل کالج سیالکوٹ میں نوکری ملی۔ یہ سال 1989 تھا۔ چند برس بعد شادی ہوگئی۔ چار بچے ہیں الحمدللہ، ان میں سے تین کی شادی ہوگئی ہے، دو جاپان میں ہیں، ایک اسلام آباد اور ایک ہمارے ساتھ۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا پھر اندرون سے؟

ج مشاہدہ، تجربہ، تخیل جب یہ تین چیزیں ملتی ہیں تو معیاری تخلیق وجود پاتی ہے۔ معاشرہ اور اندرون دونوں ہی اہم ہیں۔ تخیل بڑا ہی اہم ستون ہے تخلیق کے لئے۔

س آپ نے طویل عرصہ تدریس کے شعبے میں گزارا ہے، یہ کیسا تجربہ رہا؟

ج تدریس میرا عشق ہے۔ پڑھا کر مجھے جو طمانیت محسوس ہوتی ہے وہ کسی اور کام میں نہیں اگر مجھے ایک اور زندگی ملے تب بھی میں پڑھانا ہی پسند کروں گا۔ عمر عزیز کے 34 سال اس شعبے میں گزارے اور محبت میں گرفتار ہو کر پڑھایا ہے، مجبوری سے نہیں۔

س آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

ج آج کل میں اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہوں ''سو صفحے کی زندگی''، مختصر سی ہے۔ میں اپنے بچوں کو اپنی CV دکھاتے ہوئے کہا کرتا ہوں کہ یہ آپ پر رعب ڈالنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتانے کے لئے ہے کہ ایک یتیم بچہ اس وقت پی ایچ ڈی بہت ہی مشکل حالات میں کر لیتا ہے، جب پورے ضلع شیخوپورہ اور ضلع ننکانہ صاحب میں ایک بھی پی ایچ ڈی نہیں تھا، اس لئے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔اس کے علاوہ اردو ادب کی مختصر تاریخ لکھ رہا ہوں جو دو سو صفحات پر مشتمل ہوگی، بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ادب کا طالب علم ایک رات میں اگر چاہے تو مکمل طور پر پڑھ لے۔

س کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری پیدا ہوگئی ہے؟

ج الیکٹرانک میڈیا تو پوری دنیا میں ہے۔مگر وہاں کتاب ختم تو نہیں ہوئی ہے، اور نہ ہی مطالعہ کا ذوق ماند پڑا ہے۔ ہمارے ملک میں کتاب سے دوری کا سبب نالائق حکومتیں بھی ہیں جن کی ترجیحات میں مطالعے کو فروغ دینا نہیں ہے۔میری نظر میں تو کتاب کا ذائقہ دنیا کا سب سے مزیدار ذائقہ ہے۔باقی چیزیں تو جزو بدن نہیں بنتی مگر کتاب ہمیشہ کے لئے آپ کی یادداشت اور مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔آج بھی اگر حکمران طبقے کے ہاتھ میں کہیں کہیں کوئی معیاری کتاب نظر آ جائے کسی تقریب میں اور کسی تقریر میں کوئی ادبی جملہ اور شعر پڑھا جائے تو اس سے منظر نامہ بہت بہتر ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم کا بجٹ بہت کم اور لائبریریوں کا بجٹ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ پوری دنیا میں لائبریریاں انسان بناتی ہیں اور وہ لطف اندوز ہونے کے لئے سب سے بہتر جگہیں شمار کی جاتی ہیں۔ہم نے لطف اندوز ہونے کے لئے غلط جگہیں چن لی ہیں۔ میں نے زندگی کے تمام ذائقے چکھے ہیں اور مطالعے کا ذائقہ سب سے بہتر لگا ہے الیکٹرانک میڈیا کو تو کتاب کی ترویج کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

OOO

ڈاکٹر انور سجاد

س آپ نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز کب اور کیسے کیا؟

ج اب یہ اچھی طرح یاد نہیں مگر ظاہر ہے ادبی کیریئر کا آغاز پہلے ہی ہوا اور پڑھائی کی عادت تو استادوں نے بچپن سے ہی ڈال دی تھی۔ پھر کتابوں کا سفر جاری رہا اور یہ کتابیں نئی دنیائیں تخلیق کرتی تھیں۔تو اس تخلیق کا ہم بھی حصہ بنے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ بندہ خود چاہتا ہے کہ اپنی ذات کا اظہار کرے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ غالباً میری پہلی کتاب 52ء میں نقوش میں چھپی تھی جس کا نام ''ہوا کے دوش پر'' تھا۔ یہ میرے باقاعدہ کیریئر کا آغاز تھا۔ اسی دوران ہماری منٹو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہاں بہت بڑے لوگ آتے تھے۔ ان سے ہماری دوستی ہو گئی۔ بس وہیں سے انسپائریشن کا سامان شروع ہوا۔

س منٹو صاحب کے ساتھ اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود آپ کے ہاں ان کی چھاپ نظر نہیں آتی؟

ج نہیں، میں منٹو صاحب کے ساتھ کوئی زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ بس یہی کوئی ان کے آخری پانچ چھ سال میں مجھے ان کا ساتھ میسر رہا۔

س یہ عرصہ اتنا مختصر بھی نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی حوالے سے تھوڑا بہت اثر تو بندے پر رہ جاتا ہے؟

ج شروع شروع میں تو سب لوگوں کی تحریروں کا اثر تھا۔ اگر آپ نے میری پہلی کہانیوں کا مجموعہ پڑھا ہو تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میں خود اپنے لئے ایک الگ ڈائریکشن کا وسیلہ پیدا کرنا چاہ رہا تھا۔ اس وقت جو سرخیل تھے، اپنے اپنے اسلوب کے وہ سب کے سب بہترین تھے مگر میں ان کا زیادہ کھل کر اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ خود کو کافی مقید سا محسوس کرتا تھا۔ اکثر تخلیق کے بعد میں کچھ بجھ سا جاتا تھا کہ جیسے کچھ رہ گیا ہے۔

س افسانے کے حوالے سے ابھی آپ نے جن لوگوں کے نام لئے ہیں ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام شامل نہیں ہے؟

ج احمد ندیم قاسمی بھی ان لوگوں میں برابر کے شریک تھے۔

س آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے شعوری طور پر اپنا اسلوب تبدیل کرنے کی کوشش کی؟
ج: گریجویلی تبدیل ہوا، میری ضروریات کے مطابق شعور کا ظاہر ہے دخل ہوتا ہے اور ویسے بھی شاعر تو نہیں ہوں کہ مضامین غیب سے خیال میں آئیں۔ بلکہ جہاں تک میرا اچھا خیال ہے اچھے شاعر کے پیچھے ان شعوری کوششوں کا دخل بھی ہوتا ہے۔
س اب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آئندہ کون کون سی کتابیں شائع ہونے والی ہیں؟
ج میری اب تک شائع ہونے والی کتابوں میں چار مجموعے افسانوں کے ہیں، تین ناول ہیں اور ابھی گزشتہ اٹھارہ سالوں سے میں نے افسانہ لکھنا چھوڑا ہوا ہے جس کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔
س غالباً ڈراموں میں آپ کی مصروفیت تو اس کی ایک وجہ نہیں؟
ج نہیں، ڈرامہ تو ایک فارم آف ایکسپریشن ہے۔ عادتاً میں لکھتا نہیں ہوں کہ اچھا برا جو آئے لکھ دو۔ اتنا پڑھنے کے بعد میرے معیارات شاید بہت آگے نکل گئے ہیں۔ میں خود اپنے معیار پر پورا نہیں اتر پا رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بس فکشن لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔
س شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کچھ عرصہ سے منظر سے غائب ہیں؟
ج نہیں ایسا نہیں ہے۔ پی ٹی وی پر اکثر سال دو سال بعد میرا ایک لانگ پلے چل جاتا تھا۔ اب پی ٹی وی نے شاید یہ سلسلہ بند کر دیا ہے۔ کمرشل لکھنے میں بہت چوزی ہوں۔ ابھی میرا ایک سیریل چل رہا ہے۔
س لیکن اگر آپ کی بات عوام کے سر سے گزر جاتی ہے تو؟
ج عوام آج کل دراصل جم کر کچھ دیکھتی نہیں ہے۔ جب سے ڈش اور کیبل کا چکر چلا ہے، اتنی چوائس ہے کہ ان کے پاس، انہیں شاید مجبور نہیں کیا جا سکتا۔
س لیکن جب آپ کسی مقابلے میں جاتے ہیں تو وہاں پھر ایسی صورت حال ہوگی۔
ج: کس مقابلے میں؟
س ظاہر ہے جب زیادہ چینل ہوں گے تو ناظرین کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ایک مقابلے کی کیفیت تو بنے گی؟
ج ہمارے ہاں مقابلے کا احساس نہیں ہے کیونکہ ہمارے ٹیلی ویژن پر آپ جو بھی لکھ دیتے ہیں وہ کسی نہ کسی صورت میں چل ہی جاتا ہے۔

س کیا وجہ ہے کہ پی ٹی وی کے ڈراموں کا وہ پہلے سا معیار نہیں رہا؟

ج میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ہر زمانے میں سماج جس فن کا مستحق ہوتا ہے اس کو وہی ملتا ہے۔تو میں سمجھتا ہوں آج کا سماج ایسے فن کا مستحق ہے کیونکہ وہ اسے برداشت کئے جا رہے ہیں۔

س آپ پہلے ادا کار ہیں یا لکھاری؟

ج میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ یہ دونوں اظہار کے مختلف طریقے ہیں۔ وہ کام جو ادا کاری میں ہو سکتا ہے وہ تحریر میں نہیں ہو سکتا اور جو تحریر میں ہو سکتا ہے وہ ادا کاری میں نہیں۔

س اگر آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو؟

ج کیوں کرنا پڑے؟ کون کروائے گا یہ انتخاب؟

س زندگی میں کبھی ایسا موڑ آ جائے؟

ج تو میں یہ بات مانوں گا ہی نہیں۔ مجھے یہ کون کہہ سکتا ہے یا کسی بھی مخصوص رائٹر کو یہ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم یہ کرو یہ نہ کرو۔

س کبھی شعر کہنے کا خیال بھی سوجھا؟

ج ہاں شاعری بہت پڑھی۔شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن کچھ محدود سا معاملہ تھا۔ پورا خیال نہیں آتا تھا۔

س کبھی فلم کی طرف بھی آپ گئے؟

ج فلمیں بھی لکھیں، تقریباً 60 کی دہائی میں تین فلمیں لکھی تھیں۔

س کیا نام تھے ان فلموں کے؟

ج ایک پرچھائیں، ایک افسانہ تھی اور ایک ہم جولی۔

س کامیاب فلمیں تھیں؟

ج بالکل!

س تو پھر یہ سلسلہ جاری کیوں نہیں رکھا؟

ج پہلے جو لوگ تھے وہ مستری نہیں تھے۔ ہمارے ہاں اب فلمسازی میں مستری زیادہ ہیں۔

س آپ کی طرح تقریباً سب کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ فلموں میں پڑھے لکھوں کی کمی ہے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ کہاں سے آئیں گے؟

ج: ہر قسم کے کام کے لئے کسی خاص قسم کے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں اشفاق صاحب گئے تھے فلم کی طرف، دراصل فلموں والے پڑھے لکھے لوگوں کو ہضم نہیں کر پاتے کیونکہ جو ٹائپ آف فنانس آتا ہے اس کی ڈیمانڈز اور ہوتی ہیں۔

س: جبکہ ہمارے ہمسایہ ملک میں فلموں کے حوالے سے اچھے برے تجربات ہو رہے ہیں؟

ج: انہوں نے اپنی فلم انڈسٹری پر زور بہت زیادہ دیا ہے۔ بھرپور توجہ دی ہے۔

س: ہمارے ہاں ایسا کیوں نہیں ہو سکا؟

ج: ہندوستان میں جاگیردار ختم ہو چکا ہے۔ یہاں پر جاگیردار ابھی تک موجود ہے، لہٰذا ہر وہ کام جو فارمنگ آرٹ کا ہے، وہ یہاں کے لوگوں کی نفسیات میں یہ بات بیٹھ گئی ہے، کہ یہ کنجروں والا کام ہے۔

س: کامیابی اور شہرت دو الگ الگ چیزیں ہیں؟

ج: کامیابی کس کو سمجھتے ہیں۔ ہر فنکار میں ایک خود پرستی ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بہت اچھا ہوں۔ ہر بندہ اپنے نزدیک بہت کامیاب ہے۔

س: آپ کو یہاں تک پہنچنے میں کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟

ج: میں نے کبھی نہ کامیابی نہ شہرت کی خواہش کی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خوبی سے سرفراز فرمایا جس کا اظہار میں اس حد تک پوری ایمانداری سے کرتا ہوں۔ میں نے کوئی شعوری کوشش نہیں کی کہ میں بہت نامور یا کامیاب انسان بنوں۔

س: آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جو پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے وہ پہنچا پائے ہیں کہ نہیں؟

ج: اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے کہ میں یہ بتا سکوں کہ لوگوں تک میرا پیغام پہنچا ہے کہ نہیں۔

س: بطور ڈرامہ نگار اپنے ہم عصروں میں سے آپ کو کون لوگ پسند ہیں؟

ج: بہتر ہوگا کہ اگر میں کہوں کہ مجھے لوگوں کی بجائے کام زیادہ پسند ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ میں شخصیت پرست نہیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی پسند آجاتا ہے کبھی کوئی۔

س: عجیب بات ہے کہ یہ سوال جب بھی کسی ادیب سے کیا جاتا ہے وہ اس کا بڑا سیاسی قسم کا جواب دیتے ہیں؟

ج: میں بالکل سیاست نہیں کر رہا بلکہ صاف صاف بتا رہا ہوں۔ بہت بڑے ناموں میں اگر

آپ مجھے بھی شامل کرتے ہیں تو میں نے بھی برا کام کیا ہے۔اس میں کوئی تخصیص نہیں کی جا سکتی کہ آپ کو کون پسند ہے۔ذاتی طور پر مجھے ہر وہ ڈرامہ پسند ہے جس کا زندگی کے ساتھ تعلق ہو۔

س آج کل ٹی وی پر ہر دوسرا یا تیسرا ڈرامہ اصغر ندیم سید کا چل رہا ہے تو کیا مقدار کی زیادتی سے فرق نہیں پڑتا؟

ج میں نہیں جانتا کہ کیوں ٹی وی زیادہ نہیں دیکھتا لیکن وہ اچھے ڈرامہ نگار ہیں اور کمرشل کام میں بعض اوقات ''گھلے آم'' بھی آ جاتے ہیں۔

س ادبی گروہ بندیوں کی کیا اہمیت ہے؟

ج گروہ بندیوں میں بعض اوقات اچھی چیزیں بھی آ جاتی ہیں لیکن نقصان ذرا زیادہ ہوتا ہے مثلاً اگر آپ کا کوئی گروپ ہے اور آپ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔اگر مجھ میں واقعی کوئی صلاحیت ہے تو ظاہر ہے میں آپ سے بہت کچھ سیکھ کے آگے بڑھوں گا لیکن گروہوں میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنا غلط ہے۔ذاتی اختلاف تو رہتے ہیں اور ذاتی اختلاف ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن ذاتی اور شخصی حوالے سے جو وار کئے جاتے ہیں اس سے نقصان ہی پہنچتا ہے، فائدہ کوئی نہیں۔

س تقریبات میں شرکت کے حوالے سے کسی تقریب میں جانے یا نہ جانے کا انتخاب کیسے کرتے ہیں؟

ج تقریب کی اہمیت دیکھ کے۔اگر واقعی کوئی ایسی تقریب ہے جس میں مجھے شمولیت کرنی چاہئے تو میں ضرور جاتا ہوں۔

س آپ نے اپنے اساتذہ سے کچھ سیکھا؟

ج مشکل یہ ہے کہ حکمت کے جو بڑے بڑے نسخے ہوتے تھے اس طرح آج بھی ہمارے ہاں رواج جاری ہے کوئی نہ کوئی استاد آپ کو گائیڈ کرے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ فن کے ساتھ اس کا ہنر بھی آپ کو آنا چاہئے۔فن بذاتِ خود اس وقت تک کارآمد نہیں جب تک آپ کو اس کے کرافٹ کا پتہ نہ چلے۔کرافٹ کے لئے تعلیم ضروری ہے۔اس کی ٹریننگ ضروری ہے اور اساتذہ تو شاید اسی طرح ٹریننگ کرتے ہوں کہ غلط شعر کو اچھا کروایا۔کہانی میں کوئی سقم آیا تو بتا دیا کہ یار یہ اس طرح کی ہوتی ہے۔ہاں ایسا کوئی بندوبست نہیں جو ٹیلنٹ کو پالش کر سکے جو ان کو کرافٹ دے سکے۔

س اگر کوئی آپ سے سیکھنا چاہے؟

ج میں تو سکھا نہیں سکتا اس لئے کہ جب میں خود سیکھنے کے عمل میں ہوں تو میں ابھی خود طالب علم ہوں، میں کسی کو کیا سکھاؤں گا۔ ہاں البتہ اگر کسی یونیورسٹی سے مجھے دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ڈرامے کے کرافٹ کے بارے میں آ کر کچھ بتائیے تو لیکچر شپ کے لئے وہ سارے کا سارا پراسس مجھے پڑھنا ہوگا کہ مجھے طالب علموں کو کیسے پڑھانا ہے۔

س ادیب اور شاعر کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہئے؟

ج آئی ڈونٹ نو! ادیب شاعر اور جتنے بھی تخلیقی لوگ ہیں یہ اپنا کردار خود متعین کرتے ہیں۔ بعض لوگ ساری عمر انعامات کے پیچھے اقتدار کی غلامی میں ہی گھومتے رہتے ہیں اور اس کے لئے دوہ مختلف حربے بھی استعمال کرتے ہیں۔ دوسری طرف محمد خالد اختر کو کوئی پرواہ ہی نہیں۔ وہ ساری زندگی بس اتنا کام کرتے ہیں۔

س بطور ادیب آپ نے اپنی ذمہ داریوں کو کہاں تک پورا کیا ہے؟

ج جس بات کو میں سچ جانتا ہوں اس کو میں نے پوری قوت بغیر کسی ڈر خوف کے اور بغیر کسی مصلحت کے پوری کوشش کی ہے۔

س آج کل لکھنے کے حوالے سے آزادی حاصل ہے؟

ج ہاں! انسان کو بات کرنے کا ڈھنگ آنا چاہئے۔ ضروری نہیں کہ آپ ہمیشہ ہی دھونس سے بات کریں۔ ضروری نہیں کہ آپ کڑوی دوا ویسے ہی پینے کو کہہ دیں۔ کچھ کیپسول بھی ڈال دیتا ہے بندہ۔ بندے کو پتا ہونا چاہئے کہ کس وقت اپنی بات کیسے کہنی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کس وقت کیا بات کہنی ہے۔ وہ ابن الوقتی اور مصلحت کے زمرے میں آتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کس وقت اور کیسے بات کہنی ہے لیکن کہنی ضرور ہے۔

س بعض اوقات علامت اکثر لوگوں کے سر سے بھی تو گزر جاتی ہے۔

ج اگر علامت آپ معاشرے کے ساتھ شیئر کر رہے ہیں تو وہ کبھی سر سے نہیں گزرتی اور اگر گزرنے کی کوشش بھی کرتی ہے تو وہ کم از کم پڑھنے والے کو ڈسٹرب ضرور کرتی ہے۔ اگر وہ سنجیدہ قاری ہے تو وہ اس کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہمارے ہاں جس طرح سنجیدہ رائٹنگ کا فقدان ہے اسی طرح سنجیدہ قاری کا بھی فقدان ہے۔

س ہمارے ہاں ادب اور ادیبوں کی بہتری کے لئے حکومتی سطح پر جو ادارے بنے ہیں ان کی کارکردگی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج کبھی کبھار کوئی بندہ آ کے چمک دکھا جاتا ہے لیکن کمیٹڈ کوشش نہیں ہے۔ اس کے لئے بندے کو رسک لینا پڑتا ہے۔ محکمہ کے اندر فائٹ کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ اپنی نوکریوں سے محبت کرتے ہیں وہ لوگ تو ادارے کو زیادہ دور نہیں لے جا سکتے۔ وہ اپنے مختلف تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے وہاں جمے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادارے خراب ہیں۔ جس طرح ہم نے نیف ڈیک کو بند کر دیا کہ کارکردگی بری ہے۔ کس طرح بری؟ بھئی! برے لوگوں کی وجہ سے تو آپ اچھے لوگ آگے لائیں۔ ادارے بند کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا کہ جی فلاں ادارہ کام نہیں کر رہا اس لئے بند کر دیا۔ کیوں کام نہیں کر رہا آپ نے ادارہ بنایا کیوں تھا اگر اس نے کام نہیں کرنا تھا۔ آپ نئے بندے لے آئیں۔

س نئے لکھنے والوں کو کوئی مشورہ دیں گے؟

ج نئے لکھنے والوں کو میں کیا کوئی مشورہ دوں گا بلکہ نئے لکھنے والے مجھے کافی مشورے دیتے ہیں۔ ویسے بھی یہ مشورے بڑے محنتی قسم کے لوگ دیتے ہیں مثلاً اشفاق صاحب ہیں۔ وہ مشورہ دے سکتے ہیں۔

س قومی سطح پر جب بھی حکومت کو کسی مسئلے کے حوالے سے مشاورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ادیبوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟

ج آپ نے یہ سب سے اہم سوال کیا ہے۔ میں بڑا خوش ہوں کہ آپ نے یہ سوال کیا ہے۔ اس کے کئی جواب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جن سے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے یعنی رائٹرز وغیرہ سے تو یہ بتاؤں کہ کبھی ہم نے آپس میں مل بیٹھ کر قومی معاملات پر غور نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ ادب ضمیر ہوتا ہے۔ ہم نے اپنا یہ رول ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ رائے عامہ بنانے والے نہیں رہے۔ اس لئے حکومت کو ان کے پریشر کا اندازہ ہی نہیں۔ مجھے کوئی کانفرنس بتایئے سوائے حکومتی کانفرنسوں کے جو ادیبوں نے اپنے طور پر کسی مسئلے پر صوبائی یا قومی سطح پر خود آرگنائز کی ہو۔ حلقے میں ایک آدھ مسئلے پر شاید کوئی بحث ہو جاتی ہے۔

س آپ اس مسئلے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہیں؟

ج بالکل کرتا ہوں۔

س آپ نے اس حوالے سے کیا کیا ہے؟

ج میں کچھ نہیں کرتا۔

س کیوں نہیں کرتے؟

ج اس لئے کہ مجھے سب کا پتا ہے۔ وہ کوئی الزام دے دیتے ہیں۔ یہی کہ اس کا کوئی مقصد ہے۔

س اس کا حل کیا ہے؟

ج ادیبوں کو جوائن کرنا چاہئے۔ فورم بنانا چاہئے تا کہ قومی سطح پر بات کریں اور آگے پہنچائیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کسی آدمی کی اس میں دلچسپی ہی نہیں۔

س پھر کون آگے آئے گا؟

ج یہ نوجوان لوگوں کا کام ہے۔

س اس صورت میں کیا سینئرز ان کا ساتھ دیں گے؟

ج بالکل ساتھ دینا تو چاہئے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ نوجوانوں کو سنجیدہ لیتے ہی نہیں۔ وہ صرف اخباری بیانات تک ہی محدود ہیں کہ نوجوان بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔

OOO

اقبال راہی

س ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج ہماری رہائش انارکلی بازار میں تھی۔ پیسہ اخبار میں ایک کارپوریشن کا اسکول تھا پانچویں جماعت وہاں سے پاس کی۔اُس کے بعد دیگر اسکولوں میں زیر تعلیم رہے۔مگر ساتویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکے۔

س شاعری کی طرف کس طرح آنا ہوا؟

ج ہم چونکہ نامور شاعر حضرت احسان دانش کے مکان کے قریب ہی رہتے تھے اور بچوں کی نظمیں لکھنے کا شوق تھا۔ایک شاعر آغاز برنی ہمیں احسان دانش کے پاس لے گئے اور ہمیں ان کے حوالے کر دیا۔بس یہاں سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔یہ ایک درسگاہ تھی جہاں سے ہم نے فیض حاصل کیا۔بعد میں ہم نے باقاعدہ ان کی شاگردی اختیار کی۔

س آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بیٹھے بیٹھے شعر لکھ لیتے ہیں۔

ج دراصل ہمارے دور میں اساتذہ اپنے شاگردوں کو باقاعدہ مشق کرایا کرتے تھے۔ہمیں احسان صاحب کوئی مصرعہ دے کر کہتے تھے اس پر جتنے شعر لکھ سکتے ہو لکھ کر لاؤ۔چونکہ نیا نیا شوق تھا ہم ساری رات یہ ہی کام کرتے تھے۔جب جا کر سناتے تو تین چار مصرعے سننے کے بعد استاد کہتے تھے انھیں ردی کی ٹوکری میں پھینک آؤ۔اُس وقت اگرچہ

نا گواری کی ایک کیفیت دل ودماغ پر طاری ہوتی تھی لیکن اب یہ کھلا کہ یہ ذہنی تربیت تھی۔

س کس کس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟

ج پہلے مقبول جہانگیر مرحوم نے امروز کے لیے بچوں کی نظمیں لکھوائیں۔پھر مزاحیہ شاعری کا چکر لگا۔پھر قطعہ نگاری کی طرف آئے۔اب نثر کے میدان میں بھی کوشش جاری ہے۔

س کبھی پاکستان سے باہر کسی مشاعرے میں جانا ہوا؟

ج بچپن میں ایک کہاوت سنتے تھے۔چٹ پٹی ترکاریاں جب ہوویں ساتھ۔دال کو پھر کون

لگا تا ہے ہاتھ۔تو جناب ہم بڑے سفید پوش آدمی ہیں ہمیں کون پوچھتا ہے۔ یہاں تو بڑے بڑے دانشوروں کا ہولڈ ہے، جسے وہ چاہتے ہیں بھیج دیتے ہیں یا ساتھ لے جاتے ہیں۔

س نثری نظم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج میرے خیال کے مطابق جو شاعر بحر اور وزن کے ابجد سے بھی واقف نہ ہو وہ اپنے لیے میدان منتخب کر لیتا ہے۔اس میں نہ ہینگ لگے اور نہ پھٹکڑی اور رنگ میں چوکھا آنے والی بات ہے۔

س ابتدائی دور میں کن کن شعراء کا مطالعہ کیا؟

ج مجھے بچپن ہی سے فانی، میر، داغ اور جگر پسند تھے۔ میں نے اسے پڑھا اور اسی نوعیت کے دیگر اساتذہ میرے زیر مطالعہ ہیں۔

س اور موجودہ شاعروں میں کس سے متاثر ہیں؟

ج منیر نیازی اپنی طرز کے انوکھے شاعر تھے۔ جوش ملیح آبادی، احسان دانش،شکیب جلالی، ڈاکٹر خورشید رضوی، شہزاد احمد، حمیدہ شاہین، ادا جعفری، رخشندہ نوید، شاعری کے وہ مینار ہیں جن کی روشنی سے ادب جگمگا رہا ہے۔

س مطالعے کا رجحان کس حد تک قائم ہوا؟

ج جب سے الیکٹرک میڈیا نے سر اٹھایا ہے مطالعہ کا رجحان نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ بچے بڑے سب اس طرف راغب ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اب نئی کتابیں فٹ پاتھوں پر با آسانی دستیاب ہیں۔

س ترقی پذیر معاشرے میں ادیب کا کیا مقام ہے؟

ج یوں تو ادیب کا بڑا مقام ہے مگر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ نئی نسل تک منتقل نہیں ہو پا رہا۔ چند مخصوص ادیب ہیں جن کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ زندگی کے مسائل اس قدر ہولناک اور گھمبیر ہو گئے ہیں کہ عام آدمی کو روٹی کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ معاشرتی ناہمواری اپنی انتہا کو پہنچی ہو ئی ہے۔ بے روزگاری اپنی آخری حد بھی پار کر گئی ہے۔ معاشرہ ایک نہ ختم ہونے والی الجھن کا شکار ہے جس سے عدم تحفظ کا احساس بڑھ رہا ہے۔

س اب تک کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج پہلا مجموعہ زندہ حروف مرحوم اختر کاشمیری نے توفیق بٹ کے کہنے پر شائع کیا۔ دوسرا مجموعہ قطعات پر مشتمل تھا (جو میں روزنامہ اوصاف میں لکھتا رہا۔اب بھی جاری ہے) ہائی الرٹ پاکستان

تیسرا مجموعہ قطع برید حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ بھی کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا کے مصداق ہے کہ اس میں پروفیسر عاشق رحیل، حسن عباسی، میاں منظور شاہد، محمد جمیل خان، عبدالمجید چٹھہ اور سلیم اختر ملک کا تعاون حاصل ہے۔

س آپ کے گھریلو حالات ابتر ہیں کیا وجہ ہے؟

ج میری شادی 1973 میں ہوئی۔ گھر میں غربت کا راج تھا۔ روزگار نہ ہونے کے برابر تھا۔ پہلے خواجہ محمد رفیق کے پریس میں کام کیا پھر بچوں کا رسالہ چندا ماموں میں چپڑاسی سے ایڈیٹر تک خود تھا۔ ماہنامہ قہقہہ میں مزاحیہ شاعری لکھتا تھا۔ اس کے علاوہ جب قطعات کا سلسلہ شروع ہوا تو کوہستان ن، مغربی پاکستان، استیصال، ہما، افلاک اور اب گزشتہ سالوں سے روزنامہ اوصاف میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ جن کا معاوضہ ندارد۔

س تنقیدی اجلاسوں کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

ج حضور ہمارے زمانے میں تنقیدی اجلاس برائے اصلاح ہوا کرتے تھے۔ اب صرف تنقید برائے تنقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی گروپ ہیں جو اس محاذ آرائی میں پیش پیش ہیں، یا یوں کہیں کہ یہ شعبہ قبضہ گروپ کے ہاتھ آ گیا ہے اور اس میں ہاتھ دکھانے والوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔

س پنجابی میں بھی کوئی کتاب آئی ہے؟

ج پنجابی میں شعر تو کافی لکھے ہیں، جب محترم دلدار پرویز بھٹی زندہ تھے وہ اپنے پروگرام میں بلاتے تھے۔ وہاں ہم پنجابی نظمیں پڑھتے تھے۔ جن کی تعداد بھی اب سو کے قریب ہے۔ منظوم خراج کے عنوان سے ایک مجموعہ تیار ہے جو 150 نظموں پر مشتمل ہے۔ جو مشاہیر مرحوم اور حاضر شعراء کے بارے میں کہی گئی تھیں لیکن کتابی صورت میں لانے کے لیے خدا جانے کتنے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں گے۔

س آپ کے ساتھ پے بہ پے حادثے ہوتے رہے اس کی مختصر تفصیل۔

ج ہمارا انیس سال کا بیٹا 1997 میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد جو تین بچے خون کی مہلک بیماری تھیلسیمیا کا شکار تھے ان میں سے ایک بیٹی نیلم اقبال 8 سال قبل عید کے دوسرے دن اللہ کو پیاری ہو گئی۔ والد محترم ہمشیرہ کی شادی والے دن وفات پا گئے۔ والدہ بھی کچھ ہی عرصے کے بعد دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر ہمیں روتا چھوڑ گئی۔ اب تازہ المیہ یہ کہ ہمارا شاعر بیٹا (مصنف لہو کا حصار) 15 دسمبر 1914 کو ایک ہفتہ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد ہمیں لاکھوں برس کے غم

دے گیا۔اس کی وفات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ بینائی کم ہوگئی اور بدن کمزوری سے اپنا رشتہ مستحکم کرنے پر تل گیا ہے۔

س آج کل آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

ج 2005 میں ضلعی حکومت کی ملازمت سے ریٹائر ہوا۔ایک ماہنامہ میں ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی نے ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ ہر ماہ کسی شاعر یا شاعرہ کا کلام اس ماہ کا شاعر کے عنوان سے مہیا کریں۔روزنامہ اوصاف میں روزانہ کی بنیاد پر ایک قطع تحریر کرتا ہوں۔ایک ماہنامہ تارکین وطن ہے جو بیرون ملک ارسال کیا جاتا ہے اس کی مجلس ادارت میں شامل ہوں اور گوشہ ادب تحریر کرتا ہوں جس میں تقریبات کا احوال کتابوں پر تبصرے مختلف ادبی خبریں اور اساتذہ کا اردو پنجابی کلام شائع ہوتا ہے۔اس کے چیف ایڈیٹر میاں منظور شاہد ہیں جو بہت پیارے انسان اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔

س ارژنگ کے بارے میں کوئی رائے؟

ج یوں تو ادبی رسالے کافی تعداد میں شائع ہوتے ہیں لیکن بیشتر رسالوں کے مدیروں نے اس کو کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔عامر بن علی اور حسن عباسی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ یہ ارژنگ کے ذریعے ادبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مضافات میں رہنے والے شاعروں کا کلام تواتر سے شائع ہوتا ہے اور یہ کسی کے خلاف ایک حرف بھی لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

OOO

ابرار ندیم

س کچھ اپنے اور خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیں؟

ج میرا قلمی واصلی نام ابرار ندیم ہے راجپوت فیملی سے ہوں۔ میں 14 فروری 1970ء کو ضلع نارووال کی تحصیل ظفروال کے نواحی گاؤں وزیر پور مراڑہ میں چوہدری گلزار احمد مرحوم کے ہاں پیدا ہوا جو محکمہ واپڈا سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ والدہ کا نام احمد بی بی ہے وہ گھریلو خاتون ہیں۔ دادا چوہدری عبدالعزیز مرحوم محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے اور قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کے مختلف شہروں میں فرائض انجام دیتے رہے۔ پردادا فضل دین مرحوم موضع چمیاری ضلع امرتسر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک دین دار اور مذہبی انسان تھے اور فارغ وقت میں قران پاک کی کتابت بھی کیا کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے بسلسلہ روزگار وہاں سے ہجرت کر کے نارووال کی تحصیل ظفروال کے نزدیکی گاؤں مراڑہ شریف میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ ہمارا خاندانی سلسلہ مکے خان چمیاری والے سے ملتا ہے جو اپنے وقت میں پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جرنیل تھے۔ پردادا فضل دین کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑے بیٹے چوہدری عبدالقادر تھے جو اس وقت وائسرے ہند کے میر منشی اور حضرت علامہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ والد صاحب کے بڑے بھائی مرحوم بشارت احمد خان نارووال کی ایک معروف اور جانی پہچانی سیاسی وسماجی شخصیت تھے۔ پیپلز پارٹی نارووال کے نائب صدر ہونے کے ساتھ انہیں 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں بطور سویلین ظفروال محاذ پر پاک فوج کے شانہ بشانہ دشمن کے خلاف بہادری سے لڑنے پر حکومت پاکستان کی طرف سے اس وقت کے صدر پاکستان ایوب خان سے ستارہ شجاعت کا اعزاز بھی ملا تھا۔

س کہاں تک تعلیم حاصل کی اور تعلیمی مدارج کیسے طے کیے؟

ج میں نے پرائمری تک تعلیم ایم سی جونیئر ماڈل سکول شادباغ لاہور سے حاصل کی۔ اس کے بعد والد صاحب کا محکمانہ تبادلہ مونا واپڈا کالونی بھلوال ضلع سرگودھا ہوگیا۔ جہاں آٹھویں تک تعلیم

الاسلام مڈل سکول بھلوال، میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول بھلوال اور بی اے تک تعلیم گورنمنٹ کالج سرگودھا سے حاصل کی۔ اس کے بعد ایم اے پنجابی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ اس دوران تین سال تک ایک نجی لا کالج سے قانون کی تعلیم بھی حاصل کرتا رہا مگر بعد میں اس مضمون میں عدم دلچسپی کی وجہ سے ادھورا چھوڑ دیا۔

س ادب وصحافت سے شوق کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ج ادب وصحافت سے لگاؤ دوران طالب علمی ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ بی اے کرنے کے بعد بطور مدیر بھلوال شہر سے ماہانہ ادبی رسالے ''تغزل'' کا اجرا کیا جو دو شماروں کے بعد وسائل کی عدم دستیابی سے بند ہو گیا۔ اس کے بعد لاہور میں عامر بن علی کے ساتھ مل کے ماہانہ ادبی رسالہ ''ارژنگ'' نکالا جسے بطور مدیر تقریباً بارہ تیرہ برس تک کامیابی سے چلایا۔ اس دوران اپنے وقت کے سبھی نامور اور بڑے ادیبوں کے انٹرویوز کرنے کا موقع ملا جسے عامر بن علی کے ساتھ مل کے ''گفتگو'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ 2003ء میں ریڈیو پاکستان میں بطور پروگرام پروڈیوسر ملازمت ہو گئی آجکل پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان لاہور تعیناتی ہے۔ ریڈیو میں ملازمت سے پہلے مختلف اخبارات میں بطور سب ایڈیٹر اور ڈیلی میگزین ایڈیٹر اور مختلف پنجابی اردو اخبارات میں بھی دس بارہ برس تک کام کیا۔

س بچپن کہاں گزرا اور گردو پیش کے حالات کیسے تھے؟

ج موٹر وے پر لاہور سے اسلام آباد کی طرف سفر کرتے ہوئے سالم انٹر چینج پر پہنچیں تو یہاں سے مغرب کی طرف تقریباً گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر سرگودھا کی تحصیل بھلوال واقع ہے جو دنیا بھر میں بہترین کینو کی پیداوار کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔ ویسے تو یہ پورا علاقہ اپنی صاف ستھری آب و ہوا، کھلے ڈُلے ماحول، خالص دیسی خوراک، باغات، نہروں، تعلیم، کاروبار، لوگوں کے آپس میں محبت بھرے میل جول، امن و امان اور زندگی کی دیگر بنیادی سہولیات کی دستیابی کے حوالے سے ایک پرسکون زندگی گزارنے کے لئے مثالی علاقہ ہے۔ مگر ان تمام خوبیوں اور سہولیات سے ہٹ کر بھی یہ علاقہ میرے دل کے بہت قریب ہے۔ اس لئے کہ میرا سارا بچپن، لڑکپن اور اوائلِ جوانی یہیں کھیلتے کودتے اور ہنستے گاتے گزرے ہیں۔ یہ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پرانی بات ہے والد صاحب چوہدری گلزار احمد اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے، اُس وقت محکمہ واپڈا میں سنیئر سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ اُن کی لاہور سے

بھلوال ٹرانسفر کے سلسلے میں ہماری فیملی موناواپڈا کالونی شفٹ ہوئی تھی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کسی بھی خاندان کے لئے اپنا گھر بار اور گلی محلہ چھوڑ کر ایک نئی جگہ بسنا قدرے مشکل کام ہے پتا نہیں کیوں میرے دل میں ایک نئی جگہ اور نئے ماحول میں نئے لوگوں سے ملنے کی ایک انجانی سی خوشی تھی۔ میں اس وقت چھٹی جماعت کا طالب علم تھا مجھے آج بھی وہ لمحات اچھی طرح یاد ہیں پوری فیملی کے ساتھ ٹرک میں گھر کا سامان لادے ہم راتوں رات لاہور شہر میں شادباغ کے گلی محلوں سے نکل کر اگلی صبح ایک ایسی بستی میں آ گئے جہاں گردوغبار، گاڑیوں کا دھواں اور کسی قسم کا شور شرابا نہ تھا۔ صاف ستھری آب و ہوا، پینے کے لئے کسی پہاڑی چشمے جیسا قدرتی ٹھنڈا میٹھا پانی، پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں اور آنکھوں کو بھلا لگتا شفاف نیلا آسمان۔ بھیرہ روڈ پر بھلوال شہر سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر نہر کنارے رنگ برنگے پھولوں، درختوں اور باڑوں سے سجی یہ چھوٹی سی کالونی اس وقت اپنے پورے جوبن پر اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ جن لوگوں نے اس دور میں موناواپڈا کالونی کو دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ چاردیواری کے اندر گنتی کے چند خاندانوں پر مشتمل یہ چھوٹی سی بستی اس قدر صاف ستھری، دلکش اور پرسکون تھی کہ گردونواح سے لوگ خاص طور پر اسے دیکھنے آتے تھے۔ کالونی میں بچوں کے کھیلنے کے لئے کرکٹ گراؤنڈ اور بڑوں کے لئے الگ سے آفیسر کلب تھا جہاں لان ٹینس، بیڈمنٹن کورٹس کے ساتھ ٹیبل ٹینس اور کیرم بورڈ جیسی کھیلوں کی سہولیات بھی دستیاب تھی۔ البتہ یہاں پتنگ بازی، گلی ڈنڈا، بنٹے اور لٹو جیسے خالص لاہوری کھیل میسر نہیں تھے جن کی کمی میں ایک عرصے تک محسوس کرتا رہا۔ مگر اس کے باوجود دیگر بہن بھائیوں کی نسبت مجھے اس نئے ماحول کو اپنانے میں کوئی زیادہ وقت نہیں لگا۔ چند ہی روز میں کالونی کے ہم عمر بچوں کے ساتھ میں اس طرح گھل مل گیا گویا ہماری برسوں کی شناسائی ہو بلکہ ایک آدھ شوخے اور شرارتی بچے کو تو میں نے شروع دن سے ہی اپنا بھرپور تعارف بھی کروا دیا۔ جس کے بعد کالونی کے وہ بچے جو مجھے لاہوری بچہ سمجھ کر ''ایزی'' لے رہے تھے اُن پر بھی میرا اچھا خاصا رعب بن گیا۔

س اس دور کی خوبصورت بات جو آج بھی بہت یاد آتی ہو؟

ج یہ سارا عرصہ ہی خوبصورت تھا۔ بچپن اور لڑکپن کی درمیانی سرحد پر بے فکری عمر کا یہ وہ دور تھا جس میں ہر کوئی خواہشوں کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں اور دل پر اپنی ذات کے غرور کی پٹی بندھی ہوتی ہے۔ یاروں دوستوں کے ساتھ زندگی موناواپڈا کالونی میں اپنے

گھرسی۔تھری، چاچے نذرے کی کنٹین ،نہر کی پٹری، چاندنی چوک، کرکٹ گراؤنڈ اور کالونی کی چھوٹی سی مسجد سے لے کرسکول کی بس اور بھلوال شہر میں واقع پہلے تعلیم السلام مڈل سکول اور بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول تک محدود تھی۔رب کے کرم سے دل کو گرمانے اور آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والے ماں باپ، بہن بھائی، یاروں دوستوں اور پیاروں کے سنگ ہر طرف سَت رنگے چاہ،سُکھ اور خوشیاں تھیں۔دل میں نت نئے شوق بھی تھے اور انہیں پورا کرنے کا جوش بھی۔لاابالی پن کی ایک الگ سی دنیا تھی جس میں یاروں بیلیوں کے ساتھ مرضی کے دن اور مرضی کی راتیں تھیں۔رات دیر تک کبھی کرکٹ گراؤنڈ میں اور کبھی نہر کنارے کھلے آسمان کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں دوستوں کے ساتھ بےفکری کے قہقہے،ہنسی مذاق اور لمبی لمبی بے مقصد باتیں تھیں۔نئی نئی جوانی کے خمار نے خوابوں اور خیالوں کے آسمانی پنگھوڑے پر اس طرح سوار کیا ہوا تھا جہاں اپنی ذات سے باہر نہ کوئی اور دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی دیکھنے کی خواہش تھی۔نامعلوم فطرتاً میرا مزاج شاعرانہ تھا یا اس ماحول میں کوئی ایسا جادو تھا کہ ساتویں یا آٹھویں جماعت سے ہی میرا رجحان موسیقی،شاعری، رسالوں اور فلموں میں بڑھتا چلا گیا اور سکول کالج کی تعلیم میں صرف واجبی سی دلچسپی رہ گئی۔یہیں سے مجھے اپنے پسندیدہ گانے سنتے اور شاعری پڑھتے پڑھاتے لکھنے لکھانے کا شوق بھی پیدا ہوگیا۔جس کے بعد میں نے بھلوال شہر کی ماہانہ ادبی نشستوں میں سرگودھا ڈویژن کے زبردست کرکٹر اور شاعر دوست اکمل تبسم کے ساتھ باقاعدگی سے جانا شروع کردیا۔ان نشستوں میں نئے لکھنے والوں کے ساتھ اصغر حسین شامی اور ڈاکٹر جاوید آغا جیسے پنجابی اردو کے منجھے ہوئے سینئر شعراء بھی شریک ہوتے تھے جنھیں سُن کر ہمارے جیسے نوآموز لکھنے والوں کی ابتدائی شعری تربیت بھی ہوتی تھی۔اسی طرح کی علمی ادبی محفلوں اور یاروں دوستوں کے ساتھ دیگر کھیل تماشوں میں محبتوں سے گزرا میری زندگی کا یہ وہ سنہری دور تھا جس کی حسین یادیں آج بھی خوشبو کی طرح میرے دل ودماغ کو معطر کردیتی ہیں۔جب بھی تنہائی میں ان گزرے دنوں کی یاد آتی ہے تو مونا واپڈا کالونی اور بھلوال کے اپنے ان دوستوں اور پیاروں کی سلامتی کے لئے آنکھوں کے نم ہوتے گوشوں کے ساتھ دل سے بےاختیار ڈھیروں دعائیں نکلتی ہیں۔

س لکھنے لکھانے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

ج بچپن سے بچوں کی کہانیاں، ناول اور رسالوں کے ساتھ اخبار پڑھنے کا شوق تھا۔یہیں سے لکھنے لکھانے کا شوق ہوا۔کالم نگاری میں میرے پسندیدہ کالم نگار عطاء الحق قاسمی ہیں اور

شاعری میں میرے پسندیدہ شاعر شوکمار بٹالوی اور اسلم کولسری ہیں۔ پسندیدہ شخصیات میں والد صاحب، والدہ محترمہ، بڑے ماموں مرحوم غلام نبی سلہری، بڑے بھائی رانا آصف ندیم اور میرے سسر مرحوم چوہدری مقصود احمد باری ہیں۔

س آپ پنجابی، اردو شاعر، مزاح نگار اور کالم نویس بھی ہیں، ان اصناف ادب میں سے آپ کے دل کے زیادہ قریب کون سی صنف ہے؟

ج میں لکھتے ہوئے اپنے لئے کبھی زبان، موضوع اور صنف کا انتخاب نہیں کرتا ہوں۔ ایک طرح سے کہہ لیں کہ میری ساری تخلیقات حتیٰ کہ نثر بھی خالصتاً قدرت کی عطا یا دوسرے لفظوں میں آمد پر مبنی ہوتی ہیں۔ میں صرف اس کی نوک پلک درست کرتا ہوں اور زیادہ تر اس کی بھی نوبت نہیں آتی۔ اس لحاظ سے میں یہ کہوں گا میں نے آج تک ادب کی جس صنف میں بھی لکھا ہے وہ میرے دل کے قریب ہے۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج انٹرویو کی کتاب ''گفتگو'' کے بعد اب تک میری چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں پنجابی کے دو شعری مجموعے ''کون دلاں دیاں جانے'' اور ''اساں دل نوں مُرشد جان لیا'' کے ساتھ اردو شعری مجموعہ ''اب بھی پھول کھلتے ہیں'' کے علاوہ فکاہیہ کالموں کا مجموعہ ''چلتے چلتے'' شائع ہو چکے ہیں۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج ذاتی تجربات و مشاہدات کے ساتھ اگر مطالعہ کو بھی شامل کر لیں تو ممکن ہے مختلف تخلیق کاروں پر یہ مختلف انداز میں اثر انداز ہوتے ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو بالخصوص شاعری کے حوالے سے میں یہ کہوں گا کہ میری ساری شاعری میرے حالات و واقعات کا نتیجہ ہے۔ میں پورے دعویٰ سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آج تک کبھی کوئی شعر کسی دوسرے شاعر سے متاثر ہو کے نہیں کہا۔ آپ اسے میری نالائقی بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں اتنا قادر الکلام شاعر نہیں ہوں کہ کسی کے آرڈر پر یا کسی سے متاثر ہو کے اس کے رنگ میں کچھ لکھ سکوں۔ اچھا برا لکھنے کا جو بھی انداز ہے خالصتاً میرا اپنا ہے۔ اسی بنیاد پر میں یہ کہتا ہوں کہ میرے اب تک کے شعروں میں کوئی شعر بڑا ہو یا نہ ہو لیکن میرے تمام شعر میری اپنی کہانی ہیں۔ میں کسی کی نقل یا پیروی میں شعوری سطح پر کبھی شعر کہنے کی کوشش نہیں کرتا۔ البتہ میں کالم نگاری میں فکاہیہ

کالم نگاری کے شہنشاہ عطاء الحق قاسمی صاحب سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ شاید معروف ڈرامہ نگار، نقاد اور استاد اصغر ندیم سید نے بھی میری نثر میں اس بات کو محسوس کر کے میری کالموں کی کتاب ''چلتے چلتے'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''اردو مزاح نگاری میں عطاء الحق قاسمی کی منفرد روایت نصف صدی سے تر و تازہ ہے اور اس شاندار روایت سے فیض پانے والوں میں ابرار ندیم سرفہرست ہیں۔ وہ کالم بھی لکھتے ہیں اور مضامین کا اپنا اسلوب بھی رکھتے ہیں۔ سب سے اہم بات اس کی رچاؤ اور رس بھری نثر ہے جو عطاء الحق قاسمی کے بعد مجھے بہت کم یاب دکھائی دیتی ہے۔ ابرار ندیم صحیح معنوں میں تہذیبی تجربے میں گندھی نثر کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ مجھے ابرار ندیم ایک شریر کالم نگار اور ایک چُلبلے مزاح نگار کے ذریعے گُدگدی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ابرار ندیم کے ہاں برکتوں کی بہار ہے۔ وہ جو جملہ لکھتا ہے وہ زندگی سے مالا مال ہوتا ہے۔ میں بہت سے نئے مزاح نگاروں سے مایوس ہوا ہوں۔ جب جب مایوسی ہوتی ہے مجھے ابرار ندیم کا خیال آتا ہے اور میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ عطاء الحق قاسمی کی روایت میں ایک جاندار اور زندہ دل موجود ہے۔''

س ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا کے تمام تر منفی پہلوؤں کے باوجود اس کے بے شمار مثبت پہلو بھی ہیں جن میں سے ایک اچھا پہلو یہ بھی ہے کہ سوشل میڈیا نے ادب کو لامحدود لوگوں تک رسائی دی ہے۔ ذاتی حوالے سے بات کروں تو میرے پنجابی گیت ''دل روندا اے'' اور ''اسی دل نوں مُرشد جان لیا'' جسے نوجوان گلوکار رمضان جانی نے گایا سوشل میڈیا کی بدولت ہی پوری دنیا میں راتوں رات کروڑوں لوگوں تک اتنی تیزی سے پہنچے تھے جس کا سوشل میڈیا سے پہلے شاید تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج میرے خیال میں آج تک جتنے بھی بڑے اور اہم لکھنے والے گزرے ہیں۔ اُن کی تخلیقی سوچ کی بنیاد اُن کے حالات و واقعات سے جنم لیتی دکھائی دیتی ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار معاشرے سے کٹ کے اگر کسی جنگل بیابان میں بسیرا کر لے تو محض تخیل کی بنیاد پر وہ معاشرے کی درست عکاسی نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے اپنی ذات کے حوالے سے چند سوال و جواب اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوں مگر لوگوں کے رویوں کو سمجھنے کے لئے معاشرے کا حصہ بنے بغیر درست جواب تک پہنچنا

شاید ممکن نہ ہو۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کو معاشرے اور اندرون دونوں کے باہمی اشتراک سے ہی لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔

س تخلیقیت سے کیا مراد ہے؟

ج میرے نزدیک بغیر کسی ملاوٹ کے پوری ایمانداری اور سچائی سے بڑے شائستہ اور شستہ انداز میں اپنی فکری سوچ کے اظہار کا نام ہی ایک اچھی اور مثبت تخلیق کہلائی جاسکتی ہے۔

س آپ نے اپنی اب تک کی زندگی سے کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟

ج وہ خوبصورت رشتے ناطے جن کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال تھا۔اُن میں سے بے شمار پیارے اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر یہی قانون قدرت ہے جب درختوں سے پرانے پتے جھڑتے ہیں تو اُن کی جگہ نئی کونپلیں نکل آتی ہیں۔پرانے رشتوں کے کھونے کا ملال اپنی جگہ ہے مگر قدرت نے جو نئے رشتے ناطے دیئے ہیں اُن کی چاہت، محبت اور خوشی اپنی جگہ ہے۔باقی زندگی کے اتنے برس گزارنے کے بعد اب تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی بہت تیز رفتاری سے گزر گئی ہے۔

اینویں آندے جاندے لنگ گئی
جِندڑی اَکھ جُھمکاندے لنگ گئی

OOO

اسد عباس اسدؔ

اسد عباس اسدؔ شاعری میں ایک معتبر نام ہے۔اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو کر سندِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ جتنے خوبصورت وہ شعر کہتے ہیں ویسی ہی خوبصورت نثر نگاری بھی کرتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہی ان کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہو گیا تھا اور اب تک شاعری کی یہ رم جھم جاری ہے۔معتبر زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے مرحوم والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سیاسی میدان میں بھی سرگرم عمل ہیں۔اپنے علاقے کا ایک معروف سیاسی حوالہ ہونے کے ساتھ ساتھ وکالت کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ایسی ہمہ جہت شخصیت اور مصروفیت سے بھرپور زندگی گزارنے والے اسد عباس اسدؔ اپنی پہلی اور آخری محبت شاعری کو قرار دیتے ہیں۔ان سے ہونے والی گفتگو آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

س قارئین کرام کو اپنا تعارف کیسے کروانا پسند کریں گے؟

ج میرا قلمی نام جبکہ اصل نام رائے اسد عباس مارتھ ہے، یکم جنوری 1985 کو گاؤں 2/9R رتھ والا جو کہ دریائے راوی سے نکلنے والی نہر میلسی لنک کینال کے کنارے پر واقع ہے میں پیدا ہوا۔تعلق مارتھ قبیلے سے ہے، پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

س شاعروں کی زندگی میں صحراؤں، سمندروں، پانیوں کا بڑا دخل ہوتا ہے، آپ کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی ہے؟

ج بالکل، میرے گاؤں سے گزرنے والی خوبصورت میلسی کینال کا منظر ایسے ہی ہے۔ جیسے میرا گھر راوی کے کنارے ہے اور ساتھ ساتھ ریت کے ٹیلے، مجھے جب بھی وقت ملتا تھا، میں ان نظاروں سے شاعری کی صورت باتیں کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔اس مٹی سے خوشبوؤں کا بہت گہرا تعلق ہے۔

س میاں چنوں کی ادبی فضا بارے کیا خیال ہے؟

ج میاں چنوں میں چونکہ تعلیمی سلسلہ بھی رہا، میں نے جب سے ادبی حوالوں میں قدم

رکھا،میاں چنوں کی ادبی فضا کومعطر ہی پایا۔بزرگ شعراء کے ساتھ ساتھ سب سے اہم کردار جاپان میں مقیم،میاں چنوں کی پہچان،معروف شاعر،کالم نگار،مترجم عامر بن علی صاحب کا ہے۔جنھوں نے میاں چنوں جیسے چھوٹے شہر میں عالمی مشاعروں کا اہتمام کیا،جبکہ خود اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں۔درجنوں شعری مجموعوں،سفرناموں ودیگر تصانیف کے مصنف ہیں۔ان سے پہلے مشاعروں کی روایت سابق وزیراعلیٰ پنجاب چوہدری غلام حیدر وائیں مرحوم نے ڈالی۔جبکہ نہ صرف میاں چنوں بلکہ اس کے مضافات میں بھی خوبصورت شعراء موجود ہیں۔جیسے نوید حیدر ہاشمی کا ادبی سفر بھی میاں چنوں سے شروع ہوتا۔کویت میں مقیم بدر سیماب میاں چنوں کے نواح چیچہ وطنی اور کسووال سے جی اے نجم اس کی مثالیں ہیں۔

س شاعری کب شروع کی؟

ج 2000ء میں جب میں گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول میاں چنوں میں میٹرک میں تھا۔اسی دوران لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔جو آہستہ آہستہ پروان چڑھتا گیا۔

س پہلا شعری مجموعہ کب شائع ہوا؟

ج 2002ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج میاں چنوں میں تعلیم کے دوران پہلا شعری مجموعہ ’’تیری یاد میں اکثر‘‘ شائع ہوا۔ان دنوں گورنمنٹ ڈگری کالج میاں چنوں میں پروفیسر فدا حسین بلوچ ہوا کرتے تھے۔جن کو خود بھی ادب سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ان کی صحبت میں ادبی سرگرمیاں پروان چڑھی ہیں۔2004میں ’’ہوائیں رقص کرتی ہیں‘‘ پھر ’’مجھے آنکھوں میں رہنے دو‘‘ اس کے بعد ’’مجھ سے رابطہ رکھنا‘‘ اور اب ’’خوشبوؤں کے موسم میں‘‘ شائع ہو چکے ہیں۔

س آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے؟

ج میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں۔لیکن نظمیں بھی لکھتا ہوں۔نعتیہ کلام بھی لکھتا ہوں۔حمد باری تعالیٰ،منقبت بھی لکھتا ہوں۔

س آپ کا تعلق ضلع خانیوال سے ہے،یہاں کی ادبی تخلیقات کے بارے میں کیا کہیں گے؟

ج دنیا کی خوبصورت ادبی تخلیقات ضلع خانیوال اور مضافات میں ہو رہی ہیں۔خاص طور پر ضلع خانیوال کی تحصیلوں میاں چنوں اور کبیر والہ میں جس دھرتی نے بیدل حیدری،قمر رضا شہزاد،فیصل ہاشمی،عمار یاسر مگسی،ریاض شاہد پنہاں اور بے شمار،اسی طرح سرزمین میاں چنوں کے لئے عامر بن علی صاحب کی خدمات لازوال و بے مثال ہیں،عامر صاحب نے میاں چنوں کی ادبی فضا

کو معطر کیا ہوا ہے۔ اورسالک ربانی، مرزانصیر خالد، خورشید مستانہ، مظہر بخاری، ظفر اقبال سجن، عدنان آصف بھٹہ، مصطفی انوراوراب فاروق طراز صاحب بھی میاں چنوں تشریف لا چکے ہیں۔اسی طرح خانیوال میں طاہرنسیم نے یہ شمع روشن کی ہوئی ہے۔سوخانیوال کی ادبی فضاء وماحول بہت زیادہ سازگاراورعمدہ ہے۔

س مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں؟ کیاایک اچھاشاعرہونے کے لئے مشاعروں میں شرکت ضروری ہے؟

ج جی مشاعرے میں بھی پڑھتارہتاہوں۔اچھاشاعرہونے کے لئے قطعاً ضروری نہیں ہے کہ آپ مشاعرے بھی پڑھیں۔اگرمشاعرے ہی پڑھنے سے کوئی بڑاشاعربنتا تومحسن نقوی نے تومشاعرے نہ ہونے کے برابرپڑھے ہیں۔اسی طرح اور بہت سے نام ہیں اورآج کل سوشل میڈیاکے دورمیں تونشست بھی مشاعرے کی حیثیت رکھتی ہے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاعری میں خوبصورت تخیل پیش کریں،آپ کی بات سنی جائے گی۔

س آپ کی زندگی کے کئی پہلوہیں،آپ شاعرہیں،آپ وکیل ہیں۔آپ مقامی چیئرمین یونین کونسل وممبرضلع کونسل بھی رہے ہیں۔تینوں شعبوں کوکیسے نبھاتے ہیں؟

ج شاعری میراعشق ہے جوشروع سے میرے ساتھ ساتھ ہےاوررہے گا۔وکالت میراپیشہ اورذریعہ روزگارہےاورمقامی سیاست میرے مرحوم والدکی امانت ہے،ان کی اچانک وفات کے بعدان سے محبت کرنے والوں نے مجھے اس قابل سمجھااورمنتخب کیا۔میں ضلع کونسل خانیوال کاکم عمرممبرضلع کونسل اورچیئرمین یونین کونسل بھی تھا۔کوشش کرتاہوں تینوں شعبہ ہائے زندگی کوساتھ لیکرچلوں۔

س آپ کے خاندان میں پہلے بھی کوئی شاعرگزراہو؟

ج دلچسپ بات ہے کہ میرے خاندان توکیانسلوں میں بھی کوئی شاعرنہیں تھا۔بلکہ میرے بزرگ تجارت کرتے تھے،میرے ناناجان رائے محمودمارتھ اپنے وقت کے کبڈی کے نامورکھلاڑی تھے۔میرے خاندان سے اوربھی تھے،مثال کے طورپرمیرے کزن اقبال مارتھ بھی کبڈی کے بڑے کھلاڑی تھے۔میرے والدصاحب مقامی سیاسی وسماجی شخصیت جبکہ میں ہی شاعربنا۔

س بطورچیئرمین وممبرضلع کونسل آپ نے کیاکیا؟

ج ہماری خوش قسمتی تھی کہ چیئرمین ضلع کونسل خانیوال رضا سرگانہ صاحب ایک نوجوان چیئرمین ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت شاعر بھی تھے۔ ہم نے طاہر نسیم کے ساتھ مل کر ضلع کونسل مشاعرہ و ادبی تقریبات کا اہتمام کیا۔

س آپ کی غزلیں متعدد گلوکاروں نے گائیں؟

ج جی! کافی گلوکاروں نے گائیں۔ جن میں نو تیج سنگھ، ارشاد علی مہدی، قمر اقبال، نسیم صدیقی، بلال ساجد، ناصر کمال، عارف خان بابر اور باقی۔

س زندگی کا سب سے حسین لمحہ کونسا تھا؟

ج جب خانہ کعبہ کو اپنے ہاتھوں، آنکھوں اور ہونٹوں سے چھوا۔ اسی طرح جب اپنے ہاتھوں، آنکھوں اور ہونٹوں سے آقاؐ کے روضے کی جالیوں کو چھوا۔ زندگی کے سب سے حسین لمحات تھے۔

س زندگی کا سب سے غمگین دن؟

ج دوستوں کی طرح محبت کرنے والے شفیق والد صاحب کی وفات کا دن 10 مارچ 2011 زندگی کا سب سے غمگین دن ہے۔ جس کے بعد زندگی جو پھولوں کی سیج تھی، کانٹوں کے بستر کی طرح لگی۔ مگر پھر بھی یوں لگا جیسے وہ اب بھی میرے ساتھ ساتھ ہوں۔

س شاعروں اور ادیبوں کے لئے کیا پیغام دیں گے؟

ج آپ کے پاس قلم ہے۔ محبتیں بانٹیں، بے جا تنقید سے گریز کریں۔ سینئر ادیبوں کی عزت کریں۔

س ادبی فضاء کو مزید معطر کیسے کیا جا سکتا ہے؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ ادبی فضاء کو مزید معطر کرنے کے لئے ادبی رسائل کا اہم کردار ہے اور پاکستان میں اس وقت ماہنامہ ''ارژنگ'' لاہور اس میں بہت زیادہ نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی سے ''دنیائے ادب'' بھی بہترین خدمات سرانجام کر رہا ہے۔

OOO

اعجاز توکل خاں

شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔موسیقی ہماری سرزمین کے لوگوں کے مزاج میں رچی بسی ہوئی ہے۔اساتذہ فن کے نزدیک اردو غزل کی تو بنیاد ہی موسیقی پر ہے۔وزن سے خارج شاعری سر اور تال سے بھی خالی ہوتی ہے۔ترنم کی کسوٹی پر پورے اترنے والے شعر وسخن کے اوزان بھی عموماً درست ہی ہوتے ہیں۔بے وزن شاعری بے سری بھی ہوتی ہے۔ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی فنکار کو دونوں علوم پر بیک وقت استادانہ مہارت حاصل ہو۔اعجاز توکل خاں ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت ہیں جو باکمال شاعر ہیں اور موسیقی کے منجھے ہوئے استاد بھی ہیں،صدیوں سے برصغیر پاک وہند میں شعبہ موسیقی میں چند گھرانوں کا طوطی بولتا آیا ہے۔شاہی گوالیار گھرانہ انہی گنے چنے گھرانوں میں سے ایک ہے جس کے اعجاز توکل خاں چشم و چراغ ہیں۔شاعری اور موسیقی کے شعبوں میں ان کا مخصوص اور جداگانہ لب ولہجہ ہے،وہ بھیڑ کے آدمی نہیں ہیں بلکہ اپنی انفرادیت اور کمال فن کے سبب جانے پہچانے جاتے ہیں۔میری خوش بختی کہ وہ میرے گھر تشریف لائے اور انہوں نے انٹرویو دینے کا وقت دیا۔

س ہمارے ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مشاہیر سے انٹرویو کے دوران دنیا بھر کے موضوعات پر طویل ترین مکالمے بھی بنیادی معلومات فراہم کرنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ ممدوح پیدا کب اور کہاں ہوئے؟ابتدائی زندگی کیسی تھی؟ہماری خواہش پر سب سے پہلے اس سوال کا جواب دیں گے؟

ج رحیم یار خان میں میری پیدائش ہوئی تھی۔یہ سن 1962 کی بات ہے۔ابتدائی تعلیم بھی میں نے وہیں حاصل کی تھی۔میں آٹھویں جماعت تک رحیم یار خان میں پڑھا ہوں،پھر والد صاحب کی بہاولپور آرٹ کونسل میں آرٹ ڈائریکٹر کے طور پر تعیناتی ہو گئی۔میں بھی دیگر اہل خانہ کے ہمراہ بہاولپور آ گیا اور تب سے اب تک وہیں پر مقیم ہوں۔

س ادبی زندگی کے آغاز سفر بارے بتائیں؟

ج یہ سن 1978 کی بات ہے مجھے عدمؔ پڑھنے کا موقع ملا اور انہوں نے بے حد متاثر کیا۔ میں نے بہت ڈوب کر انہیں پڑھا اور اسی سال جب میں میٹرک میں تھا میں نے شعر کہنا شروع کر دیا۔ چونکہ میرا موسیقی کے گھرانے سے تعلق تھا اور اسی سبب سے میرے اندر ردھم تو موجود تھا۔ طبیعت میں موزونیت بھی پائی جاتی تھی جو کہ شعر کہنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا میٹرک سے لے کر اب تک یہ شعری سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری ہے۔

س آپ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں تدریس سے بھی منسلک رہے ہیں؟

ج میں نے زرعی یونیورسٹی میں موسیقی کا شعبہ قائم کیا تھا۔ اس شعبے کا سربراہ بھی میں ہی تھا۔ 2018 تک موسیقی کی تدریس کے متعلق یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے بعد میں بہاولپور میں واپس آ گیا۔

س آپ کے گھرانے کا شمار برصغیر پاک و ہند میں موسیقی کے بڑے گھرانوں میں ہوتا ہے ہمیں اس بارے میں کچھ بتایئے اور اپنے دادا استاد توکل حسین خاں کے متعلق بھی قارئین جاننا چاہیں گے؟

ج کلاسیقی اور روایتی موسیقی جنوبی ایشیا کے مشرق میں صدیوں سے کچھ گھرانوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔ پٹیالہ گھرانہ، شام چوراسی گھرانہ، دہلی گھرانہ، تلونڈی گھرانہ، آگرہ گھرانہ، میرا تعلق گوالیار گھرانے سے ہے۔ میں استاد توکل خاں صاحب کا پوتا ہوں، توکل حسین خاں موسیقی کی رائل فیملی سے تعلق رکھنے والی وہ شخصیت ہیں جو مثال بنے ہیں۔ آج بھی جب گویے آپس میں جھگڑتے ہیں تو ایک دوسری کو کہتے سنائی دیتے ہیں کہ تم کوئی توکل خاں ہو؟ تم کیا ہم پر توکل خاں لگے ہوئے ہو؟ ایڈا آیا توں توکل خاں، ریندا نئیں:۔ یہ محاورہ بن چکا ہے۔

س بڑے غلام علی خاں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ استاد توکل خاں سے متاثر بھی تھے اور خوف زدہ بھی رہتے تھے، اس بارے میں ہمیں کچھ بتائیں گے؟

ج معروف طبلہ نواز ذاکر حسین کے بہنوئی اور اللہ رکھا کے داماد ایوب اولیا نے ایک کتاب لکھی ہے۔ آج کل برطانیہ میں مقیم ایوب اولیاء لکھتے ہیں کہ جب بڑے غلام علی خاں کو استاد توکل خاں کی وفات کی خبر ملی تو وہ پیہم خاموش ہو گئے۔ شاگردوں اور دوستوں نے خاموشی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے آج وہ آدمی فوت ہو گیا ہے جس سے میں نے ساری زندگی خوف کھایا ہے۔ یہ ان کا علمی و فنی دبدبہ تھا کہ بڑے غلام علی خاں جیسا استاد فنکار بھی ان کے سامنے گانے سے گھبراتا تھا۔ یہ ان

کے فن کا اعتراف بھی ہے۔

س موسیقی پر گفتگو ہو رہی ہے تو ہمیں یہ بتا دیں کہ نصرت فتح علی خاں کا کون سا گھرانہ تھا؟

ج نصرت فتح علی خاں کا قوال بچہ گھرانہ ہے۔ چونکہ ان کے بزرگ بھی قوالی سے منسلک رہے ہیں، اس لئے یہ خاندان قوال سے ہی منسوب ومعروف ہے۔

س آپ کی شاعری معاصرانہ شاعری سے کیسے مختلف ہے؟

ج تخلیق کار خاص آدمی ہوتا ہے، اس کا کام بھی خصوصی ہونا چاہئیے۔ میری آغاز سفر سے ہی یہ کوشش اور خواہش رہی ہے کہ میرا کام روٹین سے ہٹ کر ہونا چاہئیے۔ میری تب سے یہی دعا بھی تھی کہ میرا کام باقی سب سے الگ کردے میرے خدایا۔ میں نے شاعری کا مطالعہ بہت زیادہ کیا ہے۔ جب آپ اپنا راستہ نیا اور الگ اختیار کرتے ہیں تو پھر نئی چیزیں آپ کی شاعری کا حصہ بنتی ہیں۔ جو نئی چیزیں آپ کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں، میرے خیال میں انہیں آپ کی شاعری کا بھی حصہ بن جانا چاہئیے۔ ایسا اظہار یہ جسے پڑھ کر قاری خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو جائے۔ میری نظر میں تو شعریت کی تعریف بھی یہی ہے۔ تازہ کاری ہر دور میں قیمتی رہی ہے اور رہے گی۔ شاعری میں بہت سارا کام ہو چکا تھا، اس لئے نیا راستہ اپنانا آسان نہیں تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا کی۔ اس ضمن میں ظفر اقبال جیسے اساتذہ فن کا بھی اہم کردار ہے جنہوں نے غزل کے کلیشے کو توڑا ہے۔

س آپ نے ظفر اقبال کا ذکر کیا، شمس الرحمان فاروقی نے انہیں عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے؟

ج مجھے شمس الرحمان فاروقی صاحب کے گھر الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ چند گھنٹے میں نے وہاں گزارے اور سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ شمس الرحمان فاروقی صاحب کے تجزیے سے مجھے اتفاق ہے۔

س آپ ہندوستان بھی آتے جاتے رہتے ہیں، وہاں بھی آپ کے مداحین کی کثیر تعداد موجود ہے۔ دونوں ملکوں کے ماحول میں کیا فرق دیکھتے ہیں؟

ج بھارت اور پاکستان میں سامعین کا فرق ہے۔ ان کا سامع بہت زیادہ مہذب ہے۔ مثال کے طور پر میں 2004 میں پہلی مرتبہ انڈیا گیا۔ پہلے دن ہی میرا پروموٹر مجھے ایک جگہ گانے کے لئے لے گیا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ پچاس ہزار کا مجمع ہے۔ پنڈت گرجو مہاراج چکرورتی، طبلے

پر استاد ذاکر حسین اسٹیج پر براجمان تھے۔اس اسٹیج پر جب میں پچاس ہزار افراد کے سامنے پرفارم کر رہا تھا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا یہاں کوئی بھی نہیں بیٹھا ہوا۔ایسا سکون تھا اور اتنے انہماک سے لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔

س گویا ہندوستان میں بھی آپ کا بھرپور تعارف موجود ہے؟

ج ہمارے پاکستان کی غزل ایک بہت خاص چیز ہے۔شاعری میں بھی اور موسیقی میں بھی۔ بھارت میں مہدی حسن ،غلام علی یا فریدہ خانم کے پائے کا کوئی بھی غزل گانے والا فنکار موجود نہیں ہے۔اسی طرح شاعری میں جیسی غزل ہمارے ہاں کہی جارہی ہے ویسی اور کہیں بھی نہیں ہے۔میرا حوالہ چونکہ شاعر اور گلوکار دونوں کا ہے اور موسیقی کے گھرانے سے تعلق کے سبب سب سے زیادہ میں وہاں ہٹ ہو جاتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ داد ملتی۔غزل کو وہاں کے لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں۔لوگ کہتے تھے ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آپ شاعر زیادہ اچھے ہیں یا گلوکار۔میں اپنے خاندان کی سترہویں پشت ہوں جو گائیکی سے منسلک ہے۔میرے بچے اٹھارہویں پشت ہیں جو کہ گا رہی ہے۔

س بھارت میں پذیرائی کا کوئی واقعہ جو یاد رہ گیا ہو؟

ج کیا بتاؤں جی کہ جب ہندوستان سے رخصت ہونے لگتے ہیں تو لوگ رونا شروع کر دیتے ہیں،اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں۔کسٹم کے حکام سامان تک چیک نہیں کرتے کہ خاں صاحب آپ آ گئے بس یہی بڑی بات ہے۔مقبول گلوکار ہنس راج ہنس جو کہ طبیعتاً صوفی منش ہے، مجھے اپنے گھر لے گیا اور کہنے لگا کہ اس کے تمام کمروں میں آپ کے قدموں کے نشان لگوانے ہیں تا کہ برکت رہے۔موسیقی ہندوستان میں مذہب کا حصہ بن چکی ہے اور اسے روحانی تکریم حاصل ہے۔

س آپ کی اب تک کتنی کتابیں اور شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج میری اب تک سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ 1999 میں شائع ہوا تھا۔ پانچ شعری مجموعے اردو اور دو پنجابی شعری مجموعے اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔

س کبھی نثر کو تخلیق اور اظہار کا ذریعہ بنانے کا خیال نہیں آیا؟

ج کبھی بھی نہیں۔شاعری اور موسیقی میرے دو عشق ہیں۔ساری توانائی اور وقت انہی کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔تمام تخلیقی صلاحیت بھی۔انہی میں زندہ رہتا ہوں اور سانس لیتا ہوں۔

س پاکستان میں آرٹ کی زبوں حالی کے بارے میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟

ج میں موجودہ ادبی وفنی منظرنامے کو ایک مختلف نظر سے دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں آرٹ ہمیشہ سے خاص لوگوں کے متعلق چیز رہی ہے۔ خاص لوگ ہی آرٹ تخلیق کرتے ہیں اور خاص لوگ ہی اسے سراہتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آرٹ عام لوگوں کی چیز نہیں ہے۔ عامیوں نے کبھی فن تخلیق کیا ہے اور نہ ہی عامی فن کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ میری نظر میں بہتر یہی ہوگا کہ یہ آرٹ خاص لوگوں میں ہی رہے۔ عام لوگوں کے یہ مطلب کی چیز ہی نہیں ہے۔

OOO

امجد اقبال امجدؔ

پاکستان سے باہر تارکین وطن پاکستانیوں کی سب سے بڑی آبادی متحدہ عرب امارات میں مقیم ہے۔ یواے ای میں مقیم پاکستانیوں کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ کے قریب ہے جو مقامی آبادی سے دوگنا سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اسی تناسب کے سبب یہ دیس منی پاکستان محسوس ہوتا ہے۔ اس احساس کا سبب فقط ہماری وہاں مقیم آبادی نہیں بلکہ پاکستان اور اردو زبان کے روابط ہیں۔ پاکستانی ثقافت اور اردو زبان وادب کے متحدہ عرب امارات کے ساتھ یہ ثقافتی رشتے مضبوط بنانے کے لیے کوشاں نامور شخصیات میں سے ایک امجد اقبال امجدؔ ہیں۔ وہ صاحب دیوان شاعر ہیں اور پاکستانی ایسوسی ایشن، دوبئی لٹریری سوسائٹی کے صدر بھی ہیں۔ گزشتہ دنوں دوبئی جانے کا موقع ملا تو ان کی دعوت پر پاکستان سنٹر، اور لائبریری کا بھی دورہ کیا۔ گرینڈ حیات ہوٹل میں انہوں نے ایک شاندار شعری نشست کا میرے اعزاز میں اہتمام کیا۔ کچھ فراغت محسوس ہوئی تو میں نے قارئین کے لیے ان سے انٹرویو کی فرمائش کر دی۔ یہ رسمی گفتگو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

س ابتدائی زندگی سے بات کی ابتدا کرتے ہیں۔ پیدائش کہاں ہوئی؟ ابتدائی زندگی کیسے گزری؟

ج میری پیدائش کھاریاں کے نواح میں واقع ایک گاؤں سدھ میں ہوئی اور وہاں ہی میری ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہ گاؤں میجر عزیز بھٹی شہید نشان حیدر کے گاؤں کے بالکل پاس ہی ہے۔ میرے والد صاحب نے گاؤں میں ایک لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ وہ ذہنی طور پر جماعت اسلامی سے نظریاتی وابستگی رکھتے تھے۔ میری عمر ابھی بہت چھوٹی تھی جب انہوں نے مجھے اس لائبریری کا انچارج بنا دیا۔ جو بھی آدمی لائبریری سے کتاب لے کر جاتا اس کے نام کا اندراج، جو کتاب واپس کرتا اس کا اندراج میں کرتا، اگر کوئی پندرہ دن سے زیادہ کتاب واپس نہ کرتا تو پھر اس سے میں دو روپیہ جرمانہ وصول کرتا تھا۔ میرے خیال میں یہیں سے میری کتابوں اور حرفوں سے دوستی شروع ہوئی تھی۔

س لکھنے کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ج جیسا کہ میں نے عرض کیا طبیعت میں موزونیت تو شروع سے ہی تھی اور پڑھنے لکھنے کا ماحول بھی میسر تھا، تین دہائیاں قبل جب میں دوبئی آیا تو یہاں پر سلیم جعفری کی قائم کردہ ایک ادبی تنظیم سے منسلک ہو گیا۔ انہوں نے یہاں جشن فروغ اردو ادب کے نام سے سالانہ مشاعرے کی خوبصورت روایت قائم کی۔ پاکستان سے بڑے بڑے نامور شعراء کو مدعو کیا جاتا اور ہندوستان سے بھی اردو زبان کے سرکردہ شعراء کرام ان کی دعوت پر دوبئی آنے لگے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیگم صاحبہ سے ملکر میں نے یہ شمع جلائے رکھی اور ابھی تک کسی نہ کسی رنگ میں ادبی و علمی سلسلہ جاری ہے۔

س آپ صاحب دیوان شاعر ہیں، اپنی تخلیقات کے بارے میں قارئین کو کچھ بتائیں؟

ج میرا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے دل'' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اس کی تقریب رونمائی مگر ہم نے یہاں دوبئی میں ہی رکھی تھی۔ دوستوں نے بھرپور پذیرائی بخشی اور قارئین نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس کتاب کی رونمائی اور پذیرائی کی آدھ درجن تقریبات منعقد ہوئیں۔ دوسری کتاب لاہور سے نستعلیق پبلشرز نے شائع کی ہے۔ اعلیٰ طباعت کے ساتھ ساتھ اس میں میرا شعری سفر بھی ارتقائی اعتبار سے اگلی منزلوں کی طرف رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بھی پاکستان اور دوبئی میں کئی تقریبات منعقد ہوئیں۔ شعر و سخن سے وابستہ احباب نے بڑی پذیرائی بخشی۔

س آپ کی دوسری کتاب کی تقریب رونمائی جو لاہور میں ہوئی اس میں حاضری کا موقع تو ملا تھا مگر نام ذہن سے اتر گیا۔ بھلا کیا نام تھا؟

ج دوسرے شعری مجموعے کا نام ''بارش والی شام'' تھا۔ کتاب کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لو گوں نے بہت پسند کیا۔

س آپ نثر بھی لکھتے ہیں۔؟

ج میں نے چند افسانے بھی تحریر کیے ہیں اور مضامین بھی نثر لکھنا بھی مجھے پسند ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا حقیقی تخلیقی جوہر شاعری میں ہی اظہار پاتا ہے۔

س آپ کے علاوہ بھی متحدہ عرب امارات میں اردو شاعر موجود ہیں؟

ج مقامی شعراء میں ڈاکٹر زبیر فاروق اچھے شاعر ہیں۔ حالانکہ وہ عرب ہیں مگر اردو میں شعر کہتے ہیں، شفیق سلیمی اور سلیمان جاذب بھی اچھا شعر کہتے ہیں۔

س آپ نے پاکستان کی ثقافت اور اردو زبان کی متحدہ عرب امارات میں ترویج کے لیے بہت فعال کردار ادا کیا ہے، اس وقت ہماری ثقافت اور اردو زبان یو اے ای میں کہاں کھڑی ہے؟

ج جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں نے اپنے ادبی اور سماجی خدمت کا آغاز ''شام سخن''تنظیم سے کیا۔اس کا سربراہ اور مدارالمہام بھی رہا،آج کل پاکستان ایسوسی ایشن دوبئی کے ادبی فورم کا میں صدر ہوں اس سفر میں ہم نے پاکستان اوراردوزبان کے لیے بڑی دل جمی سے کام کیا۔ آج جب اردو زبان اور پاکستانی ثقافت کا دوبئی میں چرچا دیکھتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ہردوسراشخص یہاں اردوجانتا ہے۔اردوبالخصوص دوبئی کی توقومی زبان کی حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے۔وطن سے دور وطن کی خوشبو کی مثال دیکھنی ہوتو وہ متحدہ عرب امارات ہے،یعنی پاکستانی ثقافت اس قدر یہاں رچ بس گئی ہے۔

س آپ نے مجھے پاکستان سنٹر کا دورہ کروایا اوراس میں قائم اردولائبریری بھی ملاحظہ کی،اتنا بڑا پراجیکٹ آپ لوگوں نے حکومتی مدد کے بغیر اپنی مدد آپ کے تحت کیسے مکمل کیا؟

ج ہماری خوش قسمتی کہ دوبئی حکومت نے ہمیں چند دیگر دوست ممالک کے ساتھ ایک وسیع قطعہ اراضی تحفے میں دیا۔ پاکستانی کمیونٹی میں ہم نے Fund Raising کرکے ایک عظیم الشان آڈیٹوریم بنایا جس میں آپ نے دیکھا ایک ہزارلوگ با آسانی بیٹھ سکتے ہیں،کھیلوں کے مقابلے ہوسکتے ہیں۔، پاکستانیوں کے مفت علاج کے لیے اسی میں اسپتال بن رہا ہے جوکہ اپنی تعمیر کے آخری مراحل میں ہے۔ باسکٹ بال، بیڈمنٹن اورٹینس کے میدان بنائے گئے ہیں۔ایک پاکستانی اہل دل کی فیملی نے اردولائبریری عطیہ کی ہے۔جوانہی کے نام سے نیازعلی لائبریری مشرق وسطیٰ میں اردوکتابوں کا انشاءاللہ سب سے بڑاذخیرہ ہوگی۔

س پاکستان سنٹر میں کوئی سکول بھی کھول رہے ہیں؟

ج یہاں پر پہلے ہی بفضل خدا گیارہ پاکستانی سکول قائم ہیں اور بڑے بھر پور انداز میں طالب علموں کو پاکستان اور اردوزبان سے مکمل تعارف فراہم کررہے ہیں۔آبادی کی غالب اکثریت تو ویسے ہی مسلمان ہے اور ریاست کا بنیادی ڈھانچہ بھی اسلامی ہے۔اس لیے وہ تو ہم تارکین وطن کے لیے پہلے ہی ایک نعمت میسر ہے۔

س آپ کا ادبی سفر کیسا چل رہا ہے؟ آج کل کسی موضوع پر زیادہ کام کر رہے ہیں؟

ج میں شعروسخن سے اپنی وابستگی باعث عزت سمجھتا ہوں۔شعری سفر رواں دواں ہے البتہ نثر ذرا کم کم لکھتا ہوں۔شعروسخن تو سانس کے ساتھ منسلک لگتے ہیں۔سانس لیتے ہیں،شعر کہتے ہیں۔

OOO

بشریٰ اعجاز

پنجابی صوفیانہ شاعری میں جو جذب و مستی ہے وہ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں ہو۔ بابا فریدؒ کی کوک سے لے کر حضرت سلطان باہوؒ کی ہوک تک سیدھے سادھے لفظوں کے پردے میں کہی جانے والی باتوں میں جانے کیا اثر ہے جو دلوں کے راستے روحوں میں اتر جاتا ہے۔ پنجابی صوفیانہ شاعری میں وہ سفر جو بابا فریدؒ سے شروع ہوا تھا، میاں ہدایت اللہؒ پر ختم ہو جاتا ہے۔ میاں ہدایت اللہؒ پنجابی زبان کے آخری صوفی شاعر مانے جاتے ہیں۔ ان کے بعد شاعری کے حوالے سے ویسے تو بڑے بڑے نام ہیں جیسے حکیم ناصر، مولا بخش کشتہ، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، فیروز دین، شرف، غلام رسول عالمپوری، شریف کنجاہی، عارف عبدالمتین، احمد راہی، ڈاکٹر یونس احقر اور منیر نیازی وغیرہ، مگر ان سب کے ہاں صوفیانہ رنگ کی بجائے دنیاوی موضوعات زیادہ ملتے ہیں، خال خال ان کے ہاں صوفیانہ مضامین بھی ملتے ہیں مگر ان کی شاعری کا جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ صوفیانہ شاعری کے برعکس ہے۔ مثال کے طور پر عارف عبدالمتین کی شاعری میں ایسے موضوعات بھی ہیں جو صوفیانہ رنگ لئے ہوئے ہیں لیکن کثرت ان کے ہاں بھی دنیاوی موضوعات کی ہے۔ اس کے برعکس جب بشریٰ اعجاز کے پنجابی شعری مجموعہ ''پبھاں بھار'' کا مطالعہ کریں تو اس کی شاعری پر حیرت انگیز حد تک صوفیانہ شاعری کا گمان گزرتا ہے گویا پنجابی صوفیانہ شاعری کا وہ سلسلہ جو میاں ہدایت اللہؒ پر ختم ہوتا نظر آتا تھا، ایک لمبے وقفے کے بعد بشریٰ اعجاز کے کلام کی صورت میں پھر سے جاری ہو گیا ہے۔ بشریٰ اعجاز اپنے پہلے ہی مجموعے سے نا صرف ادبی حلقوں میں اپنی اہمیت منوا چکی ہیں بلکہ عوام میں بھی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ پنجابی شعری مجموعے کے علاوہ بشریٰ اعجاز کے اردو افسانوں کا مجموعہ ''بارہ آنے کی عورت'' اور ''سفر نامہ حجاز'' بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔

س ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیسے کیا؟

ج میں نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز 1991ء میں کیا۔ 1994ء میں میرا پہلا پنجابی شاعری مجموعہ ''پبھاں بھار'' شائع ہوا جس کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی، جس سے مجھ میں لکھنے کا مزید

حوصلہ پیدا ہوا لیکن اس سے پہلے ''عرض حال'' کے عنوان سے میرا ''سفر نامہ حجاز'' شائع ہو چکا تھا۔ ''پیھاں بھار'' کے فورا بعد میرا اردو افسانوں کا مجموعہ ''بارہ آنے کی عورت'' شائع ہوا تھا۔

س نثری شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ اسے شاعری سمجھتی ہیں؟

ج نثری نظم کے حق اور مخالفت میں کافی کچھ کہا جا چکا ہے اور اب بھی یہ بحث زور وشور سے جاری ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ نثری شاعری کا مستقبل کیا ہے، میں ذاتی طور پر نثری شاعری کو پسند کرتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ بعض اوقات ایسا خیال آ جاتا ہے جو شاعری کی مروجہ پابندیوں کے اندر شاعر کی گرفت میں نہیں آتا۔ ایسی صورت میں نثری شاعری بہترین ذریعہ اظہار ہے۔ شروع میں، میں نثری شاعری بالکل نہیں کرتی تھی لیکن پچھلے دنوں میں چند نثری نظمیں کہی ہیں جو سننے والوں نے کافی پسند کی ہیں۔

س ڈش اور انٹرنیٹ کے دور میں کتاب کا کیا مستقبل ہے؟

ج بہت برا مستقبل ہے۔ نئی نسل الیکٹرانک میڈیا کی دیوانی ہے جس کی وجہ سے کتابوں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ حال یہ ہے کہ تیرہ کروڑ سے زائد آبادی والے ملک میں اچھی سے اچھی کتاب گیارہ سو سے زیادہ نہیں چھپتی ہمارے بچپن میں کتاب کا بہت اہم رول تھا بلکہ ہماری عیاشی ہی یہی ہوتی تھی کہ اپنے جیب خرچ سے غیر نصابی کتابیں خرید کر پڑھتے تھے۔ اب صورت حال مکمل تبدیل ہوگئی ہے۔ نئی نسل کتاب کی بجائے الیکٹرانک میڈیا میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔ رہی سہی کسر رنگ برنگ فیشن میگزین پوری کر دیتے ہیں جن کی موجودگی میں بغیر رنگوں اور تصویروں کے سادہ لفظوں کی کتابیں بور لگتی ہیں۔

س آپ کے خیال میں نئی نسل کو کتاب کی جانب کیسے راغب کیا جا سکتا ہے؟

ج میرے خیال میں تو سب سے پہلے ہمیں گھریلو سطح پر بچوں کو کتاب کی اہمیت کے بارے میں بتانا ہوگا۔ اس کے بعد کوشش کرنی چاہیے کہ ہر محلے میں سکول اور کالج کی سطح پر لائبریریاں بنیں، اس کے برعکس صورتحال یہ ہے کہ ہزاروں گھروں پر مشتمل یہ علاقہ (ڈیفنس سوسائٹی) جس میں ہم بیٹھے ہیں، اس میں ایک بھی لائبریری نہیں ہے۔

س شاعری میں آپ کس سے متاثر ہیں؟

ج مختلف ادوار میں مختلف شعراء کو پسند کیا ہے۔ ویسے بھی میرے نزدیک اہمیت شعر کی ہے، شاعر کی نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس بات سے قطع نظر کہ شعر کس شاعر کا ہے، اچھے شعر

پر داد دیتی ہوں لیکن مجموعی طور پر جن شاعروں نے مجھ پر اثر چھوڑا ہے وہ فیض احمد فیض، مصطفی زیدی، ن م راشد اور احمد فراز ہیں۔

س نئے لکھنے والوں میں سے کن لوگوں نے متاثر کیا؟

ج نئے لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں خاص طور پر مضافات میں بہت اچھی شاعری ہو رہی ہے۔ مجھے سب کے نام تو یاد نہیں لیکن جو چیدہ چیدہ نام یاد ہیں ان میں نصیر احمد ناصر، رفیق سندیلوی، علی محمد فرشی اور فرخ یار شامل ہیں۔

س ادیبوں کے مجموعی کردار سے کہاں تک مطمئن ہیں؟

ج جس طرح معاشرے میں اچھے برے دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اسی طرح ادیبوں میں بھی دونوں قسمیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے ادیبوں سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ ٹھیک ہے ادیب عام آدمی کی نسبت زیادہ حساس، زیادہ پڑھا لکھا ہوتا ہے لیکن بہر حال ادیب بھی انسان ہوتا ہے جو غلطی کر سکتا ہے اور ادیب غلطیاں کرتے بھی ہیں لیکن مجموعی حوالے سے ادیبوں کے کردار کے حوالے سے بات کریں تو میں کہوں گی کہ میں ادیبوں کے مجموعی کردار سے بالکل مطمئن ہوں۔

س کسی بھی شاعر کی شہرت میں اس کی شخصیت کا عمل دخل کس حد تک ہوتا ہے؟

ج صرف شخصیت کے بل بوتے پر آپ ادب میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابتداء میں آپ کو تھوڑا بہت ایڈوانٹیج تو مل سکتا ہے لیکن آگے جانے کے لئے، دوسرے لفظوں میں نام پیدا کرنے کے لئے آپ کی تخلیق ہی کام آئے گی۔ اس حوالے سے کچھ مثالیں ہیں کہ چند لوگوں کو شہرت صرف ان کی پی آر یا شخصیت کی وجہ سے ملی لیکن ان کی شہرت کا یہ عرصہ انتہائی مختصر رہا۔ جونہی یہ لوگ میڈیا سے غائب ہوئے، لوگوں نے انہیں بھلا دیا۔ وجہ صرف اس کی یہی تھی کہ بعض لوگوں نے اپنی ساری عمر کے بعد ایک کتاب لکھی اور ادب میں ان کی حیثیت ایک استاد کی بن گئی اس کے مقابلے میں کچھ لوگ دھڑا دھڑ کتابیں چھپوا رہے ہیں مگر ان کی ادبی حیثیت صفر ہے کیونکہ معیار کے بجائے مقدار پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔

س ادب میں سینئر جونیئر کا معیار عمر ہونا چاہئے یا کارکردگی؟

ج میرے خیال میں تو کارکردگی معیار ہونا چاہیے۔

س پنجابی زبان میں جو ادب آج کل لکھا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج میں سمجھتی ہوں کہ پنجابی زبان میں جو کچھ آج کل لکھا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ اچھا لکھا جا سکتا ہے۔

س خواتین شاعرات کے حوالے سے آپ سمجھتی ہیں کہ ان کے ساتھ ادبی حلقوں میں امتیازی سلوک ہوتا ہے؟

ج بالکل، ہمارے ادبی حلقوں میں خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک ہو رہا ہے جب کہ میں سمجھتی ہوں کہ عورت کو عورت کے خول میں بند کر کے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس کے ٹیلنٹ کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

س پروین شاکر کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے، آپ کے نزدیک شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، نوشی گیلانی، منصورہ احمد، یاسمین حمید، بشریٰ اعجاز اور شہناز مزمل میں سے کون اس خلا کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

ج جہاں تک پروین شاکر کی شاعری اور شخصیت کا تعلق ہے، اس کی اپنی حیثیت تھی اور رہے گی۔ کسی کے جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ اپنی جگہ رہتا ہے، نئے آنے والے یا دوسرے لوگ اپنی جگہ تو بنا سکتے ہیں لیکن کسی جانے والے کی جگہ پر کریں یہ ممکن نہیں ہے۔ پروین شاکر ایک بڑی شاعرہ تھی اور اس نے شاعری کے لئے جو قربانیاں دی ہیں، یہ اسی کی ہمت تھی۔ دوسری خواتین شاعرات شاید ہی ایسی ہمت کا مظاہرہ کر سکیں۔

س فلمی شاعری کو ادب سمجھتی ہیں؟

ج آج کل کی فلمی شاعری کو تو ادب نہیں سمجھتی لیکن ایک دور تھا جب فلموں میں اس معیار کے گیت لکھے جاتے تھے کہ بلاشبہ وہ ہر حوالے سے ادبی معیار پر پورے اترتے تھے لیکن اس کے باوجود پتا نہیں کہ کیوں اس فلمی شاعری کو ادب میں شمار نہیں کیا جاتا جبکہ آج کل کتابوں میں ادب کے نام پر دھڑا دھڑ جو کچھ چھپ رہا ہے، اس کو ادب کہا جاتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ سراسر زیادتی ہے اور اس دوہرے معیار کو ختم ہونا چاہیے۔

س اگر آپ کو کسی جانب سے آفر ہو تو آپ فلموں کے لئے گیت لکھیں گی؟

ج بالکل لکھوں گی لیکن اس شرط پر کہ فلم کی کہانی معیاری ہو۔

س آپ کی نئی آنے والی کتابیں کونسی ہیں اور کب آ رہی ہیں؟

ج عنقریب میری دو کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں، ان میں سے ایک ''بھلیکھا'' کے نام سے پنجابی شعری مجموعہ ہے جبکہ دوسرا انڈیا کا سفرنامہ ہے۔

بلقیس ریاض

لکھاری وہ ہوتا ہے جو لکھتا رہے۔ گزشتہ نصف صدی سے تخلیق کے عمل میں مصروف بلقیس ریاض ایسی ہی لکھاری ہیں جو مسلسل تخلیقی عمل میں سرگرداں رہی ہیں۔ بیس کے قریب ناول اور سات افسانوی مجموعوں کے علاوہ دو درجن سفرنامے تحریر کر چکی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے کالم شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ گزشتہ دنوں لاہور کے ایک پنج ستارہ ہوٹل میں ان کی پچاسویں کتاب کی اشاعت پر ایک بھرپور تقریب رونمائی کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے ان کا انٹرویو کیا جو حاضر خدمت ہے۔

س سب سے پہلے تو مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ کی کتب اشاعت کی نصف سنچری مکمل کر گئی ہیں۔

ج بہت بہت شکریہ۔

س میں شروع سے بات کا آغاز کرنا چاہوں گا، پیدائش کہاں ہوئی؟ بچپن کہاں گزرا؟

ج میری پیدائش لاہور میں ہوئی اور بچپن بھی اسی شہر میں گزرا۔ بچپن ہی سے مجھے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ پڑھتے پڑھتے ہی میں نے لکھنا شروع کر دیا۔

س گویا آپ نے تو بچپن سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا؟

ج جی ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں کانونٹ آف جیسس اینڈ میری میں پڑھتی تھی۔ اس زمانے میں پانچویں جماعت تک اردو ہمارے اسکول میں نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ میری امی کو فکر ہوئی کہ اس بارے میں کچھ کرنا چاہئے، ہمیں جو مولوی صاحب قرآن شریف پڑھانے آتے تھے، میری والدہ کے کہنے پر انہوں نے ہی ہمیں اردو زبان پڑھانا شروع کر دی۔ پانچویں جماعت میں ہوئی تو ہماری ٹیچر نے پوچھا کہ کسی بچی کو اردو پڑھنا آتی ہے؟ تو میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی کہ آپ بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سنائیں، اس عمل سے مجھے مزید شوق پیدا ہو گیا۔

س لکھنے کا سلسلہ کیسے آگے بڑھا؟ پہلی کتاب کب شائع ہوئی؟

ج لکھتے لکھتے میں نے ایک ناول مکمل کر لیا، اس کا عنوان ''دل اور دیوار'' تھا۔ جو بعد از اں

ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ بھی ہوا، ڈرامے کی شکل میں۔ اسکے بعد میرا رجحان افسانہ نگاری کی طرف ہوااور پھر کالم لکھنا بھی شروع کر دیا۔ یہ 1980 کی بات ہے جب میرا پہلا ناول شائع ہوااور اس کی اشاعت کا سارا اہتمام معروف شاعر نجیب احمد نے کیا تھا جو کہ میرا بھتیجا بھی تھا۔ دوسرا ناول مکمل کیا تو نامور کالم نگار عبدالقادر حسن کی اہلیہ رفعت جو کہ میری بہت اچھی سہیلی تھی، وہ مجھے مشہور اشاعتی ادارے سنگ میل لے کر چلی گئی، جہاں نیاز احمد صاحب سے ملاقات ہوئی، جو کہ اس ادارے کے موجودہ سربراہ افضال احمد کے والد تھے، بڑی خنداں پیشانی سے پیش آئے اور کہنے لگے کہ میں یہ کتاب چھاپ دوں گا۔ اس کے بعد ایک اور کتاب اور پھر ایک سے زائد۔ اسی دوران میں نے سفرنامہ حرمین لکھا، اس کی بہت زیادہ پذیرائی اور ستائش ہوئی۔ سنجیدہ اور ثقہ اہل قلم نے اس پر مجھے داد دی اور تحسین بھی کی، اصغر ندیم سید نے خصوصی طور پر فون کر کے کہا کہ یہ سفرنامہ پڑھ کر میرا دل کرتا ہے کہ ابھی اڑ کر مکہ، مدینہ پہنچ جاؤں۔ اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بیٹی کی شادی امریکہ ہوئی تو اس سے ملنے میں وہاں گئی اور اس قیام کے دوران میں نے امریکہ کا سفرنامہ لکھا۔

س آپ طویل عرصے سے روزنامہ نوائے وقت کے ساتھ منسلک ہیں، یہ تعلق کیسے پیدا ہوا؟ یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج یہ واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ مجھے برطانیہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں مجھے طویل عرصے سے مقیم پاکستانی گھرانوں کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا۔ یہ لوگ زیادہ تر میر پور آزاد کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ میں نے ان کو اپنی اولادوں کے بارے میں متفکر پایا۔ ان کے بچے عمومی طور پر بے راہ روی کا شکار تھے اور مغربی ماحول میں ایسے پھنستے چلے جا رہے تھے جیسے دلدل میں لوگ دھنستے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے سفر کا احوال اور اس موضوع پر اپنے جذبات کا اظہار چھ کالموں میں تحریر کر دیا۔ یہ کالم تحریر کر کے جب میں پاکستان پہنچی تو میں نے بیدار سرمدی کو فون کیا جو ان دنوں نوائے وقت کے سنڈے میگزین کے انچارج تھے۔ جب یہ کالم شائع ہوئے تو مجھے مجید نظامی صاحب نے بلایا اور کہا کہ اگر آپ اسی طرح کے مستقل کالم تحریر کرنا چاہتی ہیں تو ہمارا ایک سلسلہ ''دیارِ غیر'' کے نام سے مستقل اخبار کا حصہ ہے، ان کی دعوت پر پھر میں نے اخبار میں مستقل کالم لکھنا شروع کر دیا۔ اس واقعے کو چالیس سال گزر گئے ہیں اور میں اگر لاکھوں نہیں بھی تو ہزاروں کالم لکھ چکی ہوں۔ یہ تمام کالم نوائے وقت میں ہی شائع

ہوتے ہیں۔

س آپ کے اب تک بائیس سفرنامے شائع ہو چکے ہیں، سفرنامہ نگاری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج میرے میاں جسٹس ریاض احمد شیخ جب سپریم کورٹ کے جج بن کر اسلام آباد منتقل ہوئے تو انہیں مختلف ممالک میں منعقد ہونے والی کانفرنسز میں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ جس ملک میں بھی جاتے، مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ میں وہاں کانفرنس کا احوال بھی لکھتی اور سفرنامے کا خاکہ بھی تیار کر لیتی تھی۔ میرے خاوند نے ہمیشہ میری حوصلہ افزئی کی اور مجھے لکھتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری سفرنامہ نگاری میں میرے میاں کا اہم کردار ہے۔

س آپ نے پچاس کتابیں شائع کرنے کا جو سنگِ میل عبور کیا ہے، اس پر کچھ کہنا پسند کریں گی؟

ج:۔ دراصل میری 48 کتابیں شائع ہو چکی تھیں جنہیں مقبول اکیڈمی اور سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ گزشتہ برس گرمیوں میں میرا بیٹا رضا رومی ملنے کے لئے پاکستان آیا (معروف صحافی اور لکھاری رضا رومی) تو کہنے لگا کہ امی کبھی آپ کی کسی کتاب کی تقریب رونمائی نہیں ہوئی۔ آپ کی پچاس کتابیں مکمل ہو جائیں تو ہم سب کی اکٹھی تقریب رونمائی کریں گے۔ آج سے پچیس سال پہلے میری دو کتابوں کی تقریب رونمائی پی سی ہوٹل لاہور میں ہوئی تھی، ظاہر ہے یہ اب پرانی بات ہے۔ سنگِ میل نے حال ہی میں میرا ناول ''طوفانی رات'' شائع کیا تو یہ تعداد پچاس تک پہنچ گئی۔ رضا رومی بھی آج کل پاکستان آیا ہوا ہے، اسی نے ہی اس تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ کتابیں میری زندگی کا اثاثہ ہیں۔

س آپ نے اپنے بیٹے کا ذکر کیا، لکھنے کا فن کیا آپ نے انہیں سکھایا؟ تربیت دی؟

ج مجھ سے اکثر یہ سوال ہوتا ہے کہ آپ کا بیٹا بھی رائٹر ہے، وہ آپ پر گیا ہے؟ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ لکھنے کا ورثہ چاہے اس نے مجھ سے لیا ہو مگر ٹیلنٹ اپنے والد سے لیا ہے۔

س آپ ناول بھی لکھتی ہیں اور افسانہ نگار بھی ہیں، کالم نویسی کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگاری بھی کرتی ہیں، ان تمام اصناف سخن میں سے آپ کو زیادہ کون سی صنف ادب محبوب ہے؟

ج مجھے ذاتی طور پر سفرنامہ نگاری زیادہ پسند ہے۔ اس کی وجہ بھی میں آپ کو بتا دیتی ہوں سفرنامہ نگاری میں ادب کی کم و بیش تمام اصناف ہی سما سکتی ہیں۔

س کبھی کسی ادبی تحریک کا بھی حصہ بنیں؟ کسی سیاسی و سماجی جماعت کے ساتھ چلیں؟

ج:۔اتفاق ایسا ہے کہ مجھے اس کا وقت ہی نہیں مل سکا۔میں اپنی زندگی اور لکھنے کے عمل میں اس قدر مگن تھی کہ مجھے کسی تحریک میں جانے کا خیال ہی نہیں آیا۔گزشتہ چالیس سال سے تونوائے وقت میں لکھ رہی ہوں،اس کے علاوہ یہ پچاس کتابیں آپ کے سامنے ہیں۔میری خواہش ہے کہ باقی زندگی بھی اسی طرح لکھتی ہی چلی جاؤں۔

س ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا سوال ہے تو پرانا مگر آج بھی اہم ہے،آپ کا اس بابت کیا خیال ہے؟

ج میں عام فہم زبان میں عام لوگوں کے لئے لکھتی ہوں اور ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔

س قارئین کی دلچسپی کے لئے آپ اپنی کتابوں کی تفصیل بیان کرنا پسند کریں گی؟

ج جی ضرور!ناول اور دیگر کتب کے نام درج ذیل ہیں۔

1۔ دل اور دیوار (اس ناول کا PTV میں ڈرامہ بھی ٹیلی کاسٹ ہوا)

2۔ مہوش (ناول)	3۔ حادثے (ناول)
4۔ بادبان (ناول)	5۔ آسمان تلے (ناول)
6۔ تجدید وفا (ناول)	7۔ انجان (ناول)
8۔ خبطی (ناول)	9۔ کرن کہانی (ناول)
10۔ مسیحا (ناول)	11۔ خلش (ناول)
12۔ انا (ناول)	13۔ سایہ شجر (ناول)
14۔ پشیمان (ناول)	15۔ دھندلا پیکر (ناول)
16۔ اجالا (ناول)	17۔ دام سحر (ناول)
18۔ نیلا آسمان (ناول)	19۔ طوفانی رات (ناول)

افسانوں کی کتابوں کے نام

1۔ خوابوں کا محل	2۔ ندامت کے آنسو
3۔ جنت	4۔ نئے افسانے
5۔ بندھن	6۔ خوابوں کا محل
7۔ ہرجائی	

سفرناموں کے نام

1۔ بحر ظلمات سے آگے
2۔ سفر حرمین
3۔ جہاں اور بھی ہیں
4۔ خوابوں کی جنت
5۔ افق کے اس پار
6۔ اوسلو سے آگے
7۔ چین کو چلئے
8۔ انوکھا سفر
9۔ جہاں حسن جوان ہے
10۔ سفر ہے شرط
11۔ منیلا منزل
12۔ روم کی جادوئی کشش
13۔ دہلی سے آگے
14۔ اوٹاوا
15۔ آسٹریلیا خوبصورت ہے
16۔ نیلسن منڈیلا کے دیس (ساؤتھ افریقہ میں)
17۔ جہاں خزاں بھی بہار ہے
18۔ دیار غیر سے
19۔ اتھیکا حسین ہے
20۔ ساحل سے ساحل تک
21۔ عمر خیام کے دیس میں
22۔ امریکہ میں رمضان شریف

OOO

بیدل حیدری

آج کے مشاعرے بھانڈ، بھنڈالوں کی محفلیں بنتے جا رہے ہیں۔شاعری میں جھوٹ سچ اور خیر، شر کی طرح صرف دو نظریے ہیں ان خیالات کا اظہار کبیر والا میں مقیم ملک کے نامور اور سینئر شاعر بیدل حیدری نے ایک انٹرویو میں کیا، انہوں نے مزید گفتگو کرتے ہوئے کہا شعر کا تعلق شعور سے ہے اور شاعری کرنا باشعور لوگوں کا کام ہے۔احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بلاشبہ وہ دنیائے ادب کے عظیم شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔

س شاعری میں نظریے کو کس قدر اہمیت حاصل ہے؟

ج شاعری بذات خود ایک نظریہ ہے وہ اس لئے کہ شعر کا تعلق شعور سے ہے اور شاعری کرنا باشعور لوگوں کا کام ہے نا کہ جہلا اور دیوانوں کا شغل ہے۔مزید برآں نظریہ کے صرف دو پہلو ہیں، ایک مثبت اور دوسرا منفی، مثبت نظریہ شعر و فن کا تعلق گراس روٹس کی طرح اس دھرتی اور اور اس دھرتی پر بسنے والے انسانوں سے ہے۔شاعری شعوری طور پر انسانی مسائل اور اس کے عقدوں کو کھولتا ہے جبکہ جن لوگوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا ان کی شاعری اور نظریہ فن بھی منفی ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو بعض آسانیوں اور وسائل کی وجہ سے وقتی طور پر ادب میں تھوڑی بہت جگہ مل ہی جاتی ہے۔لیکن ان کا ادب وقت کے ساتھ ساتھ مر جاتا ہے۔مختصر یہ کہ شاعری میں جھوٹ، سچ اور خیر و شر کی طرح صرف دو نظریے ہیں۔باطل کو فنا ہے لیکن حق کو فنا نہیں۔

س کیا آج کی غزل میں مزید تجربات کی گنجائش ہے؟

ج غزل کو ہر دور میں تجربات کی ضرورت رہی ہے جبکہ موجودہ غزل سابقہ تجربات کی آئینہ دار ہے۔یہ تجربات با اعتبار زبان و بیان میں بھی ضروری ہیں۔اور مضامین غزل کے اعتبار سے بھی ضروری ہیں۔اگر موجودہ غزل میں تجربات نہ کئے گئے تو آج کی غزل یقینی طور پر یکسانیت کا شکار ہو جائے گی۔اور ایک ہی قسم کی غزل سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے سامع اور قاری تنگ آ جائیں گے۔ویسے بھی جمود موت کا دوسرا نام ہے۔لیکن اس کے معنی بھی ہرگز نہیں کہ غزل میں تجربات بے

لگام ہو کر کئے جائیں۔ کیونکہ غزل کے کچھ اپنے بھی تقاضے ضروری ہوتے ہیں۔اس لئے تجربات کرتے وقت فنی تقاضوں کی پاسداری ضروری ہے۔

س آج کی غزل اور نظم کا موازنہ کیسے کریں گے؟

ج آج کی غزل ہو یا قدیم غزل اس کا موازنہ نظم سے ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ غزل اور نظم کے اپنے اپنے انداز، اسلوب، اور فنی ضابطے ہیں۔آج کی غزل کا موازنہ قدیم غزل سے تو کیا جا سکتا ہے۔لیکن نظم سے نہیں اور اسی طرح آج کی نظم کا موازنہ گزشتہ نظم سے کیا جا سکتا ہے۔ میں نظم پر غزل کو اس لئے فوقیت دیتا ہوں کہ آج کی غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل نظم، ایک مکمل کہانی، اور ایک مکمل افسانہ ہے۔ جبکہ آج کی نظم صرف ایک ہی مضمون کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی ایک ہی مضمون کو تفصیل کے ساتھ نظم کر لیا جاتا ہے۔غزل اس اعتبار سے بھی نظم پر بھاری ہے۔ کہ غزل کے اشعار روزمرہ، ضرب الامثال، گانے اور گنگنانے میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ پوری نظم کسی قاری یا سامع کو یاد ہی نہیں رہتی اور ہماری اکثر نظمیں گائیکی کے معیار پر پورا نہیں اترتیں۔

س احمد ندیم قاسمی کو آپ شاعر، ادیب صحافی یا دانشور کس حیثیت میں زیادہ اہم سمجھتے ہیں؟

ج احمد ندیم قاسمی بلاشبہ دنیائے ادب کے عظیم شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔شخصیت کے حوالے سے بھی آپ ایک عظیم انسان ہیں۔ میری معلومات کے مطابق احمد ندیم قاسمی نے متعدد شاعروں ادیبوں کو فنون کے پلیٹ فارم سے متعارف کرایا۔ یہ ہی نہیں بلکہ بعض شعراء کی مالی معاونت بھی کی۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں بعض احسان فراموش لوگ بھی شامل ہیں۔ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کے حوالے سے بھی قاسمی صاحب کا کردار مثبت رہا۔

س کن شعراء نے ابتدا سے آج تک آپ کو متاثر کیا؟ یا ان کی شاعری آپ کو پسند رہی؟

ج غزل کے حوالے سے میر تقی میر، آتش لکھنوی، مرزا غالب، فانی بدایونی، مرزا یاس یگانہ چنگیزی اور اپنے استاد گرامی حضرت جلال الدین حیدر دہلوی اور نذر کھتولوی سے متاثر ہوں۔ جب کہ عصر حاضر میں مجھے احمد ندیم قاسمی ادا جعفری، پروین شاکر، احمد فراز، قتیل شفائی، محشر بدایونی محترم منصور احمد کی شاعری پسند ہے۔

س مشاعرہ کا ہماری شاعری و زبان کے فروغ میں کیا کردار ہے؟

ج مشاعرہ شاعری کے فروغ میں بلاشبہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ زمانہ جاہلیت سے آج تک شاعری کے فروغ کا اہم سلسلہ رہا ہے۔ جب اخبارات رسائل ریڈیو اور ٹی وی نہیں تھے اور مشاعرہ

ہی عوام تک شاعری پہنچانے کا ایک ذریعہ بنتا تھا۔ایسے درجنوں شاعر ہو گزرے ہیں جو مشاعروں کے بل بوتے پر عظیم شاعر بنے اور تاریخ کا حصہ بن گئے۔آج کے مشاعر بھانڈ، بھنڈ والوں کی محفلیں بنتی جارہی ہیں۔مشاعرہ میں شخصیت فن پر غالب آ گئی ہے۔مشاعروں پر نوکر شاہی کا قبضہ ہے۔اور مشاعروں میں صرف ان ہی شاعروں کو بلایا جاتا ہے یا نوازا جاتا ہے جن کا نوکر شاہی سے قریبی رابطہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ عوام آہستہ آہستہ مشاعروں سے بیزار ہوتے جارہے ہیں۔یہی نہیں بلکہ بعض نجی محفلیں مشاعروں کے حوالے سے انجمن ستائش باہمی بن کررہ گئی ہے۔

س آپ کے تلامذہ کی تعداد کافی زیادہ ہے،ان کے حوالے سے کیا کہیں گے؟

ج مجھے استاد پرستی اور تلامذہ سازی ورثے میں ملی ہے۔لہٰذا میں اپنے اساتذہ کو اپنا مرشد اور تلامذہ کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں۔مجھے اپنے تلامذہ کی صحیح تعداد تو یاد نہیں کیونکہ میں نے ایسا کوئی رجسٹر نہیں کھولا۔البتہ اتنا ضرور کہوں گا۔ان کی تعداد دس،بیس، پچاس،سو نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔جبکہ میں یہ بات بارہا بڑے وثوق سے کہہ چکا ہوں کہ میرا ہر شاگرد اپنی جگہ منصب استادی پر فائز ہے۔

س آپ کے نزدیک آج کل کون کون سے شاعر اچھی شاعری کررہے ہیں؟

ج اس وقت پاکستان میں اچھا شعر کہنے والے تقریباً ہر شہر میں موجود ہیں۔لیکن فیروز شاہ (میاں والی)،انور فیروز (راولپنڈی)،سلیم کوثر (کراچی)،شکیل سروش (امریکہ)، آل عمران (گجر خاں)،سید انصر (سرائے عالم گیر)،سالک ربانی (میاں چنوں)،اختر شمار،اطہر ناصر،عباس تابش (لاہور)،شام جعفری (خانیوال)،مظہر بخاری (میاں چنوں)،محمود غزنی،حنیف صوفی اور کاشف سجاد (بورے والا) مقصود حسنی (قصور)،انجم سلیمی (فیصل آباد)،غزالی (گوجرہ)،ناز خیالوی (تاندلیانوالہ)،ارشاد گرامی (ٹوبہ ٹیک سنگھ) ارشد جاوید (رحیم یار خان) صفدر سلیم سیال (جھنگ)، غلام حسین ساجد (لاہور)،طاہر قدیر شکیل ملتانی (خانیوال) ممتاز اطہر (ملتان)،مظہر قلندرانی (مظفر گڑھ)، حسن رضوی (لاہور)،قمر رضا شہزاد (کبیر والا)،قمر ساجد (کوٹ ادو)،ڈاکٹر عبداللہ عظیم (وہاڑی)، ادریس قمر (چیچہ وطنی)،ارشاد جالندھری (کسوال) اور فیصل عجمی (راولپنڈی) جاندار شاعری کررہے ہیں۔

س نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام؟

ج

پیچھے رہ جاؤ گے تکمیل ہنر میں ورنہ
کم سے کم ذہن کو ایک صدی آگے رکھو

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

س آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں تعلیم کہاں سے حاصل کی بچپن کہاں گزرا؟

ج میں امرتسر میں 1940 میں پیدا ہوا۔ یہ میرا آبائی شہر ہے۔ امرتسر کاروباری شہر تھا۔ اس کی میں مثال یوں دوں گا کہ متحدہ ہندوستان میں سٹاک ایکسچینج ممبئی میں تھا یا امرتسر میں تھا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ شہر کس قدر کاروباری لحاظ سے اہم تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد کشمیر سے امرتسر آئے تھے۔ امرتسر میں بہت کشمیری آباد تھے۔ امرتسر میں مسلمانوں کا کلچر کشمیری تھا۔ جب پاکستان بنا تو میرے والد کے خوش قسمتی سے کچھ فوجی آفیسر دوست تھے۔ انہوں نے ہمیں پہلے سے کہہ دیا تھا کہ چودہ اگست کو تیار رہیں۔ سفر کے لئے اس دن ایک ٹرک آیا جس کے اوپر مشین گن لگی ہوئی تھی۔ اس میں ہمیں چھپا کر امرتسر کیمپ لے آئے۔ انہوں نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ دودھ اور بسکٹ کے بہت سے پیکٹ دیے کہ پتہ نہیں کب حالات بہتر ہونگے۔ یوں ہم پاکستان پہنچ گئے۔

ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ میں بھائی کے ساتھ کراچی گیا تھا۔ یہ شہر اس وقت بہت ویران اور سنسان تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ ہمیں خود کچھ معلوم نہیں تھا مستقل طور پر کس شہر میں سکونت اختیار کرنی ہے، کیا کاروبار کرنا ہے؟ ہم کراچی سے راولپنڈی اور پھر لاہور آئے ،لاہور سے میٹرک کیا۔ پھر گریجوایشن کی۔ پی ایچ ڈی کی۔

1965 میں جاب کی، ایچی سن کالج میں پڑھایا۔ صرف دو ماہ تک اور پھر جاب چھوڑ دی۔۔

یہ میرے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔ حالانکہ جب دوسرے کالج اس وقت 250 روپے ماہانہ دیتے تھے۔ یہ چھ سو روپے ماہانہ تنخواہ دیتے تھے۔ میرے دوست پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھتے تھے جب ان کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا کہ ایسا کیوں کیا؟ مگر یہ میرے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ پھر میں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ 1985 میں اوساکا یونیورسٹی میں چلا گیا۔ 2005 تک

وہاں پڑھاتا رہا۔ پاکستان آیا تو انہوں نے کہا یونیورسٹی میں آجائیں۔ میں انکار کرتا رہا۔ پھر میں جی سی میں آ گیا۔ پڑھنے لکھنے اور پڑھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا تھا۔

س لکھنے کا آغاز کب کیا؟

ج جب میں چھوٹا تھا تو بچوں کے رسائل تعلیم و تربیت، ہدایت اور دیگر میں نظمیں بھیجا کرتے تھے جو شائع ہوجایا کرتی تھیں۔ بعد میں جب کالج پہنچا تو باقاعدہ نظمیں لکھ کر ادبی رسائل کو بھیجیں۔

س عموماً یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں شاعر اپنی شاعری کی کتاب پہلے شائع کراتا ہے بعد میں کسی اور صنف کو اہمیت دیتا ہے۔ مگر آپ کی ایڈیٹنگ کی کتب پہلے شائع ہوئیں۔ پھر تنقید کی اور بعد میں تخلیق کی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج جی آپ نے کافی لمبی بات کی۔ اپنی پروفیشنل زندگی میں مجھے زندگی میں جو میرا ذاتی معاملہ تھا میں سمجھتا تھا۔ سب سے اچھے نتائج اس میں آئیں گے۔ اس لئے میں نے ایڈیٹنگ کی۔ بہت سی کتابوں کی رام بابو سکسینہ کی ''تاریخ ادب اردو'' ۱۹۲۶ میں چھپی اس کی ایڈیٹنگ اس طرح آب حیات کی ایڈیٹنگ کی، مضامین لکھتا رہا۔ وہ بھی چھپتے رہے۔ نظموں کے چھ سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جدید اور کلاسیکی غزل سے دلچسپی بیک وقت رہی۔ اقبال پر بھی تین کتابیں ہیں۔ مگر زندگی کا حاصل ایک کتاب ہے۔ اردو ادب کی تاریخ۔

س جی میں نے آپ کی یہ کتاب پڑھی ہے۔ بلاشبہ تنقید میں یہ بڑا تخلیقی کام ہے اور دیگر تواریخ سے منفرد بھی ہے؟

ج جی میں تو کہہ رہا تھا مشفق خواجہ نے مجھ سے ایک بار کہا ایک کتاب کافی ہوتی ہے۔ عمر کے اس حصے میں یاد آتا ہے کہ اس کی بات ٹھیک تھی۔ میں اوسا کا یونیورسٹی میں تھا وہاں پر کوئی ذہنی دباؤ نہیں تھا اور نہ ہی بہت زیادہ مصرفیات ہوتی تھیں۔ مگر اس کے باوجود اردو ادب کی تاریخ اور اس کا قدیم دور وہ بھی جاپان میں بیٹھ کر لکھنا ناممکن تھا۔ ہندوستان میں میرے دوست خلیق انجم تھے۔ پاکستان میں بھی مختلف ادبی ادوار میں دوست تھے۔ ان کو فہرستیں تھما دیتا اور وہ کتابیں بھیج دیتے تھے۔ وہاں یونیورسٹی میں مجھے یہ سہولت تھی کہ کتب کی بہت فہرستیں آتی تھیں اور میں نے ہر موضوع پر بہت سی کتب منگوائیں۔ اس طرح ذہن میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔ میں 100 ڈالر تک کی کتب ہر ماہ منگوا لیتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ بعد میں یہ

کتب لائبریری کو دے دوں گا۔ژونگ سے مجھے بہت دلچسپی تھی۔اس طرح ادب اور تاریخ سے بھی کافی لگاؤ تھا۔

س کیا آپ سمجھتے ہیں ان سب موضوعات کو پڑھنے سے آپ کو اردو ادب کی تاریخ لکھنے میں کافی فائدہ ہوا؟

ج جی میں سمجھتا ہوں اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔میں نے وہاں کرنا کیا تھا۔صرف پڑھا اور اس کے بعد یہ کام۔ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔اور بہت سے عوامل مل کر اس کو پورا کرتے ہیں۔یہ کتاب لکھنے کا وقت تھا۔یہ چیزیں مکمل INVOLVEMENT سے بنتی ہیں جیسا کہ پنجابی میں کہتے ہیں ناں کہ کھب جانا،تو ایسا ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔اس کو لکھنے کے دوران جیسے میں ٹرین میں سفر کرتا تھا اور شارٹ ہینڈ میں لکھتا چلا جاتا تھا۔تو کبھی تو آٹھ دس اسٹیشن آگے نکل جاتا۔پھر واپس آتا اور غلط ٹرین پر سوار ہو جاتا۔

س تو کیا تنقید کا کام یعنی اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے کا کام اب بھی جاری ہے؟

ج کئی بار کوششیں کی۔میں سست ہو گیا، یہاں آکر، وہاں بڑا چست تھا۔جوانی بھی تھی اور کچھ زیادہ کام بھی نہیں ہوتا تھا۔کرنے کو یہی ایک کام تھا۔بیوی اور بچے پاکستان تھے۔پہلے میں اکیلا تھا۔رات 9 بجے تک کتابوں کو دیکھتا رہتا۔آئیڈیاز آتے پھر رات کو لکھتا رہتا۔کئی بار ہوا کہ پردے کا منظر بدل جاتا۔جب باہر دیکھتا صبح ہو چکی ہوتی۔INVOLVEMENT کے بغیر جو کام کیا جائے تو اس میں جان نہیں ہوتی۔تنہائی تخلیق کا سب سے بڑا منبع ہے۔جس میں آپ جو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔بس اپنے کام سے خلوص محبت کی ضرورت ہے۔

س تنقید کا بیشتر کام ۱۹۷۰ء سے قبل کے ادیبوں پر نقادوں نے کیا،نصف صدی سے نئے لکھنے والوں پر اس طرح کا کام نہیں ہو رہا؟

ج میرے خیال میں کافی کام ہوا ہے۔ہمارے ادبی اداروں اور تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ پر بیسیوں تھیسز لکھے جا چکے ہیں۔مجید امجد پر بھی کافی کام ہوا ہے۔اس طرح افسانے میں مظہر الاسلام پر بھی کافی کام ہوا ہے۔

س آپ کا مطلب ہے کہ صرف یونیورسٹی میں کام ہوتا ہے؟

ج اس طرح کے کام دانش گاہوں میں ہوتے ہیں۔وہاں ضرورت ہوتی ہے۔آپ کو یا عامر بن علی کو تو ضرورت نہیں ہے۔انہوں نے کاریں بیچنی ہیں۔ہم نے بھی تو کچھ بیچنا ہے۔

(زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے)

س جاپان میں 25 سال گزارنے کا تجربہ کیسا رہا تدریسی اور سماجی سطح پر؟

ج کوئی جاپانی اگر پاکستان آئے تو وہ بہت جلد ہمارے معاشرے کے مزاج کو سمجھ جائے گا۔کیونکہ ہم نے جو بات کرنی ہے وہ صاف کر دینی ہے۔مگر جاپانی سوسائٹی کو سمجھنا آسان نہیں۔ان کے اندر اترنا پڑتا ہے۔آپ تو وہاں رہ رہے ہیں۔جب تک 15 سے 20 سال وہاں نہ رہیں سمجھ نہیں آتی۔اگر جاپانی کو آپ پر اعتماد ہے تو وہ آپ سے اپنے دل کی بات کرتا ہے۔میں جب وہاں تھا تو اخباروں میں پڑھتا تھا، امریکی چیختے تھے کہ یہ بڑی گول مول بات کرتے ہیں، کھل کر نہیں بتاتے۔مثلاً پراڈکٹ بیچنے کے دو ہی طریقے ہیں کہ یا آپ کہیں گے ہاں یا آپ کہیں گے یہ پراڈکٹ ہمیں نہیں چاہیئے۔یہ جاپانی مزاج نہیں ہے۔اس میں نا کا لفظ نہیں ہے۔جب آپ بہت تنگ کریں گے تو وہ کہیں گیا اچھا ہم دیکھیں گے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پراڈکٹ ہم نے نہیں لینی۔سچ کہوں تو جاپانی کلچر کے باطن کو سمجھنا ناممکن ہے۔وہ کمٹمنٹ کرنے کے لئے جلدی تیار نہیں ہوتے۔ویسے وہ بڑے Humble لوگ ہیں۔ان میں غرور اور فخر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔جس طرح ہم پاکستانیوں کو عادت ہے بڑی بڑی باتیں کرنے کی۔وہاں کی بہت بڑی کمپنی Mitsubishi کے مالک کو میں نے منظر عام پر آتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ان کے کلچر کا رواج ہے جو اپنی خودنمائی کرے اس کو بڑا بے وقوف سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں جاپانیوں کا مزاج بارش جیسا ہے جو ہلکی ہلکی مسلسل ہوتی رہتی ہے۔انہوں نے استاد ہو یا شاگرد۔تھوڑا تھوڑا کام روزانہ کی بنیاد پر کرنا ہے۔جبکہ یہاں اس کے بالکل الٹ مزاج ہے۔

س نئی نسل ادب میں کس حد تک سنجیدہ ہے؟

ج بالکل سنجیدہ ہے غیر سنجیدہ تو نہیں ہو سکتی۔آخر انہوں نے بھی کچھ سوچ رکھا ہے۔جب دس سے پندرہ سال گزر جاتے ہیں تو نئے تجربے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ہمارے سینئر ادیب شاعر ہم سے نفرت کرتے تھے۔جب وہ وقت گزرا تو اس نے ثابت کیا کہ ہماری سوچ درست تھی۔اگر نئی نسل کے لوگ تجربے کے ساتھ آئیں تو ان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔لہٰذا اچھی کہانی بھی لکھی جا رہی ہے اور اچھا ناول بھی۔اور اچھی شاعری بھی ہو رہی ہے۔ہم نے بڑے دکھ سہے ہیں مجھے اس کا بڑا تجربہ ہے۔

س شاعری کا مستقبل آپ غزل میں دیکھتے ہیں یا نظم میں؟

ج دونوں میں۔نئ شاعری کی تحریک چلی ہے۔آپ ۷۰ء کی غزلیں دیکھیں اور ۶۰ء کی غزلیں دیکھیں۔آپ کوفرق صاف اور واضح نظر آئے گا۔میرے خیال میں ہمارے ہاں نظم نے بہت ترقی کی ہے۔ہاں البتہ نثری نظم لکھنا بہت مشکل کام ہے۔اس میں یا نظم ہوگی یا نہیں ہوگی۔پل صراط سے گزرنے والی بات ہے۔یا آپ جنت میں گریں گے یا جہنم میں۔

س آپ جاپانیوں کو اردو زبان سکھاتے رہے ہیں۔یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج میں زبان تو نہیں سکھاتا تھا۔جب وہ زبان سیکھ جاتے تھے۔تب ان کو اردو پڑھاتا تھا۔مجھے زیادہ تجربہ ہوتا تھا جب میں غزل پڑھاتا تھا۔اردو غزل میں محبوب کی زلفیں، گیسوئے دراز،ان کے نزدیک تو صرف بال ہیں۔Feelings کہاں سے لائیں۔ میر کا شعر ہے۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

جاپانیوں کی آنکھیں چھوٹی ہیں تو مستی کہاں سے آئے۔حالانکہ وہ شراب پینے والی قوم ہے۔اسی طرح پاکستانی ہائیکو گو شاعروں کا ایک بھی ہائیکو نہیں دیکھا جو ہائیکو ہو۔پاکستانی شاعری میں تو سارا جذبات اور احساسات کا کھیل ہے۔جبکہ ہائیکو تو موسموں کی شاعری ہے۔جیسے ہمارے ہاں ۱۲ ماسہ ہوتا ہے۔جیسے ساون اور دوسرے مہینوں کے گیت۔ ہائیکو بھی موسموں کے ذکر کی شاعری ہے۔آپ ہائیکو میں جذبات اور احساسات نہیں لا سکتے۔مثلاً ایک جاپانی ہائیکو ہے۔

بادشاہ ایک گاؤں میں گیا،مہمان رہا
دوسرے دن خدام نے دیکھا
اس کا تکیہ گیلا تھا

یہ لائٹ سیمبولک مزاج ہے جاپانی شاعری کا۔Untold قسم کا رویہ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے بادشاہ کو آ کر بتایا کہ وہ پریشان ہیں اور دکھ میں ہیں۔تو وہ رات بھر روتا رہا۔اگر یہ مضمون ہمارے ہاں ہوتا تو شاعری میں طوفان برپا ہو جاتا۔ایک اور جاپانی ہائیکو ہے۔

بارش ہے اور ایک مینڈک تالاب میں کود گیا ہے
آپ دیکھیں اس میں جذبہ بالکل نہیں ہے

س اردو ادب میں آج تک جو تنقید کا کام ہوا ہے اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ج ہمارے ہاں تنقید کی روایت ہی نہیں ہے اردو شاعری کی ابتداء سے حالی کا مقدمہ شعروشاعری اوراس کے بعد 50 برس کی خاموشی۔مختلف تحریکیں سامنے آئیں۔ پاکستان بننے کے بعد تنقید لکھی گئی۔ ہماری تنقیدی روایت Creative نہیں ہے اور نہ ہی ہم پروڈیوسر ہیں۔ ہم نے جب ناول پڑھا تو ناول لکھنا شروع کر دیا۔بیسویں صدی میں دنیا میں افسانہ مشہور ہوا۔ تو ہم نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ ہمارے ہاں ٹیکنالوجی نہیں ہے۔تو ٹیکنیک کہاں سے آئے گی۔ ہمارے ہاں چیزیں جاپان اور دیگر مما لک سے آتی ہیں تو ہم لے لیتے ہیں۔خود پیدا نہیں کرتے۔تنقید کی کوئی کتاب سوائے حالی کے۔وہ بھی مغرب سے متاثر تھے۔ ماضی میں نہیں آئی۔ انہوں نے بھی شاعری کے معیار پر کتاب لکھی۔اب تک جتنی تھیوریاں جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات ہیں وہ مغرب سے ہیں۔ ہمارے نقادان کو پڑھتے ہیں اور تھیوریاں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ مغرب کے باطن سے نکلی ہیں۔ان کے تجربے کا حصہ ہیں۔ ہمارے ہاں وہ تجربہ ہی نہیں تو ہم ان کو اپنے ادب پر کیسے اپلائی کر سکتے ہیں۔ نہ ہماری سوسائٹی میں Captalism کا تجربہ ہے نہ سوشلزم کا اور نہ Marxism کا۔ہم چیزوں سے متاثر تو ہو سکتے ہیں انہیں بنا نہیں سکتے۔سائیکل سے زیادہ ہم نے کیا بنایا ہے۔موٹر سائیکل آج تک نہیں بنا سکے۔ہم ایٹمی پاور ہیں موٹر سائیکل کا چین چین سے منگواتے ہیں تو تنقید کیسے بنا سکتے ہیں۔

OOO

بینا گوئندی

س بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج سرگودھا میں پیدا ہوئی۔ مڈل کلاس گھرانہ، والدین کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور خاص طور پر والد محمد یعقوب گوئندی کو شاعری سے بے انتہا لگاؤ تھا؛ سرگودھا میں وہ سالانہ مشاعروں کا اہتمام کرتے یوں بہت چھوٹی عمر میں بے شمار نامور شعراء کو سننے اور ملنے کے مواقع میسر ہوئے۔ چھ بہن بھائی، تین چھوٹی بہنیں اور دو بڑے بھائی ہیں۔ سرگودھا کانونٹ سکول سے نمایاں کامیابی سے میٹرک کیا، میری لاہور میں آگے پڑھنے کی خواہش پر والدین نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ یوں لاہور نے ہمیں اپنے اندر کیا سمایا وہ دل کی دھڑکن کی طرح دنیا جہان میں جہاں بھی رہی ساتھ ساتھ سفر میں رہا۔ لاہور کالج (لاہور کالج یونیورسٹی) سے ایف ایس سی اور بی ایس سی مکمل کی۔ ادھر شبنم شکیل میری اردو کی استاد تھیں۔ ادھر ہی اشفاق احمد اور امجد اسلام امجد سے تقریری مقابلے میں ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں مشرق اور خبریں اخبار میں لکھتی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی باٹنی کیا۔ زمانہ طالب علمی میں ریڈیو پاکستان پر اردو کی خبریں پڑھتی رہی۔

س ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج سکول سے انگریزی میں نظمیں لکھتی۔ کالج میں اردو میں شاعری اور چھوٹی چھوٹی سائنسی کہانیاں لکھتی۔ ماسٹرز میں ''چشم بینا'' کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا آج کل پاکستان اخبار میں لکھتی ہوں۔ مجھے لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق تھا؛ خلیل جبران کو دسویں میں پڑھ لیا تھا؛ مگر جب جب بھی کتاب کو دوبارہ پڑھا وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تفہیم بدلتی رہی۔ ماں باپ نے نام روبینہ نازلی گوئندی مگر قلمی نام کالج سے ہی مجھے اشفاق احمد نے بینا گوئندی مختصر کر کے دے دیا۔ بظاہر ہنستی مسکراتی بینا بچپن سے ہی بہت غور و فکر کرتی اپنی قلبی وارداتوں کو گہرائی اور گیرائی سے محسوس کرتی۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر انسان عملی طور پر زندگی میں شامل نہیں تو زندہ ہی نہیں؛ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جب سے آنکھ کھولی کسی نا کسی محاذ پر ذمہ داریاں نبھائی ہیں۔ دوران

تعلیم free lance لکھتی، ریڈیو، ٹی وی کے مشاعروں میں شمولیت کرتی تو کم سہی مگر معاوضہ ملتا تھا؛ اس کے علاوہ ادبیات میں چھپنے پر سو روپے ملا کرتے؛ وہ اعزاز یے دل پر نقش ہیں۔ ڈاکٹر افضل، احمد فراز، ڈاکٹر وحید قریشی، منیر نیازی، بانو قدسیہ، ڈیوڈ میتھیوز، قدرت اللہ شہاب سے لے کر واصف علی واصف سے بہت ملاقاتیں رہتیں اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ مجھے عورت کو مضبوط اور empower تو دیکھنا ہوتا تھا مگر ذاتی طور پر میں اپنے آپ کو femininism کا نعرہ لگا کر منوانے کی قائل نہیں۔ مجھے دستور کے مطابق عورت کو عورت کے دائرے میں مضبوط انسان سمجھ کر آگے بڑھنا پسند ہے۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج شاعری کی پہلی کتاب۔ سوچتی آنکھیں۔ 1992

جو تم نے دیکھا 2001

مٹی کی پیالی۔ 2014

ساحل لمحے۔ in sheets

سفر نامے

هیروشیما کے آنسو۔ جاپان۔ 1993 — نیکر کے دیس میں (جرمنی)

میری لینڈ کی ڈائری (امریکہ) — عزم سفر (سعودیہ۔ عمرہ)

انڈیا کا سفر۔

سائنس کی بے شمار کتب لکھیں۔

حال ہی میں ''فضائی آلودگی'' لکھی جو اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔

''بصد احترام'' مضامین کی کتاب

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہی ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے

ج ادب تو خود تحریک ہے۔ پروگریسو رائیٹرز کے ساتھ ہمیشہ کھڑی رہی۔ اس کے علاوہ ہمیشہ interfaith کے ساتھ منسلک رہی۔ دنیا کے بے شمار ممالک میں اس سلسلے میں نمائندگی کر چکی ہوں۔ صدر اوبامہ کے ساتھ واشنگٹن ڈی سی میں تین روزہ کانفرنس میں اسلام کی نمائندگی کا شرف ملا۔ ویسے تو ہر پاکستانی سیاست سیاست کھیلتا رہتا ہے۔ غور کریں تو لکھاری کا سفر خیال سے الفاظ کے گرد ہوتا ہے۔ ہم سب انسان الفاظ کی دنیا میں بستے ہیں، یہ الفاظ ہماری تربیت، ماحول، کردار

اور تقدیر بناتے ہیں۔ اگر لکھاری سیاست میں نہیں بھی ہوں تو سیاست دان ان کے خیال کو نہیں اُن کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ میرے خیال میں جس کا جو کام ہے وہ ہی کرے تو بہت بہتر نتائج نکلتے ہیں۔ سیاست کی اس آرٹیفشل انٹیلیجنس کے دور میں ضرورت کم ہو رہی ہے۔

س کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج میں اس کو نہیں مانتی؛ اب ٹیلی بکس، آن لائن بکس، ویب لائبریریاں اور database کتابیں لکھی اور پڑھی جا رہی ہیں۔ اس بات سے کس کو انکار ہے کہ زمانے نے بہت بڑی کروٹ لے لی ہے۔ سو اگر ہماری کتب آن لائن نہیں تو سمجھیں کہ وہ کتب کہیں بھی موجود نہیں۔ اب مکانی لائبریری نہیں ویب لائبریاں آباد ہیں۔ سو کتابیں لکھی، بولی اور پڑھی جا رہی ہیں۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج کبھی اک چھت کو ترستے تھے۔ جہاں سب کچھ اپنا ہو۔ اب بے شمار چھتیں ہیں۔ کچھ بھی نہیں اپنا۔ یہ میری نظم کا ایک ٹکڑا ہے۔ (سوچتی آنکھیں) میں ذاتی طور پر آسودگی کو پسند نہیں کرتی۔ میرے نزدیک اس سے مراد ہے مفلوج۔ میں دکھ، محنت اور کمی میں رہوں تو بہت کچھ کر جاتی ہوں۔ آرام اور سکون کسی بھی تخلیق کو کھا جاتا ہے اور یہ تخلیق کار کی موت ہوتی ہے۔ اس کی زندہ مثال جاندار کا عمل پیدائش ہے؛ اس میں کس قدر محنت، مشقت اور درد ہے۔ زندگی کے خوبصورت دن۔۔ پہلی محبت کے اقرار اور ملاپ کے درمیان کا وقت۔ پاکستان اور لاہور میری تخلیقی صلاحیتوں کو جواز حرکت اور تاثیر میسر کرتا ہے۔

س آپ نے زندگی کا ایک خوبصورت حصہ اردو سائنس بورڈ میں کام کرتے ہوئے گزارا، یہ تجربہ کیسا تھا؟

ج اردو سائنس بورڈ کا تجربہ میری زندگی کا turning point تھا۔ میرے شعور کو بیدار کیا، میرے قلم کو طاقت بخشی، صاحبہ طرز بنایا؛ جیسا کہ میں 23 برس کی عمر کی اس ادارے میں افسر بھرتی ہوئی یقین مانیں ادھر میں نے لفظ کی مزدور اور خیال کی حرمت کو سمجھا، سینچا اور عمل کیا۔ ایک وقت میں بے شمار موضوعات کو سمجھتے اور لکھتے تھے۔ ہمارا دفتر ایک learned body تھا؛ ادھر پوری دنیا کے دانشور، لکھاری، فلاسفہ اور اعلی عہدے دار آنے پر فخر محسوس کرتے۔ اس ادارے میں ہوتے ہوئے کہیں سائنس میں ایم فل کر رہی ہوں تو پھر اردو میں ایم

اے بھی اس ہی ادارے کے ماحول نے چند مہینوں کی تیاری سے کروایا۔

س اصناف سخن میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی صنف ہے؟

ج فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے؛ کیونکہ میں جب جب جو کچھ لکھتی ہوں وہ تحریر میرے دل کے بہت قریب ہوتی ہے۔ مکمل ہو جانے پر دیگر کتابوں کی مانند ان کو کبھی کبھی پڑھ لیتی ہوں اور حیران ہوتی ہوں یہ میں نے کس trans میں لکھا۔ شاعری دل کے بہت قریب ہے۔

س امریکہ میں قیام کے دوران آپ نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کام کیا؟۔ کیا آپ کو اپنی اس محنت کے کوئی اثرات محسوس ہوتے ہیں؟

ج امریکہ اپنی اعلیٰ تعلیم کے لئے آنا پڑا، ایم ایس سی کے دوران یونیورسٹی آف کیلیفورنیا اور برکلے سے پی ایچ ڈی کی آفر آئی لیکن اس کو مسترد کیا کہ اپنے وطن کی محبت وہاں سے نکلنے نہیں دیتی تھی۔ لیکن تقدیر نے پندرہ برس بعد وہ کام کسی اور انداز سے کیا؛ جس میں نفع ہی نفع رہا۔ وہ یوں کہ مجھے اپنے ماحول اپنے رشتوں میں، اپنے تہذیبی حوالوں کو مزید سمجھنے کا موقع میسر ہوا۔ اور جب بیل پر پروان کے پھول لگے تو منزل جیت گئی اور میں ہار گئی۔ دراصل میری منزل وہ تھی ''جو ہے'' مگر میں عجلت میں اس تک خالی دامن بڑھ رہی تھی۔ رب نے مجھے فہم وادراک کے ساتھ ساتھ روشن بھید کی آشنائی بخشی اور مجھے عزم منزل سے بڑھ کر مقصد منزل کی طرف بڑھایا۔ بس سمجھیں 1999 دسمبر میں اپنے دامن میں اپنی ثقافت اور کلچر کا بیج سینچ کر ادھر اعلیٰ تعلیم کے لئے آئی۔ ستمبر الیون کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور مجھے احساس ہوا کہ'' I think therefore I am '' یہ میں نہیں ڈیکارٹ کہتا ہے؛ سو مجھے اپنی شناخت کو قائم رکھنا تھا۔ فلسفے میں اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور ساتھ ہی ادھر'' گھروندا'' کلچرل سینٹر کی بنیاد رکھی۔ رنگ ونسل کی تمیز کے بنا مفت اردو کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ بے شمار ادبی تقریبات منعقد کروائیں۔ دنیا کے حالات پر سٹیج ڈرامے لکھے بنائے۔ اپنی اسٹیٹ کی یونیورسٹی میں اردو کے مضمون کو کالج کے درجے پر شروع کروایا۔ تین برس میری لینڈ میں پہلی ساؤتھ ایشین ایجوکیشن ایڈوائزر کی حیثیت سے'' این ارنڈل کاؤنٹی'' کام کیا۔ اس طرح اپنی پاکستانی کمیونٹی کی بنیاد کو مزید مضبوط کرنے کے لئے علمی سطح پر اپنی ثقافت اور زبان سے جوڑے رکھا۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج اوکاڑہ (حویلی لکھا) میں پروفیسری کی۔ چودہ برس اردو سائنس بورڈ میں ریسرچ سکالر اور

اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کیا۔ادھراشفاق احمد،کشور ناہید،ظفر اقبال،امجد اسلام امجد،ڈاکٹر آغا سہیل اور دیگر لکھاریوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔وفاقی حکومت کا ادارہ مرکزی بورڈ کو اردو سائنس بورڈ میں تبدیل کرنے میں اشفاق احمد کے ساتھ ساتھ ہم پانچ سائنس کے ریسر چرز کا بہت ہاتھ ہے:اس اسی اور نوے کی دہائی میں سائنس کی اردو میں لغت تیار کی۔ ایگرو انسائیکلو پیڈیا تیار کیا۔دیگر بے شمار موضوعات کے علاوہ نامور مسلمان سائنسدان ضخیم کتاب لکھی۔1992 میں جاپان سے بچوں کے لئے اردو میں سائنسی کتابیں لکھنے پر ایوارڈ ملا۔جاپانی حکومت نے جاپان میں book writting کے ٹریننگ کورس کے لئے ادھر بلایا۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

ج لکھاری معاشرے کا ایک ایسا فرد ہے جو اس کے ان پہلوں پر بھی نظر رکھتا ہے جو بظاہر اہم نہیں محسوس ہوتے لیکن معاشرے کے حساس موضوعات کی طرف نشاندہی ایک لکھاری کا احساس کر سکتا ہے۔اب موضوع ماحول میں موجود ہیں اور احساس تخلیق کار کے اندر پاس ہے؛ سو،"تخلیق" باطن اور ظاہر کا باہمی نتیجہ ہے۔ہماری پراسرار باطنی کائنات کبھی کبھی تخلیق کار کو بھی حیران کر دیتی ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج جب زمانہ کروٹ لے رہا ہے اور کسی حد تک ہم غیر محسوس انداز سے ایک نئی دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔تو یقیناً ادب بھی اس کے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھنا چاہیے اور بڑھ رہا ہے؛ اب سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ آیا اردو ادب اس میں اپنا کس طرح اور کیسا چہرہ پیش کر رہا ہے۔ہمیں زندہ رہنے کے لئے اپنا "ڈیٹا" آن لائن ڈالنا ضروری ہے۔کتاب چھپے،مضمون چھپے،شاعری پڑھیں یا لکھیں،وہ ہی زندہ رہے گی جو اس ڈیٹس میں موجود ہوگی۔لائبریریوں کا رخ کرنے والے اب "ای لائبریریوں" میں جاتے ہیں۔دوسرا مرحلہ ہے ہمیں social media ethics کا خیال رکھتے ہوئے آگے بڑھنا ہوگا۔یقین مانیں جونہی دنیا کے اس نئے ماحول سب کچھ settle ہو رہا ہے جو بھی کچھ اس دائرے میں نہیں ہوگا وہ delet کے بٹن سے اڑ جائے گا۔اردو ادب کی کتابوں کو سوشل میڈیا پر ڈالنا ضروری ہے۔بس خیال رہے معیار اور اخلاق دونوں اس نئی دنیا کے key words ہیں۔یہ آرٹیفشل انٹیلیجنس سچی اور کھری بات کرتی ہے۔

س ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج ذاتی تجربات انسان ہر دور میں نئی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔نومولود کے تجربات اس کو جوانی تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ہم بیک وقت اندرونی اور ظاہری سفر میں ہوتے ہیں۔ہمارے تجربات ہمارا اثاثہ ہوتے ہیں؛ یہ ضروری نہیں کہ آپ براہ راست اس میں شامل ہوں آپ ایک معاشرے کی اکائی کی صورت اس کا حصہ ہوتے ہیں۔سو میرا ذاتی خیال ہے کہ تخلیق کا عرفان گیان اور تجربے کی چکی میں بنتا ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج کیا کھویا کیا پایا۔یہ سوال اپنے آپ سے تیس برس پہلے جدا کر چکی تھی۔کتنی نادان تھی۔اس دور میں مقصد کے لئے سب کچھ کرتی تھی؛ بس وقت نے سمجھایا؛ بی بی منزلیں بدلتی رہیں گی،مقامات بدلتے رہیں گے،''بس بتاؤ کیا تمہیں تمہارا مقصد ملا کہ نہیں''،ہم بھوک مٹانے کے لئے کھاتے ہیں؛ہمارے سامنے سب کچھ ہو سوچا اگر''بھوک''ہی نا ہوتو کیا کرو گے۔بس میں نے اپنے رشتے کھوئے،گلیاں کھوئیں،محبتیں کھوئیں''سب کچھ کھو دیا''۔بدلے میں نئی محبتیں،نئی گلیاں اور نئے رشتے مل گئے۔بس سفر جاری ہے اور سفر کے ساتھ''مقصد''زندہ ہے۔ Life is continuum''

س آج کل کیا لکھ رہی ہیں؟مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

ج کیا لکھ رہی ہوں؛ بہت بڑا سوال ہے،بس جو رہ گیا اسے مکمل کر رہی ہوں۔بے شمار میرے گرد incomplete form میں بکھرا ہے؛ان کو مکمل کر رہی ہوں؛ دیکھیں توفیق مل جائے۔نیا ناول''سرگودھا کی انارکلی''۔Dichotomy of Cultures۔اور افسانوں کی کتاب ترتیب دے رہی ہوں۔

OOO

جاوید شاہین

س سوسائٹی میں بہت سے لوگ جو کام کرتے ہیں، مثلاً کوئی جنرل بن جاتا ہے، کوئی کسی ادارے کا سربراہ بن جاتا ہے۔ آپ ایک شاعر ہیں، آپ اس حوالے سے کیا محسوس کرتے ہیں کہ آپ کسی قابلِ فخر شعبے سے وابستہ ہیں یا دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں؟

ج ایک تخلیقی آدمی ہونا، اس میں شاعر، پینٹر، موسیقار ہو یا جو بھی دیگر تخلیقی شعبے میں یہ ایک قدرتی صلاحیت ہے اور یہ لاکھوں لوگوں میں کم کو ملتی ہے۔ پھر اس کے بعد مزید درجہ بندی ہے۔ کوئی اچھا تو کوئی بہت ہی بڑا شاعر ہے۔ اسی طرح موسیقی، مصوری اور جتنے بھی فنون لطیفہ کے شعبے ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ نوازتا ہے۔ جن کو زیادہ ملتا ہے وہ نام کماتے ہیں۔ سوچ کی گہرائی ان کو دوسروں سے مختلف کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب اور اقبال کو قدرت نے غیر معمولی صلاحیتیں دیں جس کے سبب اللہ نے ان کو غیر معمولی شہرت اور عزت سے نوازا۔ آپ کے سوال کے جواب میں اگر دیکھیں تو ہمارے ہاں ادیب کی قدر ہے، لیکن باہر کے ملکوں میں بہت زیادہ قدر ہے۔ 1993ء کی بات ہے، نیو یارک کے ہوائی اڈے پر میں اور میری بیوی جب ہوائی اڈے سے باہر نکل رہے تھے، ہمارے پاس دو تین بیگ تھے۔ عملے کے ایک آدمی نے تلاشی کی غرض سے ہمیں ایک بیگ کھولنے کو کہا۔ تلاشی کے دوران اتفاق سے میری ایک کتاب جس پر میری تصویر بھی تھی، کپڑوں کے اوپر ہی رکھی تھی۔ اسے پتا چلا کہ میرا لکھنے سے تعلق ہے تو اس نے تلاشی موقوف کر کے ہم سے معذرت کی اور ہمارے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ وہ کہنے لگا آپ ایک لکھاری ہیں، ہم آپ کی تلاشی نہیں لے سکتے۔ ایک اجنبی ملک کے اس آدمی کے رویے نے جو کہ ہماری زبان سے بھی واقف نہیں تھا، مجھے بڑا متاثر کیا۔ اس وقت مجھے خود پر بڑا فخر محسوس ہوا کہ میں واقعی ایک باعزت شعبے سے منسلک ہوں۔

س ہم دیکھتے ہیں کہ بیرونِ ملک میں ہمارا پاسپورٹ دیکھ کر ہمیں ایک الگ لائن میں کھڑا کر دیا جاتا ہے لیکن پاکستانی پاسپورٹ کے باوجود انہوں نے بطور شاعر آپ کو خصوصی عزت دی؟

ج: جی، بالکل، انہوں نے یہ کہا کہ پاکستانی بھی اگر تخلیق کار ہے تو وہ اس عزت کا مستحق ہے۔

س: ہمارے ہاں ادیبوں کے حوالے سے عوام میں ایسا رویہ کیوں پیدا نہیں ہوسکا؟

ج: ہمارا کلچر یورپ اور امریکہ کے کلچر سے مختلف ہے۔ آپ کے ادیبوں میں حسد ہے، حالانکہ تخلیقی آدمی ہیں لیکن ان کے ہاں میں نے اتنا حسد دیکھا ہے کہ کیا بتاؤں۔ ہمارے ہاں بالکل مختلف شعری فضا ہے، اس لیے ہمارے ہاں گروہ بندیاں ہیں۔ اگر کوئی پرچہ نکالتا ہے تو وہ سب سے پہلے خود کو پراجیکٹ کرے گا۔ پھر اس کے گرد جو دوست یا حواری اکٹھے ہوتے ہیں ان کی پروجیکشن کرے گا، یعنی ہمارے ہاں اکثریت ایسے ادیبوں کی ہے جو آگے بڑھنے کے لیے جینوئن طریقوں یا تخلیقی صلاحیتوں کی بجائے بیساکھیوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ ادبی گروہ بندیاں نظریات کی بجائے مفادات اور شخصی اختلافات کی بنیاد پر قائم ہیں اور ان کا مقصد ایک دوسرے کو ابھارنا اور مخالفین کو نیچا دکھانا ہے۔ ایسے ماحول میں غیر جانبدار ادیب کے لیے آگے بڑھنا بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔

س: سوال یہ ہے کہ عوامی سطح پر ہمارے ادیب کو وہ عزت اور مقبولیت کیوں نہیں مل سکی جس کا کہ ابھی آپ نے امریکہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے؟

ج: ہمارے ہاں بھی ہے۔ فیض ہیں، احمد ندیم قاسمی، جاوید شاہین، منیر نیازی، پروین شاکر، ظفر اقبال، کشور ناہید وغیرہ۔ ان کو عوامی سطح پر بھی ایک پذیرائی ملی۔ فیض صاحب کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی اہمیت، عزت اور شہرت ملی۔ ایک دفعہ فیض صاحب کہیں جارہے تھے۔ راستے میں ان کے جہاز کو کلکتہ میں تین گھنٹے رکنا تھا۔ وہاں کے وزیر اعلیٰ کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہاں خود گیا اور بصد اصرار اور پورے عزت و احترام سے فیض صاحب کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

س: غالباً ایک دہائی پہلے شاعر فلم، افسانے کا ہیرو تھا۔ لوگ اس سے آٹو گراف لیتے تھے مگر فی زمانہ یہ رویہ دیکھنے میں نہیں آرہا؟

ج: اس میں یہ ہوا کہ 90ء کی دہائی میں جو سیاست تھی وہ آپ پر حاوی رہی، لوگوں کی ترجیحات بدل رہی ہیں، فکر معاش سب کے اعصاب پر سوار ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ فکریں نہیں تھیں جیسی اب ہیں۔ اس سے ایک فرسٹریشن پیدا ہوگئی ہے۔ لوگوں کی توجہ فنون لطیفہ سے ہٹ کر اپنے مسائل پر مرکوز ہوگئی ہے خاص طور پر فکر معاش پر 70، 80 کی دہائی میں جب ہم لوگ غزل لکھتے تو لوگوں کو سنانے کے لیے باقاعدہ ٹی ہاؤس میں انتظار کرتے تھے۔

س: آپ اکثر اپنی گفتگو میں فیض کا تذکرہ بڑے شعراء کے ساتھ کرتے ہیں، نئی صدی میں فیض کا بڑا چرچا ہے۔ پچھلے دنوں عطاء الحق قاسمی کے پرچے ''معاصر'' میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا فیض کے حوالے سے مضمون چھپا، اس بارے میں کیا کہیں گے؟

ج: میرے خیال میں احمد ندیم قاسمی بطور انسان بہت اچھے آدمی ہیں۔ جو انہوں نے فیض صاحب کے حوالے سے مضمون لکھا ہے مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس کے پیچھے کیا عوامل تھے کہ ایک خوامخواہ کا تنازع کھڑا ہو گیا، جس سے قاسمی صاحب کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرے خیال میں قاسمی صاحب کو اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ جو آدمی موجود ہی نہیں اس کے متعلق کچھ لکھنا جب کہ وہ جواب نہ دے سکے، اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں قاسمی صاحب نے خود کو Damage کیا ہے۔

س: آپ کے خیال میں قاسمی صاحب نے اپنے مضمون میں کون سی قابل اعتراض بات لکھی ہے؟

ج: یہی کہ چائنا میں محض ایک صحافی کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا گیا جبکہ بطور شاعر اور افسانہ نگار میری حیثیت مسلمہ تھی۔ اب جبکہ یہ وفد وہاں گیا ہی صحافیانہ حیثیت سے تھا تو وہاں ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کا ذکر تو فضول بات تھی۔

س: جبکہ اسی وفد میں شامل ایک اور صاحب جن کا اس وقت میرے ذہن میں نام نہیں، فیض صاحب نے ان کی دیگر حیثیتوں کا تعارف بڑے اچھے لفظوں میں کروایا؟

ج: یہ فیض صاحب اور ان کا مسئلہ ہے۔ اب فیض صاحب نے قاسمی صاحب کا بطور شاعر ذکر کیوں نہیں کیا؟ وہ جانتے ہیں۔ یہ تنازع اب اٹھا ہے اور قاسمی صاحب نے اٹھایا ہے۔ اگر قاسمی صاحب اس کو نہ ہی چھیڑتے تو بہتر تھا۔

س: یہ جو حمید اختر اور چند دیگر احباب نے قاسمی صاحب کے مضمون کے جواب میں لکھا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: یہ لوگ فیض صاحب کے کافی قریب رہے ہیں مثلاً حمید اختر وغیرہ۔ جو انہوں نے جوابی مضامین لکھے ہیں یہ ان کا فطری ردعمل تھا۔

س: موجودہ دور میں کون سا شاعر ہے جس سے اس عہد کو منسوب کیا جا سکتا ہے؟

ج: پہلے غالب کا عہد آتا ہے۔ پھر اس کے بعد اقبال کا عہد ہے۔ ابھی اقبال کا عہد ختم نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ پروگریسو حوالے سے اسے فیض کا عہد بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح پہلے غالب اور پھر اس کے بعد اقبال نے شاعری میں بالکل نیا ٹرینڈ دیا اسی طرح فیض نے بھی ایک نئی ٹائپ

کو لے کے غم دوراں کی اورعوام کی بات کی۔اقبال کے بعد اگر کسی کا دور ہے تو وہ فیض کا دور ہے۔ حالانکہ فیض ایک مشکل پسند شاعر تھا۔اس کی ڈکشن عربی اور فارسی ترکیبوں پر مشتمل ہے۔اس کے باوجود فیض نے ایک نیا سبجیکٹ دیا۔فیض کے اسلوب میں نغمگی اور رومانیت ہے۔اس کے ہاں عوام کی بات کرنے کے ساتھ جو رومانیت ہے وہ اسے بڑا شاعر بناتی ہے مثلاً ''تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے''۔

س فیض کی ڈکشن کے حوالے سے آپ نے جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے یہ تو فیض سے پہلے بھی ہمیں چند شعراء کے ہاں نظر آتی ہیں۔مثلاً عربی اور فارسی ترکیبوں کا استعمال اورغم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی بات کہیں ایسا تو نہیں کہ فیض کی اپنی شخصیت اور ایک مخصوص نظریے سے ان کی وابستگی تھی۔اس کی بنیاد پر فیض کو بڑا شاعر بنادیا گیا؟

ج دیکھئے جب آپ نظریاتی شاعری کرتے ہیں تو ایک خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں نعرہ بن جائے، جیسے علی سردار جعفری اور بہت سے دیگر شاعر اس لپیٹ میں آ گئے۔فیض کی شاعری کی خوبی یہی ہے کہ یہ ایک نظریاتی شاعری ہے لیکن انہوں نے اس کو نعرہ نہیں بننے دیا۔ان کے ہاں محبت کی ایک مٹھاس اور ہلکے غم کی چاشنی ہے جو شاعری کا جزو سمجھی جاتی ہے اس لیے فیض کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک سوڈو رومینٹک شاعر ہیں لیکن فیض کے ہاں قنوطیت کی ایک لہر چلتی ہے جو ہمارے مزاج کے مطابق لوگوں کو پسند آتی ہے۔ایسی شاعری جس میں پاس اور رومانیت کی چاشنی ہو،لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔جوش بہت بڑا شاعر تھا لیکن ہمارے ہاں وہ اس لیے نہ چل سکا کہ اس کے ہاں دبدبہ و گھن گرج نظر آتا ہے کیونکہ ہمارے لوگ بنیادی طور پر رومان پسند ہیں۔فیض صاحب ویسے بھی خوش قسمت تھے۔انہیں اچھے دوست مل گئے۔تاثیر تھے جنہوں نے فیض کی پروجیکشن میں بڑا کردار ادا کیا۔خود فیض صاحب پڑھے لکھے تھے۔شخصیت میں دھیما پن تھا۔جس سے بات کرتے تھے،گرویدہ بنا لیتے تھے۔پھر جس مراعات یافتہ طبقہ سے ان کا تعلق تھا اس کا بھی انہیں ایڈوانٹیج ملا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ٹیلنٹ ضروری چیز ہے۔مرے ہوئے گھوڑے کو آپ جتنے مرضی چابک ماریں،وہ آگے نہیں بڑھے گا۔

س موجودہ دور میں اگر فیض ہوتے کیا انہیں یہی مقام ملتا؟

ج میں اس صورت حال پر جس میں فیض صاحب موجود نہیں ہیں، بات کرنے کو تیار نہیں ہوں۔جہاں تک روس کی ٹوٹ پھوٹ کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ روس میں سوشلزم ناکام نہیں

ہوا۔ سٹالن اور بیوروکریسی ناکام ہوئے ہیں، ورنہ روس کی ان ریاستوں میں جہاں لٹیرے تھے، جاہلیت تھی، وہاں کپاس، تیل اور دیگر ضروریات زندگی کی فراوانی اور لٹریسی ریٹ 100 فیصد تک پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔

س جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو آپ کس سے متاثر تھے؟

ج شروع میں فراق گورکھپوری چوتھی دہائی 48، 49 اور 50 میں ان کا بہت ڈنکا تھا۔ پھر فیض تھے، راشد تھے، جگر مرادآبادی اور سیماب اکبرآبادی تھے۔ یہ لوگ اس وقت شاعری کے افق پر چھائے تھے۔ جگر مرادآبادی کی ایک غزل چالیس چالیس اخباروں میں چھپتی تھی۔ فیض کی غزل ''وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے'' کی دھوم تھی۔ ہم نے انہی لوگوں کو پڑھا، ہمارے سینئر بھی انہی لوگوں کے قائل تھے۔ فیض صاحب کی نقش فریادی اور راشد کی ماورا کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔

س آج کی شعری فضا اور اس زمانے کی شعری فضا میں کیا بنیادی فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج اس زمانے کی شعری حسیات اور موجودہ دور کی شعری حسیات میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے۔ اس فرق کو سب سے پہلے ناصر کاظمی نے واضح کیا۔ ان کی شاعری بالکل نئے طرز احساس کی شاعری تھی۔ پھر مجید امجد اور منیر نیازی ہیں جن کی شاعری میں اس زمانے کے مضامین اور موجودہ زمانے کے مضامین ہیں جن میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ عدم، اختر مجاز بڑے شاعر تھے لیکن آج کے زمانے میں ان کا کوئی حوالہ نظر نہیں آتا۔ آج کا شاعر لفظوں اور اصلاحات کا استعمال نئے طریقے سے کرتا ہے بجائے اس کے کہ وہ پرانی زبان اور اصلاحات میں الجھا رہے۔ اس نے ایک نئی شعری زبان تخلیق کر لی ہے۔

س شعری ضروریات کے تحت زبان میں اس تبدیلی کے حوالے سے آپ ظفر اقبال کو کہاں رکھیں گے؟

ج ظفر اقبال ایک کمال کا شاعر تھا۔ اس کی پہلی کتاب ''آب رواں'' ہے۔ اس میں اس کے شعری اسلوب، طرز احساس اور بات کا طریقہ، اس میں ایک تازگی تھی۔ اس کے بعد ''گلفتاب'' آئی جس میں نہ جانے افتخار، جالب اور یہ جو گروپ ہے، جو زبان کو خواہ مخواہ توڑنے پر کمر بستہ ہیں۔ یہ جو ایک نئی لسانیات تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ ظفر اقبال ان کے ہتھے چڑھ گئے اور کتاب ''گلفتاب'' لکھ ماری حالانکہ گل آفتاب آپ سیدھا لکھ دیں۔ جب ان کا شعری مجموعہ آیا تو صاف نظر آتا تھا کہ یہ سب کچھ انہوں نے شعری ضروریات کے تحت نہیں بلکہ دانستہ زبان کو توڑنے

چھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اب انہوں نے اسی کتاب کو سیدھی زبان میں لکھ کر چھپوا لیا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ انہوں نے ایک مصنوعی تجربہ کیا تھا جس میں سراسر نا کام رہے۔

س آپ کے بعد نظم اور غزل میں ایک دو نسلیں منظر عام پر آئی ہیں۔ آپ کے بعد کون سے ایسے لوگ ہیں جن سے آپ اچھی توقعات رکھتے ہیں، خاص طور پر غزل کے حوالے سے؟

ج ہمارے بعد کی نسل میں بعض لوگ بڑا اچھا لکھ رہے ہیں۔ جیسے جلیل عالی، علیم قریشی، علی محمد فرشی، عباس تابش، جواز جعفری، اختر شمار، مقصود وفا، اشرف یوسفی، عذرا عباس اور کچھ کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کی غزل میں واقعی جان ہے۔

س اور یہ جو شاہد آفریدی ٹائپ دھڑا دھڑ کھیلنے والے ہارڈ ہٹر قسم کے شاعر ہیں؟

ج نہیں، یہ میری لسٹ میں شامل نہیں ہیں۔ یہ شو بز کے لوگ ہیں۔ جو آدمی صرف شہرت کے لیے کام کرتا ہے اس کی زندگی بڑی تھوڑی ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایک سراب کی سی ہے جس سے کسی کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ مجھے لکھتے ہوئے تقریباً پچاس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ میری لگن ہے۔ میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ کاتا اور لے ڈوری غزل لکھ کے جب تک دس آدمیوں کو سنا نہ لوں میری تسلی نہیں ہوتی۔

س ''میرے ماہ و سال'' آپ کی یادداشتیں ہیں، اس حوالے سے ادبی حلقوں میں بڑی ہلچل رہی، بہت ردعمل سامنے آئے، ایک طبقے نے کہا یہ چونکانے کی کوشش کے علاوہ کچھ نہیں، آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

ج میری طبیعت میں ہی نہیں ہے کہ صرف چونکانے کے لیے لکھوں۔ بنیادی طور پر میں ایک تنہائی پسند انسان ہوں۔ میرے پاس کچھ باتیں کہنے کی تھیں جو مجھے ترغیب دیتی تھیں کہ میں ان کو ریکارڈ پر لاؤں۔ میری زندگی میں میرے دوستوں کے حوالے سے کچھ واقعات تھے۔ پھر اپنے دوستوں اور خاندان جن سے میرا قریبی تعلق تھا، میں ان کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ یادداشتیں میرے ساتھ ہی دفن ہو جائیں۔ جب آپ لکھتے ہیں تو اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہوتا کہ آپ اپنی زندگی کو نمایاں کریں۔ ہر آدمی کی زندگی میں اچھے برے واقعات ہوتے ہیں۔ آدمی فرشتہ تو نہیں کہ اس سے غلطی نہ ہو۔ میں نے ان باتوں کو ایمانداری سے بیان کیا ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے ماں باپ، دوستوں اور بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ بھئی! بندہ تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرے اور خامیاں چھوڑ دے تو پھر بھلا کیا بات ہوئی۔ سچ تو دونوں پہلو سامنے

رکھ کر ہی بیان کیا جا سکتا ہے، جو میرے نزدیک سچ ہے میں نے بیان کر دیا۔ اب تک میرے بیان کردہ واقعات کو کسی نے جھٹلایا تو نہیں بس وہ یہ کہتے ہیں کہ بعض باتوں کو چھپانا ہی بہتر ہے۔

س کون کون سے لوگ آپ سے ناراض ہوئے؟

ج زاہد ڈار، منیر نیازی اور کشور ناہید خاص طور پر مجھ سے ناراض ہوئے۔

س انتظار حسین کے بارے میں بھی آپ نے کچھ لکھا؟

ج انتظار اپنے بارے میں کچھ بتاتا ہی نہیں۔ وہ ایک بند شخصیت ہے۔ وہ بڑا محتاط انسان ہے۔ وہ دوستوں کے متعلق رائے دینے سے بھی گریز کرتا ہے۔

س منیر نیازی کے بارے میں آپ نے کیا لکھا؟

ج ان سے میرے تعلقات بڑی مشکل سے ٹھیک ہوئے۔ آپ کیوں دوبارہ ہماری لڑائی کروانا چاہتے ہیں۔

س آپ یہ محتاط تبصرہ اس لیے کر رہے ہیں غالباً اب آپ نے تنہائی سے بڑا کچھ سیکھا ہے۔

ج: آپ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں نے اپنی یادداشتیں یورپ کی طرز پر لکھی تھیں جیسے یورپ میں لوگ آٹو بائیوگرافی لکھتے ہیں۔ وہاں اگر آٹو بائیوگرافی میں سات آٹھ فی صد جھوٹ بھی بول دیا جائے تو جائز ہے۔ ہمارے ہاں یہ روایت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کچھ اخلاقی قدروں کی پابندی ہے۔ ہمارے ہاں پردہ ڈالنے کی پابندی ہے جس کا میں نے کچھ لحاظ نہیں کیا۔ اس وجہ سے ناراضگیاں ہوئیں تو یہ ایک فطری ردعمل ہے۔

س سنا ہے کشور ناہید صاحبہ سے آپ کی صلح ہو گئی ہے؟ غالباً آپ کے اور ان کے درمیان کچھ معاملات طے پا گئے ہیں؟

ج ہاں اب مجھے احساس ہوا ہے کہ مجھے کچھ باتیں نہیں لکھنا چاہئیں تھیں۔ شاید میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لکھ گیا تھا۔ مگر چونکہ ہماری دوستی پرانی ہے، یہ ایسے تو ختم نہیں ہو سکتی۔ اب ہمارے تعلقات معمول پر آ گئے ہیں۔ جو ''ماہ و سال'' کی اشاعت سے پہلے تھے۔

س کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے اپنا موقف تبدیل کر دیا ہو؟

ج ہرگز نہیں، یہ ساری باتیں تو ریکارڈ پر ہیں اور میں اب بھی اس موقف پر قائم ہوں کہ وہ ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ اس میں سے کسی نے کوئی غلط یا جھوٹ کو پوائنٹ آؤٹ نہیں کیا۔ بس ان کو اعتراض تھا کہ بعض باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔

جمشید مسرور

جمشید مسرور کا نام اُردو ادب کے قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ ان چند پاکستانی شعراء میں سے ہیں جنھوں نے اردو کے علاوہ بھی کسی عالمی زبان میں شاعری کی ہو اور وہ شائع بھی یورپ میں ناروے جیسی جگہ سے ہوئی ہو۔ نارویجن سے اردو میں دولسانی شعری مجموعوں کے علاوہ بھی آپ کی پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ''شاخِ منظر'' اور ''میری خوشبوئیں میرے پھول'' شعری مجموعے ہیں جبکہ دو کتابیں لارس سو ہیے اور ارلنگ کٹرسن کے تراجم پر مشتمل ہیں۔ بے شمار عالمی اعزازات حاصل کرنے والے شاعر اور ادیب سے ہونے والی گفتگو بغیر کسی لمبی تمہید کے قارئین کی نذر ہے:

س آپ ایک طویل عرصے سے ناروے میں اردو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں، ناروے کب اور کیسے پہنچے؟

ج یہ قصہ تب کا ہے جب آتش جوان تھا، جوانی کی امنگ تھی، بار بار کے مارشل لاز سے تنگ آ گیا تھا۔ مغرب میں صرف مادی اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہی نہیں وہاں پر جمہوریت بھی ہے جو کہ میرے نزدیک ایک نعمت ہی نہیں بنیادی انسانی حق بھی ہے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء نے میرا دل پاکستان سے اچاٹ کر دیا تھا۔ میں ان دنوں سٹیٹ بنک لاہور میں کام کرتا تھا۔ میرے بعض دوست ان دنوں باہر چلے گئے تھے اور کچھ جا رہے تھے۔ انہی میں سے ایک دوست جو کوپن ہیگن میں مقیم تھا، واپس آیا اور اپنے ساتھ مرسڈیز گاڑی اور نئی نویلی دلہن لے کر آ گیا۔ وہی دوست میرے ملک چھوڑنے کا سبب بنا۔ جب وہ واپس کوپن ہیگن جانے لگا تو مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ کچھ دیر میں اسی دوست کے ہاں ٹھہرا۔ پھر وہاں سے ناروے چلا گیا۔ ناروے میں مجھے ایک بڑی اچھی فیملی کے ساتھ رابطے کا موقع ملا جس نے میری بے انتہا مدد کی اور مجھ سے کہا کہ ناروے میں ہی رک جاؤں اور میں ٹھہر گیا گو کہ اس کے بعد بھی پاکستان گیا مگر واپس آ گیا۔ بس تب سے یہیں پر ہوں۔

س شعر کہنا کب شروع کیا؟

ج بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ شعر میرے خون میں ہے۔ میرے دادا مولوی پروفیسر مسرور کپورتھلوی بڑے اچھے شاعر تھے۔ آپ صاحب دیوان تھے۔ 1926ء میں آپ کا دیوان ''نوائے رنجور'' کے نام سے شائع ہوا۔ میں آپ کو انکا ایک شعر سناتا ہوں:

نقش اس کا کہیں نہ مٹ جائے
میں رگڑتا نہیں جبین نیاز

والد محترم اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر جیسے لوگ ان کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے۔ ان کا دیوان میرے پاس پڑا ہوا ہے مگر ابھی تک چھپوا نہیں سکا۔ ان شاءاللہ جیسے ہی فرصت ملتی ہے، ضرور چھپواؤں گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، بہت ہی بچپن سے میرا جھکاؤ شاعری کی طرف تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں میں نے پہلا شعر کہا تھا جس پر میرے بہن بھائیوں نے میرا مذاق بھی اڑایا۔ شعر تو وہ بس ایسے ہی تھا لیکن شعر کے تمام فنی تقاضوں پر پورا اترتا تھا۔ بہرحال یہ میری شاعرانہ زندگی کی ابتدا تھی۔

س آپ کی اب تک کتنی اور کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ج پنجابی شعری مجموعہ تیار ہے مگر ابھی شائع نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ تقریباً سات کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیادہ تر شاعری کی کتب ہیں اور دو منظوم تراجم ہیں جو میں نے نارویجن شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کے اردو زبان میں کئے ہیں۔ ''لمحوں کے سمندر'' اور ''پچھلے برس کی دھوپ'' کے نام سے میری ذولسانی شاعری کی کتابیں بھی یہاں اوسلو سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ گو کہ شاعری کا آغاز تو بچپن سے ہی کر دیا تھا مگر میری پہلی کتاب چالیس برس کی عمر میں شائع ہوئی۔ یہاں میں بتاتا چلوں کہ ناروے میں کتاب چھپوانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں پر پبلشرز مصنف کو سوئی کے ناکے سے گزارتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ جب میری پہلی ذولسانی کتاب شائع ہوئی، نارویجن اور اردو زبان میں بیک وقت چھپنے والی میری دوسری کتاب کی اشاعت کے دوران مجھے خیر سوئی کے ناکے سے انہوں نے نہیں گزارا۔ اس کے علاوہ لارس سوہے اور کرسٹن اور ارلنگ کٹرین کے تراجم کو بھی لوگوں نے بہت سراہا ہے۔ میں نے حال ہی میں تیرہ نارویجن شعراء کے تراجم کئے ہیں جو کہ جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہونے والے ہیں۔

س اس سوال کا جواب کیا دیں گے اگر پوچھا جائے کہ لکھتے کیوں ہیں؟

ج چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔مگر خدائی اشارہ تھا۔میرے اندر سے کوئی چیز آتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی قصداً شاعری نہیں کی ہے۔جب جب اندر سے آواز آئی ہے تب تب لکھا ہے۔کچھ ایسی نظمیں ہیں جنہوں نے جگا کر مجھے نصف شب کو خود کو مجھ سے لکھوایا ہے۔ میں نے کبھی خود کو مجبور کر کے شاعری نہیں کی ہے۔

س آپ کی بیگم مرحومہ جو کہ پاکستانی نژاد تھیں،ان کے نام پر اوسلو میں ایک سڑک کا نام رکھا گیا ہے،ان کے متعلق کچھ بتائیں گے؟

ج ان کا نام روبینہ تھا۔مجھ سے شادی کے بعد روبینہ رانا ہو گئیں۔وہ بہت ہی ذہین خاتون تھیں۔بڑے علمی گھرانے میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ان کے والد سکوارڈن لیڈر تھے۔ شادی کے بعد جب وہ میرے پاس آئیں تو سب سے پہلے انہوں نے بڑی سرعت کے ساتھ نارویجن زبان پر عبور حاصل کیا۔تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے اتنی عمدہ زبان بولنا شروع کر دی کہ سب کو حیران کر دیا۔اس کے بعد انہوں نے لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔پارٹی میں بھی انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت ترقی کی۔ٹی وی مذاکروں،مباحثوں میں شرکت کی وجہ سے پورے ناروے میں بہت مقبول ہو گئیں۔آئے دن اخبارات میں ان کے انٹرویو چھپتے تھے۔روبینہ نے تارکین وطن عورتوں کے متعلق ناروے میں پائے جانے والے اس امپریشن کو توڑ ڈالا کہ یہ عورتیں لوکیس گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہوتی ہیں۔ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔وہ بڑے مختصر عرصے میں ناروے کی مقبول ترین رہنما بن گئی تھی۔انہیں قومی دن کے موقع پر قومی جلوس کی قیادت کے لئے چنا گیا۔میں بتا تا چلوں کہ یہ دن اور یہ جلوس ناروے میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔جلوس کے سربراہ نے قومی اسمبلی کو بھی خطاب کرنا ہوتا ہے اور بادشاہ معظم کو بھی مبارک باد پیش کرنا ہوتی ہے۔

انہی دنوں اوسلو شہر کی ہزارویں سالگرہ منائی گئی۔اس موقع پر یہاں کا روایتی لباس خصوصی طور پر تیار کروایا گیا تھا۔اس لباس کو شہر کے سٹی ہال میں پیش کیا جانا تھا۔یہ اعزاز بھی روبینہ کو حاصل ہوا کہ اسے اس لباس کو پہننے کے لیے چنا گیا جسے پہن کر نہ صرف وہ سٹی ہال میں گئیں بلکہ ٹی وی پر بھی اس کی لائیو کوریج کی گئی۔مگر افسوس! جیسا انگریزی میں کہتے ہیں کہ جو لوگ خدا کو زیادہ محبوب ہوتے ہیں وہ جوانی میں ہی مر جایا کرتے ہیں۔بچے ابھی بہت چھوٹے تھے،میری بیٹی اس وقت بارہ سال کی تھی جب روبینہ کا انتقال ہوا۔انہیں جتنی محبت ناروے کے معاشرے سے تھی اس

سوسائٹی نے بھی اسی محبت سے ان کی محبت کا جواب دیا۔

ان کے جنازے میں ملک کی بڑی شخصیات موجود تھیں جن میں ناروے کے موجودہ وزیر اعظم بھی شامل ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ایک متفقہ قرارداد کے ذریعے ناروے کی حکومت نے اوسلو کے بالکل مرکز میں ایک سٹریٹ کا نام ''روبینہ رانا سٹریٹ'' رکھ دیا۔ یہ کسی بھی غیر ملکی کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ جب بھی کوئی پاکستانی مہمان آتا ہے تو میزبان انہیں یہ سٹریٹ دکھانے کے لے ضرور لے کر آتے ہیں۔

س ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

ج میں خوش قسمت آدمی تھا جسے بہت اچھا جیون ساتھی ملا۔ انہوں نے کبھی میرے شوق سخن میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔ عموماً بیویاں شاعروں کا ناطقہ بند کر دیتی ہیں مگر میری بیوی تو بہت مددگار تھی۔ میں سال تک ''بازگشت'' کے نام سے ادبی پرچہ نکالتا رہا ہوں۔ اس کی تیاری میں بھی وہ میری بہت مدد کیا کرتی تھیں۔ میں مشاعروں کے لیے دوسرے ملکوں میں بھی اکثر جاتا رہتا تھا مگر انہوں نے کبھی نہیں روکا کہ مت جائیں۔ بلکہ کئی دفعہ تو میرے ساتھ ہی شریک سفر ہو گئیں۔

س شعر و ادب کی خدمت کے علاوہ آپ یہاں سرکاری ملازمت بھی کرتے ہیں؟ اپنے اس کام کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج میں یہاں رائل ریسرچ کونسل آف ناروے میں بحیثیت ایگزیکٹو آفیسر کام کر رہا ہوں۔

س آپ کا یہ ادارہ کیا کام کرتا ہے؟

ج یہاں پہلے چار پانچ الگ الگ ریسرچ کونسلیں تھیں۔ سائنس، آرٹس، ایگری کلچر وغیرہ جن کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ساری ریسرچ کونسلیں ایک بڑی اور مرکزی ریسرچ کونسل کے بینر تلے جمع ہو چکی ہیں جسے رائل ریسرچ کونسل آف ناروے کہا جاتا ہے۔ ناروے میں جو بھی ریسرچ ہوتی ہے چاہے میڈکل، آرٹ، کلچر یا پھر کسی شعبے سے وابستہ ہو، ہمارا دفتر اسے فنانس کرتا ہے۔

س ادبی دنیا میں پائی جانے والی گروہ بندیوں اور دھڑے بندیوں کو آپ کس انداز میں دیکھتے ہیں؟

ج جب میں لاہور رہتا تھا تو ان گروپ بندیوں سے بڑا تنگ تھا۔ خیر اب مجھے یہ گروہ بندیاں تنگ کرتی ہیں۔ کوئی گروپ ادھر کوئی گروہ ادھر۔ میں تو سب سے ملتا تھا۔ اگر کوئی نہیں ملنا چاہتا تھا تو اس کی اپنی مرضی۔ گروہ بندیوں کا نقصان یہ ہے کہ جب آدمی کسی گروپ میں چلا جاتا ہے تو اس کے ساتھی اسے بڑھاوا دیتے ہیں۔ خواہ وہ اچھا شاعر ہو یا نہ ہو، مگر آخر کار ادب میں زندہ وہی رہتا

ہے۔جس نے کوئی زندہ مصرع کہا ہو۔شاعری کوئی اداکاری تو ہے نہیں، اس کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ دوست میرے مختلف گروپس اور دھڑوں میں ضرور ہیں مگر میں کسی گروہ میں نہیں ہوں۔اصل بات تو آپ کا اپنا کام اور تخلیق ہے۔

س آپ کو بے شمار اعزازات بھی مل چکے ہیں، ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج پاکستان اور ہندوستان کی کئی غیر سرکاری ادبی تنظیموں کی طرف سے مجھے بہت سارے ایوارڈ مل چکے ہیں، ان کی تفصیل میں تو میں نہیں جاتا، ہاں! مجھے یہاں ناروے میں حکومت کی طرف سے آرٹس ایوارڈ دیا گیا ہے جو ناروے کا دوسرا سب سے بڑا سرکاری ایوارڈ ہے۔انگریزی فلم "Identity of soul" میں Henry Ibson کی ایک نظم کو میں نے انگلش میں ترجمہ کیا ہے، میرے لیے تو یہ بھی اعزاز ہی ہے۔

س نئے لکھاریوں کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج سب سے پہلے تو نئے لکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر دیکھیں کہ میں شاعر ہوں بھی کہ نہیں، کیونکہ شاعری ورزشیں کر کے نہیں ہوتی، یہ عطائے خداوندی ہے۔اگر اندر سے آواز آئے کہ ہاں، تو پھر شاعری کے شعبے کو اپنا لیں۔شاعری کے بھی لوازمات ہوتے ہیں جیسے موسیقی میں دیکھتے ہیں کہ گلوکار سر میں ہے کہ نہیں، مصوری میں دیکھتے ہیں کہ پینٹر رنگ کیسے لگاتا ہے۔شاعری دنیا کا نازک ترین کام ہے۔ایک کاغذ اور قلم سے لفظوں کے ذریعے شاعر نے سب کچھ دکھانا ہوتا ہے۔زمین، آسمان، سائے، منظر، اس کے لیے زبان پر مہارت اور پھر مطالعہ نہایت ضروری ہے۔جہاں تک شاعرات کا تعلق ہے تو وہ آپ بھی جانتے ہیں کہ اکثر بزرگوں کی مہربانی سے ہوتی ہیں۔

OOO

جواز جعفری

جواز جعفری اردو غزل اور نظم کے ممتاز شاعر ہیں۔ شاعری کے علاوہ کالم اور ڈرامہ بھی ان کا حوالہ ہے۔ ان کے کئی سیریلز پی ٹی وی اور پرائیویٹ چینلز سے آن ائیر جا چکے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ''دہلیز پر آنکھیں'' اور ''مٹھی میں تیرا وعدہ'' چھپ کر نقادانِ فن سے تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ خاص طور پر دوسرے شعری مجموعے کو ظفر اقبال جیسے شاعر نے نئی شاعری کا سمت نما قرار دیا ہے۔ جواز جعفری روایتی اور فرسودہ نظریہ شعر پر کاری ضربیں لگاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں انسان اور کائنات کے حوالے سے اہم تین سوالوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے'' کو بے حد پذیرائی ملی۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غزل کے بعد جواز جعفری نثری نظم کی طرف آئے تو اسے نئے ذائقوں اور جہتوں سے آشنا کیا، آجکل جنگ کے خلاف ان کی نظموں کا بڑا چرچا ہے...... ''موت کا ہاتھ کلائی پر ہے'' ان کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں اردو شاعری میں پہلی بار کسی شاعر نے جنگ کو اتنے بڑے سکیل پر شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اردو شاعری میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ ان کا ایک اور حوالہ تنقید اور تحقیق ہے اقبال ساجد کا پہلا مجموعہ اثاثہ اور بعد ازاں کلیات اقبال ساجد مرتب کئے ہیں اور ادب میں نئے مباحث کو جنم دیا۔ جواز جعفری لبرل، آزادی پسند اور صاف گو شاعر ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے استاد ہیں اور ایم اے او کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ ان دنوں اردو ادب یورپ اور امریکہ میں کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔

س آج کل جنگ کے خلاف آپ کی نظموں کا بڑا چرچا ہے، یہ خیال کیسے آیا؟ کیا پرویز مشرف اور واجپائی ملاقات سے تحریک ملی؟

ج جنگ کا تعلق کسی ایک ملک یا معاشرے سے نہیں، دنیا کا شاید ہی کوئی خوش قسمت ملک ایسا ہے جو اندرونی اور بیرونی تشدد کی لپیٹ میں نہ ہو؟ جنگ ہمیشہ سے انسان کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ انسان کی مذہبی اور سیاسی تاریخ خون کے چھینٹوں سے لبریز ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں دو

عالمی جنگوں کے علاوہ خلیج کی جنگ ہمارے سامنے ہے۔ علاوہ ازیں افریقہ، ایشیا حتیٰ کہ یورپ میں بھی انسان جنگ سے محفوظ نہیں۔ اگر ہم اپنے خطے پر نظر ڈالیں تو اس وقت جنوبی ایشیا بھی بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہے، جنگ کی معمولی سی چنگاری روایتی جنگ کو ایٹمی جنگ میں بدل سکتی ہے اور پلک جھپکنے میں انسانوں کی صدیوں کی تہذیبی کاوشیں اور حاصلات راکھ کے ڈھیر میں بدل جائیں گے۔ یہی وہ مقامی اور عالمی منظر نامہ ہے جس نے مجھے بڑی شدت سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے گزشتہ چھ سات سالوں کے دوران صرف جنگ کے خلاف لکھا ہے کیونکہ میرے خیال میں جنگ کی تباہ کاریوں پر لکھنے کے بجائے ادیب کو جنگ کے خلاف لکھنا چاہیے۔ میں ہر طرح کی روایتی اور غیر روایتی جنگ کے خلاف ہوں، بے شک میری فتح ہی کیوں نہ ہو۔

س کیا آپ کے علاوہ بھی لکھنے والوں نے اس موضوع کی طرف توجہ دی ہے؟

ج دنیا بھر میں تخلیقی آدمی روایتی طور پر جنگ کا مخالف اور امن کا حلیف تصور کیا جاتا ہے اور عالمی لٹریچر میں جنگ کے خلاف اعلیٰ پائے کا ادب موجود ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے، ہمارے ہاں بھی بعض اہل قلم نے اس کی طرف توجہ دی ہے مگر جنگ کا سوال جس قدر اہم اور بھیانک ہے اسے اتنی شدت اور ذمہ داری سے ہمارے ادب میں جگہ نہیں دی گئی۔ لکھنے والوں کی اکثریت کو تو اس سوال نے سرے سے اپنی طرف متوجہ ہی نہیں کیا۔ وہ غیر اہم اور غیر متعلق موضوعات پر پچاس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ایسے پاپولر لکھنے والوں نے قارئین کو مایوسی، تنہائی اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں دیا، جب موت اربوں انسانوں کی شہ رگ کے قریب چہل قدمی کر رہی ہو تو ایسے میں لب و رخسار کی بات کیسے ہو سکتی ہے؟ ہمارے بیشتر اہل قلم کسی اور عہد میں زندہ ہیں، انہیں اپنے آس پاس ہونے والی جغرافیائی، سماجی، معاشی سیاسی اور کلچرل تبدیلیوں کا سرے سے شعور ہی نہیں ہے۔ یا پھر شاید ہمارا لکھنے والا موت اور اسلحہ فروشوں کے ساتھ ساز باز کر چکا ہے؟ وہ بیچارہ خود حالت جنگ میں ہے اور یہ جنگ اپنے اپنے مفادات کی ہے۔ اکثر ادیبوں نے اپنی توپوں کے رخ ایک دوسرے کی ماؤں بہنوں کی طرف کر رکھے ہیں۔ ادیبوں کی باہم لڑائیوں کے نتیجے میں ادیب کی ماں بہن ہونا خطرے سے خالی نہیں رہا۔ بہر حال بات ذرا اور طرف چلی گئی۔ بطور ادیب ہمارا فرض ہے کہ ہم جنگ کو ٹالنے اور امن کے قیام کے لیے جد و جہد کریں اور لوگوں کے اندر جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کے حوالے سے شعور پیدا کریں۔ جنگ کے خلاف میری نظموں کا مجموعہ موت کا ہاتھ کلائی پر ہے، عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے جو کم از کم ہمارے ادب میں

پہلا شعری تجربہ ہے۔ میں نے ڈوبتے ہوئے جزیرے پر اپنے حصے کی مٹی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

س آپ نے اپنی شاعری میں کن سوالوں کو زیادہ اہمیت دی ہے؟

ج میرا تعلق ادیبوں کے اس گروہ سے نہیں ہے جو قافیے کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں جن کے مضامین کا تعین قافیہ کرتا ہے، یہ بات دراصل کسی بھی شخص کے کمزور شاعر ہونے کی دلیل ہے، قادرالکلام شاعر کی راہ میں قافیہ بھی رکاوٹ نہیں بنتا۔ میں ذاتی طور پر غزل کی تنگ دامانی کا گلہ بھی نہیں کرتا۔ اور بطور شاعر مجھے اچھی طرح علم ہے کہ مجھے کیا کہنا ہے یا مجھے کیا کہنا چاہیے؟ حیات و کائنات کے حوالے سے بکھرے ہوئے لاکھوں سوالوں میں سے میں اپنے طور پر اہم ترین سوالوں کو منتخب کرتا ہوں اور اپنی شاعری میں انہی سوالوں کو اٹھاتا ہوں۔ ان سوالوں میں دلچسپی ہی میرے نظریہ فن کا تعین کرتی ہے میرے دوست اور پسندیدہ شاعر ظفر اقبال غزل کو محض مصرع سازی قرار دیتے ہیں مگر یہ تو محض کرافٹ مین شپ ہے، اصل چیز تو آپ کے وہ خیالات یا نظام فکر ہے جو آپ زبان کے ذریعے یا مصرعوں کی مدد سے دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس اعلیٰ خیالات ہی نہیں ہیں تو آپ محض اعلی درجے کی مصرعہ سازی کر کے کیا تیر ماریں گے؟ جہاں تک میرے موضوعات کا تعلق ہے، میں نے کائنات کی تخلیق، اس کے کام کرنے کے طریق کار، کہکشاؤں کی تشکیل، زمین پر زندگی کا آغاز اور کائنات کے انجام جیسے اہم ترین سوالوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے گلوبل ولیج بن جانے کے بعد اب شاعر کا مخاطب کسی ایک زبان کے خطے کے لوگ نہیں رہے اس لیے اب اس کا مقابلہ بھی دنیا بھر کی زبانوں کے لٹریچر سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایسے مسائل سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے جو دنیا بھر کے انسانوں کو یکساں طور پر درپیش ہیں جیسے جنگ، بھوک، بیماری، ہجرت، بے روزگاری، آلودگی، جہالت، بے گھری اور اس قسم کے دوسرے مسائل کے بارے میں بڑے تواتر کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔

س جواز صاحب آپ کی شاعری میں خصوصاً ''مٹھی میں تیرا وعدہ'' کی شاعری میں ایک بدلا ہوا تصور کائنات نظر آتا ہے، اس حوالے سے کچھ بتائیں؟

ج اس کا کائنات سے آخر کیا رشتہ ہے؟ کائنات کے ساتھ اپنی ذات کی تطبیق اور تفہیم کے پس منظر میں ہی دیو مالا اور مذہب نے جنم لیا۔ ستارے تب بھی کروڑوں نوری سال کے فاصلے پر ہونے کے باوجود اس کی ذات اور سرگرمیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے تھے۔ سورج برفانی

عہد میں اسے اپنی حدت سے زندگی بخشتا تھا،فصلوں کے پکنے میں مدد دیتا تھا اور آگ کی دریافت سے قبل اندھیرے کی عفریت سے نجات دلاتا تھا اس لیے سورج کو مرکزی دیوتا مان کر اس کے ارد گرد ہی پورا نظام تشکیل دیا گیا اور یوں صائبیت یعنی ستارہ پرستی کے عظیم مذہب کا آغاز ہوا۔اسی طرح برفانی عہد میں آگ کی دریافت بھی ایک عظیم نعمت سے کم نہیں تھی لہٰذا آگ کو مرکزی دیوتا بنا کر اس کے گرد بھی ماضی کے ایک عظیم مذہب کے تانے بانے بنے گئے۔ یہ محض ماضی کے انسانوں کی ضعیف الاعتقادی کے قصے نہیں ہیں بلکہ یہ وہ کاوشیں ہیں جو اس کمزور انسان نے اس عظیم کائنات کو سمجھنے کے عمل کے دوران کیں،جس کے روبرو اسے اچانک لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ یہ تو ماضی کی باتیں ہیں مگر آج کا انسان بھی اپنے آباؤاجداد کی طرح کائنات اور اس کے مظاہر میں مسلسل دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے۔وہ کائنات کے قفل کو کھولنا چاہتا ہے، چاند اور سورج جو کل تک دیوتا تھے،آج کا انسان ان دیوتاؤں کے جاہ وجلال کو چیلنج کر رہا ہے، چاند کا راز اس نے فاش کر دیا ہے جبکہ سورج دیوتا کے اسرار جاننے کے لئے کئی مشن بھیجے جا چکے ہیں،انسان ستاروں کے اندر جھانک رہا ہے۔وہ ان کی پیدائش،بچپن،جوانی،بڑھاپے اور موت تک کے عمل کی تشریح کرنے کے قابل ہو گیا ہے،وہ دور پار کے سیاروں پر زندگی شفٹ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے،وہ اپنی ملکی وے کہکشاں کے علاوہ زمین پر رکھی دوربین سے ایک کھرب کہکشائیں دریافت کر چکا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک کہکشاں میں ایک ارب سے لے کر پانچ کھرب تک ستارے اور سیارے ہوتے ہیں۔سائنس نے آج کے شاعر کے سامنے کائنات کے کئی ورق الٹ دیئے ہیں، اب زمین اس کے لئے سودا کی طرح کسی بیل کے سینگ پر رکھی نئی نہیں اور نہ ہی غالب اور اس پیشروؤں کی مانند وہ سات آسمانوں والے نظریے کا قائل ہے۔وہ پوری حقیقت پسندی کے ساتھ کائنات کا سامنا کر رہا ہے۔میرے نظامِ فکر میں کاسموس ایک بنیادی سوال ہے اس لیے آپ کو میری شاعری میں ایک نیا اور بدلا ہوا تصورِ کائنات دیکھنے کو ملتا ہے۔

س آپ کا شمار 1980ء کی دہائی کے چند اہم غزل گو نوجوان شعراء میں ہوتا ہے،اتنی اچھی غزل کہتے کہتے اچانک نثری نظم کی طرف کیوں چلے آئے؟

ج آپ کا سوال نہایت اہم ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کے اس سوال کا جواب میری بجائے میری نظم کو دینا چاہیے۔میں لٹریچر میں لبرل ازم اور آزادی کا قائل ہوں اور ادب میں ہیئت اور موضوعاتی تجربوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔میرے سلسلے میں اس بات کی میرے نزدیک

کوئی اہمیت نہیں کہ میں نثری نظم کی طرف کیوں آیا؟ بلکہ اصل اہمیت تو اس بات کی ہونی چاہئے کہ میں نے کیسی نظم لکھی ہے؟ جہاں تک میرے نثری نظم کی طرف آنے کا تعلق ہے میرے نزدیک نظم اور غزل کے مقابلے میں نثری نظم کا مستقبل بہت تابناک ہے، یہ ہر طرح کے خیالات کو ویلکم کہتی اور بدلے ہوئے شعری مذاق کی نمائندہ بھی۔ میرے نزدیک ایک فکری اور تخلیقی توانائی سے بھرپور شاعر ہی نثری نظم کے معیار پر پورا اُتر سکتا ہے۔ کمزور اور روایتی ذہن والے شاعر کے لئے نثری نظم اپنی آغوش وانہیں کرتی۔ نثری نظم کہنا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں اور شاعری میں نثری نظم کے دروازے سے داخل ہونے والے غیر شاعر حضرات بھی غلطی پر ہیں۔ نثری نظم صرف پورا شاعر لکھ سکتا ہے، ادبی ہیجڑے جنہیں غزل نے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا، نثری نظم تو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ نثری نظم کا ایک اپنا تخلیقی نظام ہے۔ یہاں ردیف قافیے کی پابندی ختم ہوتی ہے تو کئی دوسری پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، غزل کئی کمزور خیال اور زبان کو قبول کر لیتی ہے مگر نثری نظم کا مزاج سمندر جیسا ہے یہ مردہ خیال اور لفظ کو باہر اگل دیتی ہے۔ میرے نثری نظم کی طرف آنے کی ایک وجہ دنیا بھر میں اس کی پذیرائی بھی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اب دنیا سمٹ رہی ہے ثقافتی اور جغرافیائی بیریئر ٹوٹ رہے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے دنیا کو آپ کی ہتھیلی پر لا رکھا ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے اور قریب آنے کی خواہش زور پکڑ رہی ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے کے لئے ادب سے زیادہ کیا چیز مفید ہوسکتی ہو؟ اس ضرورت کے تحت ہر زبان ادب کے تراجم ہو رہے ہیں چونکہ نثری نظم کا شاعر مکمل طور پر اپنی فکری اور تخلیقی توانائی پر بھروسہ کرتا ہے اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے نثری نظم کے ردیف قافیے آڑے نہیں آتے جبکہ غزل کا سب سے بڑا پرابلم ہی یہی ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اس کا خوبصورتی بھتی نظام پوری طرح دوسری زبان میں منتقل نہیں ہو پاتا۔ صرف خیال کو ہی منتقل کیا جا سکتا ہے مگر بیشتر غزلوں میں خیال نام کی چیز ہوتی کہاں ہے؟

س: آپ کے پسندیدہ شاعر؟

ج: غالب، ظفر اقبال اور جاوید شاہین۔ جاوید شاہین اس لئے بھی مجھے پسند ہے کہ وہ عمر کے اس حصے میں بھی فکری و تخلیقی سطح پر تروتازہ ہے جبکہ اس کے ہمعصروں میں بیشتر لوگ کب کے تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔ بہت سے خود کو دہرا رہے ہیں یا پھر اپنی ہی اردو شاعری کو پنجابی اور انگریزی میں خود ہی منتقل کر کے کتابوں کی تعداد بڑھانے میں مصروف ہیں۔ مگر جاوید شاہین کے ساتھ ایسا

معاملہ نہیں ہے، وہ اس عمر میں بھی میرے ساتھ باقاعدہ واک کرتا ہے، روزانہ تازہ شعر کہتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ گروپ بندی کے شکار ہمارے نقادوں نے اس کی شاعری کی طرف وہ توجہ نہیں دی جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

س آپ کے ہمعصروں میں کون کون سے شاعر آپ کو اچھے لگتے ہیں؟

ج میرے تمام ہمعصر تخلیقی طور پر توانا ہیں مگر اچھا شعر یا نظم کہنا ان میں سے اکثر کا مسئلہ نہیں رہا۔ اختر شمار ادبی صحافت کی نذر ہو رہا ہے مجھے اس بات کا دکھ ہے، میری خواہش ہے کہ وہ پہلے کی طرح محض خوبصورت شاعری پر توجہ دے۔ اسی طرح عباس تابش کو پبلشنگ نگل رہی ہے حالانکہ وہ زبردست تخلیقی قوت کا مالک ہے۔ میں نے حال ہی میں اس کی تازہ غزلیں سنی ہیں جن سے مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ قمر رضا شہزاد مجھے بہت پسند ہے مگر پتہ نہیں کیوں اس کے دونوں مصرعوں کے درمیان شعری تلازمہ اسرار ہی بنا رہتا ہے۔ اسی طرح اطہر ناسک بھی میرا پسندیدہ شاعر ہے مگر وہ آجکل منظر سے غائب ہے اور گھر سے اردو بازار کے درمیانی سفر میں روزمرہ کی معمولی چیزوں کی نذر ہو رہا ہے۔ مقصود وفا اور بھارت جا بسنے والا آفتاب حسین بھی خوبصورت شعر کہتا ہے، ان کے علاوہ مجھے سعود عثمانی بھی اچھا لگتا ہے۔ میں کبھی کبھار اس کے ہاں اس کی شاعری سننے جاتا ہوں۔ میرے سمیت آج کے غزل گو شعراء کے ہاں مطالعے کا شدید فقدان ہے۔ وہ معلوم سے آگے دیکھنے کے بجائے پہلے سے دریافت شدہ دنیا کو نئے سرے سے دریافت کرنے میں مصروف ہیں۔ کوئی ایک بھی نہیں جو سورج میں دروازہ لگائے یا اس کائنات کے کسی نامعلوم گوشے سے کسی نئی کائنات تک جانے والے راستے کی کھوج لگائے۔

○○○

جی۔اے۔نجم

س بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج میرا آبائی شہر اقبال نگر ہے۔ جو کہ ضلع ساہیوال کا شہر ہے اور میاں چنوں شہر کے بالکل قریب ہے۔ میں نے میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول اقبال نگر سے حاصل کی اور پھر ایف ایس سی گورنمنٹ کالج ساہیوال سے کی۔ پھر بی اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ میں نے 2005 میں جاب شروع کی اور اس کے ساتھ ساتھ ACCA بھی جاری رہا اور 2012 میں ACCA مکمل ہو گیا۔ مجھے باہر کے اندر 20 سال ہو گئے ہیں۔ اگر گردوپیش کے حالات کی بات کی جائے تو میرے بڑے بھائی کو شاعری کا شوق تھا۔ محمد الیاس قیصران کا نام ہے۔ وہ مختلف سنگرز کی غزلیں بڑے شوق سے سنتے تھے، ان کو سن سن کے میرے اندر بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ چونکہ بھائی بھی شاعری کرتے تھے اس لئے ان کو دیکھ دیکھ کے میرا رجحان بھی شاعری کی طرف ہو گیا۔ اور اس طرح میں نے شعر کہنا شروع کیئے۔ میرے والد صاحب کا کپڑے کا کاروبار ہے اور اس سلسلے میں وہ باہر بھی جاتے ہیں۔ وہ سائیکل پر کپڑا بیچتے ہیں۔ محنت مزدوری کر کے انہوں نے ہماری پرورش کی اور ہمیں تعلیم دلوائی اور ہمیں اس مقام پر پہنچایا۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے والدین کی محنت اور دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔

س ادب سے شوق کی ابتداء کیسے ہوئی؟

ج جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ میرے بڑے بھائی شاعری کا شوق رکھتے تھے اور مختلف سنگرز کی غزلیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ انوپ جلوٹا، مسعود خان، جلوخان کی غزلیں وہ بڑے شوق سے سنتے تھے۔ تو وہیں سے بس ادب کے سے شوق کی ابتداء ہوئی۔

س پہلا شعر کب کہا؟

ج میں نے تقریباً 2002 میں پہلا شعر کہا۔ 2002 سے 2005 تک میں نے جو شاعری کی اس میں کچھ مسائل تھے۔ جس کو کہہ لیں کہ غزل کے مسائل۔ جب 2005 میں جاب شروع ہوئی

توسلسلۂ روزگار میں مصروف ہو گئے۔ادب کا شوق ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا لیکن وہ چیزیں جاری نہ رکھ سکا۔لکھا کچھ نہیں گیا۔ 2019 میں پھر میں باقاعدہ نصیر احمد صاحب کا شاگرد بن گیا اور ان سے رہنمائی لینا شروع کی۔ان کی رہنمائی لے کر پھر باقاعدہ شاعری دوبارہ شروع کی۔لیکن ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی۔میں سمجھتا ہوں کہ جب آپ کا شوق آپ سے کہتا ہے کہ اب کتاب آجانی چاہیئے تو آپ کو کتاب لکھنی چاہیے۔جب آپ گرو ہو رہے ہوتے ہیں تو آپ کے اندر بہت سی میچور چیزیں ہوتی ہیں جو آپ کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔جیسے جیسے آپ آگے جاتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی کتاب آنی چاہئے جس میں ایسی نظمیں،غزلیں ہوں جس سے ادب کے اندر اضافہ ہو۔اس وجہ سے ابھی کوئی کتاب لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔اگر کبھی ارادہ ہوا تو انشاءاللہ ضرور لکھیں گے۔

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

ج جی میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں حصہ لینا شروع کیا پھر اس کے بعد پنجابی سنگت پاکستان۔تو یہ دو تنظیمیں ایسی ہیں جن میں میرا اٹھنا بیٹھنا رہا اور ادبی تربیت کی سرپرستی میری یہیں سے ہوئی ہے۔باقاعدہ تو کسی تحریک میں شامل نہیں ہوئے۔جی اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔سیاست کے بغیر شاعری کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔آپ کو حالات حاضرہ پر بھی نظر رکھنی چاہیئے اور جہاں آپ کو لگے کہ چیزیں ٹھیک نہیں ہو رہی،اس کے متعلق آپ کو لکھنا چاہیے۔ضرور لکھنا چاہیے۔

س کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج دیکھیں میں سمجھتا ہوں کہ ہر چیز اپنے ارتقائی عمل سے گزرتی ہے۔جوں جوں انسان آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو وہ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا کی جانب جاتا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ کتاب سے دوری ہے۔جو لوگ کتاب پڑھتے ہیں وہ آج بھی کتاب پڑھتے ہیں۔کتاب بینی بہت پر لطف ہوتی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا کی اپنی اہمیت ہے۔آپ اگر نجم فیلوز کی بات کریں جو کہ ہمارا ادارہ ہے،ہم یہی کام کر رہے ہیں کہ جو بھی شاعری ہمارے پاس پرنٹ میڈیا کی صورت میں موجود ہے، ڈیجیٹلائز کیا جائے۔ جو شاعر اور شعر ہے وہ عوام تک خود پہنچے۔کلام شاعر بہ زبان شاعر کی صورت میں پہنچے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کتاب سے دوری

ہے۔لیکن جب الیکٹرانک میڈیا پرآپ کسی کو سنتے ہیں تو آپ کا رجحان بڑھتا ہے اورآپ کا دل کرتا ہے کہ آپ مزید اسکو سنیں۔اس کے بعد وہ یوٹیوب پرآئے ہیں اور یوٹیوب کتاب تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا کی اپنی اہمیت ہے اور کتاب کی اپنی اہمیت ہے۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج یقیناً جب انسان سفر میں ہوتا ہے۔زندگی میں ایسے تجربات ہوتے اور مشاہدات ہوتے ہیں۔زندگی میں ڈی ٹریک کرنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں،حوصلہ افزائی کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔یہ سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔تخلیقی سطح پر شروع میں مجھے بالکل بھی علم نہیں تھا کہ کوئی استاد ہوتا ہے جس سے رہنمائی لی جاسکتی ہو۔اسے اپنا کام دکھایا جاسکے،جس سے آپ کی تخلیقی صلاحیت بڑھ سکے۔یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو میں نے فیس کیا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ جو نئے لکھنے والے ہیں ان کو نجم فیلوز اون کرے اور ان کی آگے تخلیقات پہنچائے۔تاکہ ان کو پتہ ہو یہ ایک ٹریک ہے اس کے اوپر رہ کر آپ نے اپنی تخلیقات پہنچانی ہیں۔میرے ساتھ تو معاملہ ہی ایسا رہا کہ جو نئے لکھنے والے ہیں ان کو اون نہیں کیا جاتا،کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں دیا جاتا۔ایک ذاتی تعلق کی بنا پر لوگوں کو مشاعرے میں شامل کیا جاتا تھا۔پھر مجھے لگا کہ کوئی پلیٹ فارم ایسا بھی ہو جہاں پر اقربا پروری نہ ہو۔ہمیں ایک ایسا پلیٹ فارم بنانا ہے جہاں ہر کوئی آسکے اور اپنی تخلیقات پیش کر سکے۔

س شعروادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہے؟

ج شعروادب کی ترویج کے لئے مشاعرے بڑے اہم ہیں۔جو شعر سننا چاہتا ہو وہ مشاعرے میں آتا ہے اور اسکو مزید شوق پیدا ہوتا ہے۔اب تو الیکٹرانک میڈیا نے اتنی آسانی کر دی ہے کہ آپ یوٹیوب یا سوشل میڈیا پر کسی بھی شاعر کو سن سکتے ہیں۔ان لوگوں کے لئے بھی آسانی ہے جو کہتے تھے ہمیں کوئی پلیٹ فارم نہیں ملتا۔سوشل میڈیا بذات خود ایک پلیٹ فارم ہے۔آپ اپنی شاعری اس کے اوپر ڈالیں تو لوگوں تک پہنچتی ہے۔

س نجم فیلوز کے قیام کا خیال کیسے آیا؟ ادب کی بے لوث خدمت کا یہ تجربہ کیسا رہا؟

ج 2019 میں جب میں نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا میں لوگوں کے پاس گیا ہوں تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ رابطے میں رہیں۔ہمارے منتظمین کی

خوشامد کریں گے تو آپ مشاعروں میں شریک ہوں گے۔تو میں نے سوچا کہ ایسا پلیٹ فارم ہو جس میں کسی بھی علاقے کو ترجیح دیئے بغیر جو بھی ادب سے متعلق ہے بغیر کسی زبان کے فرق کے جو اہل سخن ہے وہ یہاں آئے اور اپنی تخلیقات پیش کرے۔تو اس وجہ سے یہ پلیٹ فارم بنایا گیا۔دوسرا ادب کی بے لوث خدمت کرنے کے لئے یہ پلیٹ فارم بنایا گیا۔جو شاعری کی شیلف لائف ہے وہ مشاعرے کی لائف کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے جناب اچھا پروگرام کروالیا یا ہم نے ایک سال اچھے پروگرام کروالئے۔اس کے بعد آپ کا پروگرام پورا ہو گیا، ایسا نہیں ہے۔آپ کو مسلسل کام کرتے رہنا چاہیئے۔ہاں بیچ میں ایسے لوگ بھی تجربے کے طور پر آئے جن سے ہمیں سیکھنے کو بہت کچھ ملا۔ایک شعر ہے اس حوالے سے۔

محبت یوں تو اچھی ہے، مگر نجمی کے رویے نے
ہمیں اس تجربے سے یوں گزارا کہ کچھ نہیں چھوڑا

تو بعض اوقات ایسے لوگ آپ کو ایسے تجربات دے جاتے ہیں کہ آپ کو لگتا ہے کہ سب ختم ہو گیا۔میرا ذاتی طور پر خیال ہے کہ جب تک آپ کے کام سے کوئی ایک بندہ بھی مستفید ہو رہا ہو تو آپ کو جاری رکھنا چاہیئے۔بجائے اس کے جو لوگ آپ کے خلاف بات کر رہے ہیں۔اس پر توجہ دینے کی بجائے آپ کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج اساتذہ کہتے ہیں کہ آپ کو مطالعہ کرنا چاہیئے۔یہ بہت ضروری ہے۔مطالعہ کا آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ نے کیا نہیں لکھنا۔یہ بہت اہم بات ہے کہ جب کوئی تخلیق کار اس بات کو سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کیا نہیں لکھنا؟ تخلیق کار تب پیدا ہوتا ہے۔اس کی تخلیق تب پیدا ہوتی ہے۔اور ایک نیا پن اس کے اندر تب پیدا ہوتا ہے جب اسے پتا ہو کہ اسے یہ نہیں لکھنا۔ایک اچھے تخلیق کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس چیز کا خیال رکھے کہ جو چیزیں لکھی گئی ہیں ان میں ایک نیا انداز ہو۔یہ انداز ہی کسی چیز کا تسمیہ بنتا ہے۔آپ کو لگتا ہے کہ اس انداز میں اس چیز کو کسی نے پیش نہیں کیا۔ہمیں اس چیز کا خیال رکھنا ہوگا کہ جو ہم تخلیق کرنے جا رہے ہیں اس تخلیق کا فائدہ کیا ہوگا۔اس کا مقصد کیا ہے۔جب آپ اس کا مقصد سمجھ جاتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی تخلیق بھی پروان چڑھتی ہے۔آپ کے اندر برکت بھی آتی ہے، چیزیں بھی بہتر ہوتی ہیں۔بجائے اس کے کہ آپ کسی کی چیز اٹھائیں اور اس پر تجربہ کریں۔لوگ کیا کرتے ہیں کہ کسی کی چیز اٹھاتے ہیں اور اس

پر تجربہ کرتے ہیں۔اس پر مجھے ایک شعر یاد آ گیا۔

کیوں چبایا نجم لقمہ غیر کا
قہقہے سے کیوں نکالا قہقہہ

ایک تخلیق کار کو خیال رکھنا چاہیئے کہ اسے لائن کے اوپر لائن نہیں مارنی چاہیے۔آپ اپنا راستہ بنائیں۔نیا پن لائیں۔میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تخلیق بہتر ہوگی،اس میں برکت بھی ہوگی۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج 2005 میں میں نے ہائیر پاکستان کو بطور اکاؤنٹنٹ یا ڈیٹا انٹری آپریٹر جوائن کیا۔اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔اپنا A C C A مکمل کیا۔ان آٹھ سالوں میں میں نے یہ کیا کہ اس دوران جو کمایا تھا وہ سب ACCA پر لگا دیا۔تعلیم پر زیادہ توجہ دی۔تعلیم اور جاب ساتھ ساتھ چلتے رہے۔اس کے بعد کمپنی نے مجھے اسسٹنٹ مینیجر کے عہدے پر ترقی دے دی۔عموماً ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے کہ بچے ACCA کرنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ ہمیں اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ مل جائے گی،ایسا نہیں ہوتا۔آپ کا تجربہ آپ کو آگے لے جاتا ہے۔جتنا آپ کا تجربہ زیادہ ہوگا۔کسی فرم کے اندر آپ کی اہمیت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔لوگ بھی اس حساب سے آپ کو پہچانیں گے۔اگر آپ کا تجربہ نہیں ہے تو پھر چیزیں بھی اس حساب سے نہیں ہوں گی۔آپ کو پریکٹکل جاری رکھنا چاہیئے۔اس سے آپ پالش ہوں گے۔آپ کے اندر بہتری آئے گی۔سٹڈی اور جاب اگر ساتھ ساتھ کر رہے ہوں گے تو چیزیں زیادہ باریکی سے سمجھ میں آئیں گی۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج جو بھی لکھاری ہے میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اندر ایک ٹیلنٹ رکھ کے بھیجتا ہے، چیزیں جس طرح سے آپ لیتے ہو۔جیسے شاعر ایک حساس انسان سمجھا جاتا ہے۔وہ معاشرے سے، اندرون سے، ہر جگہ سے سیکھتا ہے۔سڑک پر چلتے چلتے کسی پھول کو وہ دیکھ کر رک جاتا ہے۔طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس کی آنکھیں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔تخلیقی طور پر اللہ نے جس کے اندر یہ جوہر رکھا ہے وہ اس سے تاثر لیتا ہے۔وہ معاشرے سے بھی ہو سکتی ہیں،اندرون سے بھی ہو سکتی ہیں۔وہ کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہیں۔آپ پر کچھ بیتا ہے،وہ بھی

ہوسکتا ہے۔ کسی کو دکھ میں دیکھ کر آپ کو برا لگتا ہے۔ پھر یہ آپ کو لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے تخلیق کار اپنے ارد گرد سے تخلیق کرتا ہے اور پھر تحریر کرتا ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کا بہت اہم کردار ہے۔ ہمارا سب سے بڑا پرابلم یہ ہے کہ ہم تبدیلی کو قبول نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیلنج ہمیں پھر قبول نہیں کرتا۔ اور اس کھینچا تانی میں ہم بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میں اس کی مثال ایسے دوں گا کہ لاؤڈ سپیکر جب نیا نیا آیا تو مولوی حضرات نے اسے حرام قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اب اگر آپ ان کے ساتھ ملنا بھی چاہو گے تو نہیں مل سکتے۔ ایسے ہی جب سوشل میڈیا آیا تو ہمارے کچھ دوستوں نے دیکھا کہ یہ اچھا پلیٹ فارم ہے تو کچھ نے اس سے بہت کچھ اڈوپٹ کیا تو کچھ نے اسے حرام قرار دیا کہ کیا فضول یہ ٹک ٹوک ہے، کیا یہ فیس بک ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب آہستہ آہستہ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔ اب اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کہ اگر کسی پلیٹ فارم پر کوئی حقیقی تخلیق کار بندہ موجود نہیں ہے تو غیر تخلیق کار بندے اس کو ہائی جیک کر لیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ فنکار بندے آگے آئیں۔ سوشل میڈیا کی اہمیت کو سمجھیں اور یہاں اُپنے قدم مضبوط کریں۔ پہلے ہم نے دیکھا کہ سوشل میڈیا پر بے معنی سی شاعری چلتی رہی ہے۔ کئی اور طرح کے الفاظ کہے جاسکتے ہیں اس کے لئے۔ نتیجہ کیا ہوا کہ جب جینوئن شاعر آنا شروع ہوئے تو لوگوں نے اس کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں سوشل میڈیا بہت ضروری ہے۔ اب آ رہی ہے AI ٹیکنالوجی (مصنوعی ذہانت)۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ابھی سے AI ٹیکنالوجی کے بارے میں سیکھنا چاہیئے کہ کیسے ہم اس کو استعمال میں لا کر ادب کے فروغ کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی نئی ٹیکنالوجی آئے آپ اس کو جلد سے جلد اپنی زندگی میں شامل کریں تاکہ آپ کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج شاعر بہت حساس انسان ہوتا ہے۔ جب اس کو اندر سے دوسروں کا دکھ، اپنا دکھ، کوئی خوشی نظر آتی ہے۔ کوئی محبت کے جذبات، یہ سارے جذبات، کیفیات جو اس کے سامنے ہوتی ہیں تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب وہ متاثر ہوتا ہے تو ان کو لفظوں کی شکل دیتا ہے۔ وہ لفظوں کی شکل تخلیق کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارے

تجربات،مشاہدات بنیاد بنتے ہیں۔بنی نوع انسان کی ایک لمبی تاریخ ہے بعض اوقات کئی لوگوں کامشاہدہ ایک جیسا بھی ہوسکتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی کوئی حساس بندہ آیا ہو۔جس طرح آپ لکھ رہے ہیں،وہ بھی اسی طرح لکھے۔اتنی تعداد میں اوراتنی دیر سے لوگ لکھ رہے ہیں تو آپ کوان سے ذراہٹ کے لکھنا ہے۔مختلف انداز میں لکھنا ہے۔تاکہ آپ کی تخلیق ذرامختلف ہو،اس میں برکت پڑے اوراسکی پذیرائی ہو۔تخلیق کا حق اس وقت ادا ہوتا ہے جب کوئی بھی عام آدمی اس کے اوپر کوئی بھی سچوایشن ہواسکو یوں لگے کہ جوآپ نے لکھا ہے وہ اس کے لئے فٹ ہے۔تو یہ آپ کی تخلیق کے لئے ایوارڈ سمجھ لیں۔یہ آپ کا معاوضہ ہے کہ جب کوئی بھی بندہ اپنی سچوایشن کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا ہواور آپ کا شعر سامنے آ گیا ہے تو وہ اس کو اپنے ہی الفاظ سمجھ لے،تو آپ کی تخلیق کا حق ادا ہوجا تا ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج یہ بڑااہم سوال ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ ہم بیٹھ کر ویلیوایشن کرتے ہیں کہ جو میں کام کرر ہا ہوں اس کا آخرکار مجھے کیا فائدہ ہوا،کیا نقصان ہوا؟تو معاملہ یہ ہے کہ میں اقبال نگر،میاں چنوں جیسے علاقے میں تھا،تخلیق کار،شاعر وہاں موجود تھے،لیکن ان تک رسائی ممکن نہیں تھی۔جب لاہورآیا۔لوگوں نے بے پناہ محبتیں دیں۔میں سمجھتا ہوں کہ نجم فیلوز نے جو چارسال کام کیا ہے میرا کام ریفرنس کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جب لوگ آپ کو کاپی کرر ہے ہوتے ہیں۔آئیڈیاز کاپی کر رہے ہیں۔جتنی عزت مجھے چارسال میں ملی۔لوگ چالیس چالیس سال لگادیتے ہیں لیکن ان کواس طرح پذیرائی نہیں ملتی۔الحمداللہ کہیں پر بھی جاتے ہیں تو نجم فیلوز حوالے کے طور پر موجود ہوتا ہے۔لوگ اس وجہ سے بہت عزت کرتے ہیں کہ میں نجم فیلوز کا پلیٹ فارم چلار ہا ہوں۔بہت سے نوجوان ملتے ہیں جن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نجم فیلوز کا پلیٹ فارم استعمال کریں۔

س آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟مستقبل کے کیا منصوبے اورارادے ہیں؟

ج ہم نے اس سے پہلے نجم فیلوز میں مختلف سلسلے چلائے ہوئے تھے۔میں نے نجم فیلوز کا آغاز پانچ سال پہلے کیا تھا۔پہلے دوسال میں اس کو گھر سے چلاتا رہا ہوں۔پھر میں نے باقاعدہ سٹوڈیو بنایا تاکہ لوگوں کو آنے جانے میں آسانی ہو۔ہم نے مختلف سلسلے یہاں پر اعتراف فن بنائی۔اس کے علاوہ ہم نے نجم آرائی رکھی۔ہم نے نجم نو کیا،تو یہ سارے سلسلے کئے۔اگر فکشن کی

طرف جائیں تو ہم نے کہانی پور کے نام سے پروگرام کیا۔جس میں ہم نے مختلف کہانیاں ریکارڈ کیں۔فلسفے کے اوپر ہم نے انٹرویوز اور لیکچرز ریکارڈ کئے۔یہ سارا سلسلہ چلتا رہا ہے۔اب آگے سٹوڈیو کو تھوڑا سا اپ گریڈ کر رہے ہیں۔جس میں پروگرام کی طرز پر ہم دو تین دوستوں کو بلائیں گے۔ان کے انٹرویوز کریں گے۔ان سے بات چیت کریں گے۔کوئی مخصوص موضوع ہے مثلاً ہم فلسفے کی بات کرتے ہیں۔فلسفے کے اساتذہ کو زحمت دیں گے۔ان سے بات کریں گے۔ان سے فلسفے کے متعلق سیکھیں گے۔آرٹ اور لٹریچر کی جتنی بھی جہات ہیں ان سے وابستگان کو ہم بلائیں گے۔بلا کر ان سے بات چیت کریں گے۔اس کے علاوہ ہم پوڈ کاسٹ کا سلسلہ بھی شروع کر رہے ہیں۔ظاہر ہے نشستیں تو ویسے کی ویسے ہی چلتی رہیں گی۔کسی بھی ادارے کو روشناس کرانے میں نشستیں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔لوگ شعر بڑی تعداد میں دیکھتے اور سنتے ہیں۔اور سوشل میڈیا پر اس کو پسند بھی کرتے ہیں۔آرٹ اور لٹریچر سوشل میڈیا پر شاعر اور پھر کتاب کا سفر ہوتا ہے۔اسی طرح شاعری کسی بھی پلیٹ فارم کو متعارف کرواتی ہے۔پھر آرٹ اور لٹریچر کی جو جہات ہیں آہستہ آہستہ لوگوں کو اس کی طرف لایا جاتا ہے۔جس طرح کی کسی کی دلچسپی ہوتی ہے،اس طرح کے سامعین آپ کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔اسی طرح ہم نجم فیلوز کو ری ڈیزائن کر کے اس میں نئے فیچرز شامل کریں گے۔پہلے جب ہم نے نجم فیلوز بنایا اس وقت یہ واحد سٹوڈیو تھا جو آرٹ اور لٹریچر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔پھر لوگوں نے شاعری کے اوپر سیٹ اپ بنا کر کام شروع کر دیا۔مجھے بہت خوشی ہوئی کہ لوگوں نے اس پر کام شروع کر دیا۔ہمارا کچھ برڈن ان کی طرف شفٹ ہوا۔اب ہماری کچھ اور جہات ہیں جس پر اب ہم کام کریں گے۔ادب کے حوالے سے یوں کہہ لیں کہ تھوڑا سا وقفہ دیا ہے۔میں نے اپنی آپ بیتی بھی شروع کی تھی وہ بھی اب دوبارہ لکھنی شروع کرنے کا ارادہ ہے اور شاعری تو مزاج کے ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔

OOO

حسن عباسی

س شعر وادب کی طرف رجحان کیسے پیدا ہوا؟ یہ خیال کیسے آیا کہ لکھنا چاہئے۔

ج بچپن سے ہی تصویر میں آنکھوں کے سامنے بنتی بگڑتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مجھے منظر اپنی طرف بلاتے ہیں۔ درختوں اور پرندوں سے باتیں کیا کرتا تھا، ریت پر ایک نام لکھا کرتا تھا۔ وہ نام بیل بنا، اس پر پھول آئے اور میں شاعر بن گیا۔

لکھا جو تیرا نام کوئی بیل بن گئی
آ جائیں اس پہ پھول دعا کر رہا ہوں میں

میری یہ دعا بچپن میں ہی قبول ہوگئی۔

س آپ کا تعارف ادبی حلقوں میں بطور شاعر رہا ہے، شاعری کے حوالے سے آپ ان چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنہیں نہ صرف عوامی پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ جن کی کتابیں بھی بکتی ہیں، سفرنامہ نگاری کی طرف کیسے آ گئے؟

ج کہتے ہیں جب شاعری بوڑھی ہوتی ہے تو نثر میں پناہ ڈھونڈتی ہے مگر میرے ساتھ معاملہ الٹ رہا۔ جب شاعری جوبن پہ آئی اور لوگ سراہنے لگے، اس وقت مجھے نثر لکھنے کا خیال آیا۔ سیاحت کا شوق بچپن سے تھا۔ سند باد جہازی کے سفرنامے بستے میں رہتے تھے۔ شاعری اسفار کا وسیلہ بنی اور اسفار سفرناموں کا وسیلہ ٹھہرے۔

س مکمل مزاحیہ مشاعرے بھی خوب ہو رہے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج نہ تو مزاحیہ شاعری پر میرے تحفظات ہیں اور نہ ہی مزاحیہ مشاعرے کے حوالے سے موجودہ دور میں کوئی بھی مثبت سرگرمی ہو قابل تحسین ہے۔ البتہ مجھے مزاحیہ شاعروں سے ایک گلہ ہے کہ وہ مشاعرے میں اپنا مکمل کلام سنا کے جاتے ہیں اور انہوں نے خود بخود فرض کر لیا ہے کہ جیسے ان کا اب تک کا سارا کلام سننے کے لیے لوگ آئے ہوئے ہیں، ایسی بات نہیں ہے۔

س ادب کی ترویج کے لیے قائم اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج ادب کی ترویج کے لیے قائم اداروں کا حال بھی پاکستان کے دیگر اداروں جیسا ہے۔ادب کو اور ادیب کو ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ادب تو مرکز سے دور دریا کے کنارے بیٹھا کوئی شاعر تخلیق کر رہا ہے یا پھر کسی ٹیلے پر بیٹھا یا پہاڑی علاقے میں کسی پتھر پہ بیٹھا ادیب تخلیق کر رہا ہے۔سرکاری اداروں کے تمام مفادات منظورِ نظر لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

س آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ کیا کوئی نئی کتاب آنے والی ہے؟

ج لکھنے کا سلسلہ تو چلتا رہتا ہے۔ابھی میرا تازہ سفرنامہ جو کہ یو اے ای اور دوحہ کی سیاحت پر مشتمل ہے ''ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور آج کل یورپ کا سفرنامہ ''تتلیاں ستاتی ہیں'' لکھ رہا ہوں۔

س کیا ادیب کو نظریاتی ہونا چاہیے؟ ادب میں دائیں اور بائیں بازو کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

ج ادیب تو ہوتا ہی نظریاتی ہے۔تخلیق کار کا کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور ہوتا ہے۔بغیر نظریے کے تو تخلیق ممکن نہیں۔وہ نظریہ محبت کا ہو یا انقلاب کا۔دائیں اور بائیں بازو کے نظریات ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔اب تو ایک ہی بازو ہے اور وہ ہے ارفع تخلیق کا۔

جس دیے میں جان ہو گی وہ دیا رہ جائے گا

س اپنے ہم عصروں میں سے بھی کسی سے متاثر ہیں؟

ج ہم عصر ہوں، سینئر ہوں یا جونیئر، اچھا شعر یا اچھی تخلیق سے ضرور متاثر ہوتا ہوں۔اچھی تخلیق کو پرکھنے کا پیمانہ ہر شخص کا جدا ہے۔اس میں انسان کے فطری مزاج کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔بعض اوقات ایک نقاد کے نزدیک بہت ارفع و اعلیٰ تخلیق دوسرے نقاد کی نظر میں غیر معیاری ہوتی ہے۔یہ بڑی لمبی بحث ہے۔

س پسندیدہ شاعر کون ہے؟ آپ نثر بھی لکھتے ہیں اور صاحبِ مطالعہ بھی ہیں، نثر کس ادیب کی زیادہ پسند ہے؟

ج پسندیدہ شاعر والا سوال بھی کسی پہیلی سے کم نہیں۔جیسے جیسے آپ کا ذوق، مزاج اور زمانہ بدلتا ہے، پسندیدہ شاعر بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔آج کل کوئی نہیں۔جزوی طور پر چند شعراء کی شاعری پسند ہے۔مکمل کلام کسی ایک شاعر کا کبھی پسند نہیں آیا۔یہی معاملہ نثر کا ہے۔کسی دور میں

مستنصر حسین تارڑ کی تحریریں بہت پسند تھیں۔ بعد میں مظہرالاسلام اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب اور منٹو وغیرہ کو پڑھا تو پسند کا معیار بھی بدل گیا۔مزاح میں مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، عطاء الحق قاسمی پسند ہیں۔

س بحیثیت پبلشر آپ کتاب کا کیا مستقبل دیکھ رہے ہیں؟

ج پاکستان میں کتابوں کی صورت حال کبھی بھی حوصلہ افزا نہیں رہی۔ قاری اور کتاب کے درمیان فاصلہ ہے جو کہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔لوگ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں مگر مڈل مین (دکاندار) جس کا کام قاری تک کتاب کی ترسیل ممکن بنانا ہے، سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کتاب کی تخلیق سے اشاعت تک کے مراحل میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا مگر وہ اپنی من پسند کتب جن پر کمیشن زیادہ سے زیادہ ہو، دکان میں رکھتا ہے اور اس طرح سب سے زیادہ فائدے میں وہی رہ جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی کتابوں کی قیمتوں کا ذمہ دار حکومت کی طرح وہ بھی ہے۔

س آپ کی بیشتر کتابوں کے ناموں میں محبت کا لفظ ضرور آتا ہے، اس کی کوئی وجہ ہے؟

ج محبت کا لفظ میرے نزدیک نہایت وسیع معنوں میں ہے جو کہ ذرے سے لے کر پوری کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔ زندگی سے محبت کو منہا کر دیں تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ گھر سے لے کر عالمی سطح کے مسائل محبت سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ آج ہمیں اپنے اردگرد جو خلفشار نظر آتا ہے، یہ محبت کے نہ ہونے سے ہے۔ محبت منزل نہیں راستہ ہے جس پہ عمر بھر پھول کھلانے ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ہر شخص محبت کرنا چاہتا ہے مگر دوسرے کو یہ حق دینے کو تیار نہیں۔

س کیا آپ آج کی شاعری سے مطمئن ہیں؟

ج اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ کیا میں آج کی اردو شاعری سے مطمئن ہوں؟ تو میرا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ اگرچہ میں خود غزل گو شاعر ہوں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری کو سب سے زیادہ نقصان غزل نے پہنچایا ہے۔ اسے جوان نہیں ہونے دیا۔ زندگی سے متعلق بہت سے موضوعات ہیں جو اردو شاعری کا اس طرح حصہ نہیں بن سکے۔ یہ بہت ہی افسوس ناک صورت حال ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں نظم کو بھی مقبولیت ملی ہے۔ اس سے ہو سکتا ہے مستقبل میں صورت حال تبدیل ہو جائے۔ البتہ غزل خاص کر آج کی غزل میں موضوعات کی بہت یکسانیت ہے۔

س آپ کو حال ہی میں عکس خوشبو ایوارڈ ملا ہے، اس سے متعلق آپ اپنے جذبات کس طرح

قارئین سے شیئر کریں گے؟

ج شاعر و ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے داد و تحسین کا عمل نہایت اہم ہے۔ اس کی ایک صورت ایوارڈ بھی ہے۔ سرکاری و غیر سرکاری سطح پر بہت سے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں لیکن کوئی بھی ایوارڈ اپنی کریڈیبلٹی کے حوالے سے اہم ہوا کرتا ہے۔ مختلف تنظیموں کی طرف سے مجھے ملک اور بیرونِ ملک میں کافی اعزازات اور اسناد مل چکی ہیں مگر دو وجوہ کی بنا پر مجھے عکس خوشبو ایوارڈ کی خوشی ان سب سے زیادہ ہے۔ پہلی تو یہ کہ یہ ایوارڈ ابتداء سے ہی جینوئن شعراء کو دیا گیا اور دوسری یہ کہ اس کے ساتھ اردو زبان کی نہایت معتبر اور مقبول شاعرہ پروین شاکر کی نسبت ہے۔

س آپ کی کتابوں کے ناموں میں ''محبت'' کا لفظ ہوتا ہے، ایسا شعوری طور پر ہے یا لاشعوری طور پر، اگر شعوری طور پر ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

ج مجھے محبت کا لفظ اچھا لگتا ہے۔ یہ مجھے اپنا نام لگتا ہے۔ یہ مجھے اس کا نام لگتا ہے جس کے سپنے بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ یہ لفظ مجھے اپنی زندگی کی آپ بیتی لگتا ہے۔ محبت میں مجھے پوری دنیا کے مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ محبت کا لفظ میرے ہاں بہت وسیع معانی اور مفہوم لیے ہوئے ہے۔ میرے نزدیک بقول اقبال محبت فاتح عالم ہے۔

س آپ بیرونِ ملک بھی مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں، وہاں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج بھارت میں تو اردو زبان کے حوالے سے بہت کام ہو رہا ہے۔ روزمرہ بول چال میں جو زبان بولی جاتی ہے، اسے آپ لاکھ ہندی کہہ لیں ہے تو وہ اردو ہی۔ اڑیسہ میں جو سارک کے پلیٹ فارم سے یوتھ پوئٹری فیسٹول ہوا تھا اس میں بھارت کے تمام صوبوں کے علاوہ سارک ممالک سے نوجوان شعراء آئے ہوئے تھے۔ آپ حیران ہوں گے سبھی اردو اچھی طرح سمجھتے تھے اور کافی حد تک بول بھی لیتے تھے۔ نیپال کے شعراء نے احمد فراز، منیر نیازی اور پروین شاکر کو ہم سے زیادہ پڑھ رکھا تھا البتہ رسم الخط ہندی ہے۔ یو اے ای اور دوحہ میں بہت سی ادبی تنظیمیں باقاعدگی سے مشاعرے کراتی ہیں۔ سیمینار بھی منعقد ہوتے ہیں۔ وہاں کثیر تعداد میں پاکستانی آباد ہیں اس لیے وہاں بھی اردو کے حوالے سے نہایت حوصلہ افزاء صورت حال ہے۔ ماضی قریب میں سلیم جعفری مرحوم اور ملک مصیب الرحمن نے جو علم و ادب کی شمعیں وہاں جلائی ہیں، ان کی روشنی تادیر قائم رہے گی البتہ یورپ میں اردو کی صورت حال نہایت مایوس کن ہے۔ نو

جوان نسل تو بالکل اس سے بے بہرہ ہے۔ آج سے تین یا دو دہائی قبل جو علم و ادب سے شغف رکھنے والے لوگ اور شاعر ادیب وہاں جا کر بس گئے تھے انہوں نے اپنے تئیں اردو علم و ادب کی سانسیں بحال رکھی ہوئی ہیں اور ان کے بچے بھی تھوڑی بہت شد بد رکھتے ہیں۔ وگرنہ سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں، البتہ فرانس میں ابھی بھی باقی یورپی ممالک کی نسبت مشرقی تہذیب اور اردو زبان نو جوان نسل تک منتقل ہو رہی ہے اور وہاں صورت حال قدرے مختلف ہے۔

س نئے لکھنے والوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج نئے لکھنے والے کے لیے یہی پیغام ہے کہ تخلیق کی فضا میں رہیں، اپنے اندر ٹھہراؤ پیدا کریں، جلدی نہ کریں، کلاسیکی ادب کا مطالعہ کریں، عصری ادب پر نظر رکھیں اور بھیڑ میں اپنے لیے الگ راستہ بنانے کی کوشش کریں۔

OOO

حنیف صوفی

حنیف صوفی کی تمام زندگی شعروسخن کی ترویج میں بسر ہوئی ہے۔وہ باکمال فی البدیع شاعر ہیں۔صاحب دیوان مقبول شاعر ہونے کے علاوہ ان کا ایک امتیازی تعارف یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مشاعرے منعقد کروائے۔بورے والا میں مشاعرے کی توانا روایت انہی کی مرہون منت ہے۔احمد فراز،قاسمی صاحب،منیر نیازی اور امجد اسلام امجد جیسے لوگ ان کے ایک بلاوے پر پہنچ جاتے تھے۔ہمارے وطن میں چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے شعروادب سے اس قدر والہانہ عشق کیا ہے۔میری خوش قسمتی کہ وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میاں چنوں ملاقات کے لئے میرے گھر تشریف لائے۔ان کے ہمراہ ان کے سخنور اور سخن شناس برخوردار صفیان سیفی اور پوتے بھی تشریف لائے۔یہ دیکھ کر خوشی اور طمانیت محسوس ہوئی کہ وہ ادب کو ذریعہ عزت خیال کرتے ہوئے اسے اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کے قائل ہیں۔ان سے ہونے والی گفتگو قارئین ارژنگ کی نذر ہے۔

س بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج میری پیدائش بورے والا کے علاقہ ڈی بلاک میں ہوئی۔میں نے دینی اور دنیاوی تعلیم مدرسہ عربیہ اسلامیہ بورے والا میں حاصل کی۔میرے والد صاحب بلدیہ بورے والا کے ٹھیکیدار تھے۔

س ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج مجھے بچپن سے ہی مشاعرے سننے کا شوق تھا۔1968 میں ایم سی ہائی سکول بورے والا میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔جس میں ملک کے نامور شعراء کرام نے شرکت کی۔اس مشاعرے میں ملک کے نامور شاعر جناب بری نظامی صاحب نے بھی شرکت کی۔بری نظامی کا تعلق بھی ٹرانسپورٹ سے تھا۔ان دنوں میں بھی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا ملازم تھا۔میرے خیال میں یہ وہ موقع تھا جب میں نے ادب کی راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔میں نے اس شوق

کو پورا کرنے کے لئے محترم جناب پروفیسر منشاء سلیمی صاحب کی باقاعدہ شاگردی اختیار کر لی۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج میری پہلی کتاب پنجابی میں ''کنڈیاں چوں خوشبو'' کے نام سے تھی۔جس کا پہلا ایڈیشن سن 1992 اور دوسرا ایڈیشن 1994 میں چھپا۔

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

ج سن 1972 میں ایک ادبی تنظیم مجلس میاں محمد بخش رحمت اللہ علیہ بورے والا کے نام سے قائم ہوئی جو کہ حضرت میاں محمد بخش کے نام سے منسوب تھی۔عرصہ تقریباً دو سال کے بعد ہی میں مجلس میاں محمد بخش کا صدر منتخب ہوا۔تب سے لے کر اب تک مجلس میاں محمد بخش کے زیر اہتمام سینکڑوں مشاعرے آج تک منعقد کروا چکا ہوں۔جس میں پاکستان کے بہت بڑے بڑے شعراء کرام نے شرکت کی۔

س کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج الیکٹرانک میڈیا نے نوجوان نسل کو اپنی طرف متوجہ کیا تو اس میں شاعری بھی شامل تھی۔جس کی وجہ سے نوجوان نسل کا ذہن تقسیم ہو گیا۔جس کی وجہ سے مشاعروں میں بھی کمی نظر آنے لگی اور لوگوں نے موبائل کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور ادبی سرگرمیاں کتاب سے دور ہوتی چلی گئیں۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیقیت اور ایک اچھے تخلیق کار سے مراد ہے کہ اپنی محنت اور اللہ سے عطاء کی ہوئی زندہ رہنے والی تخلیق ہوتی ہے۔اچھا شعر وہ ہوتا ہے جس کو سننے والوں کو یاد کرنے میں دشواری نہ ہو۔

س پنجابی زبان کا مستقبل کیا دیکھتے ہیں؟

ج جب تک ارد گرد مادری زبانوں والے لوگ اپنی ماں بولی سے محبت کرتے نظر آئیں گے۔انشاء اللہ ہم بھی اپنی مادری زبان سے محبت کرتے نظر آئیں گے۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج میری شادی 1968 میں ہوئی اور میں نے 1969 میں ٹرانسپورٹ کمپنی جوائن کی۔ شاعری اور مزدوری ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

س تمام زندگی آپ نے شعروسخن کی خدمت میں بسر کی ہے۔اگرنئی زندگی مالک عطا کردے توشعروسخن کی نذر کردیں گے؟ یا پھر کوئی اور کام کرنا پسند کریں گے؟

ج میں آج کل معاشرے میں جو دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔اس کو کاغذ اور قلم کے سپرد کردیتا ہوں۔جنم جنم کی بات کرنا افسانوی اور دیومالائی خیال ہے مگر بغرض محال ایسا ہوجائے توشاید اگلے جنم میں بھی شعروسخن ہی اوڑھنا بچھونا ہوگا۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا نے بہت کام کیا مگر کچھ لوگوں نے سوشل میڈیا پر ادب کو مذاق بنا دیا۔

س ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج جب انسان اندر سے جاگتا ہے اور جب کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے اس کے اندر کوئی فنکار موجود ہو تو کسی بھی صنف میں کوئی بھی راستہ اختیار کر کے تجربات ومشاہدات سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج رقم کے نقصان کو میں نقصان نہیں سمجھتا لیکن خرچ کرنے سے جو مجھے ملا،وہ بزرگ شاعروں،لکھاریوں،ادیبوں سے جو میرا تعلق اور دوستی قائم ہوئی وہ میرا سرمایہ ہے۔

س آپ نے بورے والا میں بے شمار عالمی سطح کے مشاعرے کروائے یہ کیسا تجربہ تھا؟

ج عالمی سطح پر مشاعرے منعقد کروانے سے بورے والا کے پڑھے لکھے اور کریم لوگوں کے ساتھ میری دوستی ہوگئی۔جو انشاءاللہ تعالیٰ زندگی بھر قائم رہے گی۔

س شعروادب کی ترویج میں مشاعرے کی کیا اہمیت اور کردار ہیں؟

ج ادب میں مشاعرے کا کردار گزشتہ پانچ دہائیوں سے بہت اہم رہا ہے اور لوگ دوسرے شہروں سے بھی مشاعرے سننے کے لئے آتے رہے ہیں۔اب تو کوئی بھی ایک آدمی موبائل پر بیٹھ کر مشاعرے کو آن لائن کردیتا ہے۔جس سے مشاعرے کی اہمیت پر تو فرق نہیں پڑا مگر مشاعرہ گاہ کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے۔

○○○

ڈاکٹر حنان عواد

فلسطینی شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر حنان عواد اپنے منفرد طرز تحریر کے سبب عالمی ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ ان کی آٹھ کتابیں شائع ہونے کے بعد کئی عالمی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ شاعری اور نثر میں یکساں مہارت رکھنے والی اس فنکارہ نے آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ سے عالمی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لے رکھی ہے۔ فلسطینی رائٹرز ایسوسی ایشن کی منتخب صدر ہیں۔ انقلابی رہنما یاسر عرفات کی مشیر برائے ثقافتی امور رہ چکی ہیں اور آج کل فلسطین کے موجودہ صدر محمود عباس کی بھی کلچرل ایڈوائزر ہیں۔ اخبار میں مستقل کالم لکھتی ہیں۔ تنقید کے موضوع پر انہیں عرب دنیا میں ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے اور پھر جنسی امتیاز کے متعلق ان کی تحریریں بھی عالمی سطح پر ان کا اہم تعارف ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کے پچاس سے زائد علمی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ قارئین کے لئے ان کے ساتھ پچھلے دنوں ہونے والی بات چیت پیش خدمت ہے۔

س شروع سے ہی بات کا آغاز کرتے ہیں، لکھنا کب شروع کیا؟

ج میری عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی جب یروشلم کے ایک اخبار میں میرا پہلا مضمون شائع ہوا تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، شاعری بھی انہی دنوں شروع کی تھی۔ شاعری یوں تو چھوٹی عمر میں ہی شروع کر دی تھی مگر ان دنوں سنجیدگی آ گئی۔

س یہ بتائیں لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟ یہ خیال کیسے آیا کہ لکھنا چاہئے؟

ج میرا سارا گھرانہ بہت پڑھا لکھا تھا۔ خصوصاً میرے والد تو اچھے خاصے ادبی آدمی تھے۔ طبیعت میں موزونیت شاید کچھ قدرتی بھی تھی مگر جس چیز نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ یہ احساس تھا کہ ہم اسرائیل کے زیر تسلط ہیں، شعور سنبھالتے ہی یہ بات سمجھ آئی کہ فلسطین غلام ہو چکا ہے۔ ہم اپنے مادر وطن میں ہی غیر قرار دیئے جا چکے ہیں۔ میرا لکھنے کی طرف مائل ہونا ایک احتجاج

بھی تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ لفظ کی طاقت تلوار کی طاقت کی طرح ہے اور فلسطین کی تحریک آزادی میں لفظ کی قوت بھی تلوار جیسی مؤثر ہے۔ میرے خیال میں یہی بنیادی وجوہات تھیں جنہوں نے مجھے ذریعہ اظہار کے لئے تحریر کو منتخب کرنے میں ایک کردار ادا کیا تھا۔

س اب تک کن موضوعات پر لکھ چکی ہیں اور کتنی کتابیں آپ کی شائع ہو چکی ہیں؟

ج آج کل میری سیاسی یادداشتوں پر مشتمل کتاب اپنی اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کتاب میں فلسطین پر اسرائیل کے ناجائز قبضے کی تمام کہانی بیان کی گئی ہے۔ فلسطینیوں کے مسائل اور ان کی جدوجہد آزادی پر مبنی اس کتاب کے علاوہ میری آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میری تمام شاعری دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے بالخصوص ''ہیرو کی واپسی'' اور ''خاردار تاروں کے پیچھے'' نامی کتابیں عالمی سطح پر میرا حوالہ بنی ہیں۔ ان کے تراجم کئی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ فلسطین کا مقدمہ ہی میری تحریروں کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ ''مرحوم کی یادداشتیں'' خالصتاً سیاسی موضوع پر مبنی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ تنقید اور دیگر سماجی وثقافتی موضوعات پر بھی میری کتابیں موجود ہیں۔ پچاس سے زائد اب تک میرے مقالے دنیا بھر کے اخبارات، رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ فلسطین اور مغرب کے اخبارات میں مستقل کالم نگاری بھی کرتی ہوں۔

س ادب میں کن لکھاریوں نے زیادہ متاثر کیا؟

ج محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری نے مجھے بے انتہا متاثر کیا بلکہ میں تو کہوں گی کہ میرے والد اور اہل خانہ کے بعد میرے سیاسی اور ادبی نظریات کی تشکیل میں ان دو شعراء کرام نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ محمود درویش اور ابوسلمان کی شاعری کی بدولت میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہم الفاظ کے ذریعے پورے عالم کو فلسطین کے عوام کا مؤقف سمجھا سکتے ہیں۔

س پاکستانی ادیبوں کی تحریریں بھی پڑھنے کا موقع ملا؟

ج جی ہاں! مجھے فیض احمد فیض بہت پسند آتے ہیں۔ پاکستان کے خصوصاً ترقی پسند ادیبوں

نے بہت اعلیٰ معیار کا ادب تخلیق کیا ہے۔

س آپ لکھتی کیا صرف عربی زبان میں ہی ہیں؟

ج نہیں! عربی کے علاوہ میں انگریزی میں بھی لکھتی ہوں بلکہ میری دو کتابیں تو پہلے انگریزی زبان میں شائع ہوئیں، بعدازاں ان کے عربی زبان میں تراجم شائع ہوئے ہیں۔

س ہمارے پاکستان میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے عنوان سے دو مختلف نظریات اہل قلم میں پائے جاتے ہیں، آپ ان میں سے کون سے نظریے کی قائل ہیں؟

ج ادب برائے زندگی ہی میری نظر میں معتبر بات ہے۔ ادب برائے ادب ایک مقصد تو ہو سکتا ہے لیکن زندگی کی خاطر ادب تخلیق کرنا زیادہ ارفع مقصد ہے۔

OOO

خالد مسعود خاں

خالد مسعود خان کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کالم نگاروں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے وہ مشاعروں کی جان اور اپنے منفرد طرز تحریر کے سبب قارئین کے بہت وسیع حلقے میں پسند کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے مزاحیہ شاعری کو مختلف زبانوں کی آمیزش سے نیا رنگ عطا کیا ہے جسے عوام میں بہت پسند کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت وہ عالمی سطح پر اردو کے نہایت مقبول اور معروف شاعر ہیں۔ ان کے کالم نے بھی نہایت قلیل عرصہ میں صف اوّل کے کالم نگاروں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ چند دن پیشتر ان سے ہونے والی گفتگو پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش ہے۔

س یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہئے؟

ج گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ میرے دادا شاعر تھے اور والد شاعر ہونے کے علاوہ کالج میں لائبریرین تھے۔ بہت ہی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ میرا کتاب سے تعلق بہت مضبوط اور پرانا ہے۔ کتاب سے تعلق کی بنا پر ہی میں نے زمانہ طالب علمی میں تقاریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ جن دنوں میں کالج میں زیر تعلیم تھا اور تقاریری مقابلوں میں حصہ لیتا تھا، انہی دنوں مزاحیہ شاعری شروع کی تھی بلکہ یوں کہیے کہ شروع ہوگئی تھی۔

س ویسے تو مزاح کو ہائی سیر یسنیس کہتے ہیں لیکن معروف معنوں میں کیا صرف مزاحیہ شاعری ہی کرتے ہیں یا پھر سنجیدہ شاعری بھی فرماتے ہیں؟

ج سنجیدہ شاعری کا گناہ میں نے کبھی نہیں کیا۔ میری بیگم بھی مجھ سے کبھی کبھی پوچھتی ہیں کہ آپ سنجیدہ شاعری کیوں نہیں کرتے؟ میرا موقف یہ ہے کہ اُٹھتے ہیں اخبار کھولتے ہیں تو اس میں بری بری خبریں پریشان کن حالات کا بیان ہوتا ہے۔ کام پر جاتے ہیں تو وہاں بھی ٹینشن کا راج۔ باہر نکلتے ہیں تو وہاں بھی اچھی خبر مفقود اور ارد گرد نظر دوڑائیں تو دکھی کرنے والے حالات نظر آتے ہیں۔ ایسے عالم میں مزاحیہ شاعری کے ذریعے ہم کچھ نہ کچھ خوشیاں بکھیرنے کی کوشش کرتے

ہیں۔قہقہے بانٹنے والی شاعری اداس ماحول میں ایک بہتر Contribution ہے۔

س آپ کی اب تک کوئی کتاب منظر عام پر آئی ہے کہ نہیں؟

ج کتاب تو میری اب تک کوئی بھی شائع نہیں ہوئی ہے۔

س کالم نگاری کی طرف کیسے آئے؟

ج کالم نگاری پر مجھے آمادہ کرنے کا سہرا ضیاء شاہد کے سر ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ایک دفعہ لاہور ایئر پورٹ پر فلائٹ کے انتظار میں بیٹھا تھا اور ضیاء شاہد بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ اتفاق سے فلائٹ لیٹ ہوگئی جس کے سبب مجھے اور ضیاء شاہد کو طویل گپ شپ کا موقع میسر آیا۔ اسی ملاقات میں انہوں نے مجھے کالم لکھنے کا مشورہ دیا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ تھوڑے عرصے بعد ضیاء شاہد سے ''خبریں'' کے ایک مشاعرے میں دوبارہ ملاقات ہوئی اور اس بار انہوں نے مجھے کالم لکھنے کا مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مطالبہ بھی کیا کہ میں خبریں کے لئے کالم بھیجنا شروع کروں۔ انہی دنوں خبریں ملتان کا اجراء ہوا تھا اور جو ریذیڈنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے، ان کے مجھے فون آنے شروع ہو گئے کہ آپ نے کالم لکھا کہ ابھی نہیں لکھا، لکھ دیا ہے تو بھجوا دیں۔ خبریں میں ایک دن جی کڑا کر کے کالم لکھ مارا اور سوچا کہ کالم چھاپ دیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ کالم لکھنے کا مطالبہ چھوڑ دیں گے۔ یہ 1997ء کی بات ہے، مسلسل آٹھ سال تک میں نے خبریں میں کالم لکھا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر روز نامہ اوصاف میں بھی لکھتا رہا۔ ایکسپریس سے بھی منسلک رہا اور پانچ سال سے روز نامہ جنگ کے ساتھ منسلک ہوں۔ صحافت میں آپ ضیاء شاہد کو میرا استاد بھی کہہ سکتے ہیں۔

س شاعری اور صحافت میں سے آپ کو کون سا حوالہ زیادہ پسند ہے؟

ج مجھے ذاتی طور پر شاعری کا حوالہ زیادہ خوشگوار اور پاور فل لگتا ہے مگر میں صحافت اور شاعری میں کوئی تضاد یا تصادم محسوس نہیں کرتا کیونکہ یہ دونوں ہی میری ذات کے حصے ہیں۔ نظام کی خرابیوں اور معاشرے کی ناہمواریوں اور برائیوں کے خلاف جو میرے اندر غصہ پیدا ہوتا ہے وہ صحافت کے ذریعے نکل جاتا ہے اور جو لطافت باقی بچتی ہے میں اسے شاعری کے قالب میں ڈھال لیتا ہوں۔

س آپ نے تعلیم کس شعبے کے متعلق حاصل کی؟

ج تعلیم تو میں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کی حاصل کی تھی۔ ایم بی اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس شعبے میں ملازمت بھی کی مگر صحافت اور ادب کی طرف نکل آیا۔

س بحیثیت قوم ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں یا انارکی کی جانب یا پھر کسی اور طرف؟

ج انقلاب کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں۔ ہمارے اندر انقلاب کا جین (Gene) نہیں ہے۔ اگر حالات کو صحیح رخ نہ دیا گیا تو انارکی کی طرف جانے کا امکان موجود ہے۔صورت حال کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہی نہیں ہے۔ان کا مطمع نظر تو بس یہ ہے کہ کسی طرح آج کا دن اقتدار میں گزر جائے، کل کی فکر نہیں۔ بلوچستان کا ایشو پیچیدہ صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بلوچ ہمارے دشمن نہیں ہیں مگر جب ہم ان کے شکوے شکایتیں نہیں سنیں گے، حقوق غصب کریں گے تو وہ مزاحمت تو کریں گے۔ ڈرون کا معاملہ ہے، امریکہ سے کئے گئے معاہدے ہیں اور فاٹا کا ایشو ہے۔ یہ سب معاشرے کو انارکی کی طرف دھکیل رہے ہیں مگر میں Optimistic ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ان حالات کو ٹھیک کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تسلیم کرے کہ حالات خراب ہیں۔ جب حکومت مانتی ہی نہیں کہ حالات خراب ہیں تو پھر وہ اسے ٹھیک کیسے کرے گی۔ مسئلے کا ادراک ہو گا تو پھر ہی کوئی حل بھی نکلے گا ورنہ تو یہ کرپشن اور بے ترتیبی ہمارے معاشرے کو انارکی کی طرف ہی لے جائے گی۔

س کون سے ادیب اور شاعر سے زیادہ متاثر ہیں؟

ج تحریر کی پسندیدگی مستقل چیز نہیں ہے۔ کسی کتاب سے کمٹ منٹ بھی مستقل نہیں ہوتی۔ نیا شعر زیادہ مزہ دیتا ہے اور نیا شاعر ہانٹ کرتا ہے۔ادب میں خاص پسند ناپسند چلتی رہتی ہے۔ مثلاً مجھے بچپن اور لڑکپن میں شفیق الرحمن نے اپنے حصار میں رکھا اور جوانی میں مشتاق یوسفی کے اسیر ہو گئے۔ ناول میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد پسندیدہ ہیں تو فضل کریم فضلی کا ناول بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ دیوانِ غالب ہر بار نیا لطف پیدا کرتا ہے اور اقبال کا مطالعہ بھی مستقل رہتا ہے۔ نئے شعراء میں مجھے اظہر ادیب کی نظم بے حد پسند ہے اور نظم کے ہی شاعر معین نظامی کے علاوہ عباس تابش، فیصل عجمی اور بیرون ملک بسنے والے شاعر پسند ہیں۔آپ کے علاوہ شوکت فہمی پسند ہیں۔

س شاعری کے فروغ میں مشاعرے کا کیا کردار ہے؟

ج مشاعرے کی روایت ہماری بڑی تہذیبی روایت ہے، اسے جاری رہنا چاہئے۔ پہلے مزاح مشاعرے میں انٹرٹینمنٹ کے طور پر آتا تھا اب مگر مزاحیہ مشاعرے کا کلچر سامنے آیا ہے۔ میری رائے میں سنجیدہ شاعری اور مزاح کا مکس مشاعرہ زیادہ بہتر ہے۔

س پاکستان میں ادبی مراکز لاہور، اسلام آباد اور کراچی کو سمجھا جاتا ہے جبکہ آپ ان مراکز سے دور ملتان میں مقیم ہیں، کیا آپ کو اس دوری کا احساس ہوتا ہے؟

ج میرا یقین ہے کہ میرٹ اور ٹیلنٹ کو روکا نہیں جا سکتا، صرف راستہ لمبا ہو جاتا ہے۔ اسلام آباد یا لاہور میں ہوتا تو الیکٹرانک میڈیا تک بھی با آسانی رسائی ہوتی جو کہ ملتان میں ذرا مشکل ہے مگر میں ملتان میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اس حوالے سے کوئی Regret پشیمانی نہیں ہے کیونکہ لاہور اور اسلام آباد سے دور ہونے کے جہاں نقصانات ہیں وہاں پلس پوائٹ بھی ہیں۔ کراچی کا نام میں نے دانستہ طور پر نہیں لیا کیونکہ کراچی کا مزاج میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔

دراصل ہم وہی چیزیں گنتے ہیں جو ہمیں نہیں ملتی ہیں۔ ان چیزوں کا شمار نہیں کرتے جو ہمیں حاصل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملتان کا ہم پر حق ہے اور ہمارے اس حوالے سے کچھ فرض ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرے کالموں میں بھی مقامی موضوعات چھائے رہتے ہیں کیونکہ اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اپنے اردگرد کے موضوعات پر بات کرنے سے ہمارا کینوس چھوٹا ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ بات عجیب لگتی ہے کہ بولیویا اور چلی کی محرومیاں ہمیں رلاتی ہیں لیکن گردوپیش کے مسائل سے بے نیاز رہتے ہیں کہ ان پر اظہار خیال سے ہمارا کینوس چھوٹا ہو جاتا ہے۔

OOO

خالد شریف

خالد شریف اردو شعر و ادب کا ایسا نام ہے جن کے ذکر کے بغیر ہمارے عہد کا ادبی تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔ آپ نہ صرف نامور شاعر و ادیب ہیں بلکہ کتابوں کے عاشق بھی ہیں۔ کتاب سے اسی عشق کی بنیاد پر آپ نے سول سروس چھوڑ کر اشاعتی ادارہ قائم کیا جو کہ ''ماورا'' کے نام سے آج بھی پاکستانی عوام کی علمی و ادبی تربیت کے لئے اعلیٰ معیار کی کتب شائع کر رہا ہے۔ لاہور شہر کے مال روڈ پر واقع اسی اشاعتی ادارے کے دفتر میں ان سے گزشتہ دنوں چائے پر ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں ہونے والی گفتگو قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

س پاکستانی نوجوانوں کے لئے عموماً یہ خوبصورت خواب ہوتا ہے کہ وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے بیوروکریٹ بن جائیں جبکہ شاعروں کو نکمّے اور مفلوک الحال افراد کے طور پر نہ صرف میڈیا پیش کرتا ہے بلکہ عوامی رائے بھی کم و بیش یہی ہے۔ آپ اچھے خاصے ڈپٹی کمشنر اور وہ بھی انکم ٹیکس جیسے دبنگ محکمے کے، پھر کیا ہوا کہ افسری کو لات مار کر شاعری اور کتابوں کو ہی اوڑھنا بچھونا بنالیا؟

ج وہ یوں تھا کہ پہلا ماسٹرز میں نے اکنامکس کے شعبے میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے کیا۔ ان دنوں ہمارے گھر کے معاشی حالات بس ایسے ہی تھے جیسے ہمارے ہاں اکثر و بیشتر لوگوں کے ہوتے ہیں۔ میں چھ بہنوں کا اکیلا بھائی تھا۔ والد صاحب کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی، کوئی خاص کام وہ نہیں کر رہے تھے۔ نرینہ اولاد ہونے کے ناتے گھر کی ذمہ داری مجھے خود پر محسوس ہوتی تھی اس لئے نوکری کرنا وقت کی ضرورت تھی۔ انہی دنوں چانس ملا، مقابلے کے امتحان میں بیٹھا اور کامیاب بھی ہو گیا۔ مجھے انکم ٹیکس کا محکمہ دیا گیا اور پہلی تعیناتی فیصل آباد جو کہ ان دنوں لائل پور ہوا کرتا تھا، کر دی گئی۔

س ضمنی سوال ہے کہ آپ نے اپنے اندر کے شاعر کو کب دریافت کیا؟ نیز باقاعدہ شاعری کیسے شروع کی تھی؟

ج لکھنے پڑھنے کا کیڑا تو مجھ میں شروع سے موجود تھا۔ کالج کے فرسٹ ایئر کے دنوں کی بات

ہے کہ نوٹس بورڈ پر طرحی غزل کا اشتہار دیکھا۔ کالج کے طلباء کے مابین اس مقابلے کے لئے طرح مصرع دیا گیا تھا۔ میں نے بھی اس مصرعے پر ٹوٹی پھوٹی غزل کہی اور اپنے کالج کے شعبہ فارسی کے ایک استاد کو دکھائی۔ انہوں نے ایک آدھ مصرع تبدیل کر کے ہمیں دے دی۔ حسن اتفاق سے ہماری اس غزل کو اول انعام مل گیا۔ اسی اول انعام نے ہی ہمیں پکڑ لیا۔ یہی شعری سفر کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس انعام کے بعد ہمیں سٹوڈنٹ یونین کے دفتر میں بلا کر کہا گیا کہ اگلے ہفتے ہمیں شعری مقابلے کے لئے جہلم جانا ہے۔ جہلم گئے تو وہاں سے بھی اول انعام اور ٹرافی لے آئے۔ پھر کیا تھا کہ پورے پاکستان میں جاتے اور ٹرافیاں لے کر آتے۔ خوبصورتی یہ تھی کہ ایک تو شاعری کی مشق ہوتی گئی اور دوسرا یہ ہوا کہ دوستوں کی ایک کہکشاں بنتی گئی جن سے مشاعروں اور مقابلوں میں مختلف کالجز میں ملاقات ہوتی تھی۔ اجمل نیازی، محمود شام اور امجد اسلام امجد سے میں پہلی مرتبہ انہی دنوں شعری حوالے سے ملا تھا۔ لاہور آئے تو یہاں سرمد صہبائی کے چرچے تھے۔ جب ان کے مقابلے میں ہماری غزل کو پہلا انعام ملا تو لوگوں کی ہم میں دلچسپی بڑھی کہ یہ کون ہے، اس مقابلے کے جج جناب احمد ندیم قاسمی تھے۔ دماغ میں شاعری کا فتور تو پہلے سے ہی موجود تھا، یہ دریافت کالج کے دنوں ہوا۔

س کالج کے ابتدائی سالوں میں جب آپ نے شعری سفر کا آغاز کیا تھا، کوئی ایسا واقعہ جو بہت یاد آتا ہو؟

ج جہلم میں مشاعرہ تھا۔ پورے پاکستان سے طلباء اس مقابلے میں شریک تھے۔ سٹیج پر احمد فراز، شہزاد احمد اور احسان اکبر جیسے شعراء بیٹھے ہوئے تھے۔ جب نتیجے کے اعلان کا وقت آیا تو سید ضمیر جعفری نے مائیک پر کہا کہ خالد شریف تمہیں پہلا انعام نہیں دیا جائے گا کیونکہ پچھلے تین مشاعروں میں، میں تمہیں اول انعام دے چکا ہوں۔ تمہارا انعام یہ ہے کہ تم سٹیج پر آ کر ہمارے ساتھ بیٹھو۔ جہاں پر احمد فراز، شہزاد احمد براجمان تھے جبکہ اول انعام انہوں نے دیگر طالب علم کو دے دی۔ یہ واقعہ ضمیر جعفری نے اپنی ڈائری میں درج کیا ہے جو کہ اب کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

س اشاعت کے شعبے سے وابستگی کیسے ہوگئی؟ اس شعبے میں تو آپ نے انقلاب برپا کر دیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟

ج میرے ماموں جان کے راولپنڈی میں چار پرنٹنگ پریس تھے۔ میرا بچپن انہی پرنٹنگ

مشینوں کے درمیان کھیلتے ہوئے گزرا ہے۔ میں کمپوزنگ بھی کرلیتا تھا۔ پرنٹنگ مشین بھی چلا لیتا تھا۔ کتاب سے عشق مجھے ابتداء سے ہی تھا۔ ہمارے گھر کے قریب کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی۔ میں اکثر وہاں بیٹھ کر کتابیں پڑھتا۔ کتاب خانے کے مالک سے دوستی کے سبب مجھے وہ کبھی کبھی دکان پر بٹھا کر کسی ضروری کام سے جانا ہوتو چلے جاتے تھے۔ میں اکثر ان کی غیر موجودگی میں کتابیں اور میگزین وغیرہ بیچ بھی دیا کرتا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کون سی کتاب بکتی ہے اور کون سی پڑی رہتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ابتدائی عمر میں ہی معلوم ہو گیا کہ کتاب چھپتی کیسے ہے؟ جیسے ہی میرے پاس کچھ پیسے جمع ہوئے، میں احمد فراز کے پاس چلا گیا اور ان سے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب چھاپنی ہے۔ مجھے زندگی کا پہلا چائنیز کھانا فراز صاحب نے کھلایا۔ پہلی کتاب میں نے انہی کی چھاپی تھی۔ ان دنوں دوسو کتابیں تو ڈھاکہ چلی جاتی تھیں، پانچ سو کراچی اور لاہور میں بھی کافی کھپت تھی۔ یعنی اگر ہم گیارہ سو کتابیں چھاپتے تو ہمارے پاس کوئی کتاب نہ بچتی تھی۔ فراز کی تو پانچ ہزار کتب کا ایڈیشن چھاپا تھا۔ انہی دنوں رضیہ بٹ کا ناول چھپا۔ وہ اپنے پبلشر سے ناخوش تھیں، شاید اسی لئے انہوں نے بغیر کسی تفصیل اور ہچکچاہٹ کے کہہ دیا کہ لے جاؤ اور چھاپ دو۔ پھر وہ ہوا جو اکثر سرکاری ملازمین کے ساتھ ہوتا ہے، ہمارا راولپنڈی سے لاہور تبدیلی کا پروانہ آ گیا۔ ہم روتے پیٹتے لاہور آ گئے۔

لاہور میں ان دنوں فلمسٹار حبیب بہاولپور روڈ پر کچھ فلیٹ بنا رہے تھے۔ ایک ڈیڑھ مرلہ جگہ کا فلیٹ ایک لاکھ چالیس ہزار میں فروخت کر رہے تھے۔ ہمارے پاس صرف چالیس ہزار تھے۔ انہوں نے فلیٹ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی مگر شرط رکھی کہ ان کی فلم کے گانے میں لکھوں۔ میری شرط تھی کہ میں سٹوڈیو نہیں جاؤں گا، یہیں بیٹھ کر لکھوں گا۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے رجسٹری ہمیں پکڑا دی اور باقی کی رقم میں قسطوں میں ادا کرتا رہا۔ اسی جگہ میں نے ماورا کے نام سے پبلشنگ کا سلسلہ شروع کیا۔ مال روڈ کی اس عمارت میں بعد ازاں منتقل ہوا۔ یہاں آ کر اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ راولپنڈی میں جس کتاب کو چھاپنے میں چار چھ مہینے لگتے ہیں، لاہور میں وہ چار چھ دنوں میں شائع ہو جاتی ہے۔

س آپ کے اشاعتی ادارے کا نام ''ماورا'' آپ کو کیسے سوجھا؟

ج یہ اردو کے عہد ساز شاعر ن م راشد کی پہلی کتاب کا نام تھا۔ ادارے کا نام ''ماورا'' انہی سے مستعار لیا ہے۔ ن م راشد کے کلیات میں میں نے اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام بھی

آج کل ہم ہی شائع کر رہے ہیں۔

س ابتدائی زندگی کیسی اور کہاں گزری؟ اس بارے میں کچھ بتائیے گا؟

ج ہم لوگ انبالہ سے مہاجر ہیں۔ میری پیدائش 1947ء میں ہوئی۔ میں چھ ماہ کا شیرخواہ تھا جب ہم پاکستان ہجرت کر کے پہنچے۔ راولپنڈی میں میرے والد نے راجہ بازار میں گھڑیوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی سکول سے حاصل کی۔ میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا اور وہیں سے ایم اے کی ڈگری لی۔ بعدازاں سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے سول سروس میں آ گیا۔

س محسن نقوی اور آپ کی تحریروں کے علاوہ ادبی حلقوں میں یہ بات گفتگو کا موضوع رہتی ہے کہ آپ دونوں کا تعلق پبلشر اور شاعر سے زیادہ دوستی کا تھا۔ اس بارے میں ہمارے قارئین کو کچھ بتائیں گے؟

ج ملکہ کوہسار مری میں 1973ء کو ایک مشاعرہ ہوا۔ میں مشاعرہ پڑھنے کے بعد سٹیج سے نیچے اترا تو ہجوم میں سے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ یہ محسن نقوی تھے اور ان سے پہلی ملاقات تھی۔ میری کتاب نارسائی کے دیباچے میں محسن نے اس کی تمام تفصیل لکھی ہے۔ پتہ چلا کہ وہ بڑے شاعر اور ذاکر ہیں۔ ہمارا مسلک مختلف تھا۔ وہ سید بادشاہ تھے اور میں راجپوت مگر میرے دل میں ہمیشہ سے اہل بیت رسولؐ کے لئے ایک نرم گوشہ اور محبت موجود تھی۔ ٹرانسفر ہو کر جب لاہور آیا تو علامہ اقبال ٹاؤن نشتر بلاک میں ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا۔ ہمارے درمیان ایسی دوستی ہوگئی کہ وہ ہمارے گھر کا فرد بن گیا۔ میری بیگم ان کی بہن بن گئی۔ محسن نقوی کو بطور شاعر ہمارے ادارے نے متعارف کروایا۔ گو کہ زمانہ طالب علمی میں ان کی کتاب شائع ہو چکی تھی مگر وہ ان کو پسند نہیں تھی۔ بہت بری چھپی تھی اور شاعری بھی طالب علمی کے دور کی تھی۔ میں نے کتاب شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے 1978ء میں برگ صحرا کا مسودہ دے دیا۔ ساتھ ہی اپنا مخصوص جملہ کہ یہ آپ کے لئے چیلنج ہے۔ اسے کیسے خوبصورت چھاپتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں آپ کو گولڈ دے رہا ہوں اس کے بعد ان کی کتابیں آتی رہیں، میں شائع کرتا رہا۔ شام کو وہ روزانہ چار بجے کے قریب ''ماورا'' آ جاتے۔ یہاں سے ہم آٹھ بجے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل چلے جاتے، ہماری شامیں اکثر اکٹھے گزرتیں۔ پی سی سے ہم گھر چلے جاتے۔ واپسی پر وہ لبرٹی مارکیٹ سے قوام والا پان لیتے تھے۔ ان کی شہادت تک ہماری یہی

روٹین رہی۔ ہم دونوں میں ایک بات مشترک تھی کہ ہم کسی بھی ادبی گروہ کا حصہ نہیں تھے۔

س یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے سینکڑوں کتابیں شائع کیں مگر آپ کی اپنی پہلی کتاب بہت تاخیر سے شائع ہوئی، اس کی کیا وجہ تھی؟

ج پہلی کتاب تو میری ان دنوں ہی مکمل ہو گئی تھی جب میں راولپنڈی میں تعینات تھا، کتابت بھی کروالی گئی تھی۔ یہ ہوتا رہا کہ پہلے کوئی اور کتاب آ گئی۔ کبھی فراز، کبھی محسن نقوی اور منیر نیازی، کبھی قتیل شفائی اور مظفر وارثی کی کتاب۔ جن دنوں ٹی وی ڈرامہ ''وارث'' آیا تو امجد اسلام امجد کی کتابوں کی فروخت میں ایک دم اضافہ ہو گیا۔ بہت سارے سال گزر گئے۔ محسن نقوی نے دیباچہ بھی لکھ دیا۔ خیر اب تو اس کتاب کے پچیس ایڈیشن ماشاءاللہ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تین شعری مجموعے اور دو انتخاب شائع ہوئے ہیں۔

کچھ شعر، چند دوست، کتابیں، کسی کا پیار
خالد یہی کمائی میری عمر بھر کی ہے

OOO

خالد علیم

س شاعری کس سے متاثر ہو کر شروع کی؟

ج شاعری تو ایک فطری عمل ہے اور میرے خیال میں اس کا آغاز براہ راست کسی سے متاثر ہو کر نہیں ہوتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ماحول کے اثرات کا تعلق ضرور ہے۔ میری شعری تربیت لاشعوری طور پر گھر کے ماحول سے ہوئی۔ والد محترم علیم ناصری نے غالباً مجھے چوتھی یا پانچویں کلاس میں اپنی لکھی ہوئی کچھ بچوں کی نظمیں یاد کرنے کے لئے دیں۔ سکول میں بزم ادب کا اہتمام ہوتا تھا تو میں وہ نظمیں سنایا کرتا تھا۔ اس طرح مجھے شاعری سے وابستگی پیدا ہوئی اور کچھ تک بندی بھی کرنے لگا۔ مڈل تک آتے آتے والد صاحب کی شاعری پڑھنے سے بحور و اوزان میں کچھ سدھ بدھ پیدا ہوئی۔ گھر میں والد صاحب کے ذخیرہ کتب میں دیوان غالب اور کلام اقبال موجود تھا۔ غالب تو خیر اس زمانے میں کیا سمجھ میں آتا، کلام اقبال کی تھوڑی بہت تفہیم ہوتی رہی اور مجھ میں شعری شعور پیدا ہونے لگا۔ اس طرح پہلی نظم میٹرک میں ایک حادثے کے تاثر میں لکھی۔ ہر چند تخلیقی سطح پر یہ نظم نہایت کمزور تھی اس لئے باقاعدہ شاعری کا آغاز قدرے بعد میں ہوا، اس اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں لاشعوری طور پر ابتداء میں والد محترم ہی سے متاثر ہوا۔

س باقاعدہ شاعری کب شروع کی؟

ج 1974ء سے۔ ان ایام میں نعتیہ شاعری کی طرف مائل ہوا اور نعتیہ مشاعروں میں باقاعدہ حصہ لیتا رہا۔

س یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟

ج چار پانچ سال تک تسلسل سے نعتیں لکھیں بعد میں نعتیہ قصائد اور نعتیہ رباعیات بھی لکھیں۔ یہ سلسلہ تقریباً 1980ء تک جاری رہا۔ افسوس کہ بعد میں نعت لکھنے کا وہ تسلسل نہ رہا جو ان ایام میں تھا۔

س غزل کی طرف کب مائل ہوئے؟

ج غزل اگرچہ شروع ہی سے لکھتا رہا مگر بہت ہی کم۔ بعد میں صنف غزل نے کچھ زیادہ اسیر کر لیا۔

س غزل اور نظم میں سے اظہار کا بہتر ذریعہ کس کو سمجھتے ہیں؟

ج اظہار کا بہترین ذریعہ تو میرے نزدیک غزل ہی ہے۔ اس لئے کہ غزل میں اپنے تجربات واحساسات کا اظہار آسان ہے۔ جو بات کھل کر نہیں کی جا سکتی، وہ غزل میں ایمائیت اور علامت کے انداز میں کہہ دی جاتی ہے اور پڑھنے سننے والے پر شاعر کا مافی الضمیر بھی روشن ہو جاتا ہے جبکہ نظم میں ایسا ممکن نہیں تاہم علامتی انداز میں لکھی گئی نظمیں اس سے مستثنیٰ ہیں گو کہ بعض شعراء کی ایسی نظمیں بھی موجود ہیں جن کی علامتیں اہل ادب پر بھی مشکل ہی سے کھلتی ہیں اور اس سے ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تاہم میں سمجھتا ہوں کہ شاعر ارادی طور پر کسی صنف سخن کا انتخاب نہیں کرتا۔ اس کا فطری اظہار اور موضوع سخن کسی وقت کسی بھی صنف سخن میں ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے نظم، غزل رباعی وغیرہ کی قید نہیں ہے۔

س ایک عہد کے دو بڑے شاعروں کا آپس میں تقابل کس حد تک درست ہے، کیا فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کا موازنہ کیا جا سکتا ہے اور اس موازنے میں آپ منیر نیازی کو کہاں رکھیں گے؟

ج جہاں تک منیر نیازی کا تعلق ہے، یقیناً منیر نیازی اس عہد کے ایک اہم اور جہت ساز شاعر ہیں اور ان کے شاعرانہ مقام و مرتبہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ ان کا شعری اسلوب اور فکری فضا اپنے پیشرو شعراء سے یکسر مختلف ہے۔ انہوں نے اپنا الگ اور ایک نیا راستہ نکالا ہے اور ایک دور میں تو نوجوان نسل کے شعراء ان سے متاثر بھی ہوئے اور ان کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی مگر منیر نیازی کے رنگ و آہنگ میں شعر کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پاکستان ہی نہیں ہندوستان میں بھی اس کے شعری اثرات موجود ہیں۔ منیر نیازی آج بھی اپنی آواز میں منفرد ہیں۔ جہاں تک ایک بہت بڑے Contribution کا تعلق ہے تو منیر نیازی کی شاعری اپنے عہد کی ایک نمایاں Contribution ضرور ہے مگر احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کے ساتھ ان کا موازنہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔ ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' اقبال کے بعد کسی شاعر کو اپنے لئے ایک بڑے شاعر کے طور پر منوانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ شاعر کے سامنے نئے موضوعات ہوں اور وہ ایک بہت بڑے تجربے کے عمل سے گزرا ہو۔ فیض نے یہ کام آ

سان کر دکھایا۔ اقبال کے بعد اردو شعری کائنات میں فیض نے اپنے طرز اظہار اور موضوعاتی تنوع سے ایک نئی لے پیدا کی اور پھر یہ لے شش جہات میں پھیل گئی۔ احمد ندیم قاسمی کا تصور انسان ان کی شاعرانہ فکر کا وہ بنیادی موضوع ہے جس نے ان کے شاعرانہ رویے کو تضاد سے بچا کر ایک فکری اکائی فراہم کی اور زندگی کے پیچ در پیچ مسائل پر لکھتے ہوئے انہوں نے اپنی بلند آہنگ شاعری کی بنیاد رکھی اور یوں ان کی شاعری عہد بہ عہد ایک آفاقی درجہ اختیار کر گئی۔ قاسمی صاحب نے رم جھم قطعات و رباعیات سے لے کر 'جلال و جمال کی نظم و غزل تک' اور پھر ''جلال و جمال'' سے ''بسیط'' تک جتنا شعری سفر طے کیا اور زندگی کے ان گنت موضوعات پر جس قدر توانا لہجے اور پوری شاعرانہ گرفت سے لکھا، اس لحاظ سے کوئی دوسرا ان کے مقابل نہیں ٹھہرتا۔ وہ یقیناً اپنے عہد کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں، اپنے عہد کے ان دو بڑے شاعروں کا آپس میں تقابل میرے نزدیک مناسب نہیں اس لئے کہ فیض کا اپنا ایک مقام و مرتبہ ہے۔ ان کی اپنی ایک لے ہے جس کا کوئی حریف نہیں جبکہ قاسمی صاحب کے اپنے موضوعات اور منفرد طرز اظہار ہے۔ ان کی شاعری نصف صدی سے بھی زیادہ طویل عرصہ پر محیط ہے اور اپنے آغاز سفر سے آج تک ان کی لے کہیں بھی مدھم نہیں پڑتی۔

س آپ اپنے ہم عصروں میں سے کس سے متاثر ہیں؟

ج براہ راست کسی سے بھی نہیں، تاہم سب کا اپنے اپنے شعری مرتبے کے لحاظ سے قدردان ہوں۔ میں ادبی گروہ بندی اور تعصب کا قائل نہیں ہوں۔

س شاعری میں اصلاح کے کس حد تک قائل ہیں۔ آیا اپنے والد محترم علیم ناصری جو کہ خود بہت اہم اور قادر الکلام شاعر ہیں، ان سے کبھی اصلاح لی؟

ج جی ہاں: ابتداء میں انہی سے اصلاح لی اور فنی اور شعری رموز سے آشنائی ہوئی۔ شاعری میں اصلاح کو ضروری سمجھتا ہوں لیکن اس حد تک کہ اصلاح سے فنی ارتقا پیدا ہو جائے، خیال کی تبدیلی اور شعری احساسات و نظریات کو بدلنا میرے نزدیک گمراہی ہے جس سے لکھنے والے کی رہنمائی نہیں ہوتی بلکہ اس کی فکری و تخلیقی نشو و نما ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اصل اصلاح وہ ہے جس سے لکھنے والے میں تخلیقی و فنی اعتماد پیدا ہو اور وہ آگے چل کر معیارات کے مطابق خود اپنے کلام کی اصلاح کرنے اور فن کے بلند معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے شعر کہنے پر قادر ہو۔

س ہمارے ہاں ناقدین ادب عدل سے کام لیتے ہیں یا تعصب سے؟

ج دونوں طرح کے ناقدین موجود ہیں۔ عدل کے پیمانے اگر چہ تعصّبات اور گروہ بندی سے ٹوٹ جاتے ہیں تاہم ہمارے ہاں ادب میں معیار عدل کی روایت آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی، ابھی موجود ہے اور ان شاء اللہ ہر دور میں زندہ رہے گی۔

س انسانی مصروفیت اور روز بروز بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کے اس دور میں کتاب کا کیا مستقبل ہے؟

ج بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مادہ پرستی کے اس دور میں کتاب کا مستقبل غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ماضی میں بھی کتاب سے ربط رکھنے والوں کی شرح کم ہی رہی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ لاکھوں کی آبادی میں کتاب کا ایک ایڈیشن عموماً ایک ہزار ہی کی تعداد میں نکلتا تھا، شاید اس سے بھی کم ، لیکن کتابیں پڑھنے والے اس وقت بھی موجود تھے اور لگ بھگ آج بھی موجود ہیں۔ ہزار یا پانچ سو کی تعداد میں کتاب چھپنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پڑھنے والوں کی تعداد اتنی رہی ہے یا اس وقت ہے۔ کتاب سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد آج بھی کہیں زیادہ ہے۔ پڑھنے والوں پر دیگر مصروفیات یا مادہ پرستی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ ٹی وی، کمپیوٹر یا دیگر ذرائع نے کتاب کی اہمیت کو کم کر دیا ہے اور قاری کی توجہ چھین لی ہے لیکن ایسا ممکن نہیں، یورپ، امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں ذرائع ہم سے کہیں زیادہ بڑی سطح پر ہیں لیکن کتاب کی اہمیت وافادیت پر کوئی حرف نہیں آیا اور ان ذرائع نے کتاب پڑھنے والوں کی توجہ ہرگز نہیں چھینی۔ اس لئے ہمارے ہاں بھی کتاب پر موجودہ دوروں کی مصروفیات اور مادہ پرستی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ کتاب کی اپنی ایک اہمیت ہے، جو دیگر ذرائع اور مصروفیات کے باوجود باقی رہے گی۔

س آپ نے نظم اور غزل کے علاوہ رباعی بھی کہی جبکہ ہمارے ہاں فن رباعی کو سمجھنے والے اور رباعی کہنے والے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اگلی صدی میں یہ صنف ادب زندہ رہے گی؟

ج کسی بھی فن کو سمجھنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ کوئی صنف ادب اگر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے تو دم نہیں توڑتی کہ یہ تو ایک سلسلہ ہے جو ماضی سے حال اور پھر مستقبل تک چلتا رہے گا۔ آپ دیکھیں کہ قصیدہ جس کی روایت کا آغاز عربی اور پھر فارسی سے ہوا اور بعد میں اردو میں بہت خوبصورت اور اعلیٰ درجے کے قصائد لکھے گئے اور قصیدے کے فن کو عروج حاصل ہوا جبکہ ان قصائد کی تخلیق کا مقصد

عام طور پر صلہ و یافت اور بادشاہوں سے نذرانے کا حصول تھا۔ شاہانہ دورختم ہوا تو امکان تھا کہ قصیدے کا فن بھی ختم ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ قصیدہ مناقب ونعت کی صورت میں آج بھی زندہ ہے بالخصوص اس لئے بھی کہ فن قصیدہ نگاری ہماری اردو شاعری کی ایک جاندار روایت ہے۔ رباعی اپنے اختصار و جامعیت اور اپنی طبعی لطافت کے اعتبار سے ایک خوبصورت اور موثر ذریعہ اظہار ہے۔ جو لوگ اس کی روانی پر معترض ہوتے ہیں، وہ دراصل اس کے اوزان کے فطری بہاؤ اور غنائیت آگاہ نہیں ہوتے حالانکہ رباعی کو ابتداء میں ترانہ کے نام سے موسوم کیا گیا، یعنی گانے والی چیز اور اس کی بنیاد انہی اوران پر رکھی گئی جو آج تک مروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے ساتھ ساتھ رباعیات کے مجموعے بھی شائع ہوتے رہے بلکہ بعض شاعروں نے تو فن رباعی کے حوالے سے ہی شہرت پائی تاہم یہ ضرور ہے کہ غزل نگاروں کے مقابل رباعی نگار شاعروں کی تعداد کم رہی ہے۔ آج بھی یہ تعداد کم ہے مگر فن رباعی کو سمجھنے والے آج بھی موجود ہیں اور جب تک فن شاعری زندہ ہے، اس فن کی اہمیت اپنی طبعی لطافت اور غنائیت اور جامعیت کے اعتبار سے باقی رہے گی۔

س آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''کوئی آنکھ دل سے بھری رہی'' حال ہی میں منظر عام پر آیا جس کے بعد آپ ایک اہم شاعر کے طور پر سامنے آئے، شاعری پر اس قدر استادانہ اور پختہ گرفت کے باوجود آپ کا پہلا مجموعہ اس قدر تاخیر سے کیوں آیا جبکہ آپ کے ساتھ اپنے ادبی سفر کا آغاز کرنے والوں میں سے بعض شاعروں کے اب تک بیسیوں شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا میرا مجموعہ تاخیر سے شائع ہوا۔ میرے خیال میں اس کے لئے جو وقت تھا، اس کے مطابق یہ اپنے وقت پر ہی شائع ہوا ہے۔ رہی بات بعض ہم سفروں کی تو یوں کہہ لیں کہ ان کو وہ وسائل میسر آ گئے جن کی بنیاد پر ان کے مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے۔ دوسرا پہلو یہ ہے اور اس کا اعتراف بھی میرے لئے ضروری ہے کہ میں نے اپنے ساتھ ادبی سفر کا آغاز کرنے والوں کے مقابل بہت کم لکھا اور بہت ہی کم ادبی تقریبات میں شامل ہوا۔ ایک لحاظ سے ایک طویل عرصے تک خالصتاً ذاتی مسائل اور بعض حالات کی بناء پر مشاعروں یا ادبی تقریبات میں شامل ہی نہیں ہوا جس کی وجہ سے میرے لکھنے کا عمل اس رفتار یا انداز سے نہیں رہا جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ اب بھی بہت کم ادبی تقریبات میں شامل ہوتا ہوں۔ تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا، اسے سوچ سمجھ کر اور پورے اعتماد اور خلوص سے لکھا، البتہ

معیار کا فیصلہ تو ناقدین ادب ہی کا کام ہے۔عام سطح پر بے دریغ لکھتے چلا جانا میرے لئے ممکن نہ تھا کہ یہ محض مزاج کی بات ہے۔

س موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار باقی رہ گیا ہے؟

ج شعری تربیت میں مشاعروں کا کردار خاصا اہم ہے۔شاعروں کے باہمی روابط اور شعری ابلاغ میں مشاعروں کا کردار ہماری تہذیب ادب کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔مشاعرہ ایک زمانے میں ادبی تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا مگر آج کے دور میں زیادہ تر مشاعرہ برائے مشاعرہ کا عمل کارفرما ہے تاہم ادب میں اس کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

س سرکاری سطح پر ادیبوں کو ملنے والے ایوارڈ کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے؟

ج ایوارڈ دراصل اعتراف فن کی صورت گری ہے۔دیکھنا یہ چاہئے کہ حکومتی سطح پر اعتراف فن شخصیات کے حوالے سے کیا جاتا ہے یا حقیقتاً جس کو ایوارڈ دیا جاتا ہے اس کا فن اس سطح پر ہے بھی یا نہیں۔محض مخالفت برائے مخالفت میں لب کشائی کرنے والے ایوارڈ یافتگان کے تخلیقی معیار کو ان کی شخصیت کے قد کاٹھ اور بڑی سطح پر ان کے تعلقات کے حوالے سے ناپتے ہیں، جو درست نہیں۔ایوارڈ حاصل کرنے والے کی تخلیق ان کے سامنے ہوتی ہے جو معیارِ فن پر اگر پوری اترتی ہے تو اس میں تعصب سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ کھلے دل سے عام سطح پر بھی اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔تعلقات کی بنیاد پر تھوڑی بہت گنجائش تو ہمیشہ رہتی ہیں تاہم ایک سچا ادیب اور شاعر ستائش و صلے کی تمنا نہیں رکھتا اور نہ ہی ان ایوارڈ سے اس کے تخلیقی جوہر میں کوئی اضافہ یا کمی ہوتی ہے البتہ ایک طرح سے میرٹ کی بنیاد پر دیے گئے ایوارڈز سے ان کی حوصلہ افزائی ضرور ہوتی ہے۔

OOO

خورشید مستانہ

خورشید مستانہ پنجاب کی لازوال شعری روایت کے امین ہیں۔منیر نیازی کی رائے میں ان کی شاعری کے موضوعات ہمارے معاشرے کے موجودہ طرز زندگی کے اہم حقائق کے بارے میں ہیں۔جن کو وہ بڑے گہرے اور صاف انداز میں پیش کرتے ہیں...... جو کہ ان کے ہم عصر شعراء کرام میں بہت کم ہے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق جاوید ان کی شاعری کا لب ولہجہ استادانہ مہارت پر مبنی ہے۔عمر کی ستر بہاریں دیکھ چکے ہیں مگر ان کی شاعری میں اب بھی جذبوں کی جوانی اور روانی چھلکتی ہے۔ پنجاب کے مشاعروں میں ان جیسی پذیرائی ، داداور واہ واہ کم ہی شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔

س اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج میری پیدائش مشرقی پنجاب کی ریاست نابھہ کے علاقہ مانا نوالہ برج میں ہوئی۔تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن قیام پاکستان کے وقت میری عمر سات سال کے قریب تھی۔ہجرت کے واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔میرے والد صاحب مشرقی پنجاب سے پاکستان کی جانب ہجرت کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ان کی شہادت میری آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ان کا جسد مجھے اب بھی یاد ہے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد ابتدائی سال شدید کسمپرسی کے عالم میں گزارے۔1952ء میں جب مجھے سکول داخل کروانے کے لئے لے گئے تو انہوں نے میری عمر پر اعتراض کیا جو کہ بچوں کے سکول داخل ہونے کی عمومی عمر سے کافی زیادہ تھی۔خیر میری عمر کم لکھوا کر سکول داخل کروا دیا گیا۔میٹرک میں نے میاں چنوں ہائی سکول سے کیا اور سکول کے ستر طالب علموں میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

س قیام پاکستان سے پہلے کا سماجی ماحول کیسا تھا؟ آپ تو رہتے بھی سکھ اکثریت علاقے میں تھے؟

ج پارٹیشن سے پہلے اچھا ماحول تھا۔لوگ مذہبی جنون میں مبتلا نہیں تھے۔ یہاں تک کہ کئی

مسلمانوں اور سکھوں نے آپس میں پگیں تبدیل کی ہوئی تھیں جو کہ پنجاب میں منہ بولے بھائی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا میرے والد صاحب کو سکھوں نے شہید کر دیا تھا لیکن ہمیں باحفاظت پاکستان کی سرحد تک پہنچانے والے بھی سکھ ہی تھے۔ مارنے والے بھی سکھ تھے اور بچانے والے بھی سکھ تھے اس لئے تمام لوگوں کے بارے میں ایک بیان زیادتی ہوگی۔

س شاعری کی طرف کب اور کیسے مائل ہوئے؟

ج جب میٹرک کر لیا تو نوکری کی تلاش شروع کی مگر نوکری باوجود کوشش نہیں ملی۔ دکھ بہت سارے اکٹھے ہو گئے اور اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ شعر بن کر نکلنے لگ گئے۔ مایوسیاں، پریشانیاں اور ناکامیاں مل کر مجھے شاعری کی طرف کھینچ لائیں۔ غم روزگار اور غم جاناں نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا۔

س ہجرت کے بعد آپ نے اپنی تمام زندگی میاں چنوں میں گزاری ہے۔ ادبی مراکز سے دور ہونے کا احساس کبھی نہیں ہوا؟

ج ادبی مراکز سے دوری کا احساس وسائل کی مجبوریوں کے نیچے ہی دب کر رہ گیا۔ مزدور کو مرکز سے بھلا کیا تعلق؟ تعلیم ادھوری رہی کہ ہمارے شہر میں کوئی کالج نہیں تھا اور دوسرے شہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کے وسائل نہ تھے۔ بس میں کنڈیکٹر کے طور پر روزگار کا آغاز کیا۔ تین سال کنڈیکٹری کی اور پھر تین سال بسوں میں چیکر رہا۔ بس بسوں میں بھی شعر لکھتا رہا۔ ذہن پر شاعری اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اپنے گرد و پیش کے کام تو بس خوابیدہ انداز میں ہی سرانجام دیتا رہا۔ دل و دماغ تو شاعری میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔

س پہلا شعری مجموعہ کب شائع ہوا؟

ج پہلا شعری مجموعہ 1982ء میں شائع ہوا جو کہ مزاحمتی نظموں پر مشتمل تھا۔ بہت سارا کلام تو ضائع ہو گیا۔ 2005ء میں ''سہکدے پھٹ'' کے عنوان سے کتاب شائع ہوئی۔ آج کل بھی ایک مجموعہ زیر طبع ہے مگر ابھی تک اس شعری مجموعے کا نام فائنل نہیں کر سکا۔

س آپ کی تمام شاعری پنجابی زبان میں ہے، کبھی اردو میں لکھنے کے متعلق نہیں سوچا؟

ج اردو لکھنے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ پنجابی ماں بولی تھی اس لئے کسی لغت کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اردو میں لکھنے کے لئے زیادہ جدوجہد کرنا پڑتی، لغات اور عروض کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ پنجابی زبان میں ہی خواب اور خیال آتے تھے اس لئے مناسب بھی یہی لگا کہ ماں بولی کے

ذریعے ہی لوگوں سے اور خود سے ہم کلام ہوا جائے۔

س آپ عملی سیاست میں پچھلے چالیس سال سے سرگرم ہیں، کئی بار کونسلر منتخب ہوئے ہیں اور عوامی جلسوں میں سیاسی نظمیں پڑھتے ہیں، سیاست میں کیسے آئے؟

ج سیاست میں تو سیاستدان مجھے کھینچ لائے۔ آپ کے سوال کے جواب میں منیر نیازی کا صرف یہ شعر پیش کروں گا:

کج انج وی راہواں اوکھیاں سن، کج گل وچ غم دا طوق وی سی

کج شہر دے لوگ وی ظالم سن، کج سانوں مرن دا شوق وی سی

س کیا زندگی میں کبھی عشق کیا؟

ج عشق کیا اور بھرپور کیا۔ میرے نام کی نسبت اسی عشق کی ہے۔ اگر عشق کا تڑکا نہ لگے تو شاعری بے کار ہے۔ مگر ایک بات ہے آدمی جب ایک دفعہ عشق میں ناکام ہوجائے تو پھر وہ ہرجائی ہوجاتا ہے۔ وہ ہر محبت میں پہلی محبت کا نشہ اور سرور تلاش کرتا ہے مگر پہلی محبت جیسی سرشاری اور بے خودی دوبارہ کسی محبت میں نصیب نہیں ہوتی۔ آج کل تو حالات ہی کچھ اور ہیں، عشق موبائل فونوں پر ہوتے ہیں، ہمارے وقت میں تو کہانی ہی دوسری تھی۔

''چھلادے جانشانی تیری مہربانی

س کیا آج کا دانشور اور ادیب اپنا صحیح کردار ادا کر رہا ہے؟

ج میں نہیں سمجھتا کہ آج کا ادیب اور دانشور طبقہ اپنا کردار نبھا رہا ہے۔ ادیب اور دانشور اپنی سماجی اور معاشرتی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ مصلحت اندیشی کا دور دورہ ہے۔ شاعر کا معاشرے میں وہ کردار نظر نہیں آتا جو ہوا کرتا تھا۔ سچائی اور انصاف کا ساتھ دینے کی بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دینا تو کسی بھی شخص کے لئے جائز نہیں ہے۔ اہل قلم پر انصاف اور سچائی کے ساتھ کھڑے ہونے کی شرط تو یوں بھی لازم ہے کہ ہم لوگ ان بلند اخلاقی رویوں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ جس محبت اور وفاداری کا ذکر ہم لوگ اپنی شاعری میں کرتے ہیں ہمیں عملی زندگی میں بھی ان پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

OOO

دالیا سپاٹانکوٹی

ڈاکٹر دالیا سٹاپانکوٹی کا نام عالمی ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ سکالر، فلسفی، مترجم و محقق ہونے کے علاوہ ممتاز ماہر تعلیم بھی ہیں۔ روس کی سینٹ پیٹر برگ یونیورسٹی سے فلسفے میں امتیازی حیثیت سے ڈگری لینے کے بعد برطانیہ میں پی ایچ ڈی کرنے کے علاوہ وہاں پڑھتی بھی رہی ہیں۔ لتھونیا میں پیدا ہوئیں جو اس وقت سوویت یونین کا حصہ تھا اور بعدازاں الگ ملک بن کر یورپی یونین کا حصہ بن گیا۔ عمر کا زیادہ تر حصہ انہوں نے پردیس میں گزارا اور یہی ہجرتیں ان کی عالمی شہرت یافتہ تحریروں کا موضوع بھی ہیں۔ صوفی ازم میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔ کئی عالمی ادیب ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں اوران کی تخلیقات کے کئی زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ پنج زبان ہیں، اپنی مادری زبان کے علاوہ روسی، انگریزی، یونانی اور جرمن بھی روانی سے بولتی ہیں۔ آج کل جرمنی کے شہر ہیمبرگ کی یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔ پچھلے دنوں محترم فخر زمان نے لاہور میں انٹرنیشنل پنجابی کانگریس کے زیر اہتمام عالمی امن کانفرنس کا اہتمام کیا تو اس میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر پاکستان تشریف لائیں۔ قارئین کے لئے ان سے روسی زبان میں ہونے والی گفتگو کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔

س ہم آپ کو پاکستان میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بتایئے کہ آپ کو یہاں آ کر کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ اور کیا یہ آپ کا پاکستان کا پہلا دورہ ہے؟

ج پاکستان میں پہلی دفعہ نہیں آئی بلکہ چار سال پہلے اسلام آباد میں اکادمی ادبیات کی جانب سے منعقدہ کانفرنس میں بھی شریک ہو چکی ہوں۔ پہلی مرتبہ پاکستان میں آنے اور ادبی کانفرنس میں شریک ہونے کا تجربہ بہت شاندار رہا تھا اور یہی پسندیدگی میری دوسری دفعہ آنے کی وجہ بھی ہے۔ پاکستان دوبارہ آنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں پچھلی دفعہ صرف اسلام آباد ہی دیکھ پائی تھی اور لاہور کی سیاحت سے محروم رہی تھی۔ اس تاریخی شہر کو دیکھنے کی خواہش بھی میرے پاکستانی

دورے کی وجہ بنی ہے۔

س ہمارے قارئین آپ کی اپنی زبان سے سننا چاہیں گے کہ آپ نے اب تک ادب میں کیا کام کیا ہے؟ اپنی تحریروں کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟

ج (عاجزی سے) میری لکھنے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ میں نے بطور سکالر لکھنا شروع کیا تھا۔ بطور محقق اور نقاد میری ادبی تحریروں کا آغاز تھا۔ پھر اس کے بعد میری زندگی میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ میں تراجم کرنے لگی۔ میں نے کلاسیکی ادب بطور خاص یونانی ادب کو لتھونین زبان میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ لتھونیا میں اس کی بہت ضرورت تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد لتھونیا ایک الگ ملک بنا تھا اور عالمی ادب کو لتھونین زبان میں ترجمہ کرنا بڑا ضروری تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ بطور مترجم میں نے اپنے ملک کے لئے بڑا ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ قدیم یونانی ادب اور جدید یونان کے ادب کو میں نے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے میں کافی محنت اور کام کیا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ میں نے تخلیقی تحریریں رقم کرنا شروع کر دیں۔ میری ذاتی تحریروں کی عمر دس سال کے قریب ہے۔ تخلیق کی بات کروں تو اس حوالے سے میری اب تک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میرے موضوعات ہجرت اور گلوبلائزیشن کے متعلق ہیں۔ دورِ جدید کے مسائل جیسا کہ مختلف النسل خاندان، وہ بچے جن کے والدین مختلف ممالک اور لسانی پس منظر رکھتے ہیں۔ مادری زبان کا کھو دینا۔ میرا اپنا کنبہ مختلف النسل ہے۔ میرے خاوند کا تعلق یونان سے تھا جس سے میری دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، ان کی پیدائش قبرص میں ہوئی تھی اور وہ خود کو سائپرس کی باسی سمجھتی ہیں۔ لتھونیا کو اپنا ملک نہیں مانتیں۔ ایک ماں کی حیثیت سے میرے بہت سارے تحفظات ہیں۔ بہت سارے مسائل ہیں، نفسیاتی اور جذباتی بھی۔ میں نے اس کے متعلق اونچی آواز کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا ہے اور لکھنا شروع کر دیا ہے۔ جب اس متعلق میری پہلی کتاب شائع ہوئی تو اسے بڑی کامیابی ملی۔ اس پذیرائی کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ یہ صرف میرا مسئلہ نہیں تھا بلکہ بہت سارے خاندان ان مسائل سے نبرد آزما تھے۔

س عام طور پر آپ نثر تحریر کرنے کے لئے کون سی صنف پسند کرتی ہیں؟ کیونکہ لکھتی تو آپ تقریباً سبھی اصناف ادب میں ہیں؟

ج میری پسندیدہ صنف تو سفرنامہ ہے۔ سفرنامے کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں نثر کی سبھی اصناف

سما سکتی ہیں۔ مضامین، کہانی، بیانیہ اور بھی بہت کچھ۔ میں بذاتِ خود سفرنامہ کہانی کی شکل میں لکھتی ہوں۔ ایک بڑی کہانی جس کے اندر کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوتی ہیں، جیسے ایک طرح کا ناول۔

س آپ کے خیال میں سفرنامہ فکشن ہے؟ یا پھر سفرنامے کو فکشن نہیں کہا جا سکتا؟

ج دیکھو یہ بڑا مشکل سوال ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں جواب دے سکوں، سفرنامہ حرکت کو ظاہر کرتا ہے، سفر کے دوران آپ مختلف لوگوں سے ملتے ہیں جو بعض اوقات نہیں چاہتے کہ ان کا نام ظاہر کیا جائے، کبھی کبھی آپ حقائق کے ساتھ ساتھ افسانہ بھی شامل کر دیتے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ یہ فکشن بھی نہیں ہے اور نان فکشن بھی نہیں بلکہ دونوں کے درمیان کی ایک چیز ہے۔ یوں کہہ لیں کہ اس کی دوہری شناخت ہے۔

س سفرنامے کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سنجیدہ ادب کا حصہ نہیں ہے اور تراجم کی بھی عمومی طور پر ادبی حیثیت متنازعہ سمجھی جاتی ہے۔ یہاں وضاحت کر دوں کہ میں نے خود بھی ہسپانوی زبان سے براہِ راست اردو میں گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری ترجمہ کی ہے اور حال ہی میں میرا جاپان کے بارے میں سفرنامہ بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

ج سفرنامہ بلاشبہ ادب کا حصہ ہے۔ سفر کی داستان تحریر کرنا عین ادب ہے۔ جب آپ کسی جگہ جاتے ہیں تو آپ کا بیانیہ اس جگہ میں سے کہانی تشکیل دیتا ہے۔ معلومات کے ساتھ تجربہ مل کر ایک نئی چیز تخلیق کرتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ ملنا، ان سے بات چیت کر کے آپ ایک کہانی تخلیق کرتے ہیں۔ آپ اس کہانی کے ہیرو ہوتے ہیں اور آپ کے ارد گرد ایڈونچر ہو رہا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں سفرنامہ ایک ایڈونچر کہانی بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ کیونکہ سب سے پہلے تو آپ ارد گرد کے ماحول کو اپنے لئے قابلِ فہم بناتے ہیں۔ آپ کے ارد گرد بہت سارے سائن بورڈ ہوتے ہیں جنہیں آپ فوری ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر تحریر کرتے ہوئے اپنے مشاہدات و تجربات کو بیانیے کا رنگ دیتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ یہ مین سٹریم کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تو میں کہوں گی کہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ مین سٹریم کسے قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ ناول مین سٹریم ہے تو پھر ناول انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں تو مقبول ترین صنف رہا ہے لیکن اب اکیسویں صدی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ناول کے قارئین سکڑتے جا رہے ہیں۔ ناول پس منظر میں جا رہا ہے اور شاعری عالمی سطح پر دوبارہ مقبول ترین صنفِ سخن بن کر ابھر

رہی ہے۔ مین سٹریم کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر شاعری کا ان دنوں چرچا ہے کہ آپ شاعر کو مدعو کر سکتے ہیں۔ شاعری بآسانی ساتھ لے جائی جا سکتی ہے۔ مشاعرہ بھی ایک خوبصورت روایت ہے مگر ناول کا یہ معاملہ نہیں۔ میرے خیال میں ادب کا مستقبل شاعری ہے۔

س ہمارے شعراء کرام تو آپ کی بات سن کر نہال ہو جائیں گے۔ آپ نے خود بھی شاعری کرنے کی کبھی کوشش کی ہے؟

ج میں نے مختلف زبانوں کی شاعری کا لتھونین زبان میں ترجمہ کیا ہے بلکہ حال ہی میں میرا جدید یونانی شعراء کے کلام کا ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے جسے بھرپور عوامی پذیرائی ملی ہے۔ خود شاعری کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی مگر یہ آج تک کی صورت حال ہے۔

س آپ نے آپ بیتی لکھی، تراجم کئے، کہانیاں تخلیق کیں، کیا اخبارات میں مضامین بھی لکھتی ہیں؟

ج ہاں! ہاں! فلسفے اور تراجم کے موضوع پر میں مستقل اخبارات میں لکھتی رہتی ہوں۔ ادب اور تنقید کے ساتھ ساتھ مابعد فلسفہ میرا محبوب موضوع ہے کیونکہ میں نے روس کے شہر سینٹ پیٹرز برگ میں فلسفے کے موضوع پر پہلی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی پڑھا اور جو کچھ بھی کیا وہ میرے فلسفے کے پس منظر سے ہی منسلک ہے۔

س آپ کی صوفی ازم سے دلچسپی کی کیا وجہ ہے؟ صوفی ادب سے آپ کا رشتہ کیسے پیدا ہوا؟

ج صوفی ازم سے میری رغبت کا باعث میرا قبرص میں قیام تھا۔ قبرص میں مجھے اپنے قیام کے دوران بہت سے صوفی شعراء سے ملنے کا موقع میسر آیا۔ ترکی میں تو آپ صوفی ازم یونیورسٹی میں پڑھ سکتے ہیں۔ ترکی سے قربت کے باعث میں صوفی ادب کے کئی پروفیسرز صاحبان سے ملتی رہی مگر میری بنیادی دلچسپی کا موضوع صوفیانہ شاعری ہے۔ صوفیانہ شاعری میں بہت گہرائی اور دانائی ہے۔ یہ ادبی اور عقلی تاریخ کا نچوڑ ہے۔ میرے پاکستان آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ خطہ صوفیاء کرام اور صوفیانہ شاعری کا مرکز رہا ہے۔ میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ سیاسی حالات کی وجہ سے کچھ مسائل ضروری ہیں لیکن یہ سرزمین بنیادی طور پر صوفیاء کرام کی ہے۔ یہ متمول تاریخ اور تہذیب کا خطہ ہے جہاں اب بھی صوفی ازم اپنا وجود رکھتا ہے۔

س کیا لتھونیا میں بھی صوفی ازم کے موضوع پر کوئی کام ہو رہا ہے؟

ج: زیادہ کام تو انگریزی زبان میں ہی ہوا ہے۔ایک ادیب نے لتھونین زبان میں صوفی ازم پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا مگر بد قسمتی سے وہ بہت چھوٹی عمر میں ہی انتقال کر گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں اس کے ادھورے کام کو پورا کروں گی اور اس کی خالی کی ہوئی جگہ کو پر کروں گی۔ میں پاکستان اور صوفی ازم سے اپنے تعلق پر ایک کہانی بھی لکھ رہی ہوں۔اس موضوع پر میں اپنی ادبی اور علمی ریسرچ مکمل کر چکی ہوں۔

پس تحریر: ڈاکٹر والیا کو پاکستان اتنا پسند آیا ہے کہ وہ لاہور میں کم از کم تین چار مہینے رہنے اور کسی کالج یونیورسٹی میں پڑھنے کی خواہش مند ہیں۔اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے کاغذات بھی بھجوا دیئے ہیں۔جب ان سے پاکستان میں امن و امان کی تشویشناک صورت حال کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ بات میرے دماغ میں آنے والی آخری چیز ہے یعنی کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

OOO

راجہ رسالو

راجہ رسالو 11 جولائی 1928ء کو وار برٹن ضلع شیخو پورہ چک نمبر 590 میں حاجی میاں سلطان محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول شیخو پورہ سے پاس کیا۔ ورثے میں ملے ادبی ماحول اور طبیعت میں فطری ادبی لگاؤ کی وجہ سے ادب کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ آج کل پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''سوانح ڈاکٹر نذیر احمد پرنسپل گورنمنٹ کالج، پنجاب دے لوگ گیت، پنجابی دی دوسری کتاب (پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ) آوا جائی'' (بچوں کے لئے معلوماتی مضامین) اور ''لوریاں'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ''گلاں داتا دے شہر دیاں'' کے عنوان سے، امروز اور مغربی پاکستان میں ''راجدھانی'' کے عنوان سے اور پنجابی اخبار سجن میں ''لہراں بہراں'' کے عنوان سے کالم لکھتے رہے ہیں۔ آج کل روز نامہ جنگ کے ادبی صفحے کے لئے سالانہ پنجابی ادب کا جائزہ لکھتے ہیں پنجابی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے خاص طور پر راجہ رسالو کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

س ادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج میرے والد مرحوم حاجی سلطان محمد اپنے وقت کے پرائمری پاس تھے۔ آس پاس کے تین چار دیہاتوں میں لکھنے پڑھنے کا کام ان کے ذمے تھا۔ ان کے علاوہ میرے دو بڑے بھائی حاجی محمد عاشق اور محمد حسین قرآن پاک کے علاوہ پنجابی کتابیں پڑھ لیتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں لکڑی کا صندوق دیکھا جس میں بے شمار کتابیں تھیں ان میں ہیر وارث شاہ، سید فضل شاہ کی سوہنی، مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا، میاں محمد بخش کی سیف الملوک، امام بخش کی شاہ بہرام اور دیگر چند قصے تھے۔ سکول سے واپس آکر اور بھینسوں کو چرانے سے فرصت نکال کر یہ کتابیں پڑھتا جس سے آہستہ آہستہ خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

س آپ کی پہلی باقاعدہ تخلیق کیا تھی؟

ج جہاں تک میری پہلی تخلیق کا تعلق ہے، میرا مضمون ''پورن دا کھوہ'' کے عنوان سے 49-1948ء میں ماہنامہ پنجابی میں شائع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر مرحوم مولانا عبدالمجید سالک اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر تھے۔

س آپ نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ پنجابی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے صرف کیا ہے، آپ کے خیال میں پنجابی زبان وادب کی راہ میں کیا رکاوٹ ہے؟

ج اس سلسلے میں میرے خیال کے مطابق فنڈز کی کمی ہے۔ نہ گورنمنٹ گرانٹ دیتی ہے اور نہ صنعت کار اشتہار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ پنجابی زبان وادب کی راہ میں جان بوجھ کر روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔ سندھ میں سندھی بولی جاتی ہے۔ سندھی اخبار و رسائل نکلتے ہیں۔ باقی صوبوں میں بھی ایسے ہی حالات ہیں لیکن پنجاب میں اس کے برعکس آج تک کوئی پنجابی اخبار یا رسالہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ لوگ پنجابی پڑھنا یا بولنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ جان بوجھ کے ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں کہ پنجابی بولنے اور پنجابی پڑھنے والوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ ایک دور تھا پنجابی اخبار ''سجن'' بہت پڑھا جاتا تھا۔ آج بھی میری پرانی گلی کا ہاکر مجھے دیکھ کر یہ نعرہ لگاتا ہے کہ '' آ گیا سجن''، مگر اس کو بھی یہی مجبوری آڑے آ گئی تھی یعنی اشتہار یا تو بالکل ہی نہ ملے یا ملے تو انتہائی تھوڑے۔ آپ اندازہ کریں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلے دورِ حکومت میں جب میاں نواز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ سجن کو پورے سال میں صرف 23 روپے کا ایک اشتہار ملا تھا اور وہ پنجاب سے باہر کے علاقوں سے۔

س پنجابی زبان وادب کی ترقی وترویج میں اخبارات ورسائل کا کیا کردار رہا ہے؟

ج اس سلسلہ میں سب سے پہلے روزنامہ ''امروز'' کا نام لوں گا۔ پنجابی ادب کی ترقی میں امروز کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ امروز کی وساطت سے خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں نے بھی پنجابی ادب پڑھنا شروع کر دیا امروز کا پنجابی صفحہ امروز کے ایڈیٹر جناب احمد ندیم قاسمی نے میاں افتخار الدین کے کہنے پر شروع کیا تھا۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں اس صفحے میں امروز کے بند ہونے تک لکھتا رہا۔ پہلے راجدھانی دا روزنامچہ کے عنوان سے اور بعد میں ''گلاں داتا شہر دیاں'' کے نام سے میرے کالم امروز میں چھپتے رہے۔

س آپ نے زیادہ تر پنجابی زبان میں لکھا ہے، اس کی خاص وجہ؟

ج اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اگر مجھے کوئی زبان تھوڑی بہت آتی ہے تو وہ پنجابی زبان

ہے۔ میں زبان وادب کے معاملے میں آج بھی طالبعلم ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جیسا میں پہلے بیان کر چکا ہوں میں نے جب پڑھنا شروع کیا تو میرا سب سے پہلا واسطہ پنجابی کتابوں سے پڑا تھا۔ پنجابی کا رنگ مجھ پر اتنا گوڑا چڑھا ہوا ہے کہ کسی اور زبان کی طرف دھیان دینے کو جی ہی نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر پنجابی لکھتا ہوں۔

س شاعر یا ادیب نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

ج شاعر یا ادیب نہ ہوتا تو گاؤں میں یا تو رانجھے کی طرح بانسری بجاتا یا بھینسیں چراتا۔

س آپ کی اولاد میں سے کسی کا ادب کی طرف رجحان ہے؟

ج جی، اللہ کی مہربانی سے میری ایک بیٹی شاعرہ ہے۔ وہ لاہور کالج کی گریجویٹ ہے۔ چونکہ بال بچے دار ہے اس لئے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دے پاتی۔ اس کے علاوہ میرا بیٹا غلام حسین صادق نثر لکھتا ہے اس کے مضامین ''لہراں'' میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

س ادبی گروہ بندیاں ادب کے لئے سودمند ہیں یا نقصان دہ؟

ج گروہ بندیاں سیاست میں ہوں یا برادری قبیلے میں، نقصان دہ ہوتی ہیں۔ ادیبوں کی ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی نئی نسل کو ادب سے متنفر کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل ادباء کے قریب جانے سے کتراتی ہے۔ ایک دور تھا، شاگرد اپنے اساتذہ کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے تھے۔ آج کوئی کسی کا شاگرد بننے کو تیار نہیں اور اس کی وجہ صرف یہی اساتذہ کا غیر مناسب رویہ ہے۔

س آپ پاکستان رائٹرز گلڈ سے وابستہ ہیں جس کے منشور کا ایک اہم حصہ ادیبوں کی فلاح و بہبود ہے، اس حوالے سے پاکستان رائٹرز گلڈ ادیبوں کی بہتری کے لئے کیا کر رہا ہے؟

ج ادیبوں کے لئے تو خیر کیا کرنا ہے، آج کل تو پاکستان رائٹرز گلڈ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے۔

س اس کی کیا وجہ ہے؟

ج وہی بنیادی وجہ فنڈز کی کمی ہے، پہلے حکومت ہمیں کبھی کبھار فنڈ دے دیتی تھی اب وہ بھی نہیں ملتے۔

س جس طرح فنکاروں اور کرکٹروں میں اپنی برادری کی مدد کے لئے بینیفٹ شو یا میچ منعقد ہوتے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ ادیبوں کی مالی امداد کے لئے بھی ایک ایسی تنظیم کا وجود عمل میں لایا جائے جو ہر سال ادیبوں کے لئے بینیفٹ پروگرام منعقد کروائے اور اس پروگرام کی آمدنی بذریعہ

قرعہ اندازی اس تنظیم کے ممبر ادیب کو دی جائے؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے یہ بہت اچھی تجویز دی ہے، ایسا بالکل ممکن ہے اور اس پر با قاعدہ عمل ہونا چاہئے کیونکہ ہمارے جہاں بعض ایسے ادیب اور لکھنے والے بھی ہیں جن لوگوں نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی اور اپنی ذات یا اپنے بچوں کے لئے کچھ نہ کر سکے اور اب ان کی حالت یہ ہے کہ نہ تو کسی کے آگے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں نہ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی تنظیم کا وجود عمل میں لایا جائے جو پہلے تو ملک گیر سطح پر ادیبوں اور دانشوروں کی تنظیم سازی کرے اور اس کے بعد بینیفٹ پروگرام منعقد کروائے اور اس کی آمدنی بذریعہ قرعہ اندازی کسی نہ کسی ادیب کو اس طریقے سے دی جائے کہ اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور اس کی مدد بھی ہو جائے۔اس سلسلے میں میرٹ کو اولیت حاصل ہونی چاہئے۔ملک کے چند بڑے ادیبوں کو مل بیٹھ کر ایسا طریقہ وضع کرنا چاہئے کہ یہ سارا عمل شفاف طریقے سے طے پائے اور حق دار کو اس کا حق ملے اور وقت پر ملے۔

س پاکستان رائٹرز گلڈ پہلے کی طرح فعال ہو جائے گی؟

ج میری خواہش تو یہی ہے لیکن میرے اکیلے کے چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا، سب مل کر اس کی طرف دھیان دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ فعال نہ ہو۔

س پنجابی کے کن ادیبوں اور شاعروں نے آپ کو متاثر کیا؟

ج شروع میں وارث شاہ، مولوی عبدلستار، مولوی غلام رسول اور میاں محمد بخش کو پڑھا، اس کے بعد بلھے شاہ، شاہ حسین، خواجہ غلام فرید اور بابا فرید سے راہنمائی حاصل کی جس پر مجھے فخر ہے۔ان کے علاوہ استاد دامن، احمد راہی، نجم حسین سید، مشتاق صوفی، منیر نیازی، افضل پرویز، افضل احسن رندھاوا، امرتا پرتیم اور پروفیسر موہن سنگھ ماہر جیسے بڑے اور سچے شاعروں سے متاثر ہوں۔نئی نسل میں شفقت تنویر مرزا، منشا یاد، محمد آصف خان، فرخندہ لودھی اور رفعت سلطان نے بڑا متاثر کیا۔

OOO

راجا نیئر

س سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیں؟

ج یہ میری خوش بختی ہے کہ میں ایک ترقی پسند، شاعر، دانشور، انسان دوست ہستی، لطیف ادیب کے گھر پیدا ہوا۔ میرے داداجان چراغ الدین محمد دائم (قانونگو، زمیندار) اردو پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اورمصوری وموسیقی سے بھی انہیں گہرا شغف تھا۔ افسوس کہ وہ 1935 کے قریب ٹی بی کے باعث انتقال کر گئے۔ والدگرامی جناب لطیف ادیب استاد شاعر مانے جاتے تھے۔ انہیں بھی مصوری وموسیقی سے لگاؤ تھا۔ چونکہ لکھنا پڑھنا میری سرشت میں شامل تھا اور شائد اسی لئے فنون لطیفہ سے بھی فطری طور پر وابستہ ہو گیا۔ کچھ ہمارے شہر پاک پتن کی ادبی وروحانی فضا کے زیر اثر میں بھی کسی خاص لمحۂ عنایت وکرم میں فیض یاب ہو گیا۔ ایسی ہی کسی ساعت میں والدین کی دعاؤں کے نتیجے میں مجھ پر خاص کرم ہوا اور مالک نے مجھے شعور شاعری بخش دیا۔

تب میں اپنے سینئرز کے زیر سرپرستی اوائل عمری ہی سے ادبی خدمات سرانجام دینے لگا۔ 80 کی دہائی میں اوکاڑہ، بورے والا، ساہیوال کے ادبی حلقوں میں بھرپور شرکت کی۔ اس وقت کے متحرک دوستوں میں قمر رضا شہزاد، جمیل احمد عدیل، کاشف سجاد، مسعود اوکاڑوی، رشید تبسم، سرور جاوی، علی رضا میرے ذاتی دوست ہیں۔ ان سے ان گنت خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ اس وقت اپنے چند دوستوں کو داداجان کے اشعار سنایا کرتا تھا۔ ایک بار یہ شعر سنایا تو چند ہی دنوں کے بعد خیال جوں کا توں سرقہ کر لیا گیا۔ شعر یہ تھا:

دو دلوں کا معاملہ ہے عشق
بیچ میں کیوں سماج آوے ہے

اب والدگرامی لطیف ادیب کا ایک نعتیہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ان کی غار حرا کی تنہائی
ساری انسانیت کے کام آئے

ہمارے شہر کے ادبی وروحانی اور کلچرل تناظر نے بھی میرے تخلیقی شعور کو خوب نکھارا۔ میری مصوری سے گہری وابستگی اور آرٹ فوٹو گرافی کی تشہیر نے مجھے لاہور سے وابستہ کیا۔ 85 میں ڈاکٹر طارق عزیز نے روزنامہ مشرق میں میرا انٹرویو کیا، 88 میں سعید آسی نے نوائے وقت میں متعارف کرایا۔ اور سب سے اہم اس وقت ماہ نو کے ایڈیٹر معروف شاعر قائم نقوی نے میرے کئی ٹائٹل ماہ نو میں شائع کر کے وسیع پذیرائی سے نوازا۔ 89 سے مستقل لاہور میں ہوں۔ یہاں کے ابتدائی دوستوں میں فرحت عباس شاہ، اختر شمار، منصور آفاق، اطہر ناسک، زاہد ہما، آفتاب اقبال میرے لئے نہایت اہم ہیں۔ بعد میں جن دوستوں سے کھلی دوستی کا اٹوٹ ناتا بندھا ان میں عامر بن علی سرفہرست ہیں۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیں؟

ج لاہور میں میڈیا سے وابستگی، ریڈیو پاکستان کے لئے فیچر لکھے، ڈرامے لکھے، ادبی پروگرام طویل عرصہ تک کئے۔۔۔۔۔ یہ سفر ابھی تک جاری ہے۔ اپنا ٹی وی چینل میں اداکار بابر علی کے مارننگ شو میں ان گنت ادبی پروگرام کئے۔ 1996 میں اردو شاعری کا مجموعہ شائع ہوا۔ تاہم پبلشرز کی سخت شرائط کے باعث دو تین کتابوں کے مسودے شائع نہیں کروا سکا۔ آپ دیگر ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہیں۔ امید ہے اس سال ایک مجموعہ کلام شائع کر سکوں گا۔

س آپ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔۔۔ شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج میں اول وآخر شاعر ہوں۔ باقی فنون سے وابستگی شوقیہ ہے۔ البتہ مصوری مجھے شاعری کی ہی ترجمان محسوس ہوتی ہے۔ جہاں تک کالم نگاری، فیچر نگاری یا ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے۔ وہ موضوع کی مناسبت سے خود بخود اپنا الگ امیج بنانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آپ کو بھی اس کا اندازہ تو ہوگا۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج کسی حد تک کہہ سکتے ہیں۔ دراصل اردو اور دیگر مادری زبانوں سے دوری اس صدمے کی اصل وجہ ہے۔ انگلش میڈیم سکول سسٹم نے بھی ہمارے ہاں کتاب سے دوری پیدا کی ہے۔ آئندہ نسل اپنی رابطے کی زبان اور مادری زبان سے یکسر کٹتی نظر آ رہی ہے۔ جبکہ امریکہ اور یورپ وغیرہ میں آج بھی کتاب پڑھنے کا رجحان برقرار ہے۔ یہ ہمارا ہی فرض ہے کہ اگلی نسل

کو مقامی زبانوں سے مکمل آگاہی دیں۔اور انہیں کتاب کی اہمیت سے بھی آگاہ کریں۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج عمدہ خیال کو عالم غیب سے وجود میں لانے کو تخلیقیت سمجھتا ہوں لیکن اس کا منفرد ہونا اور دوسرے انسان کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دینا،اچھے اور عمدہ تخلیق کار کا کام ہے۔

س کوئی بیحد آسودہ وقت؟تخلیق کی سطح پر اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج گزرے ہوئے وقت کی خوشگوار یادیں اور ان کی دھیمی دھیمی آنچ سے ابھرتے اچھوتے اور دلکش خیال کی مہک،لمحاتی اور دائمی سطح پر آسودگی بخشتی ہے اور وہی سچے تخلیق کار کی زندگی ہے۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟آج کل کے مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج ہمارے ہاں مشاعروں پر زوال منافقت اور گروپ بندی کے باعث آیا ہے۔دوسرا یہ کہ جو جس ادارے سے وابستہ ہے۔اپنے اختیارات کا خوب استعمال کرتا اور وقتی طور پر تعلقات بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔مگر جب وہ عہدہ چھوٹ جاتا ہے۔تو سارے عوامل کی قلعی کھل جاتی ہے۔جینوئن تخلیق کار کا راستہ روکنے سے قدرت کا ملہ عروج کیوں کر عطا کر سکتی ہے۔۔۔ایسی صورتحال سے کسی طور بھی مطمئن نہیں ہوا جا سکتا ہے۔ہمارے ہاں یا بیرون ممالک میں سامعین بار بار چند لوگوں کو کب تک سنتے رہیں؟نئے لوگوں کو بھی مقامی و بیرونی مشاعروں میں بلانا چاہیئے۔

س شہرت کے حوالے سے کیا کہیں گے؟

ج شہرت اور بھرپور تعارف فقط قسمت کا کھیل ہے۔قادر مطلق جسے چاہے دوام عطا فرما دے۔تاریخ ادب میں ان گنت ایسے تخلیق کاروں کا نام سامنے آتا ہے۔جنہیں ان کی زندگی میں اعلیٰ پائے کی شاعری تخلیق کرنے کے باوجود اس سطح کی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔بسا اوقات معروضی حالات کے باعث ''انجان'' اور اجنبی رہنا بھی عزت کا باعث بنتا ہے۔اسی حوالے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

انجان سے پھرتے ہیں
کس شان سے پھرتے ہیں
جب سے تمہیں دیکھا ہے
حیران سے پھرتے ہیں

اک ہجر سا لاحق ہے
بے جان سے پھرتے ہیں
ہم وہ نہیں صاحب جو
ایمان سے پھرتے ہیں

وہ کہتے ہیں کہ نا ”فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج ہر جینوئین تخلیق کار اپنے معاشرے بلکہ پوری دنیا کو کھلی آنکھ سے دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہے۔ تخلیق کے لمحات میں اس کا باطن اور تحت الشعور میں مجتمع واقعات، سانحات اور نامکمل آرزوئیں اس کی تازہ تخلیق کو تکمیل سے آشنا کرتی ہیں۔ اس عمل سے تخلیق کار کا باطن معطر ہوتا رہتا ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج جہاں تک ادب آشنائی کا تعلق ہے اسے تو سوشل میڈیا نے خوب سہارا دیا ہے، البتہ جو سوشل میڈیا کے متشاعر جتھے ہیں اس سے ادب کا مستقبل گہنایا جا رہا ہے، بے وزن، بے ہنگم ڈھکوسلوں کو چند لمحوں میں واہ واہ کا ایندھن بہم پہنچانے والے دادیوں کی وافر مقدار ہر گھڑی سوشل میڈیا پر ٹکراتی رہتی ہیں۔ سو ادب کا بھی اللہ ہی مالک ہے۔ مزید اس حوالے سے یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ جب تک ہم نئی نسل کو ان کی زبان پڑھنے اور سمجھنے کے قابل نہیں کریں گے اس وقت تک محض متشاعر ہی پیدا ہوں گے۔ اچھے تخلیق کار سوشل میڈیا پر کم ہی دکھائی دیتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ لمحاتی داد مستقل مقام عطاء کرنے سے قاصر ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج الحمد اللہ میں نے شاعری۔ مصوری، کالم نگاری اور براڈ کاسٹنگ سے بہت محبتیں سمیٹیں، بہت پیار کرنے والوں کا مقروض ہوں۔ جب کوئی شخص آپ کا شعر سننے کے بعد بار بار آپ کی حوصلہ افزائی کرے۔ پینٹنگ دیکھ کر سراہے، آپ کے کالم کو پڑھ کر دوسروں کو پڑھنے کی دعوت دے، آپ کی گفتگو سن کر ریڈیو پر کال کر کے سراہے، اور آپ سے کئی ان دیکھے لوگ محبت سے بار بار ملنے کا تقاضا کریں تو اس میں دور دور تک کوئی خسارہ دکھائی نہیں دیتا۔

OOO

ریحانہ قمر

ریحانہ قمر اس وقت اردو زبان کی مقبول ترین شاعرہ ہیں۔ پروین شاکر کے بعد انہوں نے بھرپور انداز میں نسوانی جذبات کی شعری آہنگ میں ترجمانی کی ہے۔ اب تک ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوکر عوامی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں جن کے نام ''سوچ کی دہلیز پر، مگر تم اپنا خیال رکھنا، ہم پھر نہ ملیں شاید'' اور ''تم ہوتو میں بھی ہوں'' ہیں۔ ریحانہ قمر امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں مقیم ہیں اور انجمن ترقی اردو امریکہ کی صدر ہیں۔ آپ امریکہ میں اردو ادب کی ترقی کے لئے کی جانے والی کوششوں میں ہمیشہ صف اول میں رہتی ہیں اور پاکستان کی طرح امریکہ میں بھی بہت مقبول و معروف ہیں۔ گزشتہ دنوں میں امریکہ گیا تو ریحانہ قمر سے ایک غیر رسمی انٹرویو کیا جو نذر قارئین ہے:

س آپ ایک مقبول شاعرہ ہونے کے علاوہ ایک کامیاب بزنس لیڈی، ایک کامیاب گھریلو خاتون اور ایک معروف سماجی شخصیت ہیں۔ اتنے سارے شعبوں کو بیک وقت کیسے سنبھالتی ہیں؟

ج میں جو بھی کام کرتی ہوں پوری لگن اور خلوص کے ساتھ کرتی ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں زندگی کے جن جن شعبوں سے منسلک ہوں تمام میں کامیاب و کامران ہوں۔

س شعری سفر کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج غالباً ساتویں جماعت میں تھی جب شعر کہنے کا آغاز کیا۔ میرے دادا بہت اچھے شاعر تھے۔ اس وجہ سے گھر میں ایک ادبی فضا بچپن ہی سے میسر تھی۔ سب سے اہم بات تو میرے نزدیک یہ ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت قدرتی ہوتی ہے۔ باقی گردوپیش کے حالات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن بنیادی صلاحیت فطری اور پیدائشی ہوتی ہے۔

س آپ نے شاعری تو کم سنی میں ہی شروع کر دی تھی لیکن آپ کا پہلا شعری مجموعہ کافی تاخیر سے آیا، اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج اس کی بنیادی وجہ میرے ذاتی حالات ہی تھے۔ شادی کے بعد میں امریکہ آگئی اور پھر

معاشی جدوجہد میں ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی، گو کہ شعری سفر تو مسلسل جاری رہا لیکن میں گھریلو زندگی کو کافی زیادہ اہمیت دیتی آئی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میرے شعری سفر کی وجہ سے میری گھریلو زندگی متاثر ہو، اس لئے مجموعہ ترتیب دینے میں تاخیر ہوئی۔

س کس شاعر سے زیادہ متاثر ہیں؟

ج میں شاعر سے نہیں ہمیشہ شعر سے متاثر ہوتی ہوں۔ اچھا شعر کہنے والا اساتذہ میں سے ہو یا پھر نو آموز ہو، اس سے میں سمجھتی ہوں کہ زیادہ فرق نہیں پڑتا اور اچھا شعر تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ ہمارے نوجوان شعراء بھی بعض اوقات چونکا دینے والے اشعار کہتے ہیں۔

س شاعری کے علاوہ کسی اور صنف ادب سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں؟

ج میرا بنیادی تعارف اور محبت تو شاعری ہی ہے لیکن میں نے چند افسانے بھی لکھے ہیں اور ایک ڈرامہ بھی لکھ چکی ہوں، تاہم میں شاعری ہی کو اپنے اندر کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہوں۔

س جب آپ پر تنقید ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟

ج اگر تو تنقید تخلیقی سطح پر ہو تو وہ بہت اچھی لگتی ہے اور انسان اس سے سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھی اور تخلیقی نوعیت کی تنقید سے تو فنکار اپنے ہنر کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ بحیثیت فنکار میں بھی تنقید سے سیکھتی ہوں لیکن اگر تنقید برائے تنقید ہو یا پھر بازاری سطح کی ہو تو پھر اس پر کان نہیں دھرتی۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتی ہوں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں ایک گھریلو خاتون ہوں۔ اگر گھر میں کبھی زیادہ گہما گہمی ہو اور کچن میں بہت سے استعمال شدہ برتن جمع ہو جائیں اور میں بوجہ مصروفیت انہیں فوری طور پر نہ دھو سکوں تو پھر کچن کی لائٹ بجھا دیتی ہوں۔ خود پر بے جا تنقید کرنے والوں کے ساتھ بھی میرا یہی رویہ ہے۔ ذہن کے جس گوشے میں وہ لوگ پڑے ہوتے ہیں میں اس گوشے کی لائٹ بجھا دیتی ہوں اس طرح وہ مجھے باوجود خواہش کے ستا نہیں پاتے۔

س لوگوں سے کوئی شکایت بھی ہے؟

ج مجھے لوگوں سے کم ہی شکایت ہے۔ ویسے بھی میرے لئے ہزاروں کی تعداد میں محبت کرنے والے لوگ زیادہ اہم ہیں۔ اگر چند لوگ اپنی آگ میں جل رہے ہیں تو جلنے دیں۔

س اپنی مادر وطن سے تو ہر انسان کو پیار ہوتا ہے لہٰذا اپنے ملک کی تو ہر بات اچھی لگتی ہے، کوئی ایسی خوبی آپ نے امریکی معاشرے میں دیکھی جو ہم میں نہ ہو؟

ج ویسے تو ان لوگوں میں کئی خوبیاں ہیں لیکن مجھے جو ان کی خوبی پسند ہے وہ یہ ہے کہ وہ چیزوں کو عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ جو بھی چیز ایجاد کرتے ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس ایجاد کو دنیا میں زیادہ سے زیادہ انسانوں تک کیسے پہنچایا جائے۔ اگر انہوں نے کمپیوٹر لیپ ٹاپ ایجاد کیا ہے تو اسے افریقہ کے بھی آخری شہر تک پہنچا دیا ہے لیکن ہمارا رویہ اس کے بالکل متضاد ہے، ہم چیزوں کو مخصوص کر دیتے ہیں۔ ہر سطح پر ہماری یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو چیز جو فن ہمارے پاس ہے، اسے کسی بھی طرح عام نہ ہونے دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ ہمارے معاشرے کی ایک بڑی خرابی ہے۔

س اچھا...... آپ کی شاعری کا محور و مرکز عورت کے جذبات واحساسات ہیں اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ج یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ ارے بھئی! جب میں عورت ہوں تو عورت ہی کے جذبات و احساس بیان کروں گی۔ باقی کچھ باتیں بحیثیت انسان مرد و عورت میں مشترک ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ان موضوعات کو بھی Discuss کیا ہے۔ آپ نے میرے مجموعے ''تم ہو تو میں بھی ہوں'' کی آخری نظمیں تو پڑھی ہوں گی لیکن مختصراً بات پھر وہی دہراؤں گی کہ میری شاعری میرے جیسی ہے۔

س آپ گیت نگاری بھی کرتی ہیں، موسیقی سے دلچسپی کس حد تک ہے؟

ج موسیقی کے بارے میں میری رائے یہ دی ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ موسیقی کا تعلق واقعی انسان کی روح کے ساتھ ہے اور یہ روح کے لئے ریلیکس ہونے کا سبب ہے۔

س کبھی کسی سے محبت کی؟

ج پھر کبھی بتاؤں گی۔

س قارئین کے لئے کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

ج قارئین کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ بڑا بننے کے لئے خود محنت کریں، دس ہزار لوگوں کو برا مت کہیں۔ کسی کے برا ہونے سے آپ اچھے نہیں ہو جاؤ گے۔ کسی کے چھوٹا ہونے سے کبھی کوئی بڑا نہیں بن سکتا۔ کسی کی خامی آپ کی خوبی نہیں بن سکتی اس لئے خود پر زیادہ محنت کریں اور اپنی تخلیق بہتر بنانے پر زور دیں۔

OOO

ڈاکٹر ریاض مجید

س آپ کی پیدائش کب، کہاں اور کون سے گھرانے میں ہوئی؟ نام قلمی نام، ولدیت؟

ج تاریخ پیدائش 12 اکتوبر 1942ء، مقام گڑھا (جالندھر کینٹ، مشرقی پنجاب انڈیا) اصل نام: ریاض الحق طاہر، قلمی نام: ریاض مجید۔ ولدیت: عبدالمجید۔

میری پیدائش جالندھر کے مولوی خاندان میں ہوئی جو گزشتہ کئی صدیوں سے درس وتدریس سے متعلق رہا ہے۔ خاندان مغلیہ کے دور میں اس خاندان کے دو بڑے عالم مولانا عبدالرحمن اور مولانا محمد محسن قاضی القضاۃ کے درجے پر فائز تھے۔ مولوی عظیم مصنف ''علی نامہ'' سے اس خاندان کی ادبی حیثیت کا ریکارڈ دستیاب ہے۔ ان کے بیٹے مولوی محمد سلیم (1805 تا 1880) مصنف گلزار محمدی، گلزار سکندری، گلزار موسیٰ، گلزار آدم نے قصص الانبیاء کو منظوم کیا۔ گلزار محمدی، پنجابی زبان میں منظوم سیرت کی پہلی کتاب ہے۔ اس خاندان کا ابتدائی سراغ محلہ دریا گنج دہلی کی تاریخی مسجد جسے عرف عام میں گھٹا مسجد کہتے تھے، سے ملتا ہے۔ بعد میں یہ خاندان لدھیانہ منتقل ہوا اور پھر بعد میں گڑھا وبیند (موجودہ جالندھر، کینٹ) میں منتقل ہو گیا۔ مولوی محمد سلیم اور ان کے بیٹے محمد علی یہیں مدفون ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان اور اس کے مختلف افراد لاہور، ملتان اور فیصل آباد میں رہائش پذیر ہوئے۔ امثال القرآن اور مثنوی سیلاب عشق کے مصنف حمید مسلم اور شان غزل (ہم طرح دیوان غالب) کے مصنف عبدالغفور سلیمان سیماب کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ اسی طرح کانٹے اور کلیاں، سیل دوراں، الغزال، باران رحمت (نعت) اور صبح صادق (نعت) کے مصنف میر کمال مسلم کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کی تفصیلات تاریخ ارائیاں، مطبوعہ علمی بک ڈپو لاہور اور تحقیقی مقالہ مولوی محمد سلیم (حیات وخدمات) میں مل سکتی ہیں۔

س اپنے والدین اور اپنے بچپن کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

ج میرے والد عبدالمجید 1953ء میں فوت ہوئے۔ اس وقت میں چھٹی جماعت میں زیر تعلیم

تھا۔ میری پرورش میری والدہ عزیز بیگم (جو اپریل 2002ء میں نوے سال کی عمر میں فوت ہوئیں) نے کی۔ میری تعلیم کی ذمہ داری میرے بڑے بھائیوں احسان الحق اور اکرام مجید نے سنبھالی۔ بچپن میں مجھے کرکٹ کھیلنے اور مطالعے کا زیادہ شوق تھا۔ میرے ماموں حمید جالندھری مصنف (شام صحرا) اور مالک مکتبہ کاروان لاہور کی طرف سے مطالعے کے لئے تازہ بہ تازہ کتابیں مل جاتی تھیں۔ یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا۔

س تعلیمی کیفیت اور ایسے اساتذہ کرام کا ذکر جن سے آپ متاثر ہوں؟

ج میں نے میٹرک سٹی مسلم ہائی سکول لائل پور، ایف اے اور بی اے گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے کیا۔ بی اے میں نے یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد میں نے ایک سال میں ایم اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1964 میں کیا۔ 1981ء میں یونیورسٹی میں ہی اردو نعت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ میرے اساتذہ میں مرزا محمد منور، سجاد باقر رضوی، حمید احمد خان (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)، وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی اور سید عبداللہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ سجاد باقر رضوی صاحب سے دوستانہ انداز میں زمانہ تعلیم کے بعد بھی متعدد صحبتیں رہیں۔ اسی طرح مرزا محمد منور اور سید عبداللہ سے بھی آخری وقت تک نیازمندی کا سلسلہ جاری رہا۔

س پہلی حمد اور نعت کب کہی اور اس کے محرکات کے بارے میں اظہار فرمائیں؟

ج پہلے حمدیہ اور نعتیہ اشعار کے بارے میں پوری طرح تعین کرنا تو شاید ممکن نہیں لیکن غالباً 1961ء کے زمانے میں، میں نے پہلی نعت کہی۔ میری ایک فارسی نعت اسی زمانے میں روزنامہ عوام فیصل آباد میں چھپی ملتی ہے۔ اس زمانے میں رمضان المبارک میں نعت خوانوں کی مختلف ٹولیاں مختلف گلی محلوں میں گھومتی تھیں اور نعتیں لحن کے ساتھ پڑھ کر لوگوں کو سحری کے وقت جگانے کا مبارک فریضہ سرانجام دیتی تھیں۔ میں نے ابتدائی چند نعتیں اپنے محلے میں گشت کرنے والی ایک ایسی ہی پارٹی کے لئے لکھیں۔ پہلی باقاعدہ طویل حمد میں نے 1973ء میں سفر عمرہ کے لئے بحری جہاز سفینہ عابد میں جدہ جاتے ہوئے لکھی۔ یوں ایک محتاط اندازے کے مطابق میں اپنی نعت گزاری کے آغاز کا تعین 1961ء اور حمد کا 1973ء سے کر سکتا ہوں۔ اگر متفرق شعروں کے حوالے سے بات کی جائے تو شاید اس کا ابتدائی سراغ 1961ء اور 1962ء کے درمیان ہی مل

جائے۔ جب میں نے بچوں کے لئے نظموں میں یا غزل اور نظمیں حمد اور نعتیہ عناصر پر کچھ لکھا۔

جہاں تک حمد اور نعت کے محرکات کا تعلق ہے، ان کا زیادہ تر تعلق باطنی احساسات، جذبات سے ہوتا ہے۔ ایسی کچھ شاعری نعتیہ مشاعروں میں شرکت کی غرض سے بھی لکھی۔ خصوصاً اسی زمانے میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے شہر میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کے لئے میں نے ایک خمسہ لکھا جس میں پانچواں مصرع ٹیپ کے مصرعے کے طور پر بار بار دہرایا جاتا تھا۔ اسی زمانے سے غالباً (1962ء میں) عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دنوں میں بھی روزنامہ عوام، فیصل آباد (تب لائل پور) میں چھپا۔

س حمد صنف سخن ہے یا نہیں؟ تفصیل سے بیان کریں۔

ج حمد ایک باقاعدہ صنف سخن ہے اور اپنی فکری ارفعیت اور فنی عظمت کے حوالے سے ان تمام خصوصیات اور صفات پر پورا اترتی ہے جو کسی بھی صنف کے لئے ضروری ہے۔ آغاز شاعری سے لے کر اب تک تعداد میں کم ہونے کے باوجود عہد بہ عہد حمد یہ اشعار کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے جنہیں عظیم شاعروں نے تخلیق کیا اور اپنے فکری اور محاسن کے اعتبار سے ارفع ادب کے درجے پر فائز ہے۔ فارسی شاعری کو ہی لیجیے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ پر پھیلی ہوئی فارسی شاعری میں ہر بڑے شاعر کے ہاں حمد یہ اشعار سر دیوان ہی دستیاب ہیں جو ہر لحاظ سے فکری اور فنی معیارات کے امین ہیں۔ عصر حاضر میں باقاعدہ نعتیہ دیوان بھی چھپ رہے ہیں جو فن کی جملہ خوبیوں کے آئینہ دار ہیں۔

س کیا حمد و نعت کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے یا نہیں؟

ج دیکھنا چاہئے، جب ہم حمد و نعت کو بحیثیت صنف سخن شمار کرتے ہیں تو اس کا اعتبار اور وثوق اسی صورت میں قائم رہے گا۔ جب اس کو مروجہ تنقیدی معیارات کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ اگر چہ ان اصناف کی بنیاد عقیدت محض پر ہے مگر یہ عقیدت فن کا درجہ تبھی اختیار کر سکتی ہے، جب اس میں وہ تمام فنی محاسن موجود ہوں جو ہر دور میں ادبیات عالیہ کی کسوٹیوں میں شامل رہے ہیں۔

س ترویج حمد و نعت کے لئے حکومت کو کوئی تجویز دینا چاہیں گے؟

ج نعت کی طرح ہر ریڈیو اور ٹی وی پر حمد کے مشاعرے ہونے چاہئیں اور صدارتی سیرت ایوارڈ کی طرح حمد یہ کتابوں پر بھی انعامات دیے جانے چاہئیں۔ اگر حمد کے حوالے سے باقاعدگی

سے کوئی ماہنامہ بھی اشاعت پذیر ہو سکے تو اس سے حمد کے رجحانات اور میلانات کی ارتقائی صورت سامنے آسکے گی۔

س زندگی کی اہم تمنا کے بارے میں بتائیں؟

ج خاتمہ بالخیر۔

س اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تفصیلات بتائیں۔

ج فہرست درج ذیل ہے۔

1- پس منظر (غزلیں) 1973ء
2- گزرے وقتوں کی عبارت (غزلیں) 1973ء
3- ڈوبتے بدن کا ہاتھ (نظمیں) 1974ء
4- انتساب (نظمیں) 1978ء
5- اردو میں نعت گوئی (مقالہ پی ایچ ڈی) 1990ء
6- توے دے تارے (پنجابی نظمیں) 1987ء
7- حی علی الثناء (پنجابی نعتیہ ہائیکو) 1991ء
8- اللھم صل علی محمد (نعتیہ مجموعہ) 1994ء
9- خودی تے بے خودی (علامہ اقبال کی معروف مثنوی اسرار و رموز کا تنقیدی جائزہ)
10- سر دوش ہوا (کلیات نظم خلیق قریشی) 1994ء
11- پڑھ بسم اللہ (پنجابی بال شاعری) 1991ء
12- نئی آوازیں (جدید غزل کا انتخاب) 1972ء
13- رفحان میں ایک شام (کل پاکستان مشاعرے کی روداد) 1978ء
14- انتخاب روشنی (گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے علمی و ادبی مجلے کا پچاس سالہ انتخاب) 1974ء
15- روشنی کے گیت 1972ء
16- تعمیر نو کے گیت (ملی نغموں کا انتخاب) 1972ء
17- سیدنا احمی (پنجابی نعتیہ دیوان) 2000ء

18- خاک (غزلیں) 2003ء اردو

19- بے چہرہ کونپلیں (نظمیں) اردو (زیر طبع)

متعدد نعتیہ مجموعے، حمدیہ مجموعے/ اردو پنجابی شعری مجموعے/ مضامین کی کتب (15 کتب)

س حمد ونعت کہنے کے لئے بنیادی طور پر کن باتوں کی اشد ضرورت ہے؟

ج فنی لوازمات کے حصول کے ساتھ ساتھ اخلاص اور حب اطاعت نژاد کی ضرورت ہے یعنی شاعر ادبیات عالیہ کی تخلیق کے مروجہ لوازمات کے ساتھ ساتھ اخلاص واطاعت کے اوصاف سے متصف ہو۔

س حمدیہ ادب کے حوالے سے تحریر وتحقیق پر کوئی کام کرنے کا ادارہ ہے؟

ج گزشتہ پچیس سالوں کی نعت پر تحقیق یعنی پی ایچ ڈی کے مقالے (جو 1975ء تک کی نعت گوئی کو محیط تھا) میں اضافہ۔ لغت نعت کی تدوین/حمد ونعت کے حوالے سے مختلف کتابوں کی تخلیق وتدوین۔

س کیا آپ کے قلب میں کبھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایک مجموعہ حمد بارگاہ ایزدی میں پیش کیا جائے؟

ج الحمدللہ! ''ربنا لک الحمد'' کے نام سے میرا ایک حمدیہ مجموعہ زیر اشاعت ہے جبکہ ایک مجموعہ حمدیہ دیوان، ایک مجموعہ حمد ومناجات باعنوان ''آمین'' اور کچھ دوسری حمدیہ کام کی ترتیب بھی میرے پیش نظر ہے۔

س کیا شاعری میں آپ کے کوئی باقاعدہ استاد ہیں؟

ج اس بارے میں عرض ہے کہ میں نے اپنی شاعری کا آغاز بچوں کی نظموں سے میٹرک کے زمانے میں کیا اور اس ذیل میں کسی سے تلمذ حاصل نہیں۔

س جدید غزل کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟

ج جدید غزل کا آغاز ہم نے نہیں کیا۔ یہ تو مرزا غالب سے بھی پہلے ہو چکا ہے بلکہ جدید اور قدیم کی بحث ایک حد تک اضافی ہے کیونکہ ہر زمانے میں جدت کا ایک رخ موجود رہا ہے جو غالب تک آتے آتے باقاعدہ طور پر کلاسیکل غزل سے مختلف ہو چکا تھا۔ جہاں تک ملی حوالے سے

تعلق ہے حالی نے اس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ پھر اقبال سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ آج کے شاعروں تک آتا ہے۔ ہم جدت کو اس حوالے سے لیتے ہیں کہ فرسودہ مضامین سے اجتناب کیا جائے اور ذاتی واردات کے حوالے سے جدید احساسات کو بیان کیا جائے اور فرسودہ تشبیہات اور استعارات سے بچتے ہوئے شعر کہے جائیں۔ اس موضوع پر امجد اسلام امجد کی ایک کتاب بھی ہے جس میں انہوں نے پرانے شاعروں کے ہاں ان عناصر کو دریافت کیا ہے جو آج کے لگتے ہیں۔ جدید ترین غزل کا آغاز 60ء کی دہائی میں ظفر اقبال، منیر نیازی، شہزاد احمد اور شکیب جلالی کر چکے تھے۔ اگر ہم صرف ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہیں تو ظفر اقبال کی ''آب رواں'' اس طرح کی غزل کی رجحان ساز کتاب قرار دی جا سکتی ہے۔ میں نے جب جدید غزل کا آغاز کیا اس وقت فیصل آباد میں حزیں لدھیانوی، خلیق قریشی اور منظور بڑی کامیابی سے غزل کہہ رہے تھے۔ ان کے ہاں کلاسیکی شاعری بھی بڑے احترام کے ساتھ موجود تھی۔ جدیدیت کے علمبرداروں میں افضل احسن رندھاوا، اکرام مجید اور نظم میں فاروق حسن اور نذیر ناجی کے نام نمایاں تھے۔ 1972ء میں میں نے فیصل آباد سے 12 جدید شاعروں کے کلام پر مشتمل کتاب ''نئی آوازیں'' مرتب کی جس میں افضل احسن، احسن زیدی، انور محمود، حزیں لدھیانوی، تنویر جیلانی، حسن شمار اور میرے ساتھ ساتھ دیگر احباب شامل تھے۔ عدیم ہاشمی فیصل آباد کے حوالے سے اپنی شناخت نہیں چاہتے تھے اس لئے بوجوہ ان کا کلام اس کتاب میں شامل نہ ہو سکا۔

س آج کی غزل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج غزل نے کسی بھی دور میں نہ شاعروں کو مایوس کیا نہ سامعین کو۔ گزشتہ آٹھ دس برسوں میں غزل اور بھی بہتر ہو گئی ہے۔

س جدید غزل میں فیصل آباد کے شعراء کا کیا کردار ہے؟

ج اگر ہم بعد میں آنے والوں کو پانچ پانچ سال کے ادوار میں تقسیم کریں تو کوثر علی، زاہد فخری، خاور زیدی، انجم سلیمی، مقصود وفا، خاور جیلانی اور اگر موجودہ دور کا ذکر کریں تو علی زریون اور احمد سلیم رونی کا کلام فیصل آباد کی شاعری کے ثروت مند ہونے کا ثبوت ہے۔ فیصل آباد نے قریباً چالیس کے قریب شاعر غزل کو دیے۔

س کیا جدت صرف موضوعات کی حد تک محدود ہے؟

ج نادرہ کاری کہنے کے انداز کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔طرز احساس نیا ہواور کچی اقدار کے ساتھ بات کرنے کا انداز بھی نیا ہو۔یہی جدت ہے۔

س کیا اردو شاعری میں انگریزی الفاظ کا استعمال درست ہے؟

ج کوملتا اور سنگ پن کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔آپ ٹی ایس ایلیٹ کی نظم دیکھیں،انگریزی نظم ہے لیکن شانتی شانتی پرختم ہوئی ہے جو ہندی کا لفظ ہے۔موبائل فون ہمارے استعمال میں ہے مگر شاعری کیوں اس سے محروم ہے؟ حالانکہ محبوب کی گفتگو بھی ہوا کی لہروں پر سفر کرتی اور اس فون کے ذریعے کانوں میں رس گھولتی ہے۔

س کیا مجید امجد کے ہاں عروض کے کچھ مسائل ہیں؟

ج ان کے ہاں ایک مسئلہ ہے۔ان کی بعض نظموں میں ایسی لائنیں موجود ہیں جو عروضی تقاضے پورے نہیں کرتیں۔انہیں ہم نثری لائنیں کہہ سکتے ہیں۔اس کا ذکر میں نے کچھ مجید امجد شناس لوگوں میں بھی کیا تھا اور میں اب بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں۔

س معریٰ نظم کی طرف شعراء کی توجہ کم کیوں ہے؟

ج نظم کے لئے مخصوص بڑے شاعر کی کمی اب تک محسوس کی جا رہی ہے۔ایک کمی جو نظم میں محسوس کی جا رہی ہے وہ حسیات کی شاعری کا فقدان ہے۔جس کی وجہ سے قاری نظم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔میری کتاب ''انتساب''میں آٹھ دس معریٰ نظمیں شامل ہیں۔عظمت اللہ خان مرحوم اکثر معریٰ نظمیں لکھا کرتے تھے مگر زندگی نے انہیں کتابی شکل دینے کی مہلت نہیں دی۔موجودہ شعراء میں آپ کی بھی کچھ معریٰ نظمیں موجود ہیں۔نئے لوگوں کو چاہئے کہ معریٰ نظم کی طرف توجہ دیں۔

س نثری نظم کا کیا جواز ہے؟

ج اگر ایک آدمی عروضی آہنگ کا خیال رکھتے ہوئے نہیں لکھ سکتا مگر وہ اندر سے شاعر ہے تو کیا اسے لکھنا چاہئے؟ کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے لوگ شاعر بنتے جائیں گے۔آپ دیکھیں پچاس ساٹھ لاکھ کے شہر میں شاعر ہیں کتنے؟ کتنے ایسے شاعر ہیں جو غزل بھی لکھتے ہیں۔ان کی کتابیں بھی آ چکی ہیں مگر وہ درحقیقت شاعر نہیں۔ان میں وہ فکری اپج ہی نہیں ہے کہ انہیں شاعر تسلیم کیا جائے۔مجھ سے اکثر یہ سوال ہوتا ہے کہ نثری نظم کیا ہے۔میں کہتا ہوں کہ ایک عام اظہار کو آپ جیسے جیسے بلیغ کرتے جائیں گے نثری نظم بنتی جائے گی۔گلی میں پھول کھلتا ہے عام آدمی کہے گا

پھول کھلا ہے۔ یہ کم از کم ایکسپریشن ہے۔ ایک آدمی کہے گا پھول مسکراتا ہے۔ یہ شاعری کی طرف ایک قدم ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کہتا ہے ٹہنیوں پر چراغ جلا۔ یہ طرز اظہار نثری نظم کے اور قریب ہو جاتا ہے۔ یونہی نثر جیسے علامتی انداز میں آگے جائے گی وہ نظم بنتی جائے گی۔ لفظوں کو عروضی ہم آہنگ دینے والے بہت سے ملیں گے لیکن شاعری کہاں ہے؟ ایک نثری نظم دیکھیں:

ہم ندیوں پر رکتے ہیں
صرف زخم دھونے کے لئے

اور ہماری مائیں بندوق سے اپنے بچوں کا قد ناپتی ہیں
جب امریکہ کی کسی مل میں ایک گولی بنتی ہے
تو ایک ویت نامی ماں اپنا کلیجہ پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے

آپ شاعر ہیں تو آپ کا اندر خود گواہی دے گا کہ ''تم بڑے وہ ہو، تمہیں مار کے ٹکڑے کر دوں'' کی بہ نسبت یہ بہت بڑی شاعری ہے۔ اس طرح نثری نظم او ررہے گی۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ جسے نثر بھی لکھنی نہیں آتی ہو وہ نثری نظمیں لکھنے کی ناکام کوشش کرے تو غلط ہے۔ میں نے شہزاد صاحب جو عمر اور شاعری کے لحاظ سے مجھ سے بہت بڑے ہیں، کی کتاب ''معلوم سے آگے'' کی تقریب میں صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کی یہ نثری نظمیں بھی نہیں ہیں۔

○○○

رخشندہ نوید

س سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے؟

ج میں بہت سارے بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، باذوق والد کی بیٹی اور والد کے پاس میں نے بہت ساری اردو فارسی کی کتابیں گھر میں دیکھیں۔ دھیرے دھیرے میں نے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا، گو مجھے سمجھ نہیں آتی تھی، مگر مجھے اچھی لگتی تھیں۔ تو ہم بہت سارے بہن بھائی تھے، بہت مزے کا گھر تھا۔ ان میں سے میں نے گھر کے چھوٹے سے کمرے پہ قبضہ کرلیا تھا۔ سکول کے زمانے میں ہی یہ قصہ ہوگیا تھا۔ اور وہاں میں نے اپنی پسند کی کتابیں، جو مجھے دیکھنے میں اچھی لگتی تھیں، جن کے ٹائیٹلز، جن کے کورز مجھے پسند تھے، وہ سب میں نے جمع کر کے ایک ٹیبل پہ رکھی تھیں۔ ابتداء سے ہی تھوڑی سی منفرد ضرور تھی، اپنے گھر کے افراد سے، اپنے ماحول سے بھی آپ کہہ سکتے ہیں، مطلب یہ کہ میرے شوق ذرا عجیب سے ہی تھے۔ میں اب سوچتی ہوں کہ اگر شادی سے پہلے تک کی باتیں کروں، بچپن، سکول کی، کالج و یونیورسٹی کی تو کچھ اور قسم کا میرا لائف اسٹائل تھا۔ حتیٰ کہ میرے بہن بھائی بچپن سے ہی میرے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنے آپ کو کچھ خاص سمجھتی ہوں کہتے تھے یہ اپنے آپ کو میم سمجھتی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اب اتنی عمر گزارنے کے باوجود بھی مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، کسی بھی چیز سے۔ میں ویسی کی ویسی ہوں۔ ماحول بھی بدلے، گھر بھی بدلے، ساری روٹین بھی بدلی، لیکن میں وہی کی وہی رہی۔ لاہور کالج سے پڑھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا۔ پنجاب یونیورسٹی تک آتے آتے میں کافی معروف شاعرہ ہوگئی تھی۔ ٹی وی میں بھی ایک دو پرگرام جو ینگسٹرز کے تھے۔ میں انٹروڈیوس ہوگئی تھی۔ والد صاحب نے شائد دیکھ لیا تھا یا گیس کر لیا تھا، کہ میرے اندر لکھنے کا کچھ کیڑا۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے باقی سب سے زیادہ مجھ پہ نظر کرم ضرور رکھی۔ جیسے وہ مجھ سے انگریزی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ پھر مجھے اقبال پڑھاتے تھے۔ ہمارے گھر میں بڑا خوبصورت لان تھا، سمن آباد میں، میں ان دنوں کلاس سکس میں تھی

توجب ہمارے والد نے گھر خریدا تھا۔ بہت خوبصورت اور بہت پیارا گھر، جیسے خواب حقیقت بن کر کھڑا ہو گیا ہو بالکل ویسے ہی۔ اس گھر میں بہت خوبصورت لان تھا۔ مجھے شاعر بنانے میں اس لان کا بہت ہاتھ ہے۔ اس میں اتنے خوبصورت پھول تھے کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ کہ میں گلاب اور موتیے کی پرات بھر بھر کر اتارا کرتی تھی۔ یہ میرا شوق تھا۔ ہر روز سکول جانے سے پہلے میں تھیلا بھر کر موتیے کا اتارتی اور پھر گجرے بھی بناتی اور پھولوں سے تو مجھے ہمیشہ ہی سے بہت پیار تھا۔ یہ تھوڑا سا ورثے میں ملا آپ کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے والد ہر موسم میں جو ہمارا مالی چاچا تھا اس سے بیل تبدیل کرواتے تھے موسم کے لحاظ سے۔ کہ اس موسم میں یہ بیل لگاؤ اس پہ یہ پھول آئیں گے۔ پھر مجھے بھولتا نہیں کہ ہم سب بہن بھائی اس لان میں گرمیوں میں چار پائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے۔ اتنا مزے کا ٹائم تھا اور میرا پڑھنے کا مشغلہ تب شروع ہو گیا تھا۔ ہمارے سمن آباد میں ڈونگی گراؤنڈ ہے، منی مارکیٹ ہے۔ اس میں ایک لائبریری ورائیٹی جو کتابیں پڑھنے کے لئے دیتی تھی۔ میں وہاں سے بہت کتابیں لیتی تھی۔ پھر میں چوری چوری سائیکل بہت چلاتی تھی۔ اس زمانے میں مجھے پن بالز بنانے کا شوق ہوا۔ حالانکہ ہمارے ابا کی کافی سختی تھی ہم پر۔ اور کوئی الٹا سیدھا کام کرنے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پورا دن اجازت لینے اور امی کی سفارش کروانے میں لگاتے۔ ہم ڈرتے تھے ابا سے۔ اور شائد ہم ابا سے ایک دو بار ہی گلے ملے ہوں۔ یوں ابا کے پاس بیٹھتے تھے، بہت باتیں کرتے تھے۔ ہمارے لان کا جو ایک ایک پتہ تھا وہ دھلواتے تھے۔ ہم لان میں بیٹھتے تھے اور ابو کوئی ایک اقبال کا شعر پڑھ کر پوچھتے تھے کہ بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے۔ مجھے عربی کی، فارسی کی گردانیں یاد کرواتے تھے۔ بچپن اسی طرح گزرا، پھر میں نے قلمی دوست بنائے۔ یہ کالج کے زمانے کی باتیں ہیں۔ انارکلی بازار کے شروع میں جو دوکانیں ہیں سٹیشنری کی وہ میری پسندیدہ جگہ تھی۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج عملی زندگی کا آغاز تو میں نے کالج کے زمانے سے ہی کر دیا تھا۔ مقامی رسائل میں میری لکھی ہوئی شاعری شائع ہوتی تھی، افسانے بھی میں لکھتی تھی۔ اردو ڈائجسٹ تھا ہمارے سمن آباد میں۔ عملی زندگی بھی اسی کو کہتے ہیں کہ کچھ کرنے کا ارادہ کر لیا، شروع سے ہی ایسا ذہن میں تھا کہ ایک عام سی زندگی نہیں گزارنی ہے، جہاں جہاں زندگی مجھے لیتی جائے گی، جیسا میں نے بتایا کہ ایم اے کے دوران شادی ہوئی تو شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد میں نے اپنا ماسٹرز مکمل کیا۔ اس

وقت میرے خاوند کیمیکل انجینئر تھے اور کالا شاہ کاکو میں اتحاد کیمیکلز میں ہمیں ایک گھر مل گیا تھا۔ان کی کالونی، میں وہاں سے میں روز یونیورسٹی آیا کرتی تھی۔ میں واپس جاتی تھی تین چار بجے۔اگر آپ پھر کہتے ہیں کہ عملی زندگی جاب کرنے کو کہتے ہیں تو وہ مجھے مستقل جاب کرنے کا کیڑا ماسٹرز کرنے کے بعد لگ گیا تھا، کہ میں کہیں پر جاب کروں۔ان دنوں قدرت کی طرف سے ایک دو جابز آئیں۔ایک تو پی ٹی وی اور دوسری ایک آدھ سرکاری جاب مگر لیٹر ہی مجھ تک نہیں پہنچ پائے اور میں نہیں کر پائی۔ پھر یہ کہ ہماری بیٹیوں کی پیدائش کے بعد بھی میں لکھتی تو رہی، مستقل میں لکھتی رہی، لکھنے کا عمل جاری رہا اگر اسے آپ عملی زندگی کہتے ہیں تو یہ عمل بھی جاری رہا، پھر میں نے ٹیچنگ کی، اگر چہ میرے ساتھ چھوٹی بیٹیاں تھی، مگر مجھے چین نہیں آتا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں کچھ نہیں کر رہی، مجھے کچھ کرنا چاہئیے،کوئی جاب کرنی چاہیے،اس طرح ٹیچ کیا،دھیرے دھیرے ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں کام کیا۔اس کے ساتھ ساتھ کتابیں مرتب کرتی رہی۔ چار کتابیں اردو کی آئیں،غزلیں،نظمیں۔ بڑی میں اس معاملے میں خوش قسمت رہی کہ نہایت بہترین لوگوں نے اس پر رائے دی۔جس میں منیر نیازی،احمد ندیم قاسمی،خورشید رضوی،مشتاق یوسفی،زاہد حسن ان تمام نے میری کتابوں پر فلیپ لکھے۔سو عملی زندگی آج تک چل رہی ہے۔آج میں کام بھی کر رہی ہوں۔لکھ بھی رہی ہوں۔ پڑھ بھی رہی ہوں۔زندگی یہی ہے کہ مجھے لگتا ہے۔میری شناخت یہی ہے۔

اس کے علاوہ ہمیشہ ہی مجھے جاب کا کیڑا رہا ہے۔جیسے جیسے مجھے ٹائم ملا۔چونکہ ایک فیملی لائف پوری تھی تو جہاں کہیں مجھے وقت ملا۔جن سالوں میں،جن مہینوں میں،ان میں میں نے ضرور اس طرح کا پریکٹیکل کام کیا۔میں نے کالم بھی لکھے۔نوائے وقت میں میرے بہت اچھے کالم چل رہے تھے۔اسداللہ غالب صاحب ایڈیٹر تھے۔ بہت سارے کالم میرے چھپے۔ان کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔دکھتی رگ کے نام سے میں کالم لکھتی تھی۔اب میں سمجھتی ہوں کہ شائد یہ سلسلہ ترک کرنا میری لائف کی بہت بڑی غلطی تھی، یہ سوچنا کہ یہ مجھے پیسے نہیں دیتے تو میں ان کے لئے کیوں لکھوں؟ تو میں نے غصے میں آ کر وہ کام چھوڑ دیا۔ چونکہ میں نے ماسٹرز کیا ہوا ہے جرنلزم میں۔ وہ میرا سبجیکٹ بھی تھا۔ مجھے بہت اچھا بھی لگتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو میں نے کالم کا موضوع بنایا۔ پھر مجھے جنگ اخبار کے ایڈیٹر نے کہا کہ آپ فیچر بنائیں۔ میں نے ان کو بہت اچھے اچھے فیچر بنا کر دیئے۔لیکن پھر وہی بات کہ میں اپنی گاڑی پر جاتی تھی،اپنے پیپر،اپنا پن

لگا کے تصویریں لگا کر۔ ہر چیز مہیا کر کے میں ان کو دیتی تھی۔لیکن ان کے بہت تھوڑے سے پیسے مجھے ملتے تھے۔ پھر مجھے لگا کہ یہ بھی کوئی کام ہے؟ یہ تو انسلٹنگ ہے۔حالانکہ اگر میں دیکھوں تو وہ بھی کمال کے فیچر بنائے ہوئے ہیں میں نے۔مشرق اخبار میں بھی چھوٹے چھوٹے ٹاپکس پر میرے مضامین چھپتے رہے۔پھر کچھ ایجنسیز کا پی رائیٹنگ کا کام کیا۔چار پانچ سال سے میں اردو زبان پڑھارہی ہوں۔تو کام کرنا اس لحاظ سے مجھے فائدہ مند لگتا ہے کہ ایک تو یہ کہ آپ صحت مند رہتے ہیں۔اگر دیکھا جائے تو پوری زندگی کاموں کے لئے کم پڑتی ہے۔اب میں سوچوں تو لگتا ہے کہ وقت بہت جلدی گزر رہا ہے۔لیکن اگر دیکھا جائے تو دن کے بارہ اٹھارہ گھنٹوں میں آپ کیا کریں گے۔صبح کے اوقات آپ کسی کو دے دیتے ہیں۔معاوضہ بھی آپکو اچھا ملتا ہے تو آپ شفٹ کر رہے ہیں اپنی ذات کا۔میرے خیال میں کام کرنا ضروری ہوتا ہے آپ کی شخصیت کے لئے ۔ جب آپ صبح اٹھ کر تیار ہوتے ہیں۔باہر جاتے ہیں۔کمیونٹی میں ملتے ہیں نئے لوگوں سے۔آپ خالی ذہن نہیں رہتے۔منفی خیال آپ کے ذہن میں کم آتے ہیں۔اسی لئے میں سمجھتی ہوں کام کرنا ضروری ہے۔

س ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج ادب سے شوق کا سٹارٹ جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں بھی بتا دیا مجھے تو لگتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی یعنی میں ایسے ہی پیدا ہوئی تھی۔جو کچھ بھی تھا میرے اندر ہی تھا۔اور وہ روز اول سے ہی تھا۔سکول کے زمانے میں اسی ڈائریز سنبھالا کرتی تھی۔کچھ کچھ لکھ کر۔مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا لکھتی ہوں۔اچھی سی خوبصورت سی تحریر۔مؤثر تحریر۔رومانٹک تحریر۔لیکن یہ بعد میں مجھ پر کھلا کہ یہ شاعری ہے۔ابھی شاعری مجھ پر کھلی بھی نہیں تھی۔ مجھے اس کا ادراک بھی نہیں تھا کہ شاعری کیا ہوتی ہے۔جب مجھے پتہ چل گیا پھر تو میں سیریس ہوگئی۔پھر جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں نے پڑھنا شروع کیا۔سارے اساتذہ کی کتابیں میرے ٹیبل پر ہوتی تھی۔نئے لکھنے والے ناصر کاظمی، عظمیٰ زیدی۔منیر نیازی۔امجد صاحب ادب میں شاعر تو میں ہوگئی۔یوں کہہ لیجئے بن گئی، میں روز اول سے ہی بن کے پیدا ہوئی۔مگر یہ شادی کے دس برس بعد تک میں لکھ لکھ کر اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھتی رہی۔اس کا کریڈٹ میرے خاوند کو بھی جاتا ہے انہوں نے مجھے کہا کہ اس کو تم کتاب کرو۔پھر میں نجیب صاحب، خالد صاحب، منیر نیازی اور قاسمی صاحب سمیت سب کو ملی۔اس کے بعد میری پہلی کتاب چھپی اور

اسکواچھی پذیرائی ملی۔پھرمیری دوسری کتاب، تیسری، چوتھی۔بعض معاملوں میں میں بڑی خوش قسمت رہی ہوں۔میری چاروں کتابیں،ابھی میں پنجابی کا ذکر بعد میں کروں گی۔بڑے شہروں میں ان کی بڑی بڑی تقریبات ہوئیں۔لاہور،ملتان،اسلام آباداورفیصل آباد ان چاروں شہروں اوراس کے علاوہ پشاور میں بھی میری کتاب کی ایک تقریب ہوئی۔ملک کے جو بیسٹ لکھنے والے رائٹرز تھے انہوں نے اس کو سند کیا۔پھرمشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اورشکر ہے خدا کا کوئی آج حسرت نہیں ہے، بہت مشاعرے پڑھے ہیں۔انٹرسٹی پڑھے ہیں۔دوسرے شہروں میں پڑھے ہیں۔اس کے بعداس سفرمیں دھیرے دھیرے میں اتنا آگے تک گئی کہ میں پاکستان کے باہرسب مشاعروں میں بھی پڑھ چکی ہوں۔کیا دبئی مشاعرہ،کیا جدہ مشاعرہ،کیا قطرمشاعرہ،کیا USA کا اپنا مشاعرہ،علی گڑھ والوں کے مشاعرے،دیگرحلقہ احباب نیویارک کے مشاعرے، کچھ بھی ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے عطا نہیں کیا۔پھرآپ کا پیٹ بھرنا بھی چاہیئے۔میں نے بہت پڑھ لئے مشاعرے اب اوروں کو بھی مواقع ملنے چاہیئں۔میں دوسرے کاموں میں بھی مصروف ہوں۔مشاعرے کا اب وہ معیار بھی نہیں ہے۔اورطرح کی شاعری اب مشاعروں میں چلنے لگی ہے۔ہوسکتا ہے جو میں اب لکھ رہی ہوں وہ مشاعرے کی شاعری ہو بھی نہ۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج 2018 میں میری پنجابی کی کتاب آئی۔اس کی ملتان میں تقریب ہوگئی ہے،لاہور میں بھی ہوچکی ہے۔ابھی باقی ہے ایک دوشہروں میں۔اسکو جو پذیرائی ملی ہے وہ میری توقعات سے زیادہ ہے۔میں ٹھوس پنجابی گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔میرا ننھیال گرداس پور کا ہے تو میں پنجابی سن کر ہی بڑی ہوئی ہوں۔میرے والد امرت سر سے ہجرت کر کے آئے تھے۔پتہ نہیں کیسے میں بہن بھائیوں سے تھوڑی منفرد نکل آئی۔میٹرک تک مجھے انگریزی سکول میں پڑھایا گیا۔مجھے میرے بڑے بھائی انگریزی پڑھاتے تھے۔میری پرورش میرے بڑے بھائی نے کی ہے ایک اچھے چائلڈ کی طرح۔میں پنجابی نہیں بولتی تھی۔مجھے پنجابی نہیں بولنی آتی تھی۔میں پنجابی سنتی تھی۔میری دادی بولتی تھی پنجابی بڑے محاورے والی۔تواردوشاعری کرتے کرتے آپ کہہ لیں کہ میں پنجابی لکھتی ضروررہی۔لکھ لکھ کے رکھتی رہی۔اس کے لئے 2018 خوش بخت ثابت ہوا ہے کہ اس کو میں نے کتابی شکل دی۔زاہد حسن نے میری بہت مدد کی۔میری ڈکٹیشن کودرست کیا۔اوروہ کتاب چھپ گئی۔ایک نظم کے نام پر میں نے کتاب کا نام

رکھا۔وہ نظم مجھ سے بہت بار سنی گئی ہے۔میں پنجابی کی کہانی بھی لکھ رہی ہوں۔اس کے علاوہ جہانگیر بکس نے ویلنٹائن پر مجھ سے مرتب کروائی تھی۔۔ویلنٹائن کے حوالے سے میں نے اس میں ڈھیر ساری شاعری ساتھ میں ایک کہانی بھی شامل تھی۔اس کا انتخاب بھی جہانگیر بکس نے کروایا تھا۔''اسے ہم چھو نہیں سکتے''وہ بھی بہت خوبصورت کتاب ہے۔یہ کام ابھی تک کر رہی ہوں۔افسانہ بھی لکھ رہی ہوں۔پہلی رات کے نام سے میرا افسانہ شائع ہوا ہے۔اور اس پر بہت لے دے بھی ہوئی ہے۔میرے موضوعات جو ہیں میں ان سے کبھی کبھی خود بھی خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔بہت بولڈ آئیڈیاز مائنڈ میں آ جاتے ہیں۔لکھنے کے معاملے میں کبھی ڈری نہیں ہوں۔

OOO

سرفراز سید

س سب سے پہلے اپنے صحافتی اور ادبی پس منظر سے آگاہ کیجئے؟

ج بچپن سے ہی اخبار اور رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ چوتھی جماعت میں ہی اخبار پڑھنے لگا تھا۔ سکول میں ہمیں علامہ اقبال کی نظمیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ہم بیت بازی کے مقابلوں میں باز و بلند کر کے علامہ اقبال اور دوسرے شعراء کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ میں چھٹی جماعت میں تھا۔ ایک روز کلاس کے اندر ہی دو گروپوں میں بیت بازی ہوئی۔ مخالف گروپ نے ایک شعر پڑھا۔ آخر میں ن کا حرف آتا تھا۔ ہم سب کے پاس ن کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ میں ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ فوراً ایک شعر گھڑا کہ

نہ اس میں کوئی بھید ہے نہ اس میں کوئی راز ہے
شاعر تو ایک ہے بس اور وہ سرفراز ہے

اس پر مخالف فریق نے ہنگامہ کر دیا اور اسے شعر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمارا گروپ بھی اڑ گیا۔ ماسٹر صاحب نے فیصلہ سنایا کہ شعر تو ہے اس کے معنی جو بھی ہوں۔ کلاس کے بعد ماسٹر صاحب نے بلایا اور مجھے شاباش دے کر کہا کہ تم اچھے شاعر بن سکتے ہو، شعر کہا کرو! یہ پہلا شعری حادثہ تھا جو بعد میں ۷۰، ۷۵ برسوں پر پھیل گیا۔ شعری ذوق بڑھنے لگا۔ سکول کے دوران ہی بچوں کے رسالوں میں کہانیاں چھپنی شروع ہوئیں۔ تعلیم و تربیت رسالے میں ''ریڈیو پاکستان'' باقاعدہ چھپتا رہا۔ یہی مشق بالآخر صحافت کی طرف لے گئی۔ وہ ایک الگ داستان ہے۔ مجھے گھر کے بزرگوں نے مستقبل کا انجینئر بنانے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل کرا دیا اور فزکس و ریاضی کے مضامین پڑھنے پڑے۔ بڑی مشکل سے ان چار برسوں میں ان مضامین میں گریجوایشن کی۔ پھر اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے نمایاں انداز میں ایم اے اردو کیا، مجھے اعزاز حاصل ہے کہ میں نے کالج کے پرنسپل جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی ریٹائرمنٹ کی تقریب میں واحد الوداعی نظم پڑھی۔ اس کے بعد عملی

زندگی میں بے شمار مشاعرے، گھر پر بہت سی علمی، ادبی، ثقافتی تقریبات، بطور شاعر آٹھ ممالک بھارت، برطانیہ، امریکہ، عرب امارات حتیٰ کہ افغانستان اور ایران میں بھی مشاعرے پڑھے۔ یہ لمبی داستان ہے۔ میرے ساتھ لندن، برمنگھم، لاس اینجلس اور ورجینیا میں خصوصی نشستیں منعقد ہو چکی ہیں۔ میری ایک نظم ''رزق'' کے ہندی، سندھی اور انگریزی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ میری شخصیت کے ادبی پہلو پر ایم فل کا مقالہ بھی آچکا ہے۔ مگر یہ ایک عام سے بات ہے۔ زندگی میں مختلف ممالک کی طرف سے اعزازات وانعامات ملے۔ لاہور کے ادبی جریدہ ''تخلیق'' کی طرف سے 2018 کا سالانہ ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ میں روزنامہ ''مشرق، پاکستان، اوصاف'' اور دوسرے بڑے اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کا انچارج بھی رہا۔ مشرق سے ادبی کالموں کا آغاز کیا۔ جو ایک عرصے بعد سیاسی وسماجی کالموں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ بڑے اخبارات میں اب تک بارہ ہزار سے زیادہ کالم شائع ہو چکے ہیں۔ روزنامہ اوصاف پاکستان کا چیف کالم نگار ہوں۔ یہ ابتدائی تذکرہ ہے۔ آگے چل کر دوسری باتیں بھی سامنے آئیں گی۔

س علمی زندگی کا آغاز کب کیا؟

ج گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج سے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد روزنامہ ''مشرق'' سے 1966 میں بطور سب ایڈیٹر نیوز روم میں کام شروع کیا۔ میں ایم اے کرنے کے بعد ایک دوست کی وساطت سے نیشنل بنک کے ایک ڈائریکٹر کے پاس بنک آفیسر بننے گیا۔ انہوں نے تعلیم پوچھی تو بتایا ایم اے اردو کیا ہے۔ کہنے لگے اخبار میں جانا پسند کرتے ہو؟ میں نے ہاں کر دی۔ انہوں نے اپنے دوست کے پاس اخبار مشرق میں بھجوا دیا۔ یہ صحافت کا آغاز تھا۔ اس سے پہلے نوائے وقت میں افغانستان، ایران اور ترکی کے سفر کے بارے میں میرا ان ملکوں سے بھیجا ہوا سفرنامہ چھ قسطوں میں چھپ چکا تھا۔ حمید نظامی صاحب نے مجھے 20 روپے معاوضہ دیا تھا۔ ان دنوں 20 روپے بھی بہت تھے۔ ابتداء ہی سے اخبارات اور رسالوں میں مختلف قومی ایام اور موضوعات پر مضامین اور کالم لکھنے شروع کر دیئے۔ رات کے وقت نیوز روم میں کام کرتا، سارا دن تعلیمی اداروں کی شوقیہ رپورٹنگ کرتا رہتا۔ اخبارات کے مالکان کو میری یہ سرگرمیاں پسند آنے لگیں۔ مشرق اخبار 1970 میں کراچی 1973 میں کوئٹہ سے نکلا۔ مجھے خصوصی طور پر ان دونوں شہروں میں بھیجا گیا۔ یوں صحافتی عملی زندگی 1966 میں شروع ہوئی 56 برس کے بعد آج تک جاری ہے۔

س: آپ کی تصانیف:

ج: ایک کتاب ''راوی نامہ'' چھپ چکی ہے۔شاعری کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔زندہ ادیبوں شاعروں کے تقریباً 400 شگفتہ لطیفے بھی جمع کئے ہوئے ہیں۔مختلف ممالک کے کچھ سفرنامے چھپ چکے ہیں۔کچھ زیر ترتیب ہیں۔ایک اہم ادبی کام یہ کیا کہ 1980 کے لگ بھگ تقریباً 40 معروف مگراب گوشہ نشین بڑے ادیبوں وشاعروں کے انٹرویوز مشرق میں شائع کئے۔انہیں ایک مجموعے کی شکل دی ہے۔ان میں خاص طور پر وہ ادیب وشاعر شامل تھے جولکھنؤ، دہلی، رام پور، بھوپال، حیدرآباد دکن، علی گڑھ اوراعظم گڑھ وغیرہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔یہ لوگ اپنے علاقوں میں بہت مشہور اور نامور تھے۔مگر ہجرت کے بعدناماموس ماحول اورمشکل حالات کے باعث گوشۂ گم نامی میں رہ رہے تھے۔انہیں مشرق کے ادبی ایڈیشنوں میں نمایاں چھاپا تو ان کے مداح انہیں پھر سے عملی زندگی، ادبی زندگی میں واپس لے آئے۔ان میں مرزا غالب اور علامہ اقبال کے بہت مشہور مفسر جناب یوسف چشتی، عرش ملیسانی، یزدانی جالندھری، صحرائی گورداسپوری وغیرہ شامل تھے۔ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ایک دلچسپ واقعہ یہ کہ مشرق میں ایک بزرگ بہت نفیس اردو بولتے تھے۔کئی برس ساتھ رہا۔ایک روز میں نے کسی پنجابی مہمان کے ساتھ پنجابی میں بات کی تو اس کے جانے کے بعد مجھ سے ناراض دکھائی دیئے۔تم اچھے بھلے اہل زبان ہو، اتنی اچھی شائستہ اورشستہ اردو بولتے ہو، پنجابی بول کر کیوں اپنا لہجہ خراب کر رہے ہو؟ تو میں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ حضور! میں تو ہوں ہی پنجابی، پنجاب میں پیدا ہوا، یہیں پر پلا پڑھا، پنجابی میں بہت سی شاعری بھی کی ہے۔میرا اصل لہجہ تو پنجابی کا ہی ہے۔اسے آپ لوگوں نے اردو بول بول کر خراب کر دیا ہے۔

س: کیا کسی ادبی تحریک کا حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے؟

ج: میں کسی ادبی تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں رہا۔مجھے ان تحریکوں کے بارے میں پڑھنے۔کا بہت موقع ملا مگر کسی نے متاثر نہیں کیا۔1936 میں عام رومانوی شاعری چل رہی تھی۔یہ کوئی تحریک نہیں تھی۔محض روایت درروایت چلی آرہی تھی۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی کے درمیان نظیر اکبرآبادی نے عام گل وبلبل، زلف ورخسار سے ہٹ کر زندگی کے معروضی حقائق کوشاعری کا موضوع بنایا۔خیالی تصوراتی موضوعات سے ہٹ کر برسات کی بہاریں، روٹی نامہ، آدمی نامہ جیسی زندگی آموز نظمیں لکھیں تو اسے روایت پر بہت ادبی حلقوں نے شاعر تسلیم

کرنے سے انکار کردیا اور ''بے رس تک بند نظم گو'' قرار دے دیا۔ 19 ویں صدی کا بیشتر حصہ عشق ومحبت کی روایتی شاعری تک محدود رہا۔ اس زمانے میں علامہ اقبال اپنی زندگی آمیز شاعری کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان کے معروضی حقائق پر مبنی شاعری زیادہ تر مسلمانوں کی حالت زار کا احاطہ کرتی ہے۔ تاہم اس شاعری نے نجی سطح پر شاعری کو جاندار موضوع بنا دیا۔ 1935 میں ترقی پسند تحریک کے آغاز نے اردو ادبیات کو نیا رُخ دیا۔ ترقی پسندی مدھم ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں انسانی نفسیات کی سطح پر رومان انگیزی کی لطافت کو یکسر ممنوع قرار دے دیا گیا اور یہ صرف کھیت مزدور اور فیکٹری مزدوری کے معاشی مسائل کی ترجمان بن کرہ گئی۔ اس کے محنت کش دوستی کے نعرے تو بہت دل کش تھے۔ مگر اس نعرے کے رہنماؤں کی زندگی تو بہت شاندار گزر رہی تھی۔ ستم یہ ہوا کہ خود اس تحریک کے علمبردار سوویت یونین (اب روس) میں سوشلزم کے نظام کی بری طرح ناکام ہوگئی تھی۔ وہاں ڈبل روٹی لینے کے لئے طویل قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس سے جلد ہی ترقی پسندی کی تحریک گم ہونے لگی۔ اس کے عروج پر بھی رومانویت کا دور ختم نہ ہوسکا اور رومان غزل، نظم اور لوک داستانیں بدستور پھلتی پھیلتی چلی گئیں، 1995 یعنی 20 سال پہلے مجھ سے واشنگٹن میں وائس آف امریکہ کے صدر دفتر میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اینکر پرسن کامران خان نے ایسی ادبی تحریکوں کے اس وقت کی حالت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ تو میں نے اس وقت کہا تھا کہ ساری ادبی تحریکوں کا ٹیلی ویژن کے ڈراموں نے رخ موڑ دیا ہے۔ اور کوئی اجتماعی نوعیت کی تحریک باقی نہیں رہی۔ اب 26 سال بعد تو انٹرنیٹ اور موبائل فون کی ایجاد نے تو عام لوگوں کو کسی قسم کی تحریکوں بلکہ گھر میں والدین اور بال بچوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ادبیات کے طلباء کے لئے یہ تحریکیں ماضی کا حصہ بن کر محض پڑھنے کی چیزیں رہ گئی ہیں۔

س کیا الیکٹرانک میڈیا نے کتاب سے دوری کا رواج عام کر دیا ہے؟

ج یہ حقیقت ہے کہ 1950 اور 1960 کی دہائی تک کتاب کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ لوگ بڑے بڑے ضخیم ناول اور افسانوی وشاعری کے مجموعے خرید کر یا لائبریری میں جا کر پڑھتے تھے۔ مگر ٹیلی ویژن کی ایجاد نے اس وراثت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ تین چار سو بلکہ زیادہ صفحات کا ناول محض ایک گھنٹے کے ٹیلی ویژن ڈرامے میں تبدیل ہو گیا، لوگوں کو ناول کی تحریر کے منجمد کرداروں کو سامنے زندہ، دیکھنے اور ان کی باتوں کے ڈرامائی لہجوں کو سننے کے بعد تین چار سو صفحات کا ناول پڑھنے کی ضرورت نہ رہی۔ بعد میں انٹرنیٹ نے اس ایک گھنٹے تک ٹیلی

ویژن کے سامنے بیٹھنے کی مشقت بھی ختم کر دی ہے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیقیت زراعت اور باغبانی کی طرح قلب ذہن کی خیال انگیزی اور سائنس کے امتزاج کی پیداوار ہے۔ارض علوم میں انجینئرنگ ،سائنس،میڈیکل تعلیم خاصی یکساں لگے بندھے فارمولوں کے پابند ہوتے ہیں۔ان کے نئے تجربوں کے نتائج کو تخلیقیت نہیں کہا جا سکتا۔تخلیق کی نمایاں مثال ماں کے ہاں بچے کا پیدا ہونا ہے۔کوئی بھی شخص محنت کر کے صنعتی یا زرعی ماہر تو بن سکتا ہے۔مگر ذہنی اور قلبی مطابقت کی عدم موجودگی میں اچھی غزل یا نظم نہیں کہہ پاتا۔ اربوں کھربوں کے کاروباری شخص کے مقابلہ سوچنے،تجربہ اور تجزیہ کرنے والا عام شخص کہیں بہتر غزل یا نظم کہہ سکتا ہے۔تخلیقیت خداداد چیز ہے۔یہ تخلیق کار کے ذہن پر پھولوں پتیوں پر آسمان کی بلندیوں سے اترنے والے اوس کے قطرے کی مانند ہوتی ہے۔جورات کے پچھلے پہر سرد راتوں میں آسمان کی بلندیوں سے نیچے اترتا ہے اور لالے کے پھول کے جگر میں داغ چھوڑ جاتا ہے۔

س زندگی اور تخلیق کی سطح پر کوئی بے حد آسودہ وقت؟

ج بڑے بڑے اخبارات میں میرے تقریباً 12 ہزار سے زائد ادبی،سماجی اور سیاسی کالم شائع ہو چکے ہیں۔ان کالموں کے ذریعے تقریباً 23 نہایت غریب لڑکیوں کی باعزت شادیاں اور 20,22 بالکل بے روزگار نوجوانوں کو باعزت روزگار کی فراہمی، بہت سی غریب بیواؤں کو سلائی مشینوں کی فراہمی اور مختلف علاقوں میں رفاہی کاموں کی انجام دہی لمحہ بہ لمحہ آسودگی بخشتی رہی ہے۔تخلیقی سطح پر اکثر کسی شعر یا تقریر کی مناسب تحسین کو بھی آسودگی سمجھ لیں۔

س آپ ادیب بھی ہیں،شاعر بھی! دل کے زیادہ قریب کون ہے؟

ج پہلی بات جو عام طور پر نہیں کہی جاتی یہ ہے کہ اچھا شاعر ہونے کے لئے اچھا صحافی اور اچھا مصور ہونا بہت ضروری ہے۔صحافی اپنے پیشہ ورانہ تجربے سے 10 سطروں کی بات کو تین سطروں کی خبر میں ڈھال دیتا ہے۔یہی تجربہ اچھا شاعر اچھی غزل ترتیب دیتے ہوئے کام میں لاتا ہے۔دوسری طرف بہت سے پھیلے ہوئے خیالات اور الفاظ کو غزل کے ایک مختصر مصرعے میں قلم بند کرنے میں صحافی شاعر کا صحافیانہ تجربہ بہت کام آتا ہے اور اگر شاعر مصور ہی ہے تو وہ اپنے کلام میں مصورانہ خوبصورت رنگ بھر دیتا ہے۔میں بنیادی طور پر رائٹر ہوں۔روزانہ کالم کی اشاعت روزانہ کچھ نہ کچھ لکھنے کی عکاسی کرتی ہے۔صحافت ایک پیشہ ہے۔ایک مدت کے بعد رک

سکتا ہے۔مگر ادب تخلیقیت ہے جو آخری سانس تک جاری رہتی ہے۔

س کسی شاعری یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون ذات سے؟

ج تحریک تو باہر سے ہی ملتی ہے۔ تجربات، شواہد، حوادث، موسموں کا تغیر و تبدیل، بہار، خزاں، انسانی طبقاتی تفریق اشعار، انسانی رشتوں کی اونچ نیچ، یہ سب بیرونی عوامل ہیں۔ جو انسان کو کچھ کہنے، کچھ لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ کسی کمرے میں مستقل بند رہنے والا انسان ان باتوں سے ناواقف رہ کر کیا مشاہداتی تجربہ کر سکے گا۔

ادیب یا شاعر اپنے اردگرد کے حالات سے کبھی لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ معاشرتی ناہمواریاں، المیے، کرب ناک ناانصافیاں ہر انسان کے ذہن کو متاثر کرتی ہیں۔ مگر شاعر اور ادیب عام انسان سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ ان باتوں کا زیادہ اثر لیتے ہیں۔ گلاب کا پھول ایک عام انسان کے لئے محض ایک پھول ہے مگر شاعر یا ادیب گلاب سے کئی استعارے، کئی معانی اخذ کر لیتا ہے۔ ایک اہم حوالہ کہ ادب کے عالمی سطح کے بیشتر اعزازات، نوبل پرائز وغیرہ زیادہ تر پسماندگی، اور کم وسائل والے ممالک کے ادیبوں شاعروں کو ملتے آرہے ہیں۔ دولت مند اور زندگی کی آسائشوں والے ممالک کو چند ایک کے سوا اتنے ایوارڈ نہیں ملے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا نے نہ صرف ادب بلکہ ثقافت، معاشرے میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس پر طویل گفتگو ہو سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ سوشل میڈیا سے ادب کے فروغ کی بجائے اسے نقصان زیادہ پہنچ رہا ہے۔ پہلے ادب پرنٹ میڈیا میں چھپتا تھا۔ اب اس کی سوشل میڈیا کی سکرینوں پر بھرمار اور یلغار ہو گئی ہے۔ بے حد مستی، بے وزن و بے تکی شاعری مضحکہ خیز نثری تخلیقات، ایک دوسرے کی مصنوعی ستائش ادب کے معیار کہیں نیچے لے گئے ہیں۔ سوشل میڈیا کا ایک مثبت پہلو بھی ہے کہ بہت سی نئی علمی و ادبی کتابوں کی تشہیر ہو جاتی ہے۔ جو ویسے ممکن نہ ہو سکتی۔ ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ سوشل میڈیا کے ذریعے ادیبوں، شاعروں کی سالگرہ، علالت اور وفات کی بروقت اور ہر جگہ بیک وقت اطلاع مل جاتی ہے۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فن کار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج معاملہ یہ ہے کہ دنیا بھر کا ادب صدیوں سے صرف ذاتی تجربات و مشاہدات پر ہی مشتمل ہوتا آیا ہے۔

سلیم طاہر

''میں اور آپ'' کے حوالے سے ملک گیر شہرت حاصل کرنے والا سلیم طاہر ٹی وی پروڈیوسر لیکن بنیادی طور پر ایک حساس شاعر ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی سلیم طاہر اس طرح کی جدوجہد میں مصروف ہے جیسے کوئی کانٹوں بھری جھاڑیوں کے جنگل میں گزرگاہ بنا رہا ہو، کبھی، میں اور آپ کے ذریعے معاشرے میں ہونے والی ظلم و زیادتیوں کو آشکار اور معاشرے کے ناسوروں کی نشاندہی کرتا اور کبھی اپنے شعری مجموعے'' کہرام'' میں اپنی سوچ کے گھنے جنگل سے گزرگاہ بناتا ہو اسلیم طاہر یونیورسٹی دور سے ہی شاعر کی حیثیت سے نوجوانوں کے دل کی دھڑکنوں کا حصہ بن چکا تھا۔ آج سے کوئی 12 سال پہلے سلیم طاہر کا پہلا پنجابی شعری مجموعہ'' تاہنگھ تریل'' کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آیا جس کو ادبی و عوامی دونوں سطحوں پر کافی پذیرائی ملی۔ ایک طویل وقفے کے بعد حال ہی میں سلیم طاہر کا اردو غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ'' کہرام'' کے نام سے آیا ہے۔ اب کی بار سلیم طاہر کے اس شعری مجموعے کی جس طرح عوامی اور ادبی حلقوں میں پذیرائی ہو رہی ہے، خدشہ ہے کہ'' میں اور آپ'' کے حوالے سے سلیم طاہر کی برسوں کی شناخت کو گم نہ کر دے اور'' میں اور آپ'' کے بجائے سلیم طاہر کا حوالہ اس کا مجموعہ، کہرام، بن جائے ایسا ہوا تو اچنبھے کی بات نہ ہو گی کہ اس میں اپنا آپ منوانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ سلیم طاہر کے مجموعے'' کہرام'' کی اشاعت کے بعد ان سے جو بات چیت ہوئی ہے وہ پیش خدمت ہے:

س شعر کہنا کب شروع کیا؟

ج ٹھیک سے تو یاد نہیں غالباً ساتویں آٹھویں جماعت کے قریب شعر کہنے شروع کئے لیکن وہ ایسے تھے کہ سنائے نہیں جا سکتے۔ میرا مطلب مکمل بے وزن اور سرے سے بے تکے شعر تھے۔

س باقاعدہ شاعری کا آغاز کب کیا؟

ج بھرپور شاعری کا آغاز 70ء میں ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی دور میں بین الکلیاتی مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ شروع میں میں صرف نظم لکھتا تھا لیکن میرے ایک شاعر دوست (ان کا نام نہیں

بتاؤں گا) جو ہمارے ساتھ ہی پڑھتے تھے، ان کے کہنے پر غزل لکھنا شروع کی۔

س حال ہی میں آپ کا اردو شعری مجموعہ ''کہرام'' کے نام سے آیا ہے جبکہ آپ کا پنجابی شعری مجموعہ ''تاہنگھ تریل'' کے نام سے کوئی 12 سال پہلے آیا تھا۔ دوسرے مجموعے کی اشاعت میں اتنا طویل وقفہ دینے کی خاص وجہ کیا ہے، جبکہ آپ کے ہمعصر دوسرے شاعروں کے اس عرصے میں بیسیوں شعری مجموعے آ چکے ہیں؟

ج میرے نزدیک اہمیت معیار کی ہے۔ مقدار کے چکر میں وہ شاعر پڑتے ہیں جو اپنے معیار کے حوالے سے کسی احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شاعر کے بڑا ہونے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ اس نے بڑی تعداد میں شعری مجموعے دیئے ہیں۔ یوں لگتا ہے ان لوگوں میں کتابیں چھپوانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر مہینے ایک نئی کتاب دے دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے شاعری کو کمرشل بنا دیا ہے۔ یہ اس دوڑ کا نتیجہ ہے کہ سنجیدہ قاری ادب سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

س کسی بھی شاعر کے کامیاب ہونے میں پی آر کیا کردار ادا کرتی ہے؟

ج وقتی طور پر تو پی آر آپ کو سہارا دے سکتی ہے لیکن مستقل کامیابی کے لئے کارکردگی انتہائی ضروری ہے۔

س آپ کی شاعری میں آنکھ کا استعارہ بار بار استعمال ہوا ہے، اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج انسانی جسم میں آنکھ ایسا مرکز ہے کہ وہ انسان کی اندرونی کیفیات بیان کرتی ہے۔ بعض اوقات جب لفظ اور زبان جواب دے جاتے ہیں تو ان حالات میں آنکھ اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ویسے بھی چونکہ میرا تعلق ویژن سے ہے اس لئے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے۔

س بنیادی طور پر آپ شاعر ہیں جب کہ عملاً آپ ٹی وی پروڈیوسر ہیں، آپ کیا سمجھتے ہیں آپ نے دونوں شعبوں سے کہاں تک انصاف کیا ہے؟

ج اپنی حد تک تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے دونوں شعبوں کے ساتھ انصاف کیا ہے لیکن اس بارے میں حتمی رائے تو لوگ ہی دے سکتے ہیں۔ میں اور آپ کے حوالے سے تو لوگ میری کارکردگی سے واقف ہیں بلکہ یوں کہوں تو مناسب ہوگا کہ اس حوالے سے اپنی کارکردگی منوا چکا ہوں۔ اب میرا اردو مجموعہ قارئین تک پہنچے گا تو اس بارے میں بھی وہی رائے دیں گے کہ میں اس شعبے میں کہاں تک کامیاب ہوں۔

س آپ کی کچھ مزاحیہ شاعری بھی ہے جسے چند لوگوں نے ٹی وی مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھا، آپ ان کا نام بتانا پسند کریں گے؟

ج مزاحیہ شاعری ایک شارٹ کٹ ہے ان لوگوں کے لئے جن کی سنجیدہ شاعری اس قابل نہیں ہوتی کہ اسے کسی کے سامنے پیش کیا جائے۔ میرے نزدیک مزاحیہ ادب کی مستقل اہمیت نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف وقتی طور پر لوگوں کو خوش کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ ایسے ہی کسی موڈ میں تھا جب میں نے چند مزاحیہ غزلیں نظمیں کہی تھیں لیکن میں ان کو اون نہیں کرتا، مبادا لوگ مجھے بھانڈ سمجھیں۔ جن لوگوں نے ٹی وی مشاعروں میں میری مزاحیہ شاعری کو اپنے نام سے پڑھا ہے، یہ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے کیونکہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔

س مزاحیہ مشاعروں کا ادب پر کیا اثر پڑا ہے؟

ج مزاحیہ مشاعرہ اور سٹیج ڈرامہ ایک مقصد کے حامل دو مختلف ڈرامے ہیں جس کا انتظامیہ کو تو فائدہ پہنچتا ہے لیکن ادب کو بے حد نقصان ہوا۔

س ادب کے فروغ کے لئے ٹی وی کیا کردار ادا کر رہا ہے؟

ج اس حوالے سے ٹی وی کا کردار بڑا مثبت ہے۔ ہمارے ملک میں کوئی بھی اچھی سے اچھی کتاب ایک ہزار سے زیادہ نہیں چھپتی، یہ ٹی وی کا کام ہی ہے کہ وہ اس کتاب کو ان لوگوں تک بھی پہنچاتا ہے جو کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے یا جن تک کتاب نہیں پہنچتی۔

س ٹیلی ویژن پر گانے والوں کو جو عزت و اہمیت دی جاتی ہے اس کے مقابلے میں ادیبوں دانشوروں کی حیثیت شاید آٹے میں نمک کے برابر ہے جبکہ پڑھے لکھے لوگ کسی بھی قوم کا دماغ سمجھے جاتے ہیں، ادیبوں سے اس امتیازی سلوک کی کوئی خاص وجہ؟

ج یہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے۔ ساری قوم کمرشلائز ہوگئی ہے۔ اسی چکر میں ادیبوں اور دانشوروں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا ہے اور یہ ہمارے لئے بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے۔

س بدلتے ہوئے ادبی رویوں سے مطمئن ہیں؟

ج دیگر تمام شعبوں کی طرح ادب میں بھی حق مارنے والے آگئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے لیکن اپنے تعلقات اور سازشوں کے بل بوتے پر یہ ادب میں ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں۔ یہ ادبی بدمعاش ہیں بلکہ ان کے لئے ادبی دہشت گرد کا لفظ زیادہ موزوں ہے، ان لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنا مزار بنالیا ہے

اور باقاعدگی سے ہر سال اپنا عرس بھی کرواتے ہیں۔

س ادب برائے ادب کے نظریے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج ادب برائے ادب کو بکواس سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں لوگوں کی خدمت اور عبادت کیلئے بھیجا ہے نا کہ وہ کسی کونے میں بیٹھ کر صرف اپنی ذات کی تسکین کے لئے وقت برباد کرتا رہے۔ میں ادب برائے زندگی پر یقین رکھتا ہوں۔

س ادب میں بنیاد پرستی کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے؟

ج بنیاد پرستی پر عمل کرنا ہر ادیب شاعر کا فرض ہے کیونکہ ہر پودا یا درخت اپنی جڑوں کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے، بغیر جڑوں کے اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح ادیب یا شاعر جب تک اپنے نظریئے پر قائم رہے گا اس وقت تک اس کی پہچان ہوگی۔ نظریہ چھوڑ دے گا تو اس کی مثال اس پودے جیسی ہوگی جو جڑوں سے اکھاڑ دیا گیا ہو، ہوا میں معلق ہو اور اس کی عمر محدود ہو۔

س ادب میں سرقہ اور چوری بہت بڑھ گئی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

ج یہ سلسلہ نیا نہیں ہے، پہلے بھی سرقہ اور چوری ہوتی تھی لیکن پتہ کم چلتا تھا، اب کمپیوٹر کا دور ہے، فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں نے فلاں کی غزل یا نظم چوری کی ہے۔ اسلام آباد کا ایک انٹر نیشنل شاعر چکوال کے ایک غیر معروف شاعر کی نعت ٹی وی کے مشاعرے میں پڑھ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک معروف مزاحیہ شاعر دو شعراء کی نظمیں پڑھ کر اپنا ادبی قد کاٹھ بنا لیتا ہے، میرے نزدیک یہ زیادتی ہے، اور یجنل شاعری کو ہی اہمیت دی جانی چاہیئے۔

س بقول احمد ندیم قاسمی، سلیم طاہر کسی تلاش میں سرگرداں ہے، تفصیل میں جائیں گے؟

ج بہت سی باتیں پردے میں رہیں تو بہتر ہے، ویسے بھی کسی تخلیق کار کے لئے اضطراب انتہائی ضروری ہے۔ باہر سے سمندر پرسکون نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر کا اضطراب تب ہی نظر آتا ہے جب اس کے اندر غوطہ زنی کی جائے، اس کے اندر جھانکا جائے، اس کے اندر داخل ہوا جائے، بعینہٖ ہی انسان بھی ایک سمندر ہے جسے بہت کم لوگ اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے اندر اترنے سے کتراتے ہیں۔ میں جس کی تلاش میں ہوں اس کا ذکر ''کہرام'' میں موجود ہے۔

OOO

سیف اللہ خالد

سیف اللہ خالد کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں میں ''ریشم جیسے خواب'' اور ''کبھی تو چاند نکلے گا'' شعری مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ ''پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال'' اور ''دیباچے سے فلیپ تک'' ان کی بے لاگ تنقیدی کتابیں ہیں۔ اسی بدولت دونوں کتب ادبی حلقوں میں بے حد متنازعہ ہیں۔

س بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج تبدیلی زندگی کا لازمہ ہے۔ صبح و شام ہمیں انقلاب کا پیغام دیتے ہیں اور جمود کو توڑنے کا درس دیتے ہیں۔ ادب بھی زندگی کا ایک خوبصورت اور موثر عنصر ہے لہٰذا اس میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ انسان کے فکری عملی تغیرات اس کے فن پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں خواہ وہ کسی پیمانے پر ہو ادب زندگی کا ایک اعلیٰ رویہ ہے لہٰذا اس میں بھی ہر آن تازگی اور جدت کا ہونا ضروری ہے۔ ادب میں جتنی بھی تحریکیں چلیں، سب نے کسی نہ کسی روایت سے اپنی کائنات سجائی لیکن ترقی پسند تحریک نے جس انقلابی نقطہ نظر کا آغاز کیا وہ تھا سچ کا پرچم، جو ابھی تک لہرا رہا ہے اور ادب کی تمام اصناف پر برابر اثر انداز ہو رہا ہے چنانچہ آج کے جدید ادبی رجحانات پر بھی اس کی روشنی پڑ رہی ہے۔ جینوئن ادب اسی تحریک کے اثرات سے مالا مال نظر آتا ہے۔ ادب کو شعری اور نثری پیمانوں سے ناپا جاتا ہے لہٰذا بدلتے ہوئے ادبی رجحانات ایک عمومی زاویہ نظر ہے۔ آج کے بدلتے ہوئے ادبی رجحانات میں سب سے پہلا رویہ یہ ہے کہ قلم کار نے اپنی ذات کو آفاقی تصور دینے کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کا آغاز احمد ندیم قاسمی سے ہوا تھا جنہوں نے ''انسان عظیم ہے خدایا'' جیسا عظیم فن پارہ لکھ کر انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیا ہے۔

س قاسمی صاحب کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے تو کیا اس ضمن میں احسان دانش مرحوم کا ذکر کئے بغیر بات تشنہ نہ رہ جائے گی؟

ج یقیناً احسان دانش صاحب کا تذکرہ ضروری ہے بلکہ قاسمی صاحب کے ہم عصر بہت سے ان ادیبوں شاعروں کا حوالہ بھی آتا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں انسان کی عظمت کو اجاگر کیا۔ احسان دانش کا حوالہ اس لئے اہم ہے کہ انہوں نے انسان کے رگ و پے میں مچلتی طاقتوں کو وجدانی بصیرت سے محسوس کیا اور انہیں موثر شعری لباس پہنایا۔ عظمت انسان کی یہ تحریک آگے بڑھی تو زمانہ موجود میں ڈاکٹر وزیر آغا تک پہنچی۔ ان کی تازہ کتاب ''عجب اک مسکراہٹ'' میں یہی ترانہ گونجتا ہے۔ نوجوان قلمکاروں نے انسان کی عظمتوں کو نئے نئے انداز سے اجاگر کیا ہے۔ جدید ادبی رویوں میں ایک اہم رویہ حقیقت پسندی پر مبنی رجحان بھی ہے یعنی اشیاء موجود کو موزوں ڈکشن عطا کر کے سادگی سے بیان کیا جائے، مبالغہ آرائی سے گریز کیا جائے، زمین اور اس کے مسائل کو اہمیت دی جائے۔ اس مرحلے پر یکا یک ہم ایک ایسی حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنا دوران مابعد الطبیعاتی کیفیات سے بڑی حد تک محروم دکھائی دیتا ہے جو کلاسیکی ادب کا خاصا تھیں کیونکہ آج کے ادیب اور شاعر نے یہ بات مان لی ہے کہ مادیت نے جسم کے ساتھ روح کو بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے اور جو لوگ مسند ارشاد پر فائز ہو کر بیٹھے ہیں وہ بھی دراصل مادیت کے اسیر ہیں۔ وہ فقط تصوف کے لالہ و گل سے بھی مسند ارشاد کو اپنی مادی ضروریات کی تسکین کے لئے استعمال کرتے ہیں چنانچہ اس حوالے سے جو جدید ادبی رویہ جنم لیتا ہے وہ ہے مابعد الطبیعات کی طرف ادیب اور شاعر کی توجہ۔ اس حوالے سے شہزاد احمد، ازہر منیر اور وزیر آغا نے خاصا کام کیا ہے بالخصوص آغا صاحب کی کتاب ''دستک اس دروازے پر'' کے کردار ''میں اور تو'' نے ان گتھیوں کو کامیابی سے سلجھایا۔ ہے آج کا شاعر ممتاز اطہر بڑی جرات سے کلاسیکی مابعد الطبیعاتی رویے پر طنز کرتے ہوئے علی الاعلان کہتا ہے:

ہر ایک آنکھ آسمان کی طرف لگی ہوئی
زمین پر جو روشنی کی فصل تھی اجڑ گئی

س محبت ایک پٹا ہوا موضوع ہے۔ اس کے متعلق جدید ادبی رجحانات میں کیا مثبت تبدیلی آئی ہے؟

ج سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ اب شاعر نہایت حقیقت پسند ہو گیا ہے اور وہ اس بازی گاہ میں جن اضطرابی کیفیات سے گزرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ فریق ثانی بھی انہی مراحل سے گزرے یعنی وہ محبت بھی برابر کی سطح پر کرنا چاہتا ہے جیسے نوجوان شاعر طارق اسد کہتا ہے:

یہی دن ہیں محبت کے یہی موسم ہیں ملنے کے
یہ دن گزر گئے تو پھر تیرا سراپا کون دیکھے گا

یہ سب سٹینڈرڈ شاعری جو عوام سے داد سخن وصول کرتی ہے نوجوان شعراء کا معیار قرار پائی ہے اور اہل ذوق اصل شاعری کا ذائقہ بھول گئے ہیں۔ اس صورتحال سے ایک ایسے المیے نے جنم لیا ہے جس کی حوصلہ شکنی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس غیر معیاری شاعری کی پذیرائی کرنے والے پیشہ ور دیباچہ نویس اور فلیپ نگار سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ ان کی سفارشوں سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ لوگ ''الم غلم'' تحریروں کو ادب سمجھ کر ان پر لٹو ہو رہے ہیں۔

س ادب میں تشدد اور بدتمیزی کی چند مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج اس سماج میں جہاں ہر چیز نمبر دو ہے، ادب بھی دو نمبر ہو گیا ہے اور تخلیق کار بھی اسی قماش کے ہیں۔ ظاہر ہے جب آپ دو نمبر چیز کو ایک نمبر چیز ثابت کرنے پر تل جائیں تو غیر معمولی اور ناشائستہ رویہ جنم لیتا ہے جس کو برحق ثابت کرنے کے لئے تشدد کا ہتھیار استعمال کرنا لازم آتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اب ادب گاہوں میں گھس بیٹھئے اپنا فن دکھا رہے ہیں اور ہر وہ ہتھیار استعمال کر رہے ہیں جو ایسے لوگوں کو استعمال کرنا چاہئے یہاں میں پھر اس بات کو دہرانا چاہوں گا کہ ان ادبی ''گھس بیٹھیوں'' کی پشت پناہی کے لئے فورسز موجود ہیں جن میں پبلک ریلشنگ کا گھٹیا حربہ بھی ہے جو عصائے موسیٰ کی طرح جا بجا اپنا اعجاز دکھا رہا ہے۔

س بعض ادیبوں نے ادب کی آڑ میں اچھی خاصی فحش نگاری کا مظاہرہ کیا ہے، اس رویے کو آپ کیا نام دیں گے؟

ج جنسی رویے کو عریانی کا لباس پہنا کر یہ تصور کرنا کہ منٹو کی روایات آگے بڑھ رہی ہیں، انتہائی بدذوقی ہے حالانکہ منٹو نے کبھی جنس پر کچھ نہیں لکھا بلکہ جنسی کج روی، خواہ وہ تصوراتی ہو یا عملی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر قلم اٹھایا تھا لیکن آج کے ادیب کی بدقسمتی ہے کہ وہ اس طرح کی کیفیات کو علامتوں کا لباس پہنانا بھی گوارہ نہیں کرتا۔ اس حوالے سے علی نواز شاہ کی ''کالک اور خون'' کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہاں تک تو خیریت تھی مگر عرفان احمد خان نے اپنے ناول ''گزارہ ایسے ہوتا ہے'' میں جس فحش نگاری کی حدیں پار کی ہیں انہیں کسی بھی حوالے سے ادبی طور پر مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

س کسی تخلیق کے بارے ایک ہی ''قد کاٹھ'' کے دو مختلف ادیبوں کی رائے مختلف کیوں ہوتی ہے؟ کیا یہ ادبی منافقت نہیں ہے؟

ج نہیں، منافقت تو جان بوجھ کر کی جاتی ہے، یہاں صورتحال یہ ہوتی ہے کہ ایک ادیب کی ایک طرف سے آنے والی رائے کا دوسرے ادیب کو اس وقت علم ہوتا ہے جب کوئی مصنف فلیپ کے طور پر دونوں ادیبوں کی آراء کو سامنے شائع کرتا ہے جیسے ایوب ندیم نے اپنے شعری مجموعے ''چاند میرا ہمسفر'' میں ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی جیسے قطبین کی آراء کو فلیپ کے طور پر بالمقابل شائع کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رائے کا اختلاف ہر شخص کے ذہنی کینوس کا سوال ہے۔ ایک تخلیق کے متعلق دو متضاد یا مختلف آراء کو منافقت نہیں بلکہ اپروچ کا اختلاف سمجھنا چاہئے۔

س دیباچہ اور فلیپ نگاری کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

ج باقی ادبی اصناف کی طرح دیباچہ اور فلیپ اصناف ادب نہیں بلکہ ادیب کو پرموٹ کرنے کے وسیلے ہیں، اردو کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اس میں دیباچے اور فلیپ نگاری کا غلط استعمال کیا گیا ہے اور انہیں سفارشی رقعے بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

س دیباچے سے فلیپ تک، آپ کی حالیہ تصنیف ہے آپ کو اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

ج میں مزاجاً غیر مفاہمت پسند واقع ہوا ہوں۔ دھاندلی جیسی بھی ہو، میرے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے ادب تو میری زندگی ہے اور ادب سے کھیلنے والوں کو میں کسی صورت معاف نہیں کر سکتا ''دیباچے سے فلیپ تک'' کی شان نزول میرا یہی مزاج ہے۔ عرصہ دراز سے ادب میں نام نہاد ادیبوں اور ان کے بزرگوں نے جو دھاندلی شروع کر رکھی تھی اس نے مجھے کتاب کو قلم بند کرنے پر اکسایا، میری زندگی میں کچھ بھی مقدس نہیں لہٰذا بڑی سے بڑی شخصیت بھی میرے قلم کے نشانے پر رہتی ہے۔ میں اقوال زریں کو نہ سنتا ہوں اور نہ انہیں حوالے کے طور پر استعمال کرنا گوارہ کرتا ہوں چنانچہ احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، خواجہ زکریا اور اس طرح کے تمام بزرگان ادب نے دیباچے اور فلیپ کے نام پر جو دھاندلی مچائی اس نے مجھے یہ کتاب لکھنے پر آمادہ کیا۔ میں جانتا ہوں یہ تار پر چلنے کا عمل تھا لیکن اس عمل کو میں نے بڑے توازن کے ساتھ سرانجام دیا۔

س آپ نے اپنی گفتگو میں اب تک جو حوالے دیئے ہیں وہ صرف لاہور اور سرگودھا سے متعلقہ ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج دنیا میں بڑے بڑے فاتحین نے جب کسی ملک پر یلغار کی ہے تو سب سے پہلے اس کے صدر مقام پر حملہ بولا ہے اگر چہ بعد میں مضافات بھی ان کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ میں خود مضافات کا آدمی ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اس وقت سچا اور اچھا ادب لاہور اور سرگودھا سے باہر وجود میں آرہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ سماج کی سچی عکاسی کرنے میں غزل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کا سرخیل شکیب جلالی تھا جس نے مضافات میں آنکھ کھولی اور تاریخ ادب میں اپنا انمٹ نقش ثبت کر گیا۔ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی صورتحال کو کامیابی کے ساتھ ادبی جامہ پہنانے میں آج کی نسل بھی نہایت موثر کردار ادا کر رہی ہے، نوشی گیلانی، ممتاز اطہر، منور جمیل اور طارق اسد جیسے غیر لاہوری لوگ کامیاب تخلیقات کر رہے ہیں۔

س آپ نے نوشی اور منور جمیل کا اکٹھے ذکر کیا ہے جبکہ ان دونوں میں کچھ غزلوں کی چوری کا مقدمہ بھی عدالت میں تھا جس کا فیصلہ نوشی کے حق میں ہو گیا، اس صورت میں منور جمیل گویا چور ٹھہرتے ہیں، کیا اس کے باوجود آپ منور جمیل کو ایک کامیاب شاعر کہیں گے؟

ج متنازعہ غزلوں کو چھوڑ کر بھی اگر دونوں کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو دونوں ہی اپنی جگہ بھرپور اور مکمل شاعر ہیں۔

○○○

سلیمان جاذب

سلیمان جاذب کا بطور شاعر اور انٹرنیٹ جرنلسٹ تعارف تو ادبی رسائل اور اخبارات کے ذریعے ادبی ذوق رکھنے والے باقی دوستوں کی طرح مجھے بھی تھا۔ گزشتہ برس اتفاق سے میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ان کی شخصیت کی اک نئی جہت سامنے آئی اور وہ تھی ایک کامیاب ایونٹ منیجر اور اعلیٰ منتظم ہونے کی۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ عجمان میں سلیمان جاذب نے خوبصورت لہجے کے مقبول شاعر وصی شاہ کے اعزاز میں ایک شام کا انعقاد کیا تھا۔ لاطینی امریکہ جاتے ہوئے مختصر وقت کے لئے میں بھی متحدہ عرب امارات آیا ہوا تھا۔ وصی شاہ کے ساتھ منائی جانے والی شام میں شرکت کی جب دعوت ملی تو میرے ذہن میں یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس لوگ ہوں گے اور بیرونِ ملک ہونے والی ادبی تقریباً کی طرح شاید یہ بھی کوئی مختصر سی تقریب ہوگی۔ وہاں تو مگر منظر ہی اور تھا۔ تقریب میں پہنچ کر میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ ہزار کے قریب لوگ فائیو سٹار ہوٹل کے سب سے بڑے ہال میں موجود ہیں۔ کوئی سعودی عرب سے آیا ہے تو کوئی کویت اور بحرین، دوبئ اور ابوظہبی شارجہ کے لوگ تو گویا میزبان بنے ہوئے تھے۔ مجھے جب اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا تو میرے لئے مناسب الفاظ کا چناؤ مشکل ہو رہا تھا کہ پاکستان سے باہر آج تک میں نے کسی ادبی تقریب کا اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا تھا۔ کھانے کے علاوہ ہر مہمان کو ایک ننھے سے پرفیوم کا تحفہ بھی دیا گیا۔ بلاشبہ اس تقریب میں لوگوں کی تعداد اور جوش وخروش میں خوبصورت شاعر دوست وصی شاہ کی شخصیت کی سحر انگیزی ہی بنیادی محرک تھی مگر جس انداز میں اس تقریب کے لئے اعلیٰ انتظامات کے گئے اور لوگوں کو متحرک کیا گیا اس کا سہرا سلیمان جاذب کے سر تھا۔ اس شام تو وہ بھی مصروف تھے اور میں نے بھی اگلے دن برازیل روانہ ہونا تھا اس لئے ان سے تفصیلی بات چیت نہ ہو سکی مگر گزشتہ دنوں میرا دوبئ جانا ہوا تو وہاں کی ادبی وسماجی تقریبات کے روحِ رواں سلیمان جاذب سے تفصیلی گفتگو ہوئی جو کہ قارئین کی نذر ہے:

س عام چلن تو یہی ہے کہ نوجوان پہلے شاعری کی جانب آتے ہیں اور پھر صحافت یا کالم نگاری کا رخ کرتے ہیں مگر آپ پہلے صحافی بنے بعد میں شاعری کی طرف آئے، پہلے ہمیں یہ معمہ سمجھایئے گا؟

ج میں نویں جماعت میں تھا جب میرا پہلا کالم شائع ہوا۔اس لحاظ سے آپ کی بات بجا ہے کہ میرا پہلا تعارف بطور صحافی ہے اور شاعری کے حوالے سے میرا تعارف لوگوں میں بعد میں پہنچا۔نثر میں میرا ہاتھ شروع سے ہی رواں تھا۔بچپن میں ہی اپنی کلاس اور سکول کے دیگر طلباء کے لئے تقاریر لکھ کر دیا کرتا تھا لیکن شعری موزونیت بھی موجود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ نثری حوالے سے تعارف ذرا پہلے لوگوں تک پہنچا۔

س کیا کوئی شعری مجموعہ بھی شائع ہوا ہے؟

ج ہاں!''تیری خوشبو'' کے نام سے شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

س آپ کی ویب سائٹ تو یہاں خاصی مقبول ہے،ویب جرنلزم کے علاوہ بھی کہیں لکھتے ہیں؟

ج روزنامہ نئی بات میں آج کل لکھنا شروع کیا ہے۔ یہاں میں اس اخبار کا بیورو چیف بھی ہوں اور کالم بھی لکھ رہا ہوں۔

س آپ معروف صحافی بھی ہیں اور شاعر بھی،ایونٹ مینجمنٹ کیسے کر پاتے ہیں؟

ج اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے سرفہرست تو یہ ہے کہ کمیونٹی بہت بڑی ہے۔ پاکستانیوں کے علاوہ برصغیر کے قرب وجوار میں جہاں کہیں سے بھی ہم زبان لوگ آتے ہیں اور یہاں پائے جاتے ہیں وہ ہمارے ٹارگٹ سامعین وناظرین ہیں۔آپ اگر مجھے کامیاب منتظم کے طور پر سوال کر رہے ہیں کہ میری کامیابی کی وجہ کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔پہلی یہ کہ لوگوں کی پسند کا خیال رکھتا ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ اور کس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری وجہ کہ ہر چیز کی کمرشل ویلیو کا بھی خیال رکھتا ہوں۔

ادبی پروگراموں کے علاوہ میں نے گزشتہ دنوں یہاں حدیقہ کیانی،عمر شریف اور منی بیگم کے شو کرائے ہیں۔خوش قسمتی یا اتفاق کہہ لیں کہ عربی تقریبات میں ہماری کمیونٹی کی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ اگر آپ پاکستان سے کوئی بھی ایسی سلیبرٹی بلاتے ہیں اور ٹھیک انداز میں اس کی مارکیٹ کرتے ہیں تو پھر کامیابی یقینی ہوتی ہے۔

س کیا آپ نے اس شعبے میں تعلیم بھی حاصل کی ہے یا پھر محض اتفاق سے ہی ادھر آ نکلے؟

ج تعلیم تو میں نے شماریات کے شعبے سے متعلق حاصل کی تھی اور یہاں میری پہلی نوکری بھی اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ہی تھی مگر آہستہ آہستہ مجھے شماریات کا شعبہ بورنگ محسوس ہونا شروع ہو گیا اور میں نے تقریبات کا رخ کیا۔ آج کل میں بطور ایونٹ منیجر ہی کام کر رہا ہوں۔

س کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہئے؟

ج ادیب طبقہ ان لوگوں میں سے ہے معاشرے میں جن کو زندگی اور حالات کا ادراک باقی عوام سے قدرے بہتر ہوتا ہے۔ سیاست بھی عوامی خدمت کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے اور اس ذریعے سے اگر کوئی ادیب عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اسے ضرور سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔

س شاعری اور صحافت کو اگر ایونٹ منیجر کی نظر سے دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

ج صحافت اور شاعری کی وجہ سے پروگرام اور تقریبات کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری اور صحافت کی وجہ سے لوگوں میں آپ کا تعارف موجود ہوتا ہے اور پھر اس سے زبان و بیان میں بھی نکھار آ جاتا ہے۔

س آپ براہ راست پاکستان کے میڈیا سے بھی منسلک ہیں، کیا آپ میڈیا کے موجودہ کردار سے مطمئن ہیں؟

ج پاکستان کے مسائل اجاگر کرنے کے حوالے سے اگر چہ میڈیا اچھا کردار ادا کر رہا ہے مگر منفی رپورٹنگ کے سبب باہر دنیا میں رہتے ہوئے اس انداز سے منفی تصویر ہی بن رہی ہے۔ میڈیا کسی طرح بھی ملک کے امیج کے لئے مثبت کام نہیں کر رہا بلکہ میں تو کہوں گا کہ میڈیا کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان کا امیج خراب ہو رہا ہے۔ اگر باہر دنیا میں ہمیں کہا جاتا ہے کہ آپ سب دہشت گرد ہیں تو یہ انہیں پاکستانی میڈیا ہی بتا رہا ہے۔ میڈیا ملک کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔

س متحدہ عرب امارات میں اردو ادب کے کیا حالات ہیں؟

ج UAE میں اردو کے حوالے سے اچھا خاصہ کام ہو رہا ہے۔ پاکستانی نژاد ادیب کبیر خان کو کشمیر کے وزیر اعظم کا ایوارڈ ملا ہے۔ مقامی عرب ڈاکٹر زبیر فاروق اردو شاعری کرتے ہیں اور ان کے تیس سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جو سب کے سب اردو میں ہیں مگر پھر بھی یہاں کے جو ادیب اردو ادب سے وابستہ ہیں وہ پاکستان سے ہی آئے ہوئے ہیں۔ پاکستانی خاندانوں کے

جو بچے یہاں پیدا ہوتے ہیں وہ اردو لکھ اور پڑھ نہیں سکتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو یہ بڑا نقصان ہو گیا ہے۔

س پاکستان کے ادیبوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج اہل قلم دوستوں سے تو یہی گزارش ہے کہ اگر ادبی گروہ بندیاں ختم کر دیں گے تو ادب اور زیادہ ترقی کر سکتا ہے، اس کی بہتر ترویج ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی ادبی گروہ بندیوں کے نقصانات ہمیں یہاں بیٹھے اور زیادہ شدید ہوتے ہیں کہ جب ہم مشاعرے کرواتے ہیں تو شاعروں کی طرف سے اس طرح کی شرطیں رکھی جاتی ہیں کہ اگر فلاں شاعر آئے گا تو پھر میں نہیں آؤں گا۔ ان لوگوں کو بلائیں گے تو ہم لوگ نہیں آئیں گے۔ ان ادبی گروہ بندیوں کی وجہ سے ہم لوگ بڑے بڑے مشاعرے کرنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں۔

OOO

ڈاکٹر سلیم اختر

س ڈاکٹر صاحب اس وقت آپ غالباً پینسٹھ برس کے ہو چکے ہیں اور ملازمت سے ریٹائر ہوئے بھی چار پانچ برس ہو چکے ہیں، اب جب کہ آپ کی باقاعدہ مصروفیات نہیں رہیں تو آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟

ج سچ پوچھیں تو مجھے یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں بعض لوگ ریٹائرمنٹ یا بڑھتی ہوئی عمر کو اعصاب پر سوار کر لیتے ہیں لیکن میں نے ریٹائرمنٹ کو مسئلہ نہیں بنایا آگے بھی لکھتا پڑھتا تھا، اب بھی لکھتا پڑھتا ہوں، بلکہ بہت سے طویل المدت ادبی منصوبے جو میں ملازمت کے دوران مکمل نہیں کر سکتا تھا، ان پر کام کرنے کے لئے میرے پاس خاصا وقت ہے۔ رہی عمر کی بات تو بڑھاپا جسمانی کم اور ذہنی زیادہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں میری افتادِ طبع کچھ الگ سی رہی ہے۔ میں جب جوان تھا تو بعض امور کے لحاظ سے بوڑھا سمجھا جاتا تھا۔ اب جب کہ کیلنڈر عمر کے لحاظ سے بوڑھا ہو رہا ہوں تو مزاج میں چونچال پن بڑھ چکا ہے، مجھے کئی بے تکلف دوستوں نے کہا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تم زیادہ تیز ہو گئے ہو لہٰذا میں ذہنی طور پر نہ ریٹائر ہوا ہوں اور نہ ہی بزرگوں میں شمار کیا جا سکتا ہوں۔

س عمر کے اس دور سے جب آپ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟

ج جب میں ماضی پر نگاہ بازگشت ڈالتا ہوں تو سود و زیاں کے طویل سلسلے نظر آتے ہیں۔ میں نے زندگی سے کچھ لیا بھی ہے اور اس کے عوض معاشرے کو کچھ دیا بھی ہے، اپنی معلمی کی صورت میں اور اپنی تحریروں کے صورت میں بھی، دراصل میں اوائل عمر ہی میں اپنے لئے کچھ ترجیحات کا تعین کر لیا تھا جن میں سرفہرست یہ تھا کہ کوئی کام محض پیسہ کمانے کے لئے نہیں کرنا اسی لئے ساری عمر میں نے امتحانوں کا سپرنٹنڈنٹ بننے کی خواہش نہ کی۔ ایف اے، بی اے کی سطح کے پرچے نہ دیکھے حالانکہ یہ وہ ذرائع ہیں کہ جائز اور ناجائز طریقوں سے خوب پیسہ کمایا جا سکتا تھا۔ یوں وقت اور توانائی بچا کر میں نے تنقید اور افسانہ نگاری کے لئے خود کو وقف کئے رکھا۔ آج آپ کو میرے

بینک بیلنس میں شاید کچھ نہ ملے لیکن میں نے جو عزت یا محبت حاصل کی اپنے دوستوں، طالب علموں اور قارئین سے میں اسی سرمایہ کو جانتا ہوں۔

س آپ کی اس وقت کل کتابیں کتنی ہیں؟ ذرا ان میں سے اہم کتابوں کے نام بھی گنوا دیں؟

ج اس وقت میں کتابوں کی نصف سنچری مکمل کر چکا ہوں۔ یہ گفتگو ختم ہونے تک شاید نئی کتاب بھی چھپ چکی ہو، میری مراد افسانوں کے تازہ مجموعے ''آدھی رات کی مخلوق'' سے ہے جو اس وقت پریس میں ہے۔ جہاں تک میری قابل ذکر کتابوں کا ذکر ہے تو چند کے نام گنواتا ہوں۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ تنقیدی دبستان شعور اور الشعور کا شاعر، غالب، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، اقبال اور ہمارے فکری رویے، جوش کا نفسیاتی مطالعہ تخلیقی اور لاشعوری محرکات وغیرہ۔

س آپ کی ڈاکٹریٹ کا کیا موضوع تھا؟

ج میں نے ''اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے تحقیقی مقالہ قلم بند کیا تھا۔ یہ مقالہ دو حصوں میں شائع ہوا،نفسیاتی تنقید،اور مغرب میں نفسیاتی تنقید۔

س نفسیات میں آپ نے اور کیا کچھ لکھا ہے؟

ج نفسیات کے متعدد موضوعات پر میری کتابیں چھپی ہیں جن میں سے عورت، جنس اور جذبات سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ ہماری جنسی اور جذباتی زندگی بھی شائع ہوئی ہے اور پھر فرائڈ، ایڈلر اور ژونگ کے حالات زندگی اور نفسیاتی تصورات کے حوالے سے ایک کتاب ہے ''تین بڑے نفسیات دان نفسیات کے سلسلے۔'' میں آپ کو دلچسپ بات بتاؤں کہ مجھے ایسے قارئین بھی ملے جو صرف میری نفسیاتی کتابوں سے ہی آگاہ تھے بلکہ وہ نفسیاتی کتابوں والے سلیم اختر اور تنقید والے سلیم اختر کو الگ الگ جانتے تھے۔ گزشتہ کئی برس سے ان نفسیاتی کتابوں کے مطالعے کے بعد مجھے متعدد مردوں، عورتوں اور نوجوانوں نے اپنے اپنے جنسی مسائل اور جذباتی الجھنوں کے بارے میں خطوط لکھے جن کا میں اپنی بساط کے مطابق جواب بھی دیتا۔ پچھلے دو تین برس سے کراچی کے ایک خوبصورت انٹرنیشنل میگزین رابطہ میں ''خود شناسی'' کے مستقل عنوان تلے میں نفسیاتی مسائل پر لکھ رہا ہوں۔ ان مضامین کی وجہ سے نفسیاتی مشورے طلب کرنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ میری شخصیت کا ایسا پہلو ہے جس سے نہ تو لوگ آگاہ ہیں اور جس کے بارے میں، میں خود بھی بالعموم گفتگو نہیں کرتا۔

س آپ پروفیسر اردو کے ہیں مگر اوڑھنا بچھونا نفسیات کو بنا رکھا ہے، یہ کیسے ہوا؟ یعنی اردو سے

آپ نفسیات کی جانب کیسے آ گئے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں اردو کے پروفیسر بالعموم اردو تک ہی محدود رہتے ہیں؟

ج اگر آپ کا خیال ہے کہ نفسیات میری ادبی منصوبہ بندی کا حصہ تھی تو ایسی بات نہیں ہے، بلکہ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے تو ایف اے میں اردو بھی نہیں پڑھی تھی۔ میں بنیادی طور پر فلسفے کا طالب علم تھا اور فلسفے ہی میں ایم اے کرنے کی خواہش تھی لیکن بعد میں نفسیات کا مطالعہ بڑھتا گیا اور میں اس میں اتنی دلچسپی لینے لگا کہ پھر فلسفے کو ذہن سے نکال دیا۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید میں نے نفسیات میں ایم اے کیا ہوا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں صرف ایم اے اردو ہی ہوں۔ بس مطالعے کا شوق تھا جو ہنوز جاری ہے۔ جب تنقید لکھنی شروع کی تو چونکہ نفسیات کے کثیر مطالعے سے ایک مخصوص زاویہ نگاہ بن چکا تھا لہٰذا تنقید اور افسانوں میں بھی خود بخود نفسیات شامل ہو گئی تاہم میں نے اتنی احتیاط ضرور برتی کہ تنقید میں نفسیات صرف وہیں استعمال کی جہاں اس کی ضرورت یا جواز تھا، یونہی بلا سوچے سمجھے اندھا دھند تخلیق کاروں پر نفسیاتی لاٹھی چارج نہیں کیا۔

س اب تک ہم نے بہت گفتگو کی لیکن آپ کے افسانوں کا ذکر نہیں آیا، ویسے بھی ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ جس طرح بطور نقاد آپ کا کھڑ کا دڑ کا رہتا ہے اس طرح افسانوں کے بارے میں نہیں ہوتا؟

ج آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے تنقید سے کہیں پہلے افسانے لکھنے شروع کئے تھے۔ آپ کو میں تھوڑا پیچھے لے جانا چاہتا ہوں یعنی جب میں انبالہ شہر میں تھا اور پانچویں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا اس وقت بچوں کی کہانیاں پڑھتا اور بچوں کے کئی رسالے ابا جی نے جاری کرائے ہوئے تھے، یوں پڑھتے پڑھتے کم عمری ہی میں لکھنے کا شوق بیدار ہو گیا اور اسی عمر ہی میں، میں نے بچوں کے رسالوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں، مضامین اور نظمیں لکھنا شروع کیں۔ قیام پاکستان کے وقت میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میں نے پہلے دو افسانے ''قربانی'' اور ''ساحرہ'' 1949ء میں لکھے جب کہ میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا یہ لاہور کے ایک فلمی پرچے میں چھپے بھی لیکن نہ تو میرے پاس ان کا ریکارڈ ہے بلکہ اب تو مجھے اس پرچے کا بھی نام یاد نہیں جس میں ان کی اشاعت ہوئی۔ دو سال بعد جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا تو رسالہ ''شمع''، دہلی میں میرے دو افسانے ''ایک محبوبہ ایک طوائف'' اور ''کٹھ پتلی'' شائع ہوئے ''شمع'' اس وقت کا بے حد مقبول پرچہ تھا، اس کے بعد بھی کوئی ایک آدھ کہانی چلتی رہی لیکن میں نے یہ

ساری کہانیاں کسی مجموعے میں شامل نہ کیں۔جس افسانے سے میں اپنی افسانہ نگاری کا آغاز بیان کرنا چاہوں گا وہ ہے ''سویٹ ہارٹ'' 1962ء کے سالنامہ ادب لطیف میں مرزا ادیب مرحوم نے اسے شائع کیا۔اس وقت اس کا خاصا چرچا ہوا اور یہ ہندی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

س آپ کے کتنے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج تنقید کے مقابلے میں میرے لئے افسانہ نگاری بہت مشکل ثابت ہوتی ہے اسی لئے افسانے تنقید کے مقابلے میں بہت کم تعداد میں لکھے جا سکے پھر میں افسانے پر زیادہ محنت بھی کرتا ہوں،اس کا عنوان،آغاز اور اختتام ان پر میں خصوصی توجہ دیتا ہوں۔افسانہ لکھ لینے کے بعد اس میں کانٹ چھانٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔شاید ہی کوئی ایسی کہانی ہو جس کے تین چار ڈرافٹ نہ بنے ہوں اسی لئے تنقید کے مقابلے میں افسانوی مجموعوں کی تعداد کم ہے۔اس وقت تک یہ مجموعے چھپ چکے ہیں ''کڑوے بادام' کانٹھ کی عورتیں،چالیس منٹ کی عورت،مٹھی بھر سانپ،اور زیر طبع مجموعہ آدھی رات کی مخلوق۔''ان افسانوں کے ساتھ ساتھ ایک ناولٹ بھی ہے ''ضبط کی دیوار۔''اس کے پاکستان اور ہندوستان میں کئی ایڈیشن چھپے اور یہ ہندی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ویسے بھی میرے متعدد افسانے انگریزی،ہندی،گرمکھی،بنگلہ اور آسامی زبانوں میں ترجمہ کئے جا چکے ہیں۔

س آپ نے کبھی کسی کتاب کی تقریب رونمائی نہیں کرائی،نہ ہی کبھی آپ کے ساتھ کوئی شام وغیرہ منائی گئی؟

ج مجھے کتابوں کی رونمائی پسند نہیں اس لئے آج تک میں نے اپنی کسی کتاب کی تقریب منعقد نہ کرائی بلکہ بعض دوستوں یا ناشروں نے ایسا کرنا چاہا تو انہیں بھی منع کر دیا اور آج کل جس پیمانے پر فائیوسٹار ہوٹلوں میں یہ تقریبات منعقد ہوتی ہیں،اس خرچ میں تو انسان اپنا ولیمہ کر سکتا ہے۔ مجھے نمود ونمائش پسند نہیں،نہ ہی مرکز نگاہ بننے کا شوق ہے اس لئے ان تمام احباب کو سختی سے منع کر دیتا ہوں جو میرے اعزاز میں تقریب منعقد کرنا چاہتے ہوں۔یہ ٹھیک ہے کہ اس میں ایک چارم بھی ہوتا ہے اور خاصی پبلسٹی بھی مل جاتی ہے لیکن نہ تو میں اس چارم کا طلب گار ہوں اور نہ ہی پبلسٹی کا شوقین۔میں نے ساری عمر گھر بیٹھ کر کام کیا ہے،مدح اور مذمت سے بے نیاز ہو کر۔یہ مزاج کا تقاضا ہے اور میں اس طرح خوش ہوں۔

س اس کے باوجود آپ پر خاصا لکھا گیا،موافقت میں بھی اور مخالفت میں بھی بلکہ گزشتہ مہینوں

میں یہ خبر بھی چھپی تھی کہ بھارت میں ایک صاحب نے آپ کی تنقید پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے؟

ج: جی ہاں یہ درست ہے، میں غالباً پاکستان کا واحد زندہ نقاد ہوں جسے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کی تنقید پر ڈاکٹریٹ دی گئی۔ بھارت کے صوبہ بہار میں ڈاکٹر جلیل اشرف نے اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر سلیم اختر کا حصہ کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور رانچی یونیورسٹی نے اس پر ڈگری دی تھی۔ مقالے کے نگران مشہور نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی ہیں: ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد کے عنوان سے یہ مقالہ انڈیا میں اور پھر اس برس پاکستان میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے میرے عزیز دوست ڈاکٹر طاہر نے ''ہم سفر کا بگولوں کا'' کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی جسے پاکستان کے مشہور ناشر نیاز احمد نے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ہی میرے بارے میں ایک اور کتاب بھی مرتب کی تھی، ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت اور تخلیقی شخصیت، اسی برس شعبہ اردو گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم محمد سعید اور طالبہ حمیرا ماجد نے ایم اے اردو کے تھیسز کے لئے مجھ ناہنجار کا انتخاب کیا، محمد سعید کے مقالہ کا موضوع ہے، ڈاکٹر سلیم اختر اور مطالعہ غالب و اقبال، ان کے نگران پروفیسر سید معین الرحمن ہیں۔

OOO

شہرت بخاری

شہرت بخاری کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔پچھلے کئی سالوں سے شہرت بخاری لندن میں مقیم ہیں۔لندن میں رہنے کے باوجود ان کا انداز بالکل روایتی ہے، لاہور کا نام سن کر اب بھی ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

س آپ ایک طویل عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔لندن اور انگریزوں کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ج میرے نزدیک پاکستان کے بعد رہنے کے لیے سب سے اچھی جگہ لندن ہے اور لندن میں بھی پرانا لندن۔ پرانے لندن کے لوگ بڑے روایتی ہیں۔ ہمیشہ روایتوں کا پاس رکھتے ہیں۔ یہاں کا موسم بھی بہت خوب ہے اور ماحول بھی، جہاں تک گوروں کا تعلق ہے تو میری دانست میں گورے بڑے غیر متعصب ہیں۔کبھی بھی تعصب سے کام نہیں لیتے یہاں میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔کچھ سال پہلے میں اور میری بیوی لندن میں ایک سٹیشن پر بیٹھے ہوئے تھے کہ نشے میں دھت ایک انگریز پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔کچھ دیر یونہی خالی نظروں سے تکتا رہا پھر قومیت کی بنیاد پر ہمیں گالیاں دینے لگا اور ہمارے سامنے تھوک کر چلا گیا۔میں خیر انتہائی افسردہ ہوا اور میری بیوی مجھ سے زیادہ کہنے لگی کہ میں نہ کہتی تھی کہ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے واپس چلے چلیں۔ہم ابھی اپنی زبان میں یہی باتیں کر رہے تھے کہ قریب ہی کھڑا ایک انتہائی معزز انگریز ہمارے پاس آیا اور بڑی معذرت کرنے لگا۔کہنے لگا خدا کی قسم ہم ایسے لوگ نہیں ہیں جیسا یہ شرابی تھا اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر اس شرابی کی حرکت پر معافی مانگنے لگا۔یہ تو خیر ایک واقعہ ہے۔اس طرح کے کئی واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں جن سے انگریزوں کی وسیع القلبی کا ثبوت ملتا ہے۔

س لندن میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

ج عامر: بیٹا لندن میں سب کچھ ہے بس لاہور نہیں ہے۔

س اچھا: لاہور کے متعلق آپ کافی رومانوی معلوم ہوتے ہیں؟

ج ہاں: بالکل لاہور سے مجھے عشق ہے۔ لاہور کا دل اور دامن بہت وسیع ہے۔ ہر نئے آنے والے کو جگہ دیتا ہے اور اس میں ایسا جادو ہے کہ ہر نئے آنے والے کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے لیکن یار یہ لاہور تو وہ لاہور ہے ہی نہیں جس میں ہم نے بچپن گزارا ہے۔ شہر کی باہر والی فصیل کے ساتھ ساتھ نہر چلا کرتی تھی۔ دن بھر عورتیں نہر پر کپڑے دھوتی تھیں۔ ہم بھی نہر کے گرد باغات میں کھیلا کرتے تھے۔ اب تو نہ وہ نہر رہی نہ وہ باغات لیکن پھر بھی میں تو ہمیشہ یہی کہتا ہوں ''جیوے شہر لاہور۔''

س کیا لندن میں بھی ادبی بیٹھکیں اور مشاعرے ہوتے ہیں؟

ج مشاعرے کے بغیر تو اردو شاعری کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ مشاعرے کی حیثیت اردو شاعری کی روایت میں ریڑھ کی ہڈی سی ہے۔ لندن میں بھی ہم کوئی نہ کوئی محفل سجائے رکھتے ہیں۔ یہاں بھی کافی اچھے شاعر موجود ہیں۔

س ترقی پسند تحریک کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا، ترقی پسند تحریک کے کردار کے حوالے سے آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج ترقی پسند تحریک کے اردو ادب پر بہت سارے احسانات ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو جو شاعر اور ادیب دیئے، آج بھی ان کے پائے کا کوئی شاعر یا ادیب موجود نہیں ہے۔ فیض، مجاز، ساحر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندر ان کے قد کا کوئی بھی شاعر یا ادیب اس عہد نے پیدا نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو کئی نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

س جدید شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج شاعری تو بس شاعری ہوتی ہے، اس میں جدید اور قدیم کی تو کوئی بھی قید نہیں ہے۔ ہم اسے مختلف شعراء کے عہدوں میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن جدید اور قدیم کا تصور غلط ہے۔ بہر حال آج کل بھی چند شعراء اچھا کہہ رہے ہیں۔

س آپ کی شاعری پر موسیقی کے بڑے اثرات ہیں؟

ج اردو شاعری کی تو بنیاد ہی موسیقی ہے بالخصوص غزل میں موسیقیت نہ ہو تو وہ بالکل بے مزہ لگتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ایک اچھا سازندہ ساز کی مدد سے بے وزن غزل کو وزن میں لا سکتا ہے۔

س آپ کے بقول پیپلز پارٹی کی سیاست بہتر ہے، بھٹو صاحب کے بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟ شہرت بخاری: (بڑے دکھ بھرے جذباتی انداز میں) صاحبو: بھٹو جیسا لیڈر اس دھرتی نے پیدا ہی نہیں کیا۔ وہ تو اس دھرتی کا لعل تھا۔ بھٹو کی شہادت پر میں نے ایک سلام لکھا تھا:

اے سپہر، وفا کے مہر مبیں
اے وقار زمین و اہل زمیں
ذوالفقار علی کی لاج ہے تو
اہل ایماں کے سر کا تاج ہے تو
کون سی ماں نے تجھ سا پوت جنا
موت بھی جس کو کر سکے نہ فنا
تجھ کو ڈھونڈیں مگر کہاں پائیں
بند ہیں راستے جدھر جائیں
یوں دھڑکنے سے رہ گیا ہے دل
سانس لینا بھی ہو گیا مشکل
اے غریبوں کے پاسبان سلام
بے زبانوں کے ترجمان سلام
اے میرے عہد کے حسین سلام
اے شہیدوں کے نور عین سلام

س بھٹو کو پھانسی دینے پر جن لوگوں نے خودسوزی کر لی ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج ایک واقعہ آپ کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فیض احمد فیض، ن م راشد، پطرس بخاری، صوفی تبسم وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے فارسی کا ایک شعر سنایا:

سینہ صد چاک گزارند، دل صد پارہ
ایں بے خبراں چاک دریدہ نہ گزارند

شعر سنتے ہی فضا میں خاموشی چھا گئی، تھوڑی دیر میں فیض صاحب رونے لگے پھر پطرس بخاری نے رونا شروع کر دیا۔ صوفی تبسم، ن م راشد سبھی لوگوں کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ (بات کرتے ہوئے شہرت بخاری کی آنکھوں میں بھی پانی تھا توقف کے بعد) بات حقیقت ہے، کسی

کے دل کا حال معلوم کئے بغیر ہم اسے کیسے غلط کہہ سکتے ہیں۔

س کیا مشقِ سخن اب بھی جاری ہے؟

ج (مسکراتے ہوئے) شاعری تو سانسوں کے ساتھ ساتھ جاری ہے لیکن یہ شاعری بھی چشمے کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی تو اتنے زوروں سے چلتا ہے کہ سیلاب ہی آ جاتا ہے اور کبھی یہ بالکل ہی سوکھ جاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب ایک دن میں سات سات آٹھ آٹھ غزلیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک کا مطلع کہا تو دوسری کا مقطع ایک وقت میں کئی کئی غزلیں، اب وہ بات تو نہیں رہی لیکن مشقِ سخن بہرحال جاری ہے۔

س موسم کون سا پسند ہے؟

ج سردیاں بہت اچھی لگتی ہیں لیکن صحراؤں میں میرے لئے ایک عجیب کشش ہے۔ شاید میرا خمیر صحراؤں سے اٹھا ہے اس لئے (سید ہونے کی وجہ سے) میں صحراؤں سے بہت مانوس ہوں۔ ریت کے ٹیلے، کھجوریں، اونٹ، گرمی کا موسم میرے جیسے کے لئے تو خوشگوار نہیں لیکن صحرا کی گرمی میری روح کے موافق ہے۔

س آپ کا تعلق کسی ادبی گروہ سے ہے؟

ج مجھے تو آج تک ادبی گروہ بندیوں کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ تعلق تو بہت بعد کی چیز ہے۔ میرا اگر کسی گروہ سے تعلق ہے تو وہ پیار کرنے والوں، وفا کرنے والوں اور ساتھ نبھانے والوں کا گروہ ہے۔

س لندن میں تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟

ج میرا بیٹا ڈاکٹر علی جو بخاری، بیوی، بہو اور پوتے سبھی میرے ساتھ رہتے ہیں ویسے بھی انگریزوں میں انسانی قدریں موجود ہیں۔ پچھلے دنوں ایک بس میں سفر کر رہا تھا کہ ڈرائیور نے یک دم بریک لگا دی۔ میں اپنے دھیان میں گم تھا اس وجہ سے سامنے سیٹ سے ٹکرا گیا لیکن بالکل محفوظ رہا۔ مسافروں نے بس رکوا دی اور ایک ایک کر کے بس کے تمام مسافر میرے پاس آئے اور پوچھا ”کیا آپ ٹھیک ہیں؟ بالکل ٹھیک ہیں؟“ کئی ایک نے تو پھول تک تھما دیئے۔ ایسے ماحول میں بھلا کیا تنہائی محسوس ہوگی۔

OOO

شہزاد احمد

س: کیا ہمارے علمی، ادبی ثقافتی ادارے آپ کے خیال میں کوئی تعمیری کام کر رہے ہیں؟

ج: یہ سوال اگر سرکاری اداروں سے متعلق ہے تو اس کا جواب اور ہوگا اور اگر سوال ایسے اداروں سے ہے جو غیر سرکاری ہیں تو ممکن ہے سوال کی نوعیت بالکل بدل جائے۔ جہاں تک سرکاری اداروں کا تعلق ہے، اس میں کارکردگی کا معیار ہمیشہ کمزور رہا ہے کیونکہ سرکاری طور پر ان اداروں کا سربراہ ہونے کے لئے صرف سیاسی ضرورتوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو ان اداروں کا سربراہ بنایا جاتا ہے جو ان اداروں کی کارکردگی میں کچھ اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ان اداروں کے مقاصد کے بارے میں سرے سے کچھ جانتے ہیں۔ کچھ ادارے ایسے ہیں جن کا وجود ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثال کے طور پر مقتدرہ قومی زبان اس لئے بنایا گیا تھا کہ اردو کو اس کی وساطت سے دفتری زبان بنایا جائے گا۔ 1986ء میں اردو کو مکمل طور پر دفتری زبان کے طور پر نافذ ہونا تھا۔ 86ء گزر گیا پھر 89ء گزر گیا۔ اب تک 13 برس گزر چکے ہیں۔ نہ قومی اسمبلی میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ یوں لگتا ہے یہ حکومت اور اس سے جو پچھلی حکومتیں تھیں، اردو کو دفتری زبان بنانا نہیں چاہتیں۔ میں اس بات پر اصرار نہیں کرتا کہ اردو کو ضرور دفتری زبان ہونا چاہئے۔ لیکن اس سلسلے میں دوٹوک فیصلہ ضرور ہو جانا چاہئے کہ اردو دفتری زبان ہوگی یا نہیں۔ حکومت نہ اردو کو دفتری زبان بنانے کا فیصلہ کرتی ہے اور نہ وہ مقتدرہ قومی زبان کے ادارے کو ختم کرتی ہے۔ حکومت کروڑوں روپے فضول میں ایسے ادارے پر خرچ کر رہی ہے جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ ایک اردو سائنس بورڈ کا ادارہ ہے جس کا رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو اس ادارے کا سربراہ بنایا جاتا رہے جو سائنس کی مبادیات بھی نہیں جانتے۔ میں نام تو نہیں لیتا لیکن ایسے لوگوں کو اس ادارے کا سربراہ ہونا چاہئے جو سائنسی علوم سے کم از کم ہمدردی رکھتے ہوں اور سائنسی مسائل کو سمجھتے ہوں۔ جہاں تک سرکاری اداروں میں ادب دوستی کا سوال ہے، اس سلسلے کا سارے کا سارا روپیہ تقریباً ضائع ہو رہا ہے۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جہاں روپے کا صحیح مصرف نکل آتا

ہے۔ہاں البتہ نجی طور پر ادارے اپنے طور پر کچھ کام کر رہے ہیں۔

س خالد احمد نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اس دنیا میں خوبصورت چہرہ رکھنے والا انسان زندگی میں کسی اضطراب کا شکار نہیں ہوتا مگر کم شکل لوگ اپنی شخصیت میں کوئی ایسا کرشمہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جوان کو خوبصورت لوگوں کے سامنے لا کھڑا کرے۔اس سلسلے میں انسان مختلف ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے، شعر کہتا ہے، افسانے لکھتا ہے، کالم نگاری کرتا ہے وغیرہ وغیرہ، آپ اس سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

ج بات یہ ہے کہ اگر آدمی خوش شکل ہوتو پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں بہت سی مزاحمت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے، وہ فوری طور پر پیدا نہیں ہوتی۔ایک سرٹیفکیٹ ہوتا ہے فوری طور پر قبول کئے جانے کا۔ پھر اس کے ساتھ اگر آواز بہتر ہو، لباس اچھا ہو، تو یہ کوالی فکیشن ہے اور اس کے ساتھ اگر اسے کچھ آتا جاتا بھی ہوتو یہ ایک ایکسٹرا کوالی فکیشن ہے۔اس لحاظ سے میں خالد احمد کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔

س سچ کے نام پر ادب میں بدتمیزی کی جو لہر چلی ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اور اس کا ادبی مستقبل پر کیا اثر پڑے گا؟

ج ہر آدمی کے نزدیک سچ کی اپنی تشریح ہے۔بعض لوگ صرف اسی کو سچ سمجھتے ہیں جو ان کے اپنے لئے قابل قبول ہو لیکن ایک ایسے ملک میں جو جمہوریت کے عمل سے حاصل کیا گیا ہو وہاں سچ کے معنی اس قدر محدود نہیں ہو سکتے۔ سچ ایسا ہونا چاہئے جو معاشرے کے لئے زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہو۔محض اپنے سچ کو لے کر نہ آپ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں نہ معاشرے کے مسائل گرفت میں لے سکتے ہیں اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ سب سے بڑا جھوٹ ہوتا ہے۔

س ادبی گروہ بندیاں ادب کی ترقی کے لئے سودمند ہیں یا نقصان دہ؟

ج ادبی گروہ بندیاں ادب کی ترقی کے لئے ضروری ہیں اور قدرتی بن جاتی ہیں۔اگر آپ ایک خاص طرح کا مزاج رکھتے ہیں مثلاً آپ غزل کہنے والے ہیں تو آپ کے دوست بھی غزل کہنے والے ہوں گے اور اگر آپ افسانہ لکھتے ہیں تو آپ کا اٹھنا بیٹھنا افسانہ لکھنے والے لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ یہ ایک قدرتی طریقہ ہے مل بیٹھ کے کام کرنے کا۔مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں آپ اپنے حقوق کا تقاضا تو کرتے ہیں لیکن اپنے فرائض کی طرف توجہ نہیں دیتے، صرف حقوق کے سلسلے میں نعرے بازی کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ بیچ میں رہ جاتا ہے کہ آپ کے فرائض کیا ہیں۔ یہ بہت

ضروری بات ہے کہ جب گروہ بنایا جائے تو اس گروہ کو کسی سیاسی یا سماجی مسئلے کے لئے مثبت طور پر تو استعمال کیا جائے لیکن منفی استعمال نہ ہو۔

س بقول اشفاق احمد کالم نگاری ادبی صنف نہیں ہے، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے، خاص طور پر مشتاق یوسفی، ابن انشاء، عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی کے کالموں کے حوالے سے؟

ج دیکھیں عمومی طور پر اشفاق احمد کی اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا کیونکہ عام طور پر ہمارے ہاں جو کالم لکھے جاتے ہیں ان کے موضوعات روزمرہ کے گزر جانے والے موضوعات ہوتے ہیں اور کالم نویسی میں زیادہ احتیاط بھی نہیں کی جاتی نہ کالم نگار کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ادبی لحاظ سے کالم کی نوک پلک سنوار سکے۔ مگر بعض اوقات کالم بھی ایسا ہوسکتا ہے جو ادب کی سطح پر آسکتا ہے۔ اب یہ ہر کالم پر الگ منحصر ہے کہ اس کو کس حد تک ادب کہا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اصولی طور پر اشفاق احمد کی بات درست ہے لیکن یہ بات ہمیشہ کے لئے درست نہیں ہے۔

س کسی ایک تخلیق کے بارے میں ایک ہی سطح کے دو ادیبوں کی متضاد رائے کو آپ کیا نام دیں گے؟

ج یہ ہوسکتا ہے دونوں کے پاس جواز موجود ہو کیونکہ ادب ہمیشہ مکمل سچائی نہیں ہوتا اور یہ بالکل سچائی ہے۔ دو آدمی اگر پوری ایمانداری سے بات کر رہے ہیں تو یہ ہوسکتا ہے کہ متضاد ہونے کے باوجود اپنی اپنی جگہ دونوں سچے ہوں۔

س فلیپ اور دیباچہ نگاری کا فائدہ یا نقصان کیا ہے، آپ اسے تنقید یا ستائش کے کس خانے میں رکھیں گے؟

ج فلیپ اور دیباچہ نگاری کی مثال سہرابندی کی ہے، جب دولہا کو سجایا جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ میک اپ تو کیا جاتا ہے۔ یہی حال دیباچہ اور فلیپ نگاری کا ہے۔ یہ باقاعدہ تنقید کے زمرے میں نہیں آتے، اس میں فن پارے کے صرف مثبت پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد صرف لکھاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

س ٹی وی چینلز کی بھرمار اور انسان کی بے انتہا مصروفیت کے دور میں ادب اور ادیب کا مستقبل کیا ہے؟

ج اصل میں ہم ایک ایسے دور میں سے گزر چکے ہیں جس میں ادب کو سب کا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں تانگے والا بھی شعر کہہ لیا کرتا تھا۔ جو بھٹیارن تھی وہ بھی شعر کہتی تھی۔ اب نہ تانگے

والے کو فرصت ہے نہ بھٹیارن کے پاس وقت ہے۔ اب چونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اس لئے بہت تھوڑے لوگ رہ گئے ہیں جو ادب کو پڑھتے ہیں اور ادب کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں۔ ادب کی اہمیت انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہے لیکن اس اہمیت میں عمر یا وقت کے لحاظ سے کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ادب صرف نوجوانوں کا مسئلہ بنا ہوا ہے لیکن آگے چل کے ادب زیادہ عمر کے لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنے گا۔ اس وقت جو شاعری پسند کی جا رہی ہے وہ نوجوانوں کے موضوعات ہیں لیکن بعد میں جو ادب لکھا جائے گا وہ ایسے لوگوں کے متعلق ہوگا جن کے پاس وقت بھی ہے اور جن کی عمریں رسیدہ ہیں۔ اس وقت ادب میں جذباتیت کم ہو جائے گی مگر گہرائی زیادہ ہوگی لیکن اس کے پڑھنے والے کم ہوں گے۔

س کیا شاعر اور ادیب کے لئے کسی نظریے کا حامل ہونا ضروری ہے؟

ج بالکل ہونا چاہئے مگر یہ کہ دوسروں پر اپنے نظریے کو تھوپنا نہیں چاہئے۔ یہی غلطی ترقی پسندوں نے کی تھی اور انہوں نے اس کا براحشر بھی دیکھا۔ ادب اپنے طور پر ایک مقصد ہے۔ اس کو کسی اور مقصد کے تابع نہیں ہونا چاہئے۔ جو آپ محسوس کرتے ہیں بس اسی کو بیان کریں اور اس بات کو بھول جائیں کہ پہلے سے متعین مقاصد پر لکھیں۔ ادب سے مراد یہ ہے کہ آپ جس طرح جو محسوس کرتے ہیں۔ اس کو بغیر کسی خیانت کے ویسا ہی بیان کریں۔

س آج کی غزل کس مقام پر ہے؟

ج آج کی غزل بڑے اچھے مقام پر ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کلاسیکی غزل کا انتخاب کیا جائے تو ممکن ہے جدید شاعروں کا انتخاب کلاسیکی شعراء کے انتخاب کے برابر ٹھہرے۔ اس دور میں بڑی اچھی غزل ہو رہی ہے اور اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو زیادہ معروف نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں غزل نے ترقی کی ہے۔ اس کے موضوعات میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ اس میں افقی اور عمودی دونوں طرح ہی ترقی ہوئی ہے۔

س موجودہ دور میں اردو کے کون کون سے شاعر پسند ہیں؟

ج نام لینے میں گڑبڑ ہوگی اس لئے میں کسی کا نام نہیں لوں گا کیونکہ بعض اوقات آپ بہت اہم نام بھول جاتے ہیں جو ساری عمر کے لئے طعنہ بن جاتے ہیں۔

س پنجابی لکھنا کیوں چھوڑا؟

ج یہ میرے لئے واقعی دکھ کی بات ہے۔ مجھے پنجابی لکھتے رہنا چاہئے تھا مگر مشکل میرے لئے

یہ ہے کہ پڑھتا میں انگریزی ہوں، لکھتا اردو ہوں اور بولتا پنجابی ہوں۔ اصل میں ایک عجیب سا سوشل رویہ ہمارے ہاں چل نکلا ہے کہ جب ماں کے پاس بیٹھیں گے تو پنجابی بولیں گے۔ جب سکول میں جائیں گے تو اردو بولیں گے اور جب ذرا سا علمی مسئلہ ہوگا تو انگریزی میں بولیں گے۔

س تو کیا پنجابی کے بارے میں ہمارے ہاں احساس کمتری ہے؟

ج نہیں، میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اصل میں پنجابی اور اردو کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے۔ صرف چند ایک الفاظ بدل دینے سے اردو بن جاتی ہے اور اردو کا چونکہ ابلاغ پنجابی کی نسبت زیادہ ہے اس لئے اردو کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ہاں اگر اردو اور پنجابی بالکل متضاد زبانیں ہوتیں تو صوت حال یقیناً مختلف ہوتی۔

....

پسِ تحریر:

شہزاد احمد دنیا سے چلے گئے ہیں۔ شعر و ادب کا ایک باب تکمیل کو پہنچا۔ ''کل نفس ذائقۃ الموت'' فرمان ہے اس پاک پروردگار کا جس کے قبضہ قدرت میں سب کی جان ہے۔ یقیناً ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والا تو خدائے ذوالجلال کا چہرہ ہی ہے۔ دل کو مگر یقین نہیں آتا کہ وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ یقین کرنا یوں بھی دشوار پاتا ہوں کہ پچھلے ہفتے ان سے ٹیلیفون پر گپ شپ ہو رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور قہقہے بکھیرتا کٹیلا لہجہ۔ دراصل کالم لکھتے ہوئے میں ایک لفظ پر اٹک گیا تھا۔ کپڑے کی باریک کترن کو ہماری پنجابی زبان میں ''لیر'' کہتے ہیں۔ اردو زبان میں اسے کیا لکھا جائے؟ بہت سوچا اور کئی کتابیں ٹٹولیں مگر جواب ندارد۔ کسی سے پوچھ لیا جائے؟ رہنمائی لینے کا خیال آتے ہی شہزاد احمد ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب کا نام ذہن میں ابھرا۔ فون کر کے میں نے انہیں اپنی الجھن بتائی۔ بڑے پیار سے انہوں نے سمجھایا کہ اردو میں بھی اسے ''لیر'' ہی لکھ دیں۔

بابا جی اشفاق احمد کہ جن کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف مجھے حاصل رہا ان کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اردو زبان کا ہاضمہ بہت اچھا ہے۔ نئے الفاظ سمونے کی اس زبان کی صلاحیت بے مثال ہے۔ ایسا عالم شخص کہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں ایک، مگر علم پر غرور و تکبر کا سایہ تک ان کو چھو کر نہ گزرا تھا۔ تصنع و بناوٹ نام کی کسی چیز سے تو ان کی شخصیت واقف ہی نہ تھی۔ کتاب سے بے پناہ محبت کرنے والے آدمی تھے۔ بہت سی کتابیں

انہوں نے مجھے تحفے میں دیں۔ کتاب کی فرمائش وہ مجھ سے ہر ملاقات میں کیا کرتے تھے۔ اس بات کا افسوس مجھے تمام عمر رہے گا کہ انہوں نے مجھے جاپان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کی گئی کچھ کتابیں لانے کی خواہش کا اظہار کیا جس میں پورا نہ کر سکا اور کتاب کے علاوہ انہوں نے کبھی کوئی فرمائش کی بھی نہیں تھی۔ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔

مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر تعینات ہوئے تو کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ کئی نایاب کتب کی تازہ اشاعت کا اہتمام کیا۔ بہت سی اہم کتابیں نستعلیق خط میں نہیں تھیں۔ ان کو دور حاضر کے مقبول خط نوری نستعلیق میں شائع کروایا۔ ہمارے ملک میں عموماً سرکاری عہدیداروں کی عزت وتکریم ان کی کرسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ان عہدوں اور کرسیوں کو عزت بخشتے ہیں۔ شہزاد احمد بھی ایسے ہی نابغہ روزگار شخص تھے۔ انہوں نے مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کر کے اس عہدے کو عزت بخشی۔ انہوں نے اپنے فرائض کو نہ صرف بخوبی سرانجام دیا بلکہ آنے والے آئندہ افسران کے لیے بھی ایک بلند معیار مقرر کر دیا ہے۔ وہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے۔ اپنی ذات میں انجمن ہونے کا مطلب اگر کسی کو سمجھ نہ آ رہا ہو تو صرف شہزاد احمد کی زندگی پر ایک نگاہ ڈال لے۔ تاریخ میں زندہ رہنے کے لیے وہ کسی منصب کے محتاج قطعاً نہیں تھے۔

OOO

شہناز مزمل

ڈاکٹر شہناز مزمل کے تعارف میں اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انہیں مادرِ دبستان لاہور کہا جاتا ہے۔ تمام زندگی شعروادب کی خدمت میں گزاری اور گزشتہ کئی دہائیوں سے ادب سرائے کے نام سے ایک ادبی تنظیم چلا رہی ہیں جو کہ پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کے درمیان باہمی ملاپ اور ملاقات کا سبب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کی ترویج کا بھی انتہائی اہم ادارہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ارژنگ کے قارئین کے لئے گفتگو کا موقع انہوں نے دیا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے جا نہ ہو گا کہ یہ گفتگو ان سے عمرے کے سفر پر روانہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے کی گئی۔

س جائے پیدائش انسان کی شخصیت کے بارے میں بہت سارے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئیں؟

ج میں فیصل آباد میں پیدا ہوئی تھی۔ اپریل کی 10 تاریخ تھی۔

س آپ کا شمار ان اہل حرف میں ہوتا ہے جو روایتی تعلیم میں بھی نمایاں کامیابیاں سمیٹنے میں کامیاب رہے۔ اپنی تعلیمی زندگی پر ذرا روشنی ڈالئے؟

ج میں نے لائبریری سائنس میں ایم اے کیا تھا، پھر اس کے بعد ہالینڈ سے ڈی ایچ ایم ایس (DHMS) کیا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ درسی تعلیم فقط آپ کی علمی سمت کا تعین کرنے میں مدد دیتی ہے مگر اصل تعلیم آپ خود ہی مطالعے سے حاصل کرتے ہیں۔

س آپ کے اب تک بیس سے زائد شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں، ہمارے قارئین کی دلچسپی کیلئے آپ کے نام بتانا پسند فرمائیں گی؟

ج میرے اب تک اکیس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں میرے نزدیک قابل فخر کام قرآن کریم کا منظوم ترجمہ ہے۔ دیگر شعری کتب میں ابتدائے عشق، عشق تماشا، عشق مسافت، عشق مسلسل عشق دا دیوا، عشق دا بھانبھڑ، نورِ کل، انتہائے عشق، عشق کل، حادۂ عرفاں، بعد تیرے، قرضِ وفا، میرے خواب ادھورے ہیں، موم کے سائبان، جراَتِ اظہار، جذب وحرف، پیامِ نو،

شہناز مزمل کے منتخب اشعار، کھلتی کلیاں، مہکتے پھول، Ten poets of today۔

س آپ نے نثر کے میدان میں بھی بہت کام کیا ہے، اپنی نثری کتب کے بارے میں بتائیں گی؟

ج میری نثری کتب کی بات کریں تو علامہ اقبال کے حوالے سے میں نے کافی کام کیا ہے جو ''کتابیاتِ اقبال'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ میرا سفرنامہ ''دوستی کا سفر'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ میری کتاب عکس خیال کافی اہم ہے اور چونکہ آپ جانتے ہیں کہ میرا شعبہ لائبریریوں کے متعلق رہا ہے، اس حوالے سے ''لائبریریوں کا شہر لاہور'' اور ''فروغ مطالعہ کے بنیادی کردار'' اہم کتب ہیں۔ بچوں کے لئے میں نے ''نماز'' کے نام سے کتاب تحریر کی ہے۔

س میں نے سنا ہے آپ براڈ کاسٹنگ کے شعبے سے بھی منسلک رہی ہیں؟

ج اس حوالے سے میں صرف اتنا بتا دیتی ہوں کہ ریڈیو پاکستان کے ملتان سنٹر سے پہلی نسوانی آواز میری نشر ہوئی تھی۔

س آپ نے پوری زندگی بطور ورکنگ وومن گزاری ہے اور اس دران سخت محنت کی ہے، میں تو کہتا ہوں کہ ہم اہل سخن اور شعراء کرام کی شہرت پر جو کاہلی اور سستی کا مبینہ داغ ہے، آپ نے وہ داغ بھی دھو دیا ہے، اپنی عملی زندگی کے بارے میں ذرا بتائیے؟

ج میں نے 1984ء میں اپنی عملی زندگی کا آغاز کوپر روڈ کالج لاہور سے کیا اور دو سال وہاں نوکری کرنے کے بعد ماڈل ٹاؤن لائبریری کی چیف لائبریرین تعینات ہوگئی۔ تقریباً 12 سال تک میں نے گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری میں یہ خدمات سرانجام دیں۔ پھر 1999ء میں بطور ریسرچ ایسوسی ایٹ (CRDC) میں دو سال لاہور سیکرٹیریٹ میں شعبہ لائبریری کی بطور ڈائریکٹر کام کیا اور 2005ء سے اگلے چار سال قائداعظم لائبریری میں نوکری کرتی رہی ہوں۔

س فروغ ادب کے لئے خدمات سرانجام دینے پر آپ کو بہت سارے ایوارڈز، اسناد اور گولڈ میڈل بھی مل چکے ہیں، اس حوالے سے کچھ تفصیل بتائیے گا؟

ج میرے نزدیک جو سب سے اہم ایوارڈ اور قابل فخر اعزاز جو رب کائنات نے عطا فرمایا ہے، وہ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ و مفہوم لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور الحمدللہ اس وقت میں پوری دنیا میں واحد خاتون ہوں جسے رب نے نہ صرف اس کام کے لئے چنا بلکہ 5 سال میں ہی یہ کام مکمل کروایا جو کتابی شکل میں موجود ہے۔ بہت سی یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے اس پر ریویو کر رہے ہیں۔

س آپ کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بہت سارا تحقیقی کام ہو چکا ہے، اس کی تفصیل بتانا پسند فرمائیں گی؟

ج میرے فن اور شخصیت کے حوالے سے محترمہ نغمانہ فاروق کی کتاب ''عکس خیال'' اہم ہے۔ علاوہ ازیں میاں وقار الاسلام نے ''مثل کلیات'' کے نام سے مجھ پر تحقیق سپر دقلم کی ہے۔ صائمہ جبیں مہک نے گزشتہ برس ''تلاشِ حق'' کے عنوان سے مجھ پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور پچھلے سال ہی دعا علی کی کتاب ''رمزِ دعا'' اور ''مثل دعا'' بھی شائع ہوئی ہیں۔

س ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو عمرے کی ادائیگی کے لئے روانہ ہونا ہے اس لئے ہمیں آخر میں بس اپنی آئندہ آنے والی کتب کے بارے میں بتا دیجئے؟

ج میری آنے والی کتب میں ایک تو ''کلیات شہناز مزمل'' کا غزل والیم ہے اور دوسری کتاب ''کلیات شہناز مزمل''، نظم ہے۔ اس کے علاوہ کلیات عشق اور سعودی عرب حجاز مقدس کے حوالے سے سفر نامہ ''سفر عشق'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ کالموں کا مجموعہ ''اجلا کون، میلا کون'' کے نام سے جلد بازار میں آنے والا ہے۔ اس کے علاوہ میری کہانیوں کا مجموعہ بھی اشاعت کے آخری مراحل میں ہے جس کا عنوان ''بریف کیس'' ہے۔

OOO

صوفیہ بیدار

برصغیر پاک وہند کی نسائی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کی صاحبزادی زیب النساءمخفی کے شعری مجموعے اور نور جہان کی شاعری سے لے کر آج تک ایک طویل قطار ہے چراغوں کی جس نے ہمارے دبستان شاعری کو روشن کر رکھا ہے۔روشنیوں کے اسی سلسلے کی ایک شمع صوفیہ بیدار ہیں۔مقبول شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت افسانے لکھتی ہیں۔ان کے اخباری کالم بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔آج کل آرٹ کونسل فیصل آباد کی ڈائیریکٹر بھی ہیں۔فنون لطیفہ سے شدید محبت رکھتی ہیں۔نئے سال کے موقع پر قارئین ارژنگ کے لئے ان کے ساتھ مکالمہ سالِ نو کا تحفہ ہے۔

س زندگی کے آغاز سے بات کی ابتداء کرتے ہیں،بچپن اور ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ج سیالکوٹ کی میری پیدائش ہے اور ہمارا سکول تھا لیڈی اینڈرسن گورنمنٹ گرلز ہائی سکول،یہ مس نیوء نے بنایا تھا جو آسٹریلیا سے آئی ہوئی انگریز خاتون تھی۔اور میری والدہ کو پڑھاتی تھیں۔ہمارے زمانے میں تو خیر وہ نہیں تھیں۔تو سکول سے واپسی پر ہم علامہ اقبال کے گھر پہ کھیلتے ہوئے آتے تھے۔اور شارٹ کٹ کے لئے مولوی میر حسن شمس العلماء کی ڈیوڑی میں سے آتے تھے۔تو ان دونوں شخصیات کا لمس ایسا تھا کہ وہاں پہ کھیلتے ،ان دیواروں کو چھوتے ،ان جگہوں پر بیٹھ کے جہاں اقبال بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔میں سمجھتی یوں کہ اس لمس کی برکت ہے کہ جو تھوڑا بہت لکھنے کا ہنر جا گا۔اور انگلیوں نے لکھنا سیکھا اور وہیں سے پڑھتے ہوئے جب میں ایف اے میں تھی تو لاہور پاکستان ٹیلی ویژن میں اناؤنسر سلیکٹ ہوگئی۔اس کے لئے کبھی مجھے لاہور آنا پڑتا تھا اپنی خالہ کے پاس اور ادھر ہی رہنا پڑتا تھا۔1982 میں میرے والد لاہور آ چکے تھے۔اور جنگ اخبار کو بطور جی ایم شروع کیا تھا یہاں سے تو پھر سارے ہم ادھر منتقل ہو گئے۔پڑھائی بھی جاری رہی اور ٹی وی پر نیوز اور اناؤنسمنٹ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔اسی طرح

دوران تعلیم شادی ہوگئی۔اور پھر ایک وقت آیا کہ شادی ، بچے ، پڑھائی ،شاعری ،نظمیں اور اس کے ساتھ رنج آلود طبیعت ،اور زندگی کی ایسی بے سمت دوڑ شروع ہوگئی کہ جس میں دل بھی تھک گیا اور پاؤں بھی تھک گئے۔

س شعروسخن کی طرف کیسے مائل ہوئیں؟

ج والدہ لکھتی تھیں اور بہت معروف شاعرہ تھیں نصرت ادیب ہاشمی۔انہوں نے انگریزی لٹریچر میں ماسٹرز کیا تھا۔انگریزی ادب کے حوالے سے زیادہ مجھ سے بات کیا کرتی تھیں۔امی اردو شاعری بہت عمدہ کرتی تھیں۔سید عبدالحمید عدم رشتے میں ان کے نانا تھے اور امی کے استاد بھی تھے۔امی نے بہت عمدہ شاعری کی اور ابو نے ان کو زیادہ مشاعروں میں جانے نہیں دیا اور گھر سے زیادہ نکلنے نہیں دیا۔یہ وہ تکلیف تھی جو میرے اندر موجود تھی ، میں سمجھتی تھی کی مجھے ماں سے دو قدم آگے جانا چاہئے۔اتنی مزاحمت وہ نہیں کرسکیں جتنی مجھے کرنی پڑی۔تھوڑا لیٹ سہی مگر میں شاعری سنانے میں کامیاب ہوئی ۔ مجھے بھی اس کی اجازت نہیں تھی۔اور شاعری اتنی خوبصورت چیز ہے کہ اس کے لئے اجازت مانگنی بھی نہیں چاہئے ۔لیکن ایسا تھا کہ مجھے شعوری طور پر پتا نہیں چلا ،لیکن سکول کی نظمیں لکھتے ہوئے ، پیپر دیتے ہوئے جہاں میں بھول جاتی تھی تو خود سے مصرعے مکمل کرلیتی تھی تو امی سے پوچھتی تھی تو امی کہتی تھی کہ تم نے بالکل وزن میں لکھا ہے، بالکل صحیح لکھا ہے۔اور میری چھوٹی چھوٹی نظموں کو سراہتی تھیں ،ہمیں کیٹس اور کولرج کے بارے میں بتایا کرتی تھیں۔بہت سارے آئیڈیاز ہمارے دماغوں میں بھرے ہوئے تھے۔پانچویں ،چھٹی ،ساتویں اور آٹھویں میں تو والد مجھ سے شعر سنا کرتے تھے۔اردو اور فارسی کا تلفظ وہ چیک کرتے تھے۔یہ خون میں تھا، ماحول میں تھا سب کچھ از خود یہ سب ہوتا چلا گیا۔

س لگتا ہے کہ گھر والوں نے لکھنے کی حوصلہ افزائی کی ہوگی؟ یا صورتحال مختلف تھی؟

ج نہیں! جن کے گھر والے حوصلہ افزائی کرتے ہیں انہیں کم ہی لکھنا آتا ہے۔اسی لئے وہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ اس نے کون سا تیر مار لینا ہے۔جن کو لکھنا آتا ہے ان کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان کے گھر والے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ لکھے گی اور اچھا لکھے گی۔اس لئے وہ اس کے پاؤں کاٹتے ہیں اور کبھی ہاتھ کاٹتے ہیں۔تو جیسے کوئی دلہن ڈولی سے پاؤں نکالتی ہے تو اس کو اندر کردیا جاتا ہے اور ہاتھ نکالتی ہے تو ہاتھ اتار کر پھینک دیا جاتے ہیں۔یہ ایک ایسا چھوٹا کفن ہے جو پوری طرح ڈھانپتا نہیں ہے۔جس میں کبھی بازو نکل آتے ہیں ،کبھی بال اور کبھی چہرہ۔تو

تکلیف ہی تکلیف ہے اس صحرا میں۔کبھی کسی عمدہ شاعر کو موافقت نہیں مل سکتی،اسے مزاحمت کا سامنا ہی ہوتا ہے۔

س: آپ افسانہ بھی لکھتی ہیں،کون سے افسانہ نگار سے زیادہ متاثر ہیں؟

ج: افسانہ نگار بہت سارے پسند ہیں لیکن جنہوں نے دل پہ اثر کیا،ان میں بلونت سنگھ،راجیند رسنگھ بیدی بہت ہی پسند ہے مجھے۔کرشن چندر بھی بہت پسند ہیں۔کرشن چندر تو حقیقت کی پکچر میں چلے جاتے ہیں کہ سفا کی بھی پوری بیان ہو جاتی ہے۔فارسی کا منظر ایسا لکھ دیتے ہیں ۔راجندر سنگھ بیدی نے ایسی خاتون کو لکھ ڈالا کہ جو جس کا خاوند اس کی عزت کرنی شروع کر دیتا ہے،وہ گھبرا جاتی ہے۔یہ وہ لٹی ہوئی عورتیں ہیں جو تقسیم کے وقت لٹ گئیں۔تو ایسے شہرہ آفاق افسانے راجندر سنگھ بیدی جوڈا کخانے میں ملازم تھے۔اور وہ سارا وقت ٹکٹ لگایا کرتے تھے۔وہ زوردار مہر ہوتی ہے ایک لکڑی کی ۔وہ لگاتے لگاتے جانے کیسے ان دل کا دھڑکا،ایک ردھم کے ساتھ کہ انہوں نے ایسے افسانے لکھ ڈالے کہ جو باریکی میں اور جزیات میں پاگل کر ڈالنے والے تھے۔مجھے جس نے بالکل ہی دیوانہ بنا دیا وہ بلونت سنگھ ہے۔بلونت سنگھ تو جیسے کھینچ کے منظر کے اندر لے جاتا ہے اور آپ اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اس کے ساتھ چلتے ہیں۔وہ آپ کو گھماتا ہے پھراتا ہے اس کا اپنا ایک انداز ہے کہ وہ شیشے میں اپنا چہرہ دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ جمائی سی لیتا ہے،اسے یاد آتا ہے کہ میں نے یہ سین کہاں دیکھا تھا،ماضی میں اسے کسی کا چہرہ یاد آتا ہے جو اس طرح سے جمائی لیتا ہوتا تھا۔کمال ہیں،نفسیات دان ہیں یہ لوگ،جادوگر ہیں۔بہت پسند ہیں یہ لوگ مجھے۔

س: آپ شعر بھی کہتی ہیں اور نثر بھی لکھتی ہیں،شعر گوئی آسان ہے یا پھر نثر نگاری؟

ج: اگر کوئی ہنر نہ آتا ہو تو نہ کوئی شعر آسان ہے نہ نثر،اور اگر یہ ہنر انگلیوں پہ چڑھ جاتا ہے اور آمادگی پیدا ہو جاتی ہے،پھر دونوں چیزیں آسان ہو جاتی ہیں۔کیونکہ یہ نکاس ہے اور اس نے کہیں نہ کہیں سے تو بہنا ہوتا ہے۔تو قلم کی سیاہی میں ساری تکلیفیں بہہ نکلتی ہیں۔

س: کون سے لکھاری کا طرزِ تحریر زیادہ بھاتا ہے؟

ج: نثر نگاری میں جو شستہ اور عمدہ اردو لکھتے ہیں،ان میں مجھے انتظار حسین کی اردو پسند ہے۔پچھلے دنوں میں نے حسین مجروح کا قراۃ العین کے حوالے سے مضمون پڑھا،مجھے بڑا اچھا لگا۔قراۃ العین کی مجھے بہت گہری منطق میں ڈوبی ہوئی تحریر اچھی لگتی ہے۔میں ان دونوں کو پڑھتی

ہوں اس کے ساتھ ساتھ میں کوئی آسان کتاب بھی پڑھتی ہوں۔ وہ میں تب پڑھتی ہوں جب مجھے تنہائی نصیب ہوتی ہے۔ وہ تمام مذاہب گوتم، نیلبر، ان مندروں میں چلی جاتی ہوں، اس کے ساتھ جہاں پہ وہ بیٹھ کر زندگی کے فلسفے پہ بات کرتے ہیں۔ لفظیات کی بات کرتے ہیں۔ لفظ آواز بننے سے پہلے کیسے محفوظ تھے۔ وہ آوازیں پہلے محفوظ تھیں تو یہ نثر نگاری کا ایک فن ہے۔ اس کے لئے وہ خود کتنی تکلیف میں جاتے تھے۔ دہلی کی اردو لکھنی ہے، پڑھنی ہے تو زاہدہ حنا کی بھی مجھے تحریر اچھی لگتی ہے۔ بہت سی ایسی تحریریں ہیں، منٹو کا جو انداز ہے اس میں سادہ فقروں کے پیچھے پوری فلاسفی ہوتی ہے۔ اردو کا مزہ لینا ہے تو بہت سے نثر نگاروں میں اس کا مزہ آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ختم نہ ہوں اور طاہرہ اقبال کا الفاظ کا خزانہ ختم نہ ہو۔ طاہرہ اقبال کا الفاظ کا خزانہ اچھا لگتا ہے۔ لیکن مجھے لشکتے ہوئے، چمکتے ہوئے الفاظ بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ مجھے گنگناتے ہوئے الفاظ بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ بولتے ہوئے الفاظ بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ جن کے لفظوں کے پیچھے جو سر چل رہے ہوتے ہیں۔ وہ والے رائٹر مجھے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔

س مزاحمتی رنگ آپ کے افسانوں میں بہت نمایاں ہے، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج میرے افسانوں میں مزاحمتی انداز شاید اس لئے ہو کہ میں نے مزاحمت کو دیکھا بہت ہے۔ ایک قدم آگے چلنا چاہا تو بادِ مخالف مجھے دس قدم پیچھے دھکیلا۔ مجھے اور پیچھے سے گیئر لگا کے آنا پڑا ہے۔ میری ساری طاقت بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ میں اس رفتار سے چل نہیں پائی کہ تیری رفتار کو اک زینہ ضروری ہے، میرا مرنا ضروری ہے، تیرا جینا ضروری ہے۔

س آج کل سنا ہے افسانے میں کہانی ختم ہوگئی ہے، کیا یہ تجزیہ درست ہے؟

ج نہیں کہانی افسانے سے جدا نہیں ہوئی، افسانے سے کہانی ختم نہیں ہوئی۔ بات کا افسانہ بنا دینا کہتے ہیں کہ کہانی تو ختم نہیں ہوتی اس کے اندر، کہانی تو چل رہی ہوتی ہے، لیکن اس کی مختلف سطحیں ہیں۔ بہت سے لوگ سیدھی سی کہانی بیٹھ کے سنتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ کہانی کے پیچھے چھپی ہوئی کہانی سنتے ہیں۔ بس اتنا سا فرق ہے۔

س آپ نامور ادیب و شاعر ہونے کے علاوہ آرٹ کونسل فیصل آباد کی ڈائریکٹر بھی ہیں، اس بابت بھی کچھ بتائیں؟

ج آرٹ کونسل کے حوالے سے جواب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ضلعی سطح پر بھی دفاتر چلے جائیں، جیسے چار ضلعے ہیں، فیصل آباد، چنیوٹ، جھنگ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ، وہاں پر بھی دفاتر

ہوں۔اور رائٹر کو زیادہ سے زیادہ موقعہ ملے۔میں بھی یہاں بیٹھک بنوا رہی ہوں۔جہاں پر ہمہ وقت مشاعرے بپا رہیں گے اور ایک بہت بڑا ہال ہے جو رینٹ آؤٹ بھی ہوتا ہے۔اس میں ڈرامے بھی ہو رہے ہوتے ہیں، میوزک ہو رہا ہوتا ہے۔ایک میں دربار ہال بنایا۔خاص طور پر نثرنگاروں کے لئے بنایا۔اور ایسا شاید پہلی مرتبہ ہوا ہے۔نثرنگاروں کو نکال کے لا رہے ہیں۔عورتوں کا کلب بنایا میں نے ترنجن۔اور اس میں ایک گھریلو سطح کی جو خواتین ہیں۔وہ جو کچھ لکھتی ہیں وہ بھی اس میں پڑھتی ہیں آ کر تو سبھی کو حق ہے کہ درجہ بدرجہ اپنی کتھارسس کرے اور اپنے ماحو کو لکھتے ہوئے۔اس میں بڑا ادیب یا چھوٹا ادیب والی بات نہ ہو۔اب ایف ایل ایف بھی ہونے والا ہے۔فیسٹویل ہوتے ہیں ہمارے ہاں بہت زیادہ۔بلاناغہ مشاعرے ہوتے ہیں۔پروگرامز ہوتے ہیں۔آرٹ کونسل میں ایک ایک دن میں چار چار پروگرامز ہو رہے ہوتے ہیں۔کوشش تو بہت ہے کہ میں اس کو Facalitate کروں۔

س آرٹ کونسل میں آپ نے کہانی دربار کے نام سے ایک سلسلہ آپ نے شروع کیا جو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا، یہ خیال کیسے آیا؟

ج کہانی دربار شروع کرنے کا خصوصی سبب یہ تھا کہ شعراء نے اپنے لئے بہت کچھ کیا ہے اور شعراء کو میں داد دیتی ہوں کہ انہوں نے ہر طرح کے حالات میں خود کو زندہ رکھا اور مشاعرے کی روایت کو ختم نہیں ہونے دیا۔بعض مرتبہ انہیں کچھ بھی نہیں دیا۔وہ پھر بھی اسکے لئے آتے ہیں۔ٹائم نکالتے ہیں۔وہ وقت جب ڈاکٹرز ،انجینئرز شام کو بیٹھ کر پانچ پانچ ہزار فیس لے رہے ہوتے ہیں۔تو شعراء دور دراز اپنی گاڑی پر بیٹھ کر مفت پڑھنے جاتے ہیں تو نثر نگار بہت کم نکل رہے تھے، انہوں نے کتابیں لکھ کر لائبریریوں کے حوالے کر دی تھیں۔اور نثر سنانے کا رواج ختم ہی ہو گیا تھا۔اور غزل گو تو دو غزلیں پکڑیں اور بیس مشاعروں میں سنا دیں، افسانوں اور نثر نگاروں کو بالکل موقعہ نہیں مل رہا تھا۔اس کے لئے میں نے ایک دربار ہال تعمیر کروایا، اسکے اندر صرف نثر نگاری کی محفلیں ہوتی ہیں۔افسانے، کہانیاں پڑھی جاتی ہیں۔ایک جگہ ترجمہ پڑھا جاتا ہے، کہانی کا جو مغربی شارٹ کہانیاں ہیں۔اس کے علاوہ جو مشرق وسطیٰ اور جو ادب ہے اس میں ایک یا دو ترجمے ہوتے ہیں۔اردو کہانیاں پڑھی جاتی ہیں۔تو یہ ایک بڑا مقبول ہوتا چلا جا رہا ہے سلسلہ اور اب انشااللہ ہر مہینے ہوتا ہے۔اس مہینے ہم بچوں کا منعقد کر رہے ہیں کہانی دربار۔وہ چیز ہم واپس لا رہے ہیں کہ جب بچوں کو کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔

س کیا لکھنے والے کے لئے پڑھنا بھی ضروری ہے؟

ج لکھنے والے کے لئے پڑھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے خون کی ضرورت ہوتی ہے، جب میں نے ساتوں صوفی پیروں کا ترجمہ کیا تھا۔کرایٹو ٹرانسلیشن ۔بابا فرید سے خواجہ فرید تک تو میری والدہ کہتی تھی کہ پہلے سب کو پڑھ چھوڑو۔ پڑھ کے ان کو بھلا دو۔اور پھر کہیں ان کو سالوں بعد لکھنا۔ پڑھنا بہت ضروری ہے اور پڑھ کے بھول جانا بھی بہت ضروری ہے۔اور اسے کہیں ابزورو ہونے دینا چاہئے۔اور پھر کہیں جا کر لکھنا چاہیے۔

س ملازمت پیشہ اور لکھاری خاتون کیا اچھی ماں اور اچھی بیوی بھی ہوتی ہے؟

ج پہلے تو مجھے یہ ہی نئ پتہ کہ اچھی ماں کیا ہوتی ہے؟ اچھی بیوی کیا ہوتی ہے اور اچھی عورت کیا ہوتی ہے؟ اور بری عورت کیا ہوتی ہے؟ اور ماں بھی کبھی بری ہو سکتی ہے؟ اچھی اور بری عورت کا جو تصور ہے، وہ مختلف علاقوں میں مختلف ہے۔اور مختلف لوگوں کے معاشی گروپس کے اندر مختلف طرح سے لیا جاتا ہے۔تو پہلے اس کو ہی ڈیفائن کرنا بڑا مشکل ہے۔ یا اچھی ماں ہونے کا یا اچھی بیوی ہونے کا یا پھر اچھی عورت ہونے کا سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت کیا ہے؟ جو خواتین رائٹرز ہیں۔ان کو تو ویسے ہی بہت زیادہ اچھا نہیں کہا جاتا۔کیونکہ ان کا دماغ ذرا بہتر ہوتا ہے اور بہتری اکثریت کو پسند نہیں ہوتی۔تو بہترین دماغ والی عورتیں ہمیشہ اقلیت میں ہوتی ہیں اور اقلیت جو ہے وہ اپنی دلیل نہیں دے سکتی۔اس کے علاوہ بھی اچھا بننے کا کیا ایسا شوق ہے؟ اور ماں تو وہ ہمیشہ اچھی ہوتی ہے اور ہر حال میں اچھی ہوتی ہے۔ بہت بڑی جگہ پہ بیٹھی ہوئی ہے، معاف کرتی چلی جاتی ہے، ہاں یہ بات ہے کہ میں رشتوں میں جیسی بھی تھی، میں اپنے آپ کو بہت اچھا ثابت نہیں کر پائی۔اچھا ہونا الگ بات ہے اور اچھا ثابت کرنا دوسری بات ہے۔

س پاکستانی ادبی منظرنامے سے مطمئن ہیں؟ شعروادب کے حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج میرے مطمئن ہونے یا نہ ہونے سے ادب کا کارواں رکنے نہیں والا۔ یہ اس کی ایک سیٹ کوانٹیٹی ہے اور تقریباً طے شدہ تعداد میں ادیب شاعر پیدا ہوتے ہیں۔انجینئر مائنڈڈ لوگ پیدا ہوتے ہیں، ڈاکٹرز پیدا ہوتے ہیں، ترکھان پیدا ہوتے ہیں، مصور پیدا ہوتے ہیں۔تو یہ ایک کوانٹیٹی ہے جو جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔اور ادب اپنی رفتار میں چلتا چلا جائے گا۔میری شخصیت کو اتنی اتھارٹی نہیں ہے، مجھے تنقید نگاروں کے چہرے اور ان کے تاثرات بڑے عجیب

سے لگتے ہیں۔ وہ زبردستی بڑا تلخ سا چہرہ بنا کے بیٹھتے ہیں کہ ان کو دانشور سمجھا جائے۔ تو مجھے ایک معصوم چہرہ بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو دانشور اور سٹیٹمنٹ دینے والا انسان نہیں بنانا چاہتی۔ اس حوالے سے میں کوئی سٹیٹ منٹ نہیں دینا چاہتی۔ مجھے سٹیٹمنٹ دینا اچھا نہیں لگتا۔ میں ایسی جگہ پہ نہیں ہوں۔ مجھے رنگ کے اندر رہنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے ریفری بننا اچھا نہیں لگتا۔

س تخلیقیت کیا ہے؟

ج اس حوالے سے میں یہ سمجھتی ہوں کہ جو بھی تخلیق کار ہجر کی کیفیت کو اور نارسائی کی کیفیت کو جس حد تک قلم بند کر پاتا ہے۔ اور جتنا بھی اسے تحریر کر پاتا ہے۔ وہ اتنا ہی بڑا تخلیق کار ہے۔ سب سے مشکل کام اس نارسائی کے احساس کو جتنا اس کو محسوس کیا، اس میں سے اگر 60% یا 70% بھی صفحہ قرطاس پر لے آتا ہے تو یہ بڑی کامیابی کی بات ہے۔

س کسی بھی رائٹر کو لکھنے کی ترغیب اندرون سے ملتی ہے یا خارج سے؟

ج یہ نفسیات کا بھی ایک بہت بڑا سوال ہے، کہ ہم لکھتے ہیں، ایک بہت بڑے نفسیات دان کے لئے سوال ہے اگر ہم خارجی کیفیت ایسی بنا لیتے ہیں کہ بال بکھیر لیتے ہیں۔ سیاہ لباس پہن لیتے ہیں۔ تو کسی حد تک وہ منظر اندر اترنا شروع ہو جاتا ہے کہ جب آپ کے چاروں طرف آہیں ہوں، آنسو ہوں، بین ہوں تو آپ کے اندر اثر شروع ہو جاتا ہے۔ اور اگر اندر سے خوشی پھوٹ رہی ہے اور باہر سے پانی نہیں مل رہا۔ تو وہ بھی خوشی کا پودا مرجھانے لگتا ہے۔ تو مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ دونوں کیفیات خارجی اور اندرونی، یہ دونوں داخلی کیفیات ہیں۔ دونوں کی مل کر ایک تصویر بنتی ہے۔ اور دونوں معاون ہیں ایک دوسرے کے۔ تاہم اگر ان میں تقابل کی بات ہو تو داخلی کیفیات کا درجہ زیادہ بڑا ہے۔

س ذاتی واقعات تخلیقات پر کتنا اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج یہ سب تو جو زندگی میں گزر رہا ہوتا ہے یا آگے چل کر ہونا ہوتا ہے۔ یہ بعض اوقات پہلے تحریر میں آجاتا ہے۔ اور بعض اوقات بعد میں تحریر میں آتا ہے۔ جیسے میں نے ایک زمانے میں ایک شعر لکھا تھا کہ

سرخ آنچل میرے چہرے سے ہٹا دے کوئی
کب سے سوئی ہوں مجھے آ کے جگا دے کوئی

صدمہ دید سے پتھرا گئیں آنکھیں میری
مژدۂ ہجر سنا کے مجھے رلا دے کوئی

اس وقت تونہیں معلوم تھا کہ یہ کیوں لکھا۔لیکن کچھ زمانے کے بعد جب میری ماں کا خاموش چہرہ،ان کی میت پڑی ہوئی تھی تب میری ساتھ کی بہنوں نے ان کے ساتھ گلابی دوپٹہ رکھا اور کہا کہ یہ سہاگن جارہی ہیں دنیا سے۔تب مجھے وہ منظر اور اس شعر کا پس منظر یاد آیا کہ میں بھی اپنی ماں کی ایکس ٹینشن ہوں۔تو مجھے یہ پہلے سے لگا تھا کہ جیسے ان پر دوپٹہ دیا جائے گا۔اور سین لکھا گیا۔تو یہ سب تصویریں اندر سے باہر آتی رہتی ہیں اور باہر سے اندر جاتی ہیں اور ہم لکھتے ہیں۔اور پہلے ہم تحریر کر لیتے ہیں اور واقعات بعد میں ہوتے ہیں۔اور کبھی بعض اوقات واقعات پہلے ہوجاتے ہیں اور ہم لکھتے بعد میں ہیں۔

س ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا کے کردار کی آپ نے بات کی ہے تو ادب کے فروغ کے لئے تونہیں،البتہ بے ادبی کے استعمال کے لئے تو کہا جا سکتا ہے کہ کافی استعمال ہورہا ہے۔ادب کے فروغ کے لئے تو بہت سارے پرانے میڈیم موجود ہیں۔لیکن یہ جو ذریعہ ابلاغ ہے یہ اس طرح سے لگام کے اندر نہیں آیا۔ابھی بے لگام ہے۔آپ کی تصویر کسی بھی طرح دنیا کے سامنے لائی جا سکتی ہے۔اور بہت سے نامعلوم اشعار آپ کے ساتھ لگائے جا سکتے ہیں۔اور آپ کے اشعار کسی دوسرے کے ساتھ لگ سکتے ہیں۔تو یہ بڑا بے اعتبار سا میڈیم ہے۔ابھی اس کی اتھنٹی سٹی نہیں موجود۔یہ ابھی ایک ایسا عبوری دور موجود ہے اس کے اوپر کہ جب کافی سارے بے لگام رتھ گزر جائیں گے تو تب کہیں جا کر ٹھہرے گا۔تب اسکی تطہیر ہوگی اور پھر اس میں سے کوئی شکل نکلے گی۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے،اس کا ذمہ دار کون ہے؟ موجودہ شعری منظرنامے پر کیا کہیں گی؟

ج آپ نے مشاعروں کے زوال کی بات کی ہے تو زوال تو بحیثیت مجموعی ہر شعبہ ہائے زندگی میں اور ہر شعبہ ہائے ادب میں موجود ہے۔موسیقی میں،مصوری میں،میرے خیال میں جب بہت بڑے فنکار جب زمینوں کا سارا تخلیقی رس چوس لیتے ہیں۔سارا سوک لیتے ہیں۔اور بڑے عرصے تک یہ بنجر اور بے آباد رہتی ہیں یہ تخلیقی زمینیں تو۔کونپلیں تو پھوٹتی رہتی ہیں۔لیکن جہاں تک خوبصورت روایتوں میں ایک مشاعرے کی روایت تھی،وہ سفارش اور گروپس اور لڑائیاں اور

حوصلہ نہ ہونا، ایک دوسرے کو برداشت نہ کرناان ساری منفی جذبوں کی نظر ہو گیا ہے۔اور ہمارے ایسے لوگ جو انتظامی سیٹوں پر ہوتے ہیں۔لوگ شکوہ کناں ہی رہتے ہیں، خلاف بھی بہت لکھتے ہیں۔لیکن جتنی مخالفت سہنے کی عادت ہو گئی ہوئی ہے۔اس سے کچھ اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔میں سمجھتی ہوں کہ مشاعرے کی خوبصورت روایت کو واقعتاً نقصان پہنچ ہے۔اور سرکاری مشاعروں سے توتو لوگوں کو شکوہ ہوتا ہے اور یہ دور چونکہ خبر کا دور ہے اسمیں ایک ایسی صنف سخن ابھر کر آئی ہے ، جسے کالم نگاری کہتے ہیں۔یہ دوسری اصناف کو کھا گئی ہے۔اسی میں شعر بھی ڈال دیئے جاتے ہیں،اسی میں خیالات بھی ڈال دیئے جاتے ہیں۔بہت سارے کالم تو ہوتے ہی افسانے ہیں۔اسی طرح مشاعرہ پر تشدد دور کے اندر ایسی مہذب اور شاعرانہ، دلبرانہ محفل وہ شائد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کے حوالے سے بھی؟

ج ایسا زندگی میں ہوا ہے کبھی کبھی وقت کی لگام کو خود تھام لیا اور وقت ہمارے کہنے پر چلا۔اس میں وہ تمام بیڑیاں کھل گئیں، وہ تمام زنجیریں آزاد ہو گئیں۔اور وہ اتنا بڑا اعزاز نہ تھا کہ جس نے صدیوں کی دل کی غلامی کو آزاد کیا۔وہ لمحات سالوں پر بھاری تھے اور ایسا زندگی میں ہوا اور شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔لیکن ہے بہت پر قیمت۔اقبال کا شعر یاد آتا ہے۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

تو بڑی ہی بخیلی کے ساتھ زندگی کو چند گھڑیاں میسر آتی ہیں۔اور اس کا بہت بڑا دستِ قدرت معاوضہ لیتی ہے۔

س عام تاثر پایا جاتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج ہو اہے؟ آپ کیا کہیں گی؟

ج یہ جو کہا جاتا ہے کہ کتاب سے دوری کا معاملہ تو میں نہیں اس سے متفق، کیونکہ صرف میڈیم تبدیل ہوا ہے۔وہی سلیٹ جس پر ہم نے لکھنا شروع کیا تھا۔اس کو ایک تار لگ گئی، وہ الیکٹرک ہو گئی ہے۔اور ہم لکھ رہے ہیں۔کتاب کی خوشبو میسر نہیں ہے تو اس کی خوشبوئیں ہم سے روٹھ گئی ہیں۔جہاں تک اس میڈیم کا بدل جانا ہے۔تو پہلے لوگ ہاتھ سے کپڑے دھوتے تھے اب مشین میں دھوتے ہیں۔کپڑے دھلنا تو بند نہیں ہوا۔اسی طرح باقی ساری جگہوں پہ مشینوں نے جگہ لے

لی ہے۔انسان کی سہولت کے لئے نہ لکھنا لکھنا کم ہوا ہے، نہ کتابوں کا چھپنا، بلکہ یہ نئی نسل تو مجھے لگتا ہے کہ ہر وقت لکھتی رہتی ہے۔اور بے تحاشہ پیغام رسانی ،ہمارے زمانے میں ایک رقعے پر قیامت آجاتی تھے۔اب تو رقعے سامنے لکھے جاتے ہیں۔جنکو میسیجز کہتے ہیں۔اور اسکو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔زمانے زمانے کی بات ہے،اب تو سامنے بیٹھے لوگ بھی ایک دوسرے کو میسج لکھ رہے ہوتے ہیں۔لوگ بول کر بات نہیں کرتے ،لکھ کر بات کرتے ہیں۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج 2006 میں شاعری کی کتاب آئی تھی ''خاموشیاں'' ماورا سے شائع ہوئی اور اس کے بعد 2009 پنجابی کہانیاں یا کالم آپ ان کو کہہ لیں۔ایک پنجابی کے نثر پارے تھے ''ست گتر''، یہ جمیل پال صاحب نے پنجابی مرکز سے چھاپی تھی۔اور تیسری کتاب وہ بھی شاعری کی کتاب تھی ''تاراج''، یہ 2015 میں آئی تھی اس کا پہلا شعر جو انتساب کا شعر ہوتا تھا۔وہ یہ تھا کہ

حوصلے سارے رہے صبر میں تاراج ہوئے
دستبردار تیرے عشق سے ہم آج ہوئے

اور اس کے بعد کتاب بابا فرید سے خواجہ فرید تک، یہ ساتوں صوفی پیروں کے تخلیقی تراجم ہیں۔مجھے لگا تھا کہ ان عظیم بابوں کی تخلیقات کو ترجمہ تو ہم کر ہی نہیں سکتے ، کیونکہ کبھی عشق بھی ترجمہ ہوا ہے۔کبھی تخلیقات کا ترجمہ بھی ممکن ہے،تو جب مجھے حسن عباسی نے کہا کہ آپ نے ان کو ٹرانسلیٹ کرنا ہے،ہم اس کو بابا فرید سے خواجہ فرید کے عنوان سے کتاب چھاپیں گے۔تب میں نے کہا کہ میں یہ سب کیسے کروں گی؟ تو اسنے کہا کہ یہ آپ ہی کر سکتی ہیں تخلیق میں بھیگی ہوئی نثر میں آپ اسے کر ڈالئے۔پھر میرے کچھ برس اس کی نظر ہوئے۔اور کیفیت بھی ایسی تھی کہ کالم بھی نہیں لکھا جاتا تھا۔اور خود کو بڑی مشکل سے اس کنویں سے نکالا۔یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی،اور اس نے تخلیقی ترجمے کو رواج دیا جس میں اس کیفیت کے نزدیک ہونے کی کوشش کی جس کیفیت میں جا کر سید پیر وارث شاہ لکھ رہے تھے۔جس میں بابا فرید لکھ رہے تھے۔بابا بلھے شاہ لکھ رہے تھے۔سلطان باہو لکھ رہے تھے۔میاں محمد بخش لکھ رہے تھے۔وہ کیفیت ٹچ کرنے کی کوشش کی،اس کو چھونے کی کوشش کی ۔اس کیفیت کے لمس سے گزر کر اسکو تحریر کیا۔اب کتابیں جو ہیں میری اردو شاعری کی کتاب دربار آخری مراحل میں ہے۔تو دربار کی آمد کی منتظر ہوں۔اور اسکے ساتھ اردو افسانوں کی کتاب بھی آج کل میں آیا چاہتی ہے۔پنجابی شاعری چونکہ

بہت ہی عزیز ہے مجھے تو اس کو میں دیکھ بھال رہی ہوں ۔ جیسے جیسے خود بدلتی جا رہی ہوں، اسے بھی بدل رہی ہوں ۔ اس میں کبھی جذبہ انکا ہوجاتا ہے تو اسمیں سنگنا پن کہا جاتا ہے شاعری کا ۔ حیاتی تجربوں سے گزر رہی ہوں ۔ اورابھی سوچ میں ہوں کہ اس کو کب شائع کیا جائے ۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج آخری سوال بڑا دلچسپ اور دل پہ لگنے والا ہے ۔ کیا کھویا اور کیا پایا؟ ہم اپنی تنہائی میں یہی سوال تو کرتے ہیں خود سے ۔ اور حیرت کی بات ہے کہ بے شک اس سوال کے جواب میں نہیں ہوتی جیسا کہ میں نے لکھا

اپنی تنہائی سے وحشت نہیں ہوتی مجھ کو
کیا عجب شے ہوں محبت نہیں ہوتی مجھ کو

اس احساس کا کھو جانا اپنا نقصان ہے اور جو کھو دیا ہے وہ آرزو ہے ۔ آرزو کا گم ہوجانا بہت بڑا نقصان ہے ۔ تمنا کا تکمیل کے مرحلے تک نہ پہنچنا یہ بہت بڑا نقصان ہے ۔ اور یہ ہوا تکمیل کے لمحے میں تمنا ہمیشہ غائب ہوتی ہے ۔ اس کا وجود ختم ہوجاتا ہے ۔ آرزو کا تمام ہوجانا بڑا تکلیف اور دکھ کا باعث ہے ۔ اور خواہش اور تمنا اور آرزو کے مقامات کا تعین کر لینا اور اپنی آنکھوں کے سامنے جاتے دیکھنا ۔ بے وقت ایک ایسا تجربہ ہے جو خوش کن اس لحاظ سے ہے کہ آپ کی محتاجی زندگی کی ختم ہوتی ہے ۔ آپ دل کے محتاج ہوتے ہیں ایک زمانے میں اور ایک زمانہ ایسا آجاتا ہے کہ جب آپ اپنی آرزوؤں پر خود فتح یاب ہو چکے ہوتے ہیں ۔ اور نارسائی کے انجام دیکھ رہے ہوتے ہیں ۔ تو وہ تو کھونے کی کیفیت ہے تو مجھے شخصیت کے کچھ ٹریٹس ہیں جن کے کھو جانے کا دکھ ہے کہ جیسے ہم سمجھتے تھے کہ ہم دنیا کو بالکل بدل دیں گے ۔ اور انصاف والا معاشرہ بنا دیں گے ۔ لیکن نہیں کر سکے کچھ بھی ۔ اور خود اس کا حصہ بن گئے ۔ اور اس سے بھی زیادہ کھو دینے کا احساس یہ ہے کہ کہ میں اپنے آپ کو بطور انسان جس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی اس مقام پر نہیں ہوں ۔ آپ خود شاعر ہیں آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تجربات، یہ مشاہدے، جھولی میں واپس آئے ہوئے کنکر اور یہ سارا اتنا بڑا اثاثہ ہیں تو یادوں کے انبار ہیں اور ان کے آتش دان سے کچھ نکلتا ہے اسکو لکھ ڈالتے ہیں ۔ زندگی رواں دواں بھی ہے ۔ اور اچھے اور برے تجربات کے ساتھ گزر رہی ہے ۔ برے لوگوں میں بھی زندگی اچھی گزر جاتی ہے ۔

OOO

ڈاکٹر صغرا صدف

س یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہئے؟

ج چھٹی کلاس میں تھی جب میں نے اپنے نام کے ساتھ صدف تخلص استعمال کرنا شروع کیا اور نظمیں لکھیں جن میں محنت اور تعلیم سے مقام حاصل کرنے کا عزم پایا جاتا ہے۔

س آپ نے ایم اے کا مقالہ فیض احمد فیض کے عمرانی فلسفے کے موضوع پر کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری میاں محمد بخش کے فلسفہ عشق پر کی، شاعری اور شاعروں کی زندگی سے دلچسپی کی کوئی خاص وجہ؟

ج شاعری سے میرا لگاؤ قدرتی ہے کیوں کہ میں خود شاعرہ ہوں۔ میں نے شاعروں کی زندگی سے زیادہ ان کے فن، فکر اور فلسفے پر کام کیا ہے اسی لئے میں نے ایم اے میں تھیسز کے لئے فیض احمد فیض اور پی پی ایچ ڈی میں میاں محمد بخش کے فلسفہ عشق کو اپنا موضوع بنایا۔

س آپ نے کئی کتابیں اردو میں لکھی ہیں اور کئی کتب آپ کی پنجابی زبان میں ہیں، بیک وقت مختلف زبانوں میں لکھنا کیسا تجربہ ہے؟

ج یہ مختلف زبانیں نہیں، ان میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ مختلف تجربہ تو تب ہو جب میں فرانسیسی، عربی یا کسی اور بدیسی زبان میں لکھوں۔ بہر حال ان دونوں زبانوں میں لکھنا اچھا لگتا ہے۔

س آپ نے پنجابی زبان میں بہت کام کیا ہے۔ آج کل آپ پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر کی ڈائریکٹر ہیں، اپنی موجودہ ذمہ داریوں کے متعلق ہمیں بتانا پسند کریں گی؟

ج یہ ادارہ پنجابی زبان، فن اور ثقافت کی ترویج و ترقی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ میری ذمہ داریوں میں پنجابی زبان فن اور ثقافت تینوں کا فروغ شامل ہے۔ یہ جاب میرا شوق بھی ہے اس لئے میں اسے خوشی سے سرانجام دے رہی ہوں۔

س پلاک کی اچیومنٹس کیا ہیں؟ اس ادارے کا کردار کس قدر اہم ہے؟

ج ماشاء اللہ پلاک کے زیر اہتمام پنجابی میگزین ''ترنجن'' باقاعدگی سے چھاپا جا رہا ہے جس

میں پنجابی زبان، فن اور ثقافت سے متعلق تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اسی طرح پنجابی زبان فن، ثقافت اور تاریخ سے متعلق کتب کی اشاعت بھی کی جاتی ہے۔ ادارے کے تحت پاکستان کے پہلے پنجابی ریڈیو چینل ایف ایم 95 پنجاب رنگ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کے ذریعے پنجابی زبان وادب کی ترویج ممکن ہوئی ہے۔ مزید برآں پنجاب میوزیم اور پنجاب آرٹ گیلری کے قیام کے ذریعے پنجاب کی ثقافت اور دستکاریوں کو محفوظ بنا کر عوام کے لئے قابل نمائش بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی لائبریری کا قیام بھی عمل عمل میں لایا گیا ہے جس میں پنجابی زبان، فن، ثقافت، تاریخ اور صوفی ازم پر کم وبیش 10 ہزار کتب ورسائل اور مطالعے کے لئے دستیاب ہیں۔ پنجاب آڈیٹوریم کے ذریعے مختلف قسم کی تقاریب کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جن کے ذریعے پنجابی زبان اور ثقافت کا فروغ ممکن ہوا ہے۔ پنجاب کیفے میں ادباء، شعراء اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو آپس میں مکالمے کی سہولت بہم پہنچانے کے لئے خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ تقریباً 19 کے قریب کتب کی اشاعت ادارے کے تحت کی جا چکی ہے اور کچھ کتابیں زیر طبع ہیں۔

س اپنی ادبی تخلیق اور کتابوں کی تفصیل بتایئے گا؟

ج میری شاعری، تحقیق، فلسفے اور نثر کے حوالے سے دس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

س پہلی کتاب کب اور کن حالات میں آئی؟

ج 1999ء میں پہلی کتاب شائع ہوئی ''میں کیوں مانوں ہار'' اردو شاعری کی کتاب ہے۔

س اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں؟

ج جی میرا تعلق تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں سے ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ میٹرک قریبی قصبہ کوٹلہ سے کیا جہاں روزانہ چھ میل پیدل چل کر جایا کرتی تھی۔ بی اے فوارہ چوک گجرات اور ایم اے پنجاب یونیورسٹی فلسفہ ڈیپارٹمنٹ سے پہلی پوزیشن کے ساتھ کیا۔

س آج کل آپ ادبی شعبے میں کچھ تحریر کر رہی ہیں؟

ج جی آج کل میں زیادہ تر اردو افسانہ، پنجابی کہانی اور تحقیقی کام کر رہی ہوں، کالم بھی لکھ رہی ہوں۔

س ادیبہ، شاعرہ اور کالم نگار کے علاوہ آپ ایک سماجی شخصیت بھی ہیں، اتنا سارا کچھ کیسے کر پاتی ہیں؟ سب کاموں کے لئے وقت کیسے نکالتی ہیں؟

ج: جی انسان کے ارادے مضبوط ہوں تو یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ پورا ہفتہ خیالات میرے ذہن میں تیرتے رہتے ہیں۔ اتوار کو میں انہیں صفحہ پر منتقل کرنے کی کاوش کرتی ہوں۔

س: آپ بیرون ملک بھی اکثر مشاعروں اور ادبی تقریبات میں جاتی رہتی ہیں، اب تک کون کون سے ممالک دیکھ چکی ہیں؟ سیاحت کا تجربہ کیسا رہا؟

ج: امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، فرانس، ناروے، دبئی، انڈیا، قطر وغیرہ۔ مشاعرے کم پڑھے ہیں۔ سیاحت کی غرض سے باہر زیادہ جانا ہوا۔

س: اب تک کون کون سے ادبی اعزازات حاصل کر چکی ہیں؟

ج: کئی ممالک سے بے شمار اعزازات حاصل کر چکی ہوں مگر میری نظر میں اعزاز ایک ہی ہے پرائڈ آف پرفارمنس جو ابھی تک مجھے نہیں ملا۔

س: ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی، بہت پرانا مگر اہم سوال ہے، آپ اس بارے میں کیا رائے دیں گی؟

ج: ادب دراصل ادب برائے زندگی ہی ہوتا ہے، جو ادب زندگی کو نہ سنوارے، زندگی کے مسائل کو زیر بحث نہ لائے وہ ادب نہیں ہو سکتا مگر ادب اور نعرے میں فرق ہونا چاہئے۔

○○○

طاہر انوار پاشا

س پولیس کا محکمہ اور قرطاس وقلم سے نسبت بظاہر متضاد جہتیں محسوس ہوتی ہیں؟ آپ دونوں شعبوں میں بامِ عروج تک پہنچے، یہ کیسے ممکن ہوا؟

ج لکھنے کا شوق تو مجھے بچپن سے ہی تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی بچوں کے میگزین اور رسائل میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر میں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ کالج کے زمانے میں کالج میگزین کا ایڈیٹر بھی رہا۔ عملی زندگی میں جب آیا اور پولیس کی نوکری اختیار کی تو آپ نے بجا فرمایا کہ یہ بڑی حد تک متضاد چیزیں تھیں۔ لکھنے کا شوق میرا پولیس سروس کے دوران پورا نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ مجھے سیاحت اور مصوری کا بھی شوق تھا مگر نوکری کے دوران یہ شوق پس منظر میں چلے گئے۔ پولیس کی نوکری گرچہ میرے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔ حالات مگر کچھ ایسے بنے کہ مجھے پولیس میں جانا پڑا بلکہ مجھ پر ٹھونسی گئی یوں کہہ لیجئے۔ ان دنوں اصل میں مقابلے کے امتحان میں نمبروں کے حساب سے محکمے الاٹ ہوتے تھے۔ میرا نمبر پولیس میں آ گیا۔ بعدازاں میں نے کافی کوشش بھی کی کہ اسے تبدیل کروالوں۔ فارن سروس مجھے زیادہ پسند تھی۔ مگر رشتہ داروں کا یہ پریشر تھا کہ پولیس میں ہی رہوں۔ اہل خانہ اور رشتہ داروں کا استدلال تھا کہ پولیس کی افسری تو بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اس میں بہت عزت ہے۔ شاید میرے پولیس میں رہنے کا ان کو فائدہ بھی تھا اور ان دنوں پولیس کی واقعی بڑی عزت ہوتی تھی۔ اب تو خیر یہ عزت خاک میں مل گئی ہے۔ میں پولیس میں جانے سے جھجک بھی اسی وجہ سے رہا تھا کہ مجھے بدنامی سے ڈر لگتا تھا۔ پھر یہ سوچا کہ شاید میں پولیس میں رہ کر کوئی عوامی خدمت کر سکوں، لوگوں کے دکھ درد کو کم کر سکوں۔ ملک کی تعمیر میں اپنا یوں حصہ ڈال دوں۔ نوکری کے دوران کبھی کبھی لکھنے کا شوق پورا کر لیتا تھا، کبھی کوئی سرکاری رپورٹ لکھتا تو اچھا لگتا تھا۔ جب میں ایڈیشنل آئی جی سپیشل برانچ تھا تو میں نے ایک جریدے کا آغاز کیا۔ حالانکہ سپیشل برانچ اور جریدے کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بنتا لیکن اندر کا ادیب تو بہرحال موجود تھا۔ ''رازدان'' کے نام سے اس جریدے کی نیلما ناہید درانی مدیر تھیں

اور پولیس کے افراد اپنی تحریریں اس میں اشاعت کے لئے بھیجتے، شاعری ونثر دونوں چھپتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنا شروع کیا۔ لکھتا تو میں دوران ملازمت بھی تھا مگر بعد ازاں زیادہ توجہ اور وقت دینے کا موقع مل گیا۔ زیادہ یکسوئی سے تحریر وتصنیف کی جانب آ گیا ہوں، یہ شوق دب سکتا ہے، ختم نہیں ہوسکتا۔ اندر کے ادیب کو آپ دبا سکتے ہیں، مار نہیں سکتے۔

س کبھی کسی ادبی تحریک کا بھی حصہ رہے ہیں؟

ج میں ہمیشہ سے ہی اپنے شوق کی تکمیل کے لئے لکھتا رہا ہوں، کبھی کسی ادبی تحریک یا دھڑے بندی کا حصہ نہیں رہا۔ ویسے ادب کی بہتری کے لئے اگر کوئی تحریک یا گروہ کام کرتا ہے تو میرے نزدیک یہ قابل تحسین بات ہے، میرا کسی ادبی تنظیم یا تحریک سے منسلک نہ رہنا ایک نجی بات ہے۔

س کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہئے؟

ج سیاست تو آجکل جھوٹ بولنے کا نام ہے۔ ایک ڈھکوسلہ بن کر رہ گئی ہے، اگر میں کہوں کہ یہ گندی چیز ہے تو اس میں بھی کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ جبکہ اہل قلم کا کام بہت اجلا اور صاف ستھرا ہے۔ اگر لکھاری بھی سیاست میں حصہ لیں گے تو پھر ان میں اور سیاستدانوں میں کیا فرق رہ جائے گا؟ کسی سیاسی نظریے سے وابستہ ہونا مخصوص سیاسی فکر کا حامی ہونا ایک الگ اور جائز بات ہے مگر عملی سیاست میں اہل قلم کا ملوث ہونا ایک بالکل مختلف بات ہے اور میرے نزدیک یہ درست عمل نہیں ہے۔

س یہ تاثر کس حد تک درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا جارہا ہے؟

ج صد فی صد متفق ہوں آپ کی بات سے، الیکٹرانک میڈیا نے لوگوں کی کتاب سے محبت کم کردی ہے۔ اصل میں لوگوں کی یادداشت کم ہوتی جارہی ہے۔ اس شارٹ میموری کا سبب یہی الیکٹرانک میڈیا ہے اور کتاب پڑھنے سے طویل یاداشت یا لانگ میموری پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں کتاب کی طرف لوگوں کو لانے کے طریقے ڈھونڈنے ہوں گے

س کوئی بے حد آسودہ لمحہ، تخلیقی سطح پر بھی اور عام زندگی میں بھی؟

ج میری زندگی بہت ہی آسودہ گزری ہے۔ اللہ تعالٰی کا مجھ پر بے حد کرم رہا ہے۔ میں مصروف رہوں تو زیادہ آسودہ رہتا ہوں۔ کام کرتے ہوئے، لکھتے ہوئے وقت زیادہ آسودہ گزرتا ہے۔

س آپ ادیب بھی ہیں اور پولیس والے بھی، دل کے زیادہ قریب کونسا شعبہ ہے؟

ج ادیب ہونا میرے دل کے زیادہ قریب ہے۔ پولیس کا شعبہ تو جیسے میں نے پہلے بتایا کہ مجھ پر ٹھونسا گیا تھا۔ مگر میں نے پوری ایمانداری اور ذمہ داری سے اسے فرض سمجھ کر نبھایا مگر بنیادی طور پر تو مجھے لکھنے کا ہی شوق تھا۔ گرچہ میں پولیس کے شعبہ میں بھی اہم ترین ذمہ داریاں نبھاتا رہا، بلکہ بعض دوستوں کا اس متعلق یہ خیال ہے کہ مجھے ان ماہ وسال کو آپ بیتی کی شکل میں شائع کرنا چاہیے۔ میرے دل میں بہت سارے راز ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان کو افشا کرنے سے کسی کا بھلا ہوگا، چونکہ اگر میں لکھوں گا تو پھر سارا سچ لکھوں گا۔

س ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج میرے خیال میں تو لکھنے کی تحریک اندرون سے ملتی ہے۔ یہ اندر کی آواز ہوتی ہے کہ لکھنا چاہیے ۔ چاہے افسانہ ہو، شاعری یا پھر کوئی اور صنف ادب، تحریک اندر سے ہی ملتی ہے۔ آپ معاشرے کا مشاہدہ وتجزیہ ضرور کرتے ہیں مگر ان احساسات کو قلم بند کرنے کا خیال اندرونی تحریک ہے۔

س ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کا کیا کردار ہے؟

ج آج کل لوگوں کی اطلاعات کا سب سے اہم ذریعہ سوشل میڈیا بن چکا ہے۔ کسی حد تک یہ ادب کے فروغ کا بھی ذریعہ ہے۔ ای کتب اور ادبی مواد کی مفت اور پھر قیمت ادا کر کے فراہمی نے سوشل میڈیا کو ادب کے فروغ کے لئے ایک موثر پلیٹ فارم بنا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس سے ادبی موضوعات پر گفتگو کو فروغ دیکر مزید فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

س زندگی میں کیا کھویا کیا پایا؟

ج میں خود کو بہت خوش نصیب انسان سمجھتا ہوں۔ کیا کھویا ہے؟ کا جواب مجھے سوچ کر دینا پڑتا ہے، میرے خیال میں میں نے ادبی لحاظ سے کھویا ہے، یعنی اگر لکھنے میں نوکری کی وجہ سے بریک نہ آنے دیتا تو شاید بہت زیادہ لکھ سکتا تھا۔ اور جہاں تک پانے کا تعلق ہے تو میں نے پایا ہی پایا ہے، تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ نے مجھے عنائت فرما دی ہیں۔ مجھے زندگی سے یا اپنے رب سے کوئی شکوہ نہیں ہے، میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں اس قابل نہیں تھا جتنی نعمتوں سے اس نے مجھے نوازا ہے۔

س اردو زبان وادب کا کیا مستقبل ہے؟

ج سچ پوچھیں تو کوئی تابناک مستقبل دکھائی نہیں دیتا۔ صورتحال اس حوالے سے زیادہ حوصلہ

افزانہیں ہے۔ اردوزبان وادب ترقی کی بجائے تنزلی کا شکار ہے۔

س تخلیقی سفر میں ملازمت کوکبھی رکاوٹ تومحسوس نہیں کیا؟

ج بالکل رکاوٹ بنی رہی یہ ملازمت میرے تخلیقی سفر میں۔ سوفیصد اس رکاوٹ کومحسوس بھی کیا۔ آپ دیکھیں کہ ملازمت سے پہلے افسانہ نگاری کرتا تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد سفر نامہ نگاری شروع کردی، یعنی ڈگر ہی تبدیل کردی میرے ادبی سفر کی اس ملازمت نے۔ صنفِ سخن ہی بدل گئی۔ مگر اب میں اس ڈگر پر ڈٹا رہوں گا۔ قاسم علی شاہ نے ایک تقریب میں پیشین گوئی کی ہے کہ میں دس سفر نامے لکھوں گا۔ دیکھیں کیا بنتا ہے، چونکہ دوستوں کا اصرار ہے کہ یہ دس کی حد ختم ہونی چاہئیے۔ ہم عمر کے اس حصے میں ہیں کہ چل چلاؤ کا وقت ہوتا ہے۔ بشرطِ زندگی ہی یہ ساری باتیں ہیں۔ میں آجکل سری لنکا کا سفر نامہ لکھ رہا ہوں، دوست جب پوچھتے ہیں کہ کب شائع ہوگا تو میرا جواب ہوتا ہے اس سال کے آخر تک بشرطِ زندگی شائع ہوجائے گا۔

س سفر نامہ نگاری کو آپ ادب کا حصہ سمجھتے ہیں؟ کیا سفر نامہ فکشن ہے؟

ج ادب کا حصہ سفر نامہ بالکل ہے۔ میرے خیال میں سفر نامہ نگاری ضرور ادب میں داخل ہے مگر میں اسے فکشن نہیں سمجھتا۔ گرچہ آپ نے اپنی کتاب میں معروف، مقبول سفر نامہ نگاروں کے یہ تاثرات تحریر کئے ہیں کہ ان کے نزدیک سفر نامہ فکشن ہے، میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ چونکہ جب ہم فکشن کی بات کرتے ہیں تو اس میں بہت سارا کچھ آجاتا ہے۔ فکشن واقعاتی نہیں ہوتی ہے، سارا سچ نہیں کہا جاسکتا اسے، جبکہ میرے نزدیک سفر نامہ وہی معتبر ہے جس میں مصنف نے سارا سچ تحریر کیا ہوا ہو۔ میری نظر میں سفر نامہ نگاری ادب میں شامل ہے مگر فکشن نہیں ہے؟

س آج کل کوئی سفر نامہ لکھ رہے ہیں؟

ج میرا حال ہی میں نیپال کا سفر نامہ شائع ہوا ہے۔ گزشتہ دنوں ہی اس کی تقریب رونمائی بھی تھی۔ آج کل میں سری لنکا کا سفر نامہ لکھ رہا ہوں۔ ویسے تو میں روس کا سفر نامہ لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں سفر کے تمام انتظامات بھی مکمل تھے۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور ہوٹل کی بکنگ تک ہو چکی تھی۔ مگر پھر یہ نامراد کرونا وائرس آ گیا۔ روس کا سفر تو منسوخ ہوگیا مگر پھر تمام وقت گھر پر بھی گزارنا مشکل تھا، لہٰذا میں نے سری لنکا کے لئے رختِ سفر باندھا۔

س آپ کے سفر ناموں پر کیا کوئی تحقیقی کام بھی ہوا ہے؟

ج کافی کام ہوا ہے اور ہو بھی رہا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے پچھلے دنوں میرے

سفرناموں پر ایم فل کیا ہے اور اسکے علاوہ لاہور کالج یونیورسٹی سے بھی ایم فل کا تحقیقی کام میرے سفرناموں کے حوالے سے مکمل کر کے ڈگری حاصل کی گئی ہے۔تیسرے مقالے کے لئے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی والوں نے رابطہ کیا ہے۔وہ میرے کسی ایک سفرنامے پر ایم فل کروانا چاہتے ہیں۔

س پاکستان میں آپ کا آبائی علاقہ کونسا ہے؟

ج بنیادی طور پر میرا تعلق اٹک سے ہے۔وہیں میری ابتدائی تعلیم ہوئی اور پھر کالج بھی اٹک میں ہی گیا۔ویسے تو سابقہ کیمبل پور اور موجودہ اٹک پس ماندہ علاقہ ہے،مگر وہاں کا کالج بہت اعلیٰ تعلیمی معیار کا حامل ہوا کرتا تھا۔بہت ہی شاندار اساتذہ ہمیں پڑھاتے تھے۔سیاحت اور مصوری کا بچپن سے ہی شوق تھا ان کی تشفی کے لئے بھی یہ علاقہ بہت ہی بہترین تھا۔

س پولیس کی نوکری کیسی رہی؟

ج بہت مشکل نوکری ہے۔چوبیس گھنٹے کے سخت اوقات کار ہیں۔پہلے تو ٹریننگ میں ہی اتنی جان ماری ہے کہ پولیس کے علاوہ ہر چیز بھول جاتی ہے۔صرف پولیس ہی یاد رہ جاتی ہے۔1973 میں جوائن کی اور 2008 میں بطور آئی جی پولیس سے ریٹائر ہو گیا۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عزت کے ساتھ وقت گزرا۔

س بینکنگ کے شعبے سے بھی آپ وابستہ رہے،کیسا تجربہ رہا؟

ج پولیس جوائن کرنے سے پہلے میں نے بینکنگ کے شعبے میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔نوکری کے دوران بھی مختلف بنکوں سے آفرز آتی رہیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے تین سال کے کنٹریکٹ پر بنک میں ملازمت اختیار کرلی۔جب یہ معاہدہ ختم ہوا تو وہ مزید تین سال کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا۔پینتیس سال پولیس کی نوکری اور پھر تین سال بنک کی نوکری۔38 سال بعد مجھے اپنے لئے بھی وقت درکار تھا۔

س سب سے پہلے کس ملک کا سفرنامہ شائع ہوا؟اب تک کتنے سفرنامے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں؟

ج ازبکستان کے سفر کی روداد،ازبکستان۔امام بخاری اور امیر تیمور کا دیس کے عنوان سے سب سے پہلے کتاب کی شکل میں شائع ہوئی۔ترکی میں پاشا کے عنوان سے ترکی اور پھر نیل کے سنگ،پیغمبروں اور فرعونوں کی سرزمین کا سفرنامہ مصر شائع ہوا۔حال ہی میں جیسے پہلے عرض کیا نیپال کے متعلق ایورسٹ کی سرزمین کے نام سے سفرنامہ شائع ہوا ہے۔

س سیاحت کا آپ کو بہت شوق ہے اب تک کتنے ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں؟

ج اب تک پینتیس سے زیادہ ممالک گھوم چکا ہوں۔سفراب بھی جاری ہے۔

س آپ کا کہنا ہے کہ سفرنامہ نگاری کے فیض سے مستقل سفر میں رہتا ہوں، یہ نقطہ ذرا واضح کریں گے؟

ج جب میں کہتا ہوں کہ میں مستقل سفر میں رہتا ہوں تو یہ حرف بہ حرف سچ بات ہے۔اس کی وضاحت میں یوں کرتا ہوں کہ جب میں سیاحت سے واپس گھر آ کر سفرنامہ لکھنا شروع کرتا ہوں تو ایک طرح سے میں ذہنی طور پر پھر اسی سفر پر نکل جاتا ہوں، پھر وہی مناظر ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔آج کل چونکہ میں سارا سال لکھتا ہوں اس لئے تمام برس ہی سفر و سیاحت میں گزارتا ہوں۔

س مجھے کسی دوست نے بتایا ہے کہ منیر نیازی سے آپ کی رشتہ داری ہے؟

ج جی ہاں! میری بیگم منیر نیازی کی بھانجی ہے۔

س نگری نگری گھوم چکے ہیں، بیرونی دنیا میں پاکستان کے امیج بارے کیا رائے ہے؟

ج چند برس پہلے تک تو سچ پوچھیں بیرونی دنیا میں ہمارا امیج بہت خراب تھا، وہ ہر پاکستانی کو دہشت گرد سمجھتے تھے۔مگر جب سے ہماری پاک افواج نے دہشت گردی کے خلاف کامیاب آپریشن کر کے دہشت گردوں کی بیخ کنی کی ہے۔پاکستان کا امیج بہت بہتر ہو گیا ہے۔اب ہمیں دہشت گرد نہیں سمجھا جاتا۔ایک مسئلہ ہے اور وہ غیر قانونی طریقے سے پاکستانیوں کا غیر ممالک میں جانا ہے۔اگر پاکستانی جائز طریقے سے ویزے لگوا کر سفر اختیار کرنے لگیں تو یہ معاملہ بھی سدھر سکتا ہے۔پاکستانی ایک منظم قوم ہیں، ذہین لوگ ہیں، ٹیلنٹ تو بہت ہے پاکستانیوں میں۔اگر یہ چاہیں تو اس معاملے کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔

س نئے لکھنے والوں کے نام کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟

ج ہم سب ابن آدم ہیں۔آدم زاد ہیں۔آدمی کو جو چیز انسان بناتی ہے وہ کتاب ہے۔کتاب کو اپنائیں۔مطالعہ آدمی کو انسان بناتا ہے۔مطالعہ کی عادت ڈالیں اور اللہ کا شکر ادا کرنا سیکھیں۔

OOO

طاہر نسیم

س آپ شاعر ہیں اور صحافی ہیں، عہد حاضر کے ادب اور ادبی صورت حال پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟
ج اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایک محسوس کرنے اور جاننے والا تخلیق کار بنایا۔ عہد حاضر میں ادب اور ادبی صورت حال اتنی اچھی نہیں مگر مایوسی بھی نہیں، میرے خیال میں ادب کو تعمیر ذات کے ساتھ ساتھ تعمیر ملت کا سبب بھی ہونا چاہئے، جب تعمیر ملت کا خیال کریں گے تو ادبی صورت حال بھی بہتر ہوگی۔

س بڑھتی ہوئی میڈیائی یلغار ادب کے لئے معاون ثابت ہوئی؟
ج بڑھتی ہوئی میڈیائی یلغار نے ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، بہت کم ایسا ہوا ہے کہ چینلز پر کوئی معیاری مشاعرہ یا ادبی ٹاک آتی ہو ورنہ تو بھانڈ ازم کو ادب کا لبادہ پہنایا جا رہا ہے۔

س نئی نسل میں ادبی رجحانات پیدا کرنے کے لئے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے؟
ج بہت اہم سوال ہے۔ ادب اور ادبی رجحانات جس تیزی سے نئی نسل میں ناپید ہو رہا ہے، مجھے کبھی کبھی بہت پریشانی ہوتی ہے۔ میں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کا جائزہ لیا ہے، وہ ویران ہو رہی ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری لائبریریوں کا بھی یہی عالم ہے۔ لائبریری ادب کے فروغ کا بنیادی ذریعہ ہے۔ ہمیں ان میں یہ شوق پیدا کرنا ہوگا۔ اساتذہ کو اس سلسلے میں ذمہ دارانہ کردار ادا کرنا ہوگا۔

س ادبی گروہ بندیوں کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟
ج اختلاف انسانی سرشت کا حصہ ہے مگر یہ بہتری اور تعمیر کے لئے اچھا لگتا ہے مگر جب ادب سے ہٹ کر ذاتی اختلاف کرنے لگتے ہیں تو خرابی شروع ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تخلیق ادب کی معراج اور منشاء انسانیت ہے اور اسی کو ہونا چاہئے۔ عہد گزشتہ میں نامور ادبی شخصیات کی گروہ بندیوں اور اختلافات کا مجموعی طور پر ادب اور ادب سے وابستہ لوگوں کو نقصان ہی ہوا ہے۔

س ادب اور ادیب کی بہتری میں حکومتی اقدامات سے مطمئن ہیں؟

ج حکومتی سطح پر بہت سے اقدامات کی ضرورت ہے جس طرح موجودہ حکومت اور خاص طور پر وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف تعلیمی شعبے کی ترقی کے لئے خصوصی توجہ کئے ہوئے ہیں، اسی طرح ادب کے شعبے پر بھی توجہ دیں تو بہتری ہو سکتی ہے۔ صوبائی، ڈویژنل، ضلعی اور تحصیل کی سطح پر لٹریری کونسلیں تشکیل ہوں۔ وہ مشاعروں، مذاکروں، مباحثوں کا اہتمام کریں اور مجھے یقین ہے کہ عطاء الحق قاسمی صاحب کا رول اس سلسلے میں مشعل راہ ہے۔

س آپ نے مرتضیٰ برلاس کے ساتھ مل کر اردو کانفرنس کی، کیا اب بھی ایسی کانفرنسز کی ضرورت ہے؟

ج اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ہماری قومی اور واحد رابطے کی زبان ہے۔ اگر اسے اپنائیں گے تو ملک ترقی کرے گا، چین اور جاپان کی ترقی کا راز تمام تعلیم ان کی اپنی زبان میں ہے۔ مرتضیٰ برلاس صاحب نے پوری زندگی اس کام کے لئے وقف کی۔ انہوں نے خانیوال میں اردو کانفرنس کی سفارشات تیار کیں جو حکومتی حلقوں میں گئیں۔ آج بھی ایسی کانفرنسز کی ضرورت ہے اور مرتضیٰ برلاس صاحب، عطاء الحق قاسمی صاحب، امجد اسلام امجد صاحب اس سلسلے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

س جنوبی پنجاب کے ادبی منظر نامے پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

ج جنوبی پنجاب میں ادب اور ادبی صورت حال کافی حوصلہ افزاء ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں کا کردار بھی نمایاں اور بہتر رہا ہے۔ عہد حاضر میں جنوبی پنجاب میں خاص طور پر ملتان میں خالد مسعود خان، قمر رضا شہزاد، رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر، شاعروں اور ادیبوں کو جوڑنے میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ پھر عامر بن علی نے ضلع خانیوال میں ادبی چراغ کو روشن کیا ہوا ہے۔ وہ گاہے بگاہے میاں چنوں میں آل پاکستان مشاعروں اور کانفرنسوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ملتان میں ٹی ہاؤس کا قیام بھی خوشگوار حیرت ہے۔ عباس تابش بھی جنوبی پنجاب کا درخشندہ ستارہ ہے۔

س کوئی پیغام جو آپ قارئین کو دینا چاہیں؟

ج ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں جی، اگر ہم سب مل کر اپنی تخلیقات کے ذریعے بہتری اور تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو پھر نئی نسل کو کتاب سے جوڑ دیں۔ ان کے اندر کتب بینی، ادب پروری کو پرو دیں تو شاید مستقبل میں ایک باادب سوسائٹی کا خواب پورا ہوتا دیکھ لیں......

ڈاکٹر طاہر تونسوی

س کیا آپ بتائیں گے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کون ہیں؟

ج جی ضرور میرا اصل نام حفیظ الرحمن ہے اور تخلص طاہر ہے مگر اب بقول حسرت موہانی جب سے کہا ہے عشق نے حسرت مجھے کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن۔ میں اب طاہر تونسوی ہوں اور اسی نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہوں حتیٰ کہ میری والدہ مرحومہ بھی مجھے طاہر کہہ کر پکارتی تھیں البتہ سرکاری کاغذات اور شناختی کارڈ پر یہی نام درج ہے اور ڈگریوں پر بھی حفیظ الرحمن طاہر تونسوی لکھا ہوا ہے۔ میں کاشانہ محمود تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان میں یکم جنوری 1948ء کو پیدا ہوا اور اولیاء کی اس سرزمین میں میرا بچپن اور پھر لڑکپن گزرا اور میں نے اپنی ابتدائی تعلیم وہیں مکمل کی اور پھر گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول ڈیرہ غازی خان سے میٹرک، گورنمنٹ کالج ملتان سے ایف ایس سی اور بی اے اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے تھرڈ ایئر میں گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان میں داخلہ لیا اور پھر مائیگریشن کر کے گورنمنٹ کالج ملتان آ گیا۔ اسی طرح گورنمنٹ کالج ملتان میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور مائیگریشن کر کے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ڈگری لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ملتان میں مقالہ لکھنے کی اجازت نہیں تھی چنانچہ مجھے ہجرت کرنی پڑی اور اپنے استاد محترم ڈاکٹر سلیم اختر کے مشورے سے لاہور چلا آیا۔

آپ کے علم میں ہے کہ تونسہ ایک مردم خیز خطہ ہے۔ اولیاء کی سرزمین ہونے کے ناتے (حضرت شاہ سلیمان تونسوی جو چشتیہ سلسلے کے نامور ولی تھے ان کی بدولت برصغیر پاک و ہند میں چشتیہ سلسلے کو فروغ حاصل ہوا) اور پیر پٹھان کے فیض و برکات کی وجہ سے تونسہ، تونسہ شریف کہلایا اور ان کی بدولت علم و ادب کا بھی چرچا ہوا چنانچہ اس زمین نے علم و ادب کے کئی روشن ستارے پیدا کئے جو ادب کی ترویج میں پیش پیش رہے اور بڑا نام کمایا۔ ان میں فکر تونسوی و دیا پرکاش، سرور تونسوی، فدائے ادب تونسوی محشر تونسوی اور رشید قیصرانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں

لمحہ موجود تک ایک ایسی کہکشاں ہے جو ادبی دنیا کو آباد اور شاداب کیسے ہوئے ہے۔

س تونسہ ایک چھوٹا سا قصبہ اور پسماندہ علاقہ ہے، وہاں سے آ کر آپ نے اتنی ترقی کی ہے، بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوایا، اس کی وجوہات کیا ہیں؟

ج آپ نے صحیح سنا ہے اور درست کہا ہے کہ تونسہ پنجاب کی ایک پسماندہ تحصیل ہے اور جب سب تحصیلوں میں کالج کھل گئے تو پھر اس کی باری آئی مگر یہاں تعلیمی کیفیت کا حال یہ ہے کہ اسے چھوٹا یونان کہا جا سکتا ہے اور تعلیم کا گراف سو فیصد ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ میرے چھوٹے سے گاؤں اور قصبے میں بھی شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو تعلیم یافتہ نہ ہو اور یہی حال لڑکیوں کا ہے۔ ہر گھر میں بی اے اور ایم اے پاس خواتین وحضرات کی تعداد قابل رشک ہے اور پھر آپ کے علم میں ہے کہ بادشمال جہاں جہاں سے گزرتی ہے، ذہانتیں بکھیرتی چلی جاتی ہے۔ یہ حال میرے شہر اور اس کے آس پاس کی بستیوں کا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ روزگار کے مواقع نہ ہونا۔ صورت حال یہ ہے کہ تونسہ کے مغرب میں کوہ سلیمان ہے جو خشک اور بنجر پہاڑ ہے اور کبھی کبھی بارش ہو جاتی ہے۔ مشرق میں کہنے کو تو دریائے سندھ گزرتا ہے مگر وہ تونسہ کے لئے آبی وسائل کا باعث نہیں بنتا۔ رہی بات تونسہ بیراج کی تو یہ صرف نام کے لئے ہے۔ وہاں سے دو نہریں نکالی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈیرہ غازی خان چلی جاتی ہے اور دوسری مظفر گڑھ۔ ہمارے حصے میں صرف سیلابی پانی آتا ہے۔ جو گزرگاہوں اور سڑکوں کو بھی بند کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے جب زمینوں کو پانی نہیں ملے گا تو فصلیں کیسے اگیں گی، اناج کس طرح پیدا ہوگا۔ تونسہ میں میٹھے پانی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ رہی چشمہ سے نکلنے والی چشمہ نہر تو جو پانی بچ جاتا ہے، ٹیل تک پہنچتے پہنچتے بس وہ قطرہ اشک کے برابر ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں جب روزگار کے مواقع نہ ہوں تو پھر تعلیم کا حصول ہی مقصد رہ جاتا ہے اور یہی ہے۔ پھر روزگار کی تلاش کے لئے بلوچستان اور پنجاب کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ ایک اور بات محنت اور جفاکشی ہے۔ اس کی بدولت میں نے بھی پی ایچ ڈی کرنے کے بعد تحقیق و تنقید کی راہ اختیار کر کے شب و روز محنت اور اپنی تحریروں کی بدولت نام بھی کمایا اور شہرت بھی حاصل کی۔ حکومتی سطح پر دیر سے ہی سہی مگر اس کا اعتراف تو ہوا کہ مجھے 2009ء میں ادبی خدمات کے سلسلے میں تمغۂ امتیاز ملا ہے۔ آپ نے بین الاقوامی سطح کی بات کی ہے مگر میرے لئے یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے تاہم مجھے خوشی ہے بلکہ فخر ہے کہ میرے تحقیقی کام کی پذیرائی ہوئی ہے۔ ملتان یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ایجوکیشن

یونیورسٹی لاہور میں ایم اے کی سطح پر میری تحقیق وتنقید پر مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ایم فل کی سطح پر مقالہ تحریر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ونو بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ (بھارت) جامعہ شمس عین (الازہر یونیورسٹی) مصر میں میری تحقیق وتنقید پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور اساتذہ کی مہربانی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا گیا۔ اس میں یقینی طور پر میری محنت اور ریاضت کو بڑا دخل حاصل ہے۔

س ادب میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟

ج میں ادب برائے زندگی کا قائل ہوں اور محض ادب برائے ادب کا نہیں اس لئے کہ زندگی کی کیفیات اور اس کے باطن سے پھوٹنے والی روشنی اور اس کے محرکات کی وجہ سے یہاں کائنات رنگ و بو میں ہلچل ہے وہاں ادب میں بھی حرکت ہوئی اور تغیرات کی صورت حال بھی۔ اس تناظر میں جہاں زندگی میں حرکت وحرارت ہے تو پھر ادب میں بھی اس کا ہونا لازمی امر بن جاتا ہے کہ ادب کے لئے موضوعات تو زندگی کے روزمرہ معمولات ومعاملات ہی سے جنم لیتے ہیں۔ سو میں ادب کی تخلیق کے لئے مواد زندگی سے پیدا شدہ واقعات اور اس میں پیش آنے والے موضوعات سے لیتا ہوں اور میرا نظریہ ادب برائے زندگی ہے اور اس حوالے سے انسان کی باطنی واردات اور ظاہری تشکیلات ہیں چنانچہ ہونے اور زندگی سہنے کو میں ادب کا وسیلہ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک وہی ادب ہے جو زندگی کی بوقلمونیوں سے پیدا ہوتا ہے۔

س شاعری تخلیق اور تنقید کس طرح ساتھ ساتھ چل رہے ہیں؟

ج میں نے اپنی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا مگر تحقیق وتنقید کی طرف زیادہ رغبت ہونے کی بنا پر شاعری کی طرف توجہ کم ہوتی گئی اور پھر اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ آدمی محض شاعر ہو تو مشاعرے پڑھنے کی طرف لپکا ہی رہتا ہے اور تحقیق وتنقید تو وقت مانگتی ہے۔ اس پس منظر میں میرے استاد محترم ڈاکٹر سلیم اختر نے مجھے مشورہ دیا کہ دو کشتیوں میں پاؤں مت رکھو چنانچہ میں تحقیق وتنقید کی طرف آ گیا اور شاعری کم کم کرنے لگا۔ ویسے میں بنیادی طور پر شاعری یعنی تخلیقی فن کار ہوں اور شاعری کے حوالے ہی سے ادبی میدان میں قدم رکھا۔ پھر تحقیق وتنقید کی طرف راغب ہوا۔ تحقیق وتنقید کے سلسلے میں مجھے ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے راہ دکھائی اور عرش صدیقی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تخلیق، تحقیق اور تنقید کو ساتھ ساتھ رکھتا ہوں اور شعر کہنا میری جبلت اور فطرت میں شامل ہے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ تخلیقی

تجربے کے بغیر تنقید کا فریضہ سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے مجھے شعر کہنا اچھا لگتا ہے اور تخلیقی تحریروں کے بارے میں تنقید لکھنا تو اور بھی اچھا لگتا ہے اور پھر تحقیق کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے اور مواد کی فراہمی کے لئے تگ و دو کرتے ہوئے بہت اچھا اور بہت ہی اچھا لگتا ہے کہ اس سے انسان کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ آپ نے کوائف نامے میں میری تحقیقی و تنقیدی کتب کی فہرست دیکھی ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ میں نے اتنا کام کیسے کر لیا۔ ظاہر ہے یہ میری محنت اور لگن کا ثمر ہے اور اب تو میری شاعری کا مجموعہ ''تو طے ہوا نا!'' بھی سامنے آ چکا ہے جس کا دیباچہ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر اسلم انصاری نے لکھا ہے اور فلیپ احمد فراز کا ہے جو میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ میرا ایک شعر ہے:

صعوبتوں کے سفر میں میں نے بھرم رکھا پھر بھی حوصلوں کا
منافقت کے جہاں میں مجھ کو صداقتوں کا نصاب لکھنا

س یہ بات درست ہے کہ تحقیق و تنقید میں آپ نے ڈھیر سارا کام ہے مگر فہرست میں مرتب کردہ کتابوں کی تعداد زیادہ ہے جبکہ آپ کا تخلیقی کام کم نظر آتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

ج ایسا نہیں ہے میری اوریجنل کتابیں بھی بہت ہیں اور جو کتابیں میں نے ترتیب دی ہیں ان کی تحقیقی نوعیت بھی ہے اور تنقیدی اہمیت بھی۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ترتیب کے کام کو تیسرے درجے کا کام نہیں سمجھا جاتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کسی بھی موضوع پر دس ہیں کتابوں کو سامنے رکھ کر اور ان کے مضامین کا ایک انتخاب کیا اور دیباچہ لکھ کر کتابی شکل میں چھاپ دیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہندوستان میں ترتیب و تدوین کا کام پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوا ہے اور اس کام کی اہمیت اور افادیت بھی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان بھر میں مختلف موضوعات پر سیمینار ہوتے ہیں۔ غالب، میر انیس، میر، حالی، سرسید، شبلی، اردو افسانہ کے مسائل، اردو نویسی کے مسائل، اردو املا کے مسائل، اردو تحقیق - روایت و ارتقاء، تنقید کے دبستان وغیرہ سیمیناروں میں جب یہ مضامین پڑھے جاتے ہیں اور ان کے خالق مختلف الخیال دانشور ہوتے ہیں اور اگر یہ سارے مقالے کتابی شکل میں یکجا ہو جائیں تو اس میں حرج کیا ہے۔ چنانچہ ایسی سینکڑوں کتابیں ہیں جن کے مرتبین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر انیس اشفاق، ڈاکٹر علی احمد کاظمی، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی اور بہت سے مستند ناقدین اور محققین ہوتے ہیں اور ان سے بجا طور پر استفادہ کیا جاتا ہے تاہم اگر پاکستان میں کوئی لکھنے والا اس طرح کے

موضوعات پر کتابیں مرتب کرے تو اس پر تنقید کی جاتی ہے اور اس میں تضاد یہ ہے کہ معترضین ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور بغیر حوالے کے استفادہ کرتے ہیں اور پھر دیکھئے کہ کسی خاص موضوع پر رسائل و جرائد کی تلاش اور تحقیق کے بعد کوئی کتاب مرتب کر دیتا ہے تو اس سے ریسرچ سکالرز کے لئے سہولت پیدا ہوتی ہے اور اسے بغیر دوڑ بھاگ کے ایک جگہ پر مواد میسر آ جاتا ہے۔ غالب صدی، اقبال صدی اور تحقیق و تدوین کے علاوہ لسانیات کے سلسلے میں جو کام تدوین کی شکل میں سامنے آیا اسے قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ اس وضاحت کے بعد اگر آپ مرتب کردہ کام دیکھیں تو اس کی مثال جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے، اس حوالے سے اقبال صدی کے موقع پر میں نے علامہ اقبال کے فکر و فن کے بارے میں جو کتابیں مرتب کیں وہ ریسرچ سکالرز اور اقبال فہمی کے سلسلے میں کام کرنے والوں کی معاونت کرتی ہیں۔ یہی حال دوسرے موضوعات کا ہے۔ فہرست سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شجر سایہ دار صحرا کا (کشفی ملتانی فن اور شخصیت) حیات اقبال، اقبال اور پاکستانی ادب، اقبال اور سلیمان ندوی، اقبال اور مشاہیر، اقبال اور عظیم شخصیات، طنز و مزاح، تاریخ تنقید، انتخاب، مسعود حسن رضوی (کتابیات) عرش صدیقی کے ساتھ مترادف، اقبال شناسی اور نخلستان، لکھنویات، ادیب، اقبال شناسی اور الخیل، فیض کی تخلیقی شخصیت، اقبال شناسی در نیرنگ خیال، ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت و تخلیقی شخصیت، صنف نازک کی کہانیاں، صنف نازک کی شاعری، اقبال شناسی اور نیاز و نگار، ڈاکٹر فرمان فتح پوری انیس و دبیر تعارف و تقابل، غالب شناس اور نخلستان ادب وغیرہ کے متنوع موضوعات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا ہوگا اور لمحہ موجود سے لے کر زمانہ مستقبل تک یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری تحقیقی و تنقیدی کتب اور مضامین کے مجموعوں پر نظر دوڑائیں تو میں نے اور یجنل کام بھی بہت کیا ہے اور ان میں جو تنوع اور انفرادیت ہے اس کو پیش نظر رکھنا چاہئے مثلاً تجزیے، ہم سفر بگولوں کا، رجحانات، ہم سخن فہم ہیں، لمحہ موجود، ادب اور ادیب، عرش صدیقی، جہاں تخلیق کا شہاب، حیات اور کارنامے (پی ایچ ڈی کا مکالمہ) تحقیق و تنقید منظر نامہ، تذکرہ کتابوں کا، وہ میرا محسن وہ تیرا شاعر، افکار و تجزیات، خواجہ فرید شخصیت اور فن میرے قلم سے نکلی ہوئی میری تحریروں کی واضح گواہی کے لئے کافی ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ اتنے کم عرصے میں اپنا تخلیقی و تنقیدی کام کسی نے بھی نہیں کیا۔ ان کتب میں سے بیشتر بھارت میں شائع ہو چکی ہیں۔ حال میں

ہی سچل سرشاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی خیر پور نے میری کتاب سچل سرمست محبتوں کا پیامبر شائع کی ہے اور آپ کے علم میں ہے کہ میری ادبی خدمات کے سلسلے میں اس سال حکومت پاکستان کی طرف سے مجھے ''تمغہ امتیاز'' سے نوازا گیا جو میری محنت اور کام کا ثمر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بھی شامل ہے۔

س کیا آپ گروپ ادبی بندی کے قائل ہیں اور کیا گروپ بندی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟

ج جہاں تک میرا ذاتی تعلق ہے یوں تو میں ادب میں گروپ بندی کا قائل ہوں اور اسے ہم خیال لکھنے والے دوستوں کا ایک حلقہ سمجھتا ہوں اور آج کے میڈیا کے دور میں جب تک کوئی لکھنے والا اپنے گروہ کے ساتھ نہیں چلتا تب تک اس کی شناخت نہیں بن سکتی البتہ اس سلسلے میں بددیانتی کا ارتکاب کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔ محض گروپ کے لئے کسی کی نفی کرنا اچھی بات نہیں۔ دوسرے گروپ کے لکھنے والوں کے اچھے کاموں کی تحسین بھی ہونی چاہئے مگر یہاں ایسا ہونا بہتر نہیں ہے کہ ادبی مزارعین صرف اپنے جاگیردار کی رطب اللسانی میں مصروف رہتے ہیں۔ یوں ادب میں جو تحریریں سامنے آئیں کیا وہ گروپ بند نہیں تھے۔ سرسید کی تحریک، فورٹ ولیم کی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک وغیرہ۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اس کے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اختلاف تو صحت مند دل و دماغ کی علامت ہے۔ بس ذرا اس میں خرابی پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔

س ادبی مافیا کا کیا حال ہے؟

ج ادبی مافیا کا جو حال پہلے تھا اب بھی وہی ہے۔ یہ لوگ ہر دور میں چھائے رہتے ہیں کہ ان سب کے پیش نظر مفادات ہوتے ہیں اور مفادات اور رعایت حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غیر ملکی دوروں سے لے کر اعزازات حاصل کرنے تک یہ مافیا کیا کیا نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حقدار مارا جاتا ہے۔ یہ قبضہ گروپ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔

س تنقید کی موجودہ صورت حال سے مطمئن ہیں؟

ج کسی حد تک مگر اچھی تنقید بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ بس وہ گنے چنے ناقدین ہیں جن کے حوالے موجود ہیں یا پھر مغربی ادب سے استفادے کی بھونڈی شکل دکھائی دیتی ہے۔ پہلے

ساختیات، پھر پس ساختیات اور پھر کچھ نہیں تاہم ایسے ناقد موجود ہیں جن کی وجہ سے تنقید کا بھرم قائم ہے۔

س سنا ہے آپ فلمیں بہت دیکھتے ہیں، کون سی فلمیں پسند ہیں؟

ج آپ کو کس نے کہہ دیا کہ میں فلموں کا شوقین ہوں۔ میں تو فلمیں دیکھتا ہی نہیں اور پھر یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ میں 1987ء سے انتظامی عہدوں پر تعینات رہا ہوں۔ دفتری ذمہ داریوں سے وقت نہیں ملتا تھا کہ فلمیں دیکھتا پھرتا اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی نوکری کر رہا ہوں۔ پڑھنا بھی اس میں شامل ہے اور انتظامی مصروفیات بھی ہیں۔ جوانی میں سینما جا کر فلم دیکھ لیتے تھے، اب تو ایسا بھی نہیں ہوتا۔

س کیا آپ موسیقی کے رسیا ہیں، کیسی موسیقی پسند ہے؟

ج میں موسیقی کا دلدادہ ضرور ہوں مگر راگ راگنی سے واقف نہیں ہوں البتہ غزلیں سننا زیادہ پسند کرتا ہوں اور اکثر اوقات ٹیپ ریکارڈر پر غزلیں لگا کر لکھنے کا کام کرتا ہوں تاکہ توجہ مرکوز رہے البتہ مجھے بعض فلمی گیت بہت ہانٹ کرتے ہیں، اس تناظر میں ہندوستانی گیت اچھے لگتے ہیں اور انہیں گنگناتا بھی رہتا ہوں۔

س کیا آپ کے نزدیک سرائیکی زبان وادب کی الگ شناخت ہے؟

ج سرائیکی میرے نزدیک الگ زبان ہی نہیں برصغیر پاک و ہند کی قدیم ترین زبان بھی ہے اور وسیع زبان کے ناتے یہ ہر علاقے اور ہر خطے میں بولی جاتی ہے۔ سندھ کے بسنے والوں کی زبان بھی سرائیکی ہے اور سومرو عہد میں اسے بڑا عروج حاصل رہا۔ سرائیکی کی ایک الگ زبان ہونے کے ناتے ایک منفرد شناخت ہے۔ املاء کے اعتبار سے بھی اور حروف کے اعتبار سے بھی کہ اس کے پانچ اضافی حروف ہیں اور یہ پنجابی زبان سے الگ تھلگ ہے اور اب تو یہ علاقائی زبانیں پاکستانی زبانیں ہیں۔ سرائیکی اب تدریسی زبان بھی ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اور بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں سرائیکی کے الگ شعبے ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لئے سرائیکی الگ سے شامل ہے۔ سرائیکی ادبی بورڈ ملتان نے سرائیکی زبان و ادب کی نو سے زیادہ کتب شائع کی ہیں اور پنجابی سرائیکی کے جس جھگڑے کا تذکرہ آپ کر رہے ہیں، وہ ماضی کا قصہ بن کر دفن ہو چکا ہے اور اس قصے میں بعض لوگوں کا ہاتھ ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب پر ناجائز قبضہ درست نہیں ہوتا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اسے ملتانی کہا ہے اور

اگراب پنجابی دانشور یہ کہیں کہ ملتانی سے مراد پنجابی ہے تو یہ سراسر تعصب کی بات ہے۔خواجہ فرید کو پنجابی شاعری کہہ دینے سے ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ خالصتاً پنجابی یا سرائیکی کے شاعر ہیں۔ پنجابی دانشوروں کا تو یہ حال ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کو بھی پنجابی شاعر قرار دیا ہے۔ یہ رویہ درست نہیں ہے۔ زبانیں ایک دوسرے کی دشمن نہیں ہوتیں۔ یہ تو لوگ ہوتے ہیں جو ان میں دشمنی کا بیج بونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ رہی بات سرائیکی صوبے کی تو میں لسانی بنیادوں پر تقسیم کا قائل نہیں ہوں۔ اگر پاکستان کو مزید صوبوں پر تقسیم کرنا ہے تو پھر یہ ایک انتظامی عمل ہوگا،لسانی نہیں۔

س مستقبل کے عزائم کیا ہیں؟

ج آپ جانتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے چیئر مین کی حیثیت سے کام کررہا ہوں۔ تدریسی اور انتظامی دونوں ذمہ داریاں میرے سپرد ہیں اور بلا مبالغہ یہ عطاء یونیورسٹی آف سرگودھا کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری صاحب کی ہے کہ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے یہ فریضہ سونپا ہے اور شعبہ اردو کی ترقی کے لئے ان کی رہنماء میں، میں آج شعبہ اردو کو تحقیقی وتنقیدی (ریسرچ ورک) کے حوالے سے نمایاں کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ ایم فل اردو کی کلاسوں کا اجراء ہو چکا ہے اور اب پی ایچ ڈی کی کلاس شروع کرنے کا پروگرام ہے۔فیکلٹی کے ریسرچ جرنل کی اشاعت کا کام بھی جاری ہے۔اس طرح کی مصروفیات میں سے جو وقت بچتا ہے اس میں میں اپنا تحقیقی وتنقیدی کام کرتا رہتا ہوں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ دیگر یونیورسٹیوں میں منعقد ہونے والے ادبی سیمیناروں میں بھی شرکت کروں۔آپ نے میرے آئندہ کے عزائم کے بارے میں استفسار کیا ہے تو چند منصوبے ایسے ہیں جن پر کام ہورہا ہے اور بعض کی اشاعت بہت جلد متوقع ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے:

1- شاعرِ خوشنوا،فیض احمد فیض

2- ماخذاتِ غالب (پاکستان میں غالب شناسی کا تناظر)

3- ماخذاتِ فیض

4- ماخذاتِ احمد فراز

5 -ماخذاتِ خواجہ فرید

6- مولوی لطف علی،شخصیت وفن (پاکستانی ادب کے معمار)

7- حالی اور پیروی مغربی (اس موضوع پر مکالات کا مجموعہ)

8- اردو ادب کا عالمی نظام اور دوسرے مضامین (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

س اردو ادب میں ایک بڑے شاعر کا نام لیں تو آپ کس کا ذکر کریں گے؟

ج اس عہد کے اعتبار سے میرے نزدیک میر تقی میر، غالب، اقبال اور فیض بلا خوف حرف تردید بڑے شاعر ہیں۔

عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تری اذان میں نہیں ہے مری سحر کا پیغام

OOO

ظفر اقبال

س ادبی سفر کا آغاز کیسے کیا، ابتدا میں کن سے متاثر تھے؟

ج میں اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب میں نے دیوان غالب اور کلیات میر کا بیشتر حصہ پڑھ ڈالا تھا لیکن مجھے چونکہ پتہ تھا کہ میں نے کبھی جا کر شاعری کرنی ہے اور اگر یہ دونوں اساتذہ میرے زیر مطالعہ رہے تو میں ان کے اثر سے کبھی نہیں نکل سکوں گا۔ تو اس خدشے کے پیش نظر کلیات میر میں نے اپنے دوست سید اسرار زیدی کو دے دی جو ان دنوں اوکاڑہ ہی میں رہائش رکھتے تھے اور دیوان غالب (مصور چغتائی ایڈیشن) کوئی میرے ہاں سے اٹھا کر لے گیا جس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے علاوہ میرا نہیں خیال کہ میں کبھی کسی کی شاعری سے متاثر ہوا ہوں۔ یہی دو شاعر شروع شروع میں میرے زیر مطالعہ آئے تاہم لکھنے کا آغاز میں نے بہت بعد میں اس وقت شروع کیا جب میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔

س تو کیا آپ مطالعہ کی نفی کرتے ہیں؟

ج میرا مطلب یہ ہے کہ ذہن پر اگر کوئی آدمی حاوی ہو جائے تو وہ اسی سے متاثر ہوتا ہے اس لئے میں نے اس خطرے کا ازالہ اس طرح کیا کہ ان دونوں اساتذہ کو وقتی طور پر اپنے آپ سے الگ کر لیا۔

س اوکاڑا سے نکل کر لاہور میں پہچان بنانے کے لئے آپ کو کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟

ج دراصل میری پہچان قیام اوکاڑہ کے دوران ہی بن چکی تھی، لاہور تو میں 1995ء میں آیا تھا اور یہ مسئلہ مجھے درپیش نہیں تھا۔

س آپ ہر وقت بڑے ''موڈ'' میں نظر آتے ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج میں موڈ میں ہوتا ہی نہیں کبھی بھی، بلکہ ساتھ بیٹھے دوستوں کے ساتھ حسب توفیق گپ شپ بھی کیا کرتا ہوں اور مجھے کبھی خیال نہیں ہوا کہ میں دوسروں سے الگ تھلگ غصے یا موڈ میں ہوتا ہوں نہ ہی میرا مزاج ایسا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو لیکن میں نے خود یہ بات کبھی محسوس نہیں کی

نہ ہی یہ میری شعوری کوشش کا حصہ ہے۔

س آپ بیک وقت وکیل، کالم نگار اور شاعر ہیں، تین متضاد شعبوں میں خود کو برابر کیسے تقسیم کرتے ہیں؟

ج مجھے ان میں ایسا کوئی تضاد نظر نہیں آتا، اب تو میں اس بات کا عادی ہو گیا ہوں بلکہ وکالت میں تو کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے مجھے مدد دی ہے مثلاً وکالت میں منطق اس کا لازمی حصہ ہے جو دلائل دیتے وقت کام آتی ہے تو کالم لکھتے وقت بعض اوقات میں اس منطق سے بھی کام لیتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں میرا کام آسان ہو جاتا ہے۔

س آپ کا کہنا ہے کہ کالم نگاری میں بھی آپ نے اپنی شاعری کی طرز پر اپنا وضع کردہ طریقہ اپنایا ہے؟

ج میں کہوں گا کہ یہ میری اپنی ایجاد ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن میں سمجھتا ہوں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ فکاہیہ کالم میں، میں پیروڈی لکھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں اور سرخیاں ان کی متن ہمارے بھی پیروڈی کی ہی ایک شکل ہے۔

س سرخیاں ان کی متن ہمارے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کیا، ''نوائے وقت'' کے کالم سر راہے ہی کی ایک شکل نہیں؟

ج سر راہے کے ساتھ اس کا تقابل بالکل نہیں کیا جا سکتا، وہ مختلف موضوعات پر ٹکڑوں میں کمنٹس ہوتے ہیں جب کہ سرخیاں ان کی متن ہمارا اس میں عام طور پر کسی سیاستدان کا بیان ہوتا ہے اور میں اس کو اپنی ٹریٹمنٹ دیتا ہوں اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس بیان کے اس حصے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے یا اس کا مضحکہ خیز پہلو یہ بھی نکل سکتا ہے یا یہ کہ بیان دینے والے کے دل کے کسی گوشے میں یہ بات بھی ہو سکتی ہے جو اس کے بیان کے بظاہر کے بالکل برعکس ہی کیوں نہ ہو بہر حال کالم نویسی کو میں نے اپنی شناخت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کام میں خود مزا لینے کی خاطر کرتا ہوں۔

س کالم نویسی ایسا سنجیدہ کام آپ صرف مزا لینے کے لئے کرتے ہیں؟

ج میرا مطلب یہ ہے کہ لکھنے میں شاعری بہت سنجیدہ کام ہے، میں اس سے بھی بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ ہر تخلیق کار اپنی تخلیق یا فن پارے سے بہت لطف اندوز بھی ہوتا ہے کیونکہ ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ آپ کے لئے حقیقی مسرت یہ احساس ہے کہ آپ کسی کام میں مکمل طور پر

Competent ہوں اور کرافٹ کے حوالے سے جب آپ محسوس کرتے ہیں بلکہ انچ کے حوالے سے بھی کہ آپ کی تخلیق وہ شعر ہو یا کالم ہو اس پر آپ کو ایک طرح کا عبور حاصل ہے تو لامحالہ اس احساس سے خوشی ہوتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عبور آپ کو حقیقتاً حاصل بھی ہو بلکہ یہ احساس ہی کافی ہے کہ آپ کسی صنف کسی انداز کسی لہجے یا کسی اسلوب پر ایک طرح کی قدرت رکھتے ہیں۔

س کیا ہر شخص کے لئے اپنا الگ تجربہ ضروری ہے؟

ج تجربہ جو میں نے کیا وہ شاعری کے حوالے سے کیا ہے اور یہ تجربہ آدمی اپنی ضرورت یا مجبوری کے تحت کرتا ہے یا سمجھتا ہے کہ اس میدان میں کہ تخلیقی تبدیلی یا کایا کلپ کی ضرورت ہے اور جو شعراء یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی نیا تجربہ کئے بغیر ہی تسلی بخش طور پر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھ سکتے ہیں وہ تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ میں نے مثلاً زبان کے حوالے سے محسوس کیا کہ مروج اور پرانی زبان نہ صرف یہ کہ میرے ساتھ نہیں چل سکتی بلکہ نئی شاعری کے لئے زبان کا نیا ہونا بھی اس حد تک ضروری ہے کہ اس کا طریقہ استعمال کم از کم نیا ہو اور زبان کے حوالے سے ہمارے ہاں بے جا Taboos پائے جاتے ہیں۔ اس سے گلوخلاصی کو میں نے بہت ضروری سمجھا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ زبان کے حوالے سے اگر کھل کھیلنے کی ہمت اور انداز نہ اپنایا جائے تو آپ زیادہ دیر اور زیادہ دور تک سامان رسائی حاصل نہیں کر سکتے چنانچہ یہ بات میرے تجربے میں آئی کہ وہ سرچشمے یعنی مقامی زبانیں جنہوں نے اردو کی آبیاری کی تھی ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کو اردو معلیٰ کہتے ہوئے یہ سرچشمے اس پر بند کر دیئے حالانکہ اردو اپنے طور پر کوئی زبان نہیں تھی بلکہ بہت سی زبانوں اور بولیوں کا ایک مجموعہ تھی جو عوام کی اکثریت میں بہت تیزی سے مقبول ہوئی اور پھیلی۔ ان دروازوں کو بند کرنے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا کہ اس زبان کے بہت سے الفاظ کثرت استعمال سے گھس چکے ہیں اور انہوں نے معنی دینا بند کر دیا ہے چنانچہ میں نے ان زبانوں اور بولیوں، الفاظ، لب ولہجہ، محاوروں اور روزمرہ (Flood Gate) اس زبان پر دوبارہ کھول دیا جس کی پہلی مثال میرے دوسرے شعری مجموعے گلفتاب میں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان میں میں نے زیادہ تر پنجابی زبان کے استعمال کے امکانات کا جائزہ لیا ہے بلکہ پنجابی کے وہ لفظ جو اردو میں متروک ہو چکے چکے تھے ان کے بارے میں مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ دراصل یہ تو بہت عرصے سے اردو میں استعمال ہوتے رہے ہیں جن کا استعمال بعد میں ترک کر دیا گیا، یہ اشفاق احمد کی ایک چھوٹی سی کتاب اردو کے خوابیدہ الفاظ سے مجھے علم ہوا۔

س لفظوں کو غیر متروک قرار دینے کا اختیار کس کے پاس ہے؟

ج کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو عمومی سطح پر نہیں کئے جاتے بلکہ تخلیق کاروں اور مصنّفین کی سطح پر کئے جاتے ہیں اور انہیں بدلا یا ان کی کایا کلپ بھی اسی سطح پر ہوتی ہے اور میں نے اس نظریے کے تحت بطور ایک مصنف اور تخلیق کار کے اس تبدیل شدہ صورت حال کو دوبارہ روایت دینے کی کوشش کی۔ یہ کام زیادہ تر نقاد حضرات کرتے ہیں جو اپنے طور پر زبان کے مدوجزر اور الفاظ کے سکہ رائج الوقت ہونے کے بارے میں وقتاً فوقتاً فیصلے کرتے رہتے ہیں۔

س گویا اس طرح آپ نے عوامی زبان کو ادبی زبان بنا دیا ہے؟

ج یہ عمل چلتا رہتا ہے عوامی زبان ادبی زبان بنتی رہتی ہے اور ادبی زبان عوامی کہ یہی جاتا ہے کہ زبان میں کسی بھی تبدیلی کا عمل عوامی سطح پر ہوتا ہے اور اس میں شعوری کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لیکن ایک تخلیق کار چونکہ مستقبل بیں ہوتا ہے اس لئے وہ آنے والی ضروریات اور صورت حال کو سو پچاس سال پہلے بھی دیکھ سکتا ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ میرا نقطہ نظر غلط نہیں تھا، وہ اس طرح سے کہ اب آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں اردو عوامی سطح پر بھی اب وہ اردو نہیں ہے جو پچاس سال پہلے بولی اور لکھی جاتی تھی حتیٰ کہ اخباری زبان تک تبدیل ہو گئی ہے اور یہ عمل پاکستان کے تمام صوبوں میں یکساں طور پر ہوا ہے یعنی پنجاب میں بولی اور لکھے جانے والی زبان اس طرح تبدیل ہوئی ہے کہ اس میں پنجابی کے بے شمار لفظ لب و لہجے محاورے اور انگ شامل ہو گئے ہیں جو پہلے نہیں تھے جب کہ دوسرے صوبوں سندھ اور خصوصاً سرحد میں بھی یہی کچھ ہوا حتیٰ کہ سرحد پار بھارت میں بھی اخبارات ریڈیو، ٹیلی ویژن اور شعر و ادب میں جو اردو زبان کارفرما ہوئی ہے وہ حیرت انگیز حد تک تبدیل ہو چکی ہے اور اس میں ہندی، سنسکرت، پنجابی اور انگریزی کے الفاظ اور لہجے کثرت کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ میرا عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زبان میں تبدیلی کا عمل شعوری (تخلیقی سطح پر) اور عوامی یعنی بول چال کی سطح پر برابر جاری رہتا ہے اور ان دونوں کوششوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا پھر میرا ایک تھیسز یہ بھی ہے کہ پاکستان کی ایک قومی زبان ایسی ہونی چاہئے جو اس کی چاروں علاقائی زبانوں کے مجموعے سے بنتی ہو کیونکہ صرف اسی ایک طریقے سے چاروں صوبوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکتا ہے اور انہیں ایک قوم کی صورت دی جا سکتی ہے جو اسے آج تک حاصل نہیں ہو سکی اور جو کہ ہمارا بہت بڑا المیہ بھی ہے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ صرف مذہب بھی ہمیں ایک قوم بنا سکنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ جو دوری

مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان میں اس حد تک پیدا ہوئی کہ ان دونوں طرف اسلام موجود تھا۔

س زبان کا رشتہ تو ہمارا انڈیا کے ساتھ بھی کافی حد تک موجود تھا پھر ہمیں علیحدہ وطن کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ج معاشی طور پر انہوں نے ہمارا جینا دشوار کر رکھا تھا اور آئندہ بھی کر سکتے تھے اور اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیں دبائے رکھنے کا شوق پورا کر سکتے تھے اور ہم سے سینکڑوں سال کی اس حکمرانی کا بدلہ لے سکتے تھے جو انگریزوں کے آنے سے پہلے ان کے تجربے میں آئی تھی اور بھی کئی عوامل ایسے تھے جن کی وجہ سے ہمیں ان سے الگ ہونا پڑا اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مذہب جو ہے اگر کئی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے تو کئی معاملات اس کے دائرہ کار میں نہیں آتے اور جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں ورنہ اگر ہم اندر اور باہر دونوں طرف سے مسلمان ہوتے تو ایک امت مسلمہ کی شکل اختیار کرتے ہوئے اس یگانگت اور یکجہتی کا مظاہرہ کرتے جو ہمارے ہاں مفقود نظر آتی ہے۔ زبان کا حوالہ یہاں عملی طور پر ظاہر ہوا ہے کہ ایک بلوچی، سندھی اور پختون، پنجابی نہیں جانتا اور اسی طرح پنجابی ان صوبوں کی زبان بول سکتے ہیں لکھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں حالانکہ یہ صوبے ایک ہی ملک میں واقع ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ اگر ان علاقائی زبانوں کے فاصلے اتنے کم ہو جائیں کہ ایک یگانگت کا احساس پیدا ہو سکے تو ہماری قومی یکجہتی کا الجھا ہوا مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے۔

س تجربہ کرنے کے لئے کسی قسم کی اہلیت درکار ہے؟

ج اگر زبان کا تجربہ کر رہے ہیں تو آپ کو زبان پر خاصی حد تک عبور حاصل ہونا چاہئے، یہ نہ ہو آپ زبان سے اپنی لاعلمی کو بہانے کے طور پر پیش کریں۔ اگر آپ کو زبان پر قدرت حاصل نہیں ہے تو آپ کو اس کام میں ہرگز ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے کیونکہ اس کا نتیجہ ناکامی ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو تجربہ آپ کرنا چاہتے ہیں یا جو تبدیلی آپ لانا چاہتے ہیں۔ اس نظریے پر آپ کا مکمل ایمان بھی ہو۔ تیسرے اس تجربے کو بروئے کار لانے کے لئے جس دلیری اور جرأت کی ضرورت ہے وہ بھی آپ میں موجود ہو اور یہ تجربہ آپ اس بات سے بے پروا ہو کر کریں کہ دوسرے کیا کہیں گے یا یہ کہ وہ تجربہ کامیابی کا منہ دیکھتا ہے یا نہیں کیونکہ کسی تجربے کا 5 فیصد کامیاب ہو جانا بھی اس کی کامیابی ہی کی دلیل ہے۔ حتیٰ کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک تجربہ مکمل طور پر ناکام بھی ہو جاتا ہے تب بھی یہ ایسا ہے کہ اسے کیا جانا چاہئے اور تبدیلی کی کوشش مسلسل کرتے

رہنا چاہئے کیونکہ تازگی اور تبدیلی تجربے سے ہی میسر آسکتی ہے بلکہ ایک قول جس کا میں حوالہ بھی دیا کرتا ہوں، یہ ہے کہ کچھ نہ سوچنے سے غلط سوچنا بہرحال بہتر ہے اور میں اپنے ضمن میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اگر اب تک شعری ادب اور ادبی منظر پر موجود ہوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ان تجربات سے خود فائدہ اٹھایا ہے۔ اگرچہ دوسروں کے لئے فائدہ اٹھانے کی دعوت بھی اس میں موجود تھی لیکن اگر کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا تو شاید اس لئے بھی کہ اس کام میں بہرحال خطرات مول لینے پڑتے ہیں اور اپنی بنی بنائی شناخت اور امیج کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے جب کہ میرے اندر یہ جرأت رندانہ تب بھی موجود تھی اور اب بھی اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ میں غلط ہوسکتا ہوں لیکن جسے میں صحیح سمجھتا ہوں اسے ضرور کرگزرتا ہوں۔ اس سے میرے بڑے مخالفین وجود میں آئے لیکن اگر میں اس بات کا خیال کرتا تو شاید کبھی کچھ نہ کرسکتا اور اپنے ساتھ آغاز سفر کرنے والوں کی طرح ربع صدی پہلے سے ہی ایک قصہ پارینہ ہوکر شعری و ادبی ریٹائرمنٹ لے چکا ہوتا۔

س جیسا کہ آپ نے ابھی کہا، اگر آپ کو زبان پر قدرت حاصل نہیں تو آپ کو اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے کیونکہ اس کا نتیجہ ناکامی بھی ہوسکتا ہے، کیا ہم اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں اس کا نتیجہ تجربہ بھی ہوسکتا ہے؟

ج یہ دو کیٹیگریز ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کو زبان پر قدرت حاصل ہو لیکن آپ اس میں تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کریں، دوسری یہ کہ زبان پر قدرت حاصل ہونے کے باوجود آپ اس سے مطمئن نہ ہوں اور وہ آپ کے ساتھ چل نہ رہی ہو اور آپ سمجھ رہے ہوں کہ اس میں بنیادی تبدیلیاں کئے بغیر آپ اپنا تخلیقی سفر جاری نہیں رکھ سکتے تو پھر آپ کی یہ مجبوری بن جاتا ہے کہ آپ زبان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کریں، حسب ضرورت اس کی توڑ پھوڑ کریں اور بطور خاص شاعری میں ایسے طریقے سے استعمال کریں جو وسعت زدہ از کار رفتہ اور روائتی نہ ہو اور آپ کے مزاج سے لگا کھاتا ہو اور آپ کے تخلیقی وفور کا ساتھ دے سکتا ہو۔

س اس طرح بیک وقت دو محاذ پر لڑائی سے کیا تخلیقی قوت متاثر نہیں ہوگی؟

ج اس طرح تجربہ آپ کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے پھر کوئی تضاد باقی نہیں رہ جاتا بلکہ یہ تجربہ آپ کو نئی طاقت توانائی اور تازگی بخشتا ہے۔

س ہمعصر کالم نگاروں اور شاعروں میں سے کن سے متاثر ہیں، چند ایک نام ضرور لیں؟

ج نہ میں کسی شاعر سے متاثر ہوا ہوں نہ کسی کالم نگار سے بلکہ میں شعروادب میں متاثر کرنے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے اس ضمن میں کبھی استادی شاگردی کا روگ پالا ہے۔

س اپنے ایک انٹرویو میں آپ نے یہ بات کی کہ آپ نے اوکاڑہ میں بیٹھ کر پاکستان کے دو بڑے ادبی گروپوں کا ناکوں چنے چبوائے، کیا یہ بات درست ہے اور کیا یہ خود کو منوانے کا ایک طریقہ تو نہیں تھا؟

ج اس میں مقصد تھا کہ ادب میں گروپ بازی یا دھڑے بندی ادب کو نقصان پہنچاتی ہے اور میں چونکہ بنیادی طور پر دھڑے بازی کے خلاف تھا اس لئے یہ دونوں دھڑے اور ان کے لیڈر بطور خاص میرا قدرتی ہدف بنتے تھے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی شناخت بنانے اور اپنے مقام کو اونچا کرنے کے لئے ان دونوں دھڑوں نے ایک طرح سے اپنی اپنی آڑھت کھول رکھی تھی اور اپنے اپنے ادبی رسالے کے ذریعے یہ اپنی اپنی دوکانداری چمکانے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف افسوسناک حد تک صف آراء تھے اور ایک ادبی بدمزگی انہوں نے پیدا کر رکھی تھی جو آج بھی جاری وساری ہے چنانچہ میرے جیسے آدمی کا ان دھڑے بازوں کو آنکھیں دکھانا اور ان کو ان کی اصلی حیثیت سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں اس کام کے ذریعے اپنی پہچان بنانے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ اس لئے غلط ہے کہ میں تو خود بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا کیونکہ صورت حال یہ تھی اور کم وبیش اب تک بھی جاری وساری ہے کہ پاکستان کا کوئی شاعر ادیب ان دونوں دھڑوں میں سے ایک کے ساتھ وابستہ ہوئے بغیر یا دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھے بغیر یا دونوں دھڑوں کے بارے میں ایک منافقانہ مرنجان رویہ اختیار کئے بغیر ادبی منظر پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے ابتداء میں ان دونوں دھڑوں کی طرف سے ہمیشہ مثبت سلوک اور رویہ میسر آیا لیکن چونکہ ان کا کام غلط تھا جس کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں۔ اس لئے میرے پاس ان دونوں کو مسترد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اور میں نے ان کی اس سیاست کا نہ صرف ہمیشہ سے انکار کیا ہے بلکہ اس کے خلاف اپنی بساط کے مطابق صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے اور بعض اوقات یہ ناگوار فرض بھی ادا کرنا پڑا ہے کہ تخلیقی اعتبار سے ان دونوں ادبی رہنماؤں کی اصل حیثیت کیا ہے، کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا رہا ہوں جس کا کہ مجھے ہر طرح سے حق حاصل ہے اور جس طرح کہ ہر لکھنے والے کا ہر دوسرے لکھنے والے کے بارے میں رائے ظاہر کرنے کا استحقاق موجود ہوتا ہے، ورنہ مجھے الحمدللہ ان کے ذاتی یا شخصی کردار سے کبھی

دلچسپی نہیں رہی۔اسی لئے میں ان کے فن کے بارے میں گفتگو کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

س آپ اور آپ کے بعد کی نسل کے شاعر اسلم کولسری کے بعد اوکاڑہ کے ادبی منظر پہ کوئی قابل ذکر نام جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟

ج اوکاڑہ میں ایک دو شاعر ہیں،مثلاً مسعود احمد اور جاوید اختر مانو وہاں پر دو جینوین شاعر تخلیق شعر ادب میں مصروف ہیں جن کی دو دو تین تین کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ان میں جاوید اختر مانو زیادہ جدید، زیادہ جاندار اور زیادہ مزاحمتی ہے۔ وہ نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کرتا ہے۔اس نے شاعری کے علاوہ چند بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔اس کے علاوہ ہمارے سینئر دوست اقبال صلاح الدین ہیں جو بیماری کی حالت میں بھی اپنے تخلیقی اور تحقیقی کام میں مصروف رہتے ہیں۔

س ادب کی ترقی وترویج میں ادبی اخبارات ورسائل کے مدیران کا کیا کردار ہے اور کیا ان کی اس ادبی خدمت کے صلے میں حکومتی سطح پر اعتراف ہونا چاہیئے؟

ج ان کا بالکل حصہ ہے بلکہ میں نے اپنے ایک انٹرویو میں اوراق اور فنون، دونوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا تھا البتہ جو ادبی خبر نامے قسم کے اخبارات نکلے ہیں، ان کی اپنی ایک افادیت ہے اور شاعروں، ادیبوں کو ایک دوسرے کے ذاتی اور فنی معاملات سے آگاہ کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے جو دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور انہوں نے ایک اچھے خاصے خلا کو پر کر رکھا ہے۔ جہاں تک ایوارڈز کا تعلق ہے تو یہ دینے والوں کا تعلق ہے کہ وہ کس کا ایوارڈ دیتے ہیں اور کس کا نہیں۔البتہ یہ مدیران کرام چونکہ اپنی حیثیت میں مسلمہ طور پر شاعر یا ادیب بھی ہیں۔اس حیثیت میں وہ ایوارڈ دینے والوں کی نگاہ انتخاب میں آسکتے ہیں اور کئی حضرات کو یہ ایوارڈز مل بھی چکے ہیں۔

OOO

عطاء الحق قاسمی

س آپ بیک وقت استاد، ڈرامہ نویس، سفرنامہ نگار، شاعر اور کالم نگار ہیں، آپ کے خیال میں آپ کی اصل پہچان کس حوالے سے ہے؟

ج میرا خیال ہے کہ شاعری کے علاوہ باقی جتنی اصناف میں لکھتا ہوں اس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ میرے ٹی وی ڈرامے طنز و مزاح کی ذیل میں آتے ہیں۔ میرے کالموں میں فکاہیہ عنصر نمایاں ہے۔ اسی طرح میرے سفرناموں میں بھی یہی فضا غالب نظر آتی ہے۔ چنانچہ میرے خیال میں میری پہچان طنز و مزاح کے حوالے سے بنتی ہے۔

س کالم نگاری کی طرف آپ کا رجحان حادثاتی تھا یا باقاعدہ آپ کے ذوق شوق کی علامت کے طور پر سامنے آیا؟

ج کالم نگاری کا آغاز میں نے فرسٹ ایئر میں کیا جب ایم اے او کالج میں طالب علم تھا۔ یہ 1960ء کی بات ہے اور یوں اگر دیکھا جائے تو آج میری کالم نگاری کی عمر 40 سال ہو چکی ہے جس میں چونتیس سال میں نے صرف ''نوائے وقت'' کے لئے کالم لکھا ہے۔ میں حادثاتی طور پر کالم نگار نہیں بنا بلکہ یہ تحفہ مجھے اپنے والد ماجد مولانا بہاؤالحق قاسمی کی طرف سے وراثت میں ملا۔ والد محترم ایک جید عالم دین ہونے کے علاوہ ایک پندرہ روزہ کے ایڈیٹر بھی تھے جس میں وہ خود فکاہیہ کالم بھی لکھتے۔ یوں یہ چیزیں میرے خون میں شامل ہیں۔

س نوائے وقت کے ساتھ اس قدر شدید وابستگی کے پیچھے کیا کوئی نظریاتی وجہ ہے؟

ج شاید اس لئے کہ میری پہلی تقرری بطور سب ایڈیٹر نوائے وقت میں ہوئی۔ وہاں سے میں نے باقاعدہ کالم نگاری کا آغاز کیا اور آج تک میں اسی اخبار سے وابستہ ہوں کیونکہ بقول میر:

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

مجھے دوسرے اخباروں سے بہت بڑی آفرز بھی موصول ہوئیں مگر میرا دل نہیں مانتا تھا کہ

میں صرف دولت کی خاطر اپنا اخبار تبدیل کروں حالانکہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا مگر یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔

س بقول ظفر اقبال:

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفرؔ
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہئے

اس شعر کے تناظر میں یہ بتایئے کہ ایک ادیب یا کالم نگار کو کس حد تک نظریاتی ہونا چاہئے؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ ایک ادیب کی نظریاتی کمٹمنٹ معاشرے کے دیگر افراد سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہونی چاہئے۔ بہت سے ادیب اور دانشور فاٹا گروپ کے ارکان کی طرح ہر حکومت کی سیاسی اور نظریاتی بیل گاڑی میں جتے نظر آتے ہیں۔ یہ ادب اور ادیب کی توہین ہے۔ جو ادیب قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی تربیت کا اہتمام نہیں کرتا وہ ادیب نہیں ''مالشیا'' ہے۔

س موجودہ مجموعی ملکی صورت حال کے حوالے سے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہمارا دانشور طبقہ اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہا ہے؟

ج ہمارا دانشور طبقہ بالکل اسی طرح آج بھی اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کر رہا ہے جس طرح اس نے 1857ء کی جنگ آزادی اور 1947ء کی تحریک پاکستان میں عوام کی خواہشوں، ان کی امنگوں اور ان کی آرزوؤں سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔ بہت کم دانشور ایسے ہیں جو اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے رہنا جانتے ہیں ورنہ چھوٹے چھوٹے مفادات، گھٹیا خواہشیں اور جھوٹی اَنا انہیں اس رستے پر لے جاتی ہیں جو ایک دانشور کا رستہ نہیں ہوتا۔

س آزادیٔ صحافت کے حوالے سے آپ موجودہ حکومت کے کردار کو کس حوالے سے دیکھتے ہیں؟

ج مجھے موجودہ حکومت سے بنیادی اختلاف ہیں جن کا اظہار میں 12 اکتوبر 1999ء سے آج تک پورے تواتر اور بلند آہنگی کے ساتھ کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن میرے نزدیک ڈیول، کو اس کا ڈیو ضرور دینا چاہئے۔ اس کے مطابق مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ اس حکومت نے پریس کو بہت حد تک آزادی دے رکھی ہے جس کی گواہی اخبارات کے صفحے بھی دیتے ہیں۔

س بین الاقوامی مشاعروں میں آپ کو بطور شاعر دعوت دی جاتی ہے جبکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اور جیسا کہ آپ نے اس گفتگو میں خود بھی اعتراف کیا ہے کہ آپ کی اصل شہرت اور مقام بحیثیت مزاح نگار ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج اس میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مزاح نگار کے طور پر پہچان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے یا دوسرے لوگوں نے بطور شاعر میری پہچان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میں نے اندرون ملک اور بیرون ملک بے شمار مشاعرے پڑھے ہیں اور ہر مشاعرے میں میری شاعرانہ حیثیت کی بے پناہ پذیرائی ہوئی ہے جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مجھ سے ملتی جلتی مثال منو بھائی کی بھی ہے جو ایک کالم نگار کے طور پر پہچانے جاتے ہیں مگر لوگ انہیں مشاعروں میں بطور شاعر بھی مدعو کرتے ہیں اور ان کا کلام ثابت کرتا ہے کہ وہ بہت عمدہ شاعر بھی ہیں۔ ایک اور بات جو اس حوالے سے میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ منتظمین صرف ان شعراء کو اپنے مشاعروں میں مدعو کرتے ہیں جن کی عوام میں مانگ ہوتی ہے تاہم اس سے ان شعراء کا دل کھٹا نہیں ہونا چاہئے جنہیں مشاعروں میں نظر انداز کر دی جاتا ہے کیونکہ عوامی مقبولیت یا عدم مقبولیت کسی کے بڑا یا چھوٹا شاعر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

س مشاعروں میں شرکت کے حوالے سے کسی ادبی پرچے کی ادارت یا ادبی ایڈیشن کی انچارج شپ کس حد تک معاون ہو سکتی ہے؟

ج جہاں تک ادبی ایڈیشن کا معاملہ ہے، اس کا بہتر جواب تو وہ دے سکتے ہیں جو کسی ادبی ایڈیشن کے انچارج ہیں مگر جہاں تک ادبی پرچے کا مدیر ہونے کا تعلق ہے تو بے شمار ادبی پرچوں کے مدیر ایسے ہیں جو شاعر بھی ہیں مگر انہیں مشاعروں میں شرکت کا موقع نہیں ملتا۔ اس کی وجہ وہی ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مشاعرہ پڑھنا یا نہ پڑھنا کسی کے چھوٹے یا بڑے شاعر ہونے کی دلیل نہیں۔

س اپنے موجودہ مقام وحیثیت سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج آپ کو سن کر حیرت ہوگی، زندگی میں کسی بھی مقصد کے لئے میں نے کبھی کوئی پلاننگ نہیں کی۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس کی رحمت اور اپنے والدین کی دعاؤں کی بدولت ہوں۔ میں نوائے وقت میں سب ایڈیٹر بھی حادثاتی طور پر بنا، کالج میں لیکچر شپ بھی حادثاتی طور پر ملی اور ناروے میں بطور سفیر میرا تقرر بھی میری طلب کے بغیر ہوا بلکہ میں نے انکار کیا مگر جس طرح زندگی کے دوسرے مواقع پر وہ کچھ بنتا چلا گیا جس کی میں نے خواہش نہیں کی تھی، یہاں بھی وہی معاملہ درپیش ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ 12 اکتوبر 1999ء کو سفارت کے عہدے سے استعفیٰ دیتے ہوئے مجھے رتی بھر ملال محسوس نہیں ہوا۔ میں آج بھی اتنا ہی مطمئن اور خوش ہوں جتنا ہمیشہ سے تھا۔

س تھائی لینڈ اور ناروے میں بطور سفیر کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟

ج جیسا کہ میں نے آپ کو ابھی یہ بتایا کہ اس عہدے کو قبول کرنے کے سلسلے میں میرے کچھ تحفظات تھے مگر جب مجھے سوا دو سال ناروے اور تھائی لینڈ میں بطور سفیر کام کرنے کا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ اگر میں یہ عہدہ قبول نہ کرتا تو شاید ایک بہت بڑے تجربے سے محروم رہ جاتا۔ بطور سفیر مجھے اس شعبے میں جھانکنے کا موقع ملا جس کا موقع بطور ادیب نہیں مل سکتا تھا اور یوں میرا Vision پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہوا جو میرے تخلیقی کاموں میں معاون ثابت ہوا۔

س بطور سفیر آپ جن تجربات ومشاہدات سے گزرے ان کو کتابی شکل دینے کا کوئی ارادہ ہے؟ اگر ہے تو کب تک ہے؟

ج میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے تجربات کتابی صورت میں بیان کروں مگر یہ ایک خاصا محنت طلب اور نازک کام ہے، ان شاء اللہ کسی مناسب موقع پر اپنے یہ تجربات احاطہ تحریر میں لاؤں گا۔

س کافی دیر ہوگئی ٹی وی پر آپ کا کوئی ڈرامہ دیکھنے میں نہیں آیا، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج میں اصل میں ڈرامہ اپنی خواہش سے کبھی نہیں لکھتا۔ میرے ڈرامے خواجہ اینڈ سن، شب دیگ، حویلی، اپنے پرائے، الیکشن الیکشن اور شیدا ٹلی ٹی وی والوں کے بے پناہ اصرار کے تحت لکھے گئے۔ ان دنوں پرائیویٹ پروڈکشن والوں نے مجھ پر یلغار کی ہوئی ہے تاہم میں ابھی تک کسی کے قابو میں نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے آئندہ سال کوئی ڈرامہ لکھوں مگر میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

س کچھ خاندانی پس منظر، بچپن اور تعلیم وغیرہ کے بارے میں بتائیں؟

ج میں یکم فروری 1943ء کو امرتسر میں پیدا ہوا۔ میری انتہائی خوش بختی ہے کہ میرے والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمی تھے جو ایک نامور عالم دین اور کئی کتب کے مصنف تھے۔ ان کی ایک اہم تصنیف ''تذکرۃ الاسلاف'' ہے جو ہمارے بزرگوں کے بارے میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے اسلاف کی تاریخ گزشتہ ایک ہزار برس پر محیط ہے۔ دوسری اہم کتاب ہے ''اسلام اور اشتراکیت''، یہ ابا جی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی چوہدری افضل حق کے ساتھ ایک علمی بحث پر مشتمل تھے۔ یہ مضامین بعد ازاں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ والد محترم امرتسر ہی سے ایک پندرہ روزہ مجلہ ضیاء الاسلام بھی نکالتے تھے جس کے وہ خود مدیر بھی تھے اور اس میں ایک فکاہی کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ فکاہی کالم نگاری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ میرے دادا مفتی غلام مصطفی قاسمی ایک مشہور عالم دین اور

امرتسر کے مفتی تھے۔ ان کے شاگردوں میں بہت بڑی بڑی شخصیات شامل ہیں جن میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسن نمایاں ہیں۔ میرے دادا کے والد اور ان کے والد اسی طرح ہمارے خاندان میں ایک ہزار سال تک کوئی بزرگ ایسا نہیں گزرا جس کی علمی و دینی خدمات تاریخ میں ریکارڈ نہ ہوئی ہوں۔ ہمارے آباؤ اجداد عرب سے آئے تھے اور ہم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ وہ لوگ عرب سے آ کر ہندوستان میں آگرہ میں آباد ہوئے اور وہاں سے کشمیر چلے گئے۔ یہ کوئی آٹھ سو سال قبل کی بات ہے۔ علم کا چراغ انہوں نے ہمیشہ ہی روشن رکھا۔ ہمارے اسلاف کے شاگردوں میں حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔ ہمارے خاندان کے بزرگوں میں دو افراد ایسے بھی ہیں جن کو دوسرے ممالک میں سفارت کاری کا شرف حاصل رہا۔ گویا سفارت کاری بھی مجھے ورثے میں ملی ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے علم سے محبت عطا فرمائی۔ کشمیر میں آٹھ سو سال رہنے کے بعد میرے بزرگ امرتسر آ گئے۔ چنانچہ آپ یہ سمجھ لیں کہ پنجاب میں ہمارا خاندان گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے آباد ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری پیدائش امرتسر کی ہے، جب پاکستان قائم ہوا تو ہم لوگ ہجرت کر کے وزیر آباد آ گئے۔ وزیر آباد آنے کی وجہ غالباً یہ رہی ہو گی کہ میری نانی اماں رہائش پذیر تھیں۔ میں نے پرائمری تعلیم وزیر آباد سے حاصل کی اور میٹرک کرنے کے دوران ہم لوگ ماڈل ٹاؤن شفٹ ہو گئے۔ وزیر آباد میں اباجی ایک سکول میں مدرس تھے۔ والد صاحب کے مرشد تھے مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ والے اور مفتی صاحب کے مرشد میرے دادا تھے۔ اس طرح میرے والد اور مفتی محمد حسن کے درمیان دہرا رشتہ قائم تھا۔ مفتی صاحب نے میرے والد صاحب کو حکم فرمایا کہ وہ جامعہ مسجد ماڈل ٹاؤن کی خطابت کے فرائض سنبھال لیں۔ والد محترم یہاں نہیں آنا چاہتے تھے لیکن چونکہ استاد کا حکم تھا اس لئے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ماڈل ٹاؤن آ گئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہم بھی یہاں شفٹ ہو گئے۔ اس لئے میٹرک میں نے ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن سے کیا۔ بی اے ایم اے او کالج لاہور اور ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اورینٹل کالج سے حاصل کی۔ ماڈل ٹاؤن میں میرا حلقہ احباب طبقہ امراء کے آزاد خیال نوجوانوں پر مشتمل تھا جبکہ میرے گھر کا ماحول نہایت علمی اور دینی تھا۔ مزید یہ کہ گھر میں امارات کی بھی کوئی جھلک نہ تھی۔ چنانچہ یہ دو متضاد حالات تھے جن سے مجھے گزرنا پڑا لیکن اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ میں ملا بنا نہ مسٹر بلکہ میانہ روی اختیار کرتے ہوئے وہ بنا جو آج سب کے

سامنے ہوں۔

س یہ جو آپ نے کہا کہ آپ کا حلقہ احباب ماڈل ٹاؤن کے آزاد خیال نوجوانوں پر مشتمل تھا، تو یہ بتائیے کہ ان میں کون لوگ شامل تھے اور ان دنوں آپ کی کیا مصروفیات رہتی تھیں؟

ج جی میرا تمام دوست طبقہ امراء سے تعلق رکھتا تھا جو بڑے آزاد خیال لوگ تھے اور انہی کے ساتھ میرا تمام وقت گزرتا تھا۔ ایک بات جو بہت اہم ہے وہ میں بتاتا چلوں گا کہ اگرچہ میرے تمام دوست بہت متمول گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن میری تربیت میں ہمارے خاندان کی علمی و دینی خدمات نے وہ فخر و غرور پیدا کر دیا تھا کہ اس افتخار نے کبھی بھی مجھے مادی آسائشوں سے مرعوب نہیں ہونے دیا۔ میں اپنے امیر دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا اور اس کے باعث میری شخصیت کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچی۔ ان لوگوں کی کوٹھیاں، زرق برق لباس، کاریں اور دولت کی ریل پیل میرے لئے قطعی غیر اہم تھی۔ اگر میرے اندر یہ افتخار نہ ہوتا تو میری شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی۔ دوسری طرف میرے دوست بھی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے میری مالی کم مائیگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ یہ ایک غیور شخص ہے اس لئے ان کا طرزِ عمل بھی ہمیشہ مثبت رہا۔ ان دوستوں کے ساتھ گزرا ہوا وقت آج بھی سہانے خواب کی طرح یاد آتا ہے۔ ان دنوں ہم لوگ سارا دن گھومتے پھرتے تھے۔ سیر سپاٹے کرتے اور وقت گزارنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ کبھی موڈ آتا تو مری نکل جاتے، کبھی پشاور چلے جاتے۔ اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے میٹرک کیا تو والد محترم نے کہا کہ وہ مجھے دینی تعلیم کے لئے جامعہ اشرفیہ میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ میں تو ایسا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ میں خود بھی دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن میٹرک کے بعد اس کا وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا جو آپ چاہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ پہلے بی اے کر لوں ورنہ تو ملاؤں میں ایک اور ملا کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح بڑی مشکل سے میں نے والد صاحب کو راضی کیا کہ وہ مجھے بی اے کر لینے دیں۔ جب میں نے بی اے کر لیا تو انہوں نے کہا کہ چلو جامعہ اشرفیہ۔ اب میں نے جامعہ اشرفیہ کا ماحول دیکھا ہوا تھا۔ وہاں لڑکوں نے ٹنڈیں کرائی ہوئی اور ٹخنوں سے اونچے پاجامے پہنے، پاؤں سے ننگے، برے حالوں میں پھرتے تھے۔ میرے ذہن میں اس طرح کا نقش ثبت ہوا تھا کہ میں وہاں جانے سے خوفزدہ تھا۔ اب کی بار والد صاحب کو منانا بہت مشکل تھا اس لئے میں نے والدہ ماجدہ کی امداد بطور کمک حاصل

کی۔ انہوں نے کہا چلو تم ایم اے کر لو لیکن ایم اے کے بعد میں نے ضرور تمہیں وہاں داخل کرانا ہے۔ جب میں نے ایم اے کر لیا تو والد صاحب نے کہا کہ ایم اے کرنے کے بعد اب تمہارا جامعہ اشرفیہ جانا کچھ زیادہ مناسب نہیں اس لئے میں تمہیں مدینہ یونیورسٹی میں داخل کرا دیتا ہوں۔ اب چونکہ میں کسی حد تک خود مختار ہو گیا تھا اس لئے میں وہاں بھی نہ گیا۔

س گویا آپ دینی تعلیم سے دور بھاگتے رہے؟

ج ایسی بات بھی نہیں، جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے تو آپ اس وقت بھی میری سٹڈی دیکھ رہے ہیں کہ اس میں کتنی زیادہ کتابیں ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میرے والد ماجد کے ذخیرہ کتب میں اس سے بھی زیادہ کتابیں تھیں اور ہر کتاب نہایت ہی اعلیٰ اور قیمتی اور دنیا کے تمام مذاہب پر۔ میں نے آٹھویں جماعت سے ہی ان کی لائبریری میں مطالعہ شروع کر دیا تھا اور اس وقت تک میں گویا ان کی پوری لائبریری گھول کر پی چکا تھا۔ چنانچہ جہاں تک دینی علم اور معلومات کا تعلق تھا، وہ مجھے خاصی حد تک حاصل تھی۔ اس کے علاوہ والد صاحب نے قرآن پاک کی تفسیر مجھے پڑھانا شروع کی تھی لیکن افسوس کہ میں نے چند پارے ہی پڑھے لیکن ان کا طریقہ تعلیم اس قدر آسان اور دلکش تھا کہ آج بھی قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھیں تو اس کی تفسیر نہ ہی سہی لیکن بڑی حد تک اس کا مفہوم میں آپ کو بتا سکتا ہوں لیکن میں ذرا ترجمہ کی مدد لے لوں تو بہت اچھی طرح اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔

س ابھی آپ نے کہا کہ آپ نے والد صاحب کی پوری لائبریری پڑھ ڈالی تھی، جس میں تمام مذاہب پر کتب موجود تھیں تو یہ بتائیے کہ مذاہب کے تقابلی جائزے میں آپ نے کیا محسوس کیا یا اس مطالعے سے مختلف مذاہب عالم سے کیا اخذ کیا؟

ج جی اس میں ہندومت کی کتب بھی میں نے پڑھیں۔ انجیل کے مختلف Version بھی میں نے پڑھے۔ اسلام کے مختلف مکاتب فکر کی کتب بھی پڑھنے کا موقع ملا جس میں غلام احمد پرویز، مولانا مودودی اور عبداللہ چکڑالوی جیسے علماء بھی شامل تھے تو ادیان کے مطالعے سے جس نتیجے پر پہنچا وہ ایک مثبت نتیجہ ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ تمام مذاہب کی روح ایک ہی ہے اور سب کا بنیادی تصور بھی ایک ہی ہے کہ آپ جو فصل بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ اس کے علاوہ خدا کا تصور بھی تمام مذاہب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ جو ہم ہندوؤں کو کہتے ہیں کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے وہ واقعی بتوں کی پوجا کرتے ہیں لیکن حتمی طور پر وہ خدا ہی کو

مانتے ہیں یعنی بھگوان کو اور اس کی پوجا کرتے ہیں اور مورتی کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ انہوں نے خدا ہی کی ایک تجسیمی شکل بنائی ہے تا کہ عبادت میں ارتکاز رہے۔ بنیادی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کے تمام مذاہب خیر کی طرف ہی لوگوں کو بلاتے ہیں۔ مختلف راستے ضرور ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔

س اب اس وسیع مطالعے کے بعد آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ مذہب اور فلسفے میں کیا تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے کو کہاں تک برداشت کرتے ہیں؟

ج میں نہیں سمجھتا کہ مذاہب، فلسفے اور سائنس کا آپس میں کوئی جوڑ یا مماثلت ہے۔ یہ جوڑ لگانا سہی نہیں۔ میں تو اس بات کے بھی بہت خلاف ہوں کہ لوگ قرآن مجید میں سے آج کے مادی علوم تلاش کرتے ہیں۔ سائنسی تھیوریوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ ایٹم بم کا فارمولا قرآن میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ قرآن حکیم سائنس کی کتاب ہے نہ فلسفے کی۔ یہ تو آپ کے اندر کی دنیا آباد کرتا ہے۔ آپ کے اندر روشنی پیدا کرتا ہے۔ دیکھیں نا سائنس کی تھیوریاں اور نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آج آپ قرآن سے ایک چیز نکال لیتے ہیں، کل کو وہ سائنسی نظریہ ثابت ہو جاتا ہے تو کیا نعوذ باللہ قرآن کو غلط ثابت کریں یا اس میں ترمیم کریں گے۔ قرآن مذہبی کتاب ہے اور اس کو وہی رہنے دیں جو یہ ہے۔ ایک اور ظلم ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے اور وہ ہے طب نبویؐ کے نام پر۔ یہ بتائیں کہ آنحضورؐ کی بتائی ہوئی کوئی دوا اگر کسی مریض کو دی جائے اور اس کو افاقہ نہ ہو تو کیا یہ اچھی بات ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس سے شفا ہو جاتی ہے تو کیا یہ عمل آنحضورؐ کے مرتبے میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ انہیں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ نعوذ باللہ آپ انہیں حکمت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے جو باتیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنیں کہ فلاں چیز کھانی چاہئے اور فلاں نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے وہی انہوں نے لوگوں کو بتائیں۔ دوسری بات یہ کہ وہاں عرب میں دو تین چیزیں ہی زیادہ ہوتی تھیں مثلاً کھجور، زیتون اور انجیر وغیرہ، انہی میں سے ہر مرض کا علاج تلاش کیا جاتا تھا اور بڑے بوڑھے یہی چیزیں کھانے کو کہتے تھے۔ سو یہی بات وہاں تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہاں ایک ڈاکٹر صاحب ہیں وہ طب نبویؐ کے نام پر ذیابیطس کے مریضوں کو کھجوریں کھلا رہے ہیں، چاہے مریضوں کا شوگر لیول کنٹرول سے باہر ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مذہب کا استحصال ہے اور کچھ بھی نہیں۔

س قاسمی صاحب! وہ بات درمیان میں ہی رہ گئی کہ آپ کے ماڈل ٹاؤن والے دوست کون تھے اور اب یہ کہاں ہیں؟

ج یہ بڑی دلچسپ بات ہے اور اتفاق ایسا بنا کہ ان سب دوستوں کا یہ پروگرام بن گیا کہ امریکہ جایا جائے۔ ان سب کے پاس تو وسائل تھے اس لئے انہوں نے مجھے کہا کہ تم بھی چلو۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں بھی چلتا ہوں۔ یہ لوگ ایک ایک کر کے امریکہ چلے گئے۔ اس زمانے میں ویزہ بھی آسانی سے مل جاتا تھا۔ یہ بات ہے 60 کے عشرے کی۔ اب پیچھے میں اکیلا رہ گیا۔ میں اباجی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ مان ہی نہیں رہے تھے۔ کیونکہ ان کو مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی محبت شاید ہی کسی کو ہو گی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آٹھویں جماعت تک وہ مجھے خود نہلاتے تھے۔ چنانچہ وہ مجھے جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ مجھے بھی ان سے بہت محبت تھی لیکن میں امریکہ جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی اس محبت کو Exploit کیا اور بالآخر ان کو قائل کر ہی لیا۔ اب پیسوں کا مسئلہ تھا۔ ہمارے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ میرے پاس ایک 50cc موٹر سائیکل تھی۔ وہ موٹر سائیکل 1500 روپے میں اپنے دوست چوہدری صفدر کو بیچی۔ اس طرح میں نے کچھ رقم ادھار لی۔ کچھ پیسے والد صاحب سے لئے اور کسی نہ کسی طرح سات ہزار روپے جمع کر لئے اور امریکہ کے لئے بائی روڈ چل پڑا۔ لاہور سے بائی روڈ پشاور، پشاور سے پی آئی اے کے ذریعے کابل اور کابل سے یورپ تک بائی روڈ۔ یہ میرا بہت دلچسپ سفر تھا جو میں نے اپنے سفرنامہ ''شوقِ آوارگی'' میں بیان کیا۔ یورپ سے بائی ایئر میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں میرے یہ سارے دوست تھے جو یہاں سے گئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی وہاں کام کئے تھے جو یہاں سے امریکہ جانے والے لوگ شروع میں کرتے ہیں۔ اتنی چھوٹی موٹی ملازمتیں حالانکہ یہ لوگ اچھے خاصے امیر گھرانوں کے تھے۔ میں نے بھی چھوٹی موٹی ملازمتوں سے آغاز کیا اور سال ڈیڑھ سال میں ایک اچھی جگہ ملازمت حاصل کر لی۔ یہ 1970ء کی بات ہے۔ وہاں ایک ہوٹل تھا Ramad Inn، مجھے اس ہوٹل میں فوڈ اینڈ بیوریج منیجر کی ملازمت مل گئی۔ یہ ایک وائٹ کالر ملازمت تھی جس کے پیسے بھی معقول ملتے تھے لیکن صورت حال یہ ہوئی کہ ادھر سے مجھے والد محترم کے خط آتے رہتے تھے کہ واپس آ جاؤ۔ میں ان کے خط کئی کئی روز نہیں کھولتا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے کیا لکھا ہو گا اور خط پڑھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال ایک روز میں نے فیصلہ کر لیا مجھے اس معاشرے میں نہیں رہنا۔ میرے دوستوں نے مجھے

منع کیا لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا اس لئے میں نے ٹکٹ کٹائی اور یورپ تک بائی ایئر آیا اور یورپ سے بائی روڈ پاکستان۔ میں بغیر اطلاع کے اپنے گھر پہنچا اور جب ابا جی نے اچانک مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر آنے والی خوشی کی لہر میری زندگی کا حاصل ہے۔ اس طرح میں تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال بعد واپس گھر آ گیا۔ آپ نے دوستوں کا پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں کہ وہ سب مختلف عادات و کردار کے لوگ تھے۔ وہ سب دوست وہیں رہ گئے۔ ان میں سے صرف دو ایسے تھے جو بہت عرصہ بعد واپس آئے۔ ایک منیر احمد شاہ تھے۔ ان کا پس منظر بھی بہت مذہبی تھا۔ اس نے وہاں ایک لڑکی سے شادی کی جو نسلاً ڈچ تھی اور نام تھا اس کا ''خرید''۔ اس سے ایک بیٹا بھی ہے ان کا۔ یہ کوئی سولہ سترہ برس وہاں گزار کر واپس آیا تھا۔ آج کل لاہور ہی میں ہے اور اپنا بزنس کر رہا ہے۔ یہ دوست ایچی سن کالج سے پڑھا ہوا ہے۔ دوسرا دوست جو واپس آیا وہ ہے مسعود علی خان۔ یہ میرا سب سے عزیز دوست ہے۔ ان میں سے ایک سب سے دلچسپ دوست تھا۔ اس کی زندگی کی بجائے خود ایک افسانہ ہے۔ اس کا نام خالدی تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور یہ لوگ ماڈل ٹاؤن کے اے بلاک میں رہائش پذیر تھے۔ اس کی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بڑی وسیع کوٹھی میں وہ اور اس کے بوڑھے والد رہتے تھے۔ یہ اپنے والدین کا بڑا لاڈلا تھا۔ اس لاڈ پیار کی وجہ سے اس میں ذرا Abnormality سی آ گئی تھی۔ مثال کے طور پر اگر اس کا موڈ بنا کہ اس نے تصویریں بنانا ہیں تو وہ کئی کئی مہینوں تک تصویریں ہی بناتا چلا جاتا تھا۔ اگر کبھی دل چاہا کہ گلاس الٹا کر اس پر روحیں بلانا ہیں تو سارا دن اور ساری رات یہ ہی کام ہوتا رہا ہے۔ اگر کتابوں کا شوق چڑھ آیا تو کئی کئی ماہ تک صرف مطالعہ ہی کرتا رہا ہے۔ اس حد تک کہ باتھ روم میں بھی مطالعہ کے لئے کتاب ساتھ لے جاتا تھا۔ بجلی چلی جائے تو موم بتی جلا کر مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ یہ دوست بھی وہیں تھا۔ میں نے امریکہ پہنچ کر سب سے پہلے خالدی کا پوچھا تو دوستوں نے بتایا کہ وہ بھی یہیں ہے اور اس نے شادی کر لی ہے ایک امریکی لڑکی کے ساتھ۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے ملواؤ تو میرا دوست مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ جب ہم اس کے فلیٹ پر پہنچے تو کال بیل دی لیکن جواب ندارد۔ البتہ اندر سے کچھ چیزیں وغیرہ گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر بیل دی لیکن کوئی نہ آیا البتہ آوازیں آتی رہیں۔ کافی دیر بعد دروازہ کھلا تو خالدی سامنے کھڑا تھا لیکن بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ۔ اتنے عرصے بعد مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔ اتنے میں اندر سے ایک بیلن

اڑتا ہوا نظر آیا اور اس کے سر پر لگا۔ اس نے پھر دروازہ بند کر لیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا چل رہا ہے۔ میرے دوسرے دوست نے کہا کہ میں اس لئے آنا نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری وجہ سے آنا پڑا ہے۔ یہ تماشا تو روز ہوتا ہے۔ خیر اگلے دن خالدی کا فون آیا اور اس نے کہا کہ تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ چنانچہ وہ آیا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی تھی۔ وہ مجھے بالکل اسی طرح ملا جس طرح ہم لاہور میں تھے۔ اسی پیار اور محبت کے ساتھ۔ اس کی بیوی بار بار پرس سے آئینہ نکالتی اور کہتی Khalid! How I look like? وہ بھی فوراً جواب دیتا Honey! You are pretty۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئینہ دیکھ کر پوچھتی Tell me, How I look like! وہ پھر کہتا You are pretty. I love you۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر ایک ڈرائیون سینما میں گئے۔ وہاں میں فلم دیکھتا رہا، ان دونوں کے درمیان یہ ہی چلتا رہا کہ How I look like? وہ پھر کہتا You are pretty. You are lovely۔ میں بھی صرف سکرین پر تصویریں دیکھتا رہا لیکن میرے کانوں میں آوازیں صرف یہ ہی آ رہی تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکی ابنارمل ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی زیادہ ابنارمل ہوگئی۔ چنانچہ خالدی نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور دوسری شادی کر لی۔ وہاں بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا اور شادی ناکام ہوگئی پھر اس نے تیسری شادی کی ایک چینی لڑکی کے ساتھ۔ وہ لڑکی اسے ساتھ لے کر ہانگ کانگ آ گئی۔ جب میں تھائی لینڈ میں سفیر تھا تو ایک روز ہمارے ایک مشترکہ دوست مالک کا امریکہ سے فون آیا۔ اس نے بتایا کہ خالدی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیسے تو اس نے بتایا کہ پہلے اس کو فالج ہوا۔ ایک روز پہلے اس کی بیوی اس کے کمرے میں گئی تو اس کا سر کمپیوٹر ٹیبل پر لٹکا ہا تھا اور روح پرواز کر چکی تھی۔ مجھے سخت صدمہ ہوا۔ یہ میرے ان دوستوں میں سے تھا جن کے ساتھ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا تھا اور میں اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔

س آپ نے اورینٹل کالج سے ایم اے کیا، وہ کب کی بات ہے؟

ج میں نے داخلہ لیا تھا 1964ء میں اور دو سال بعد ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

س ان دنوں آپ کے اساتذہ کون تھے اور اس وقت میں اور آج کے حالات میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج ان دنوں جب لوگ ایم اے اردو کرتے تھے۔ وہ واقعی ایم اے کرتے تھے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی اور مضمون میں داخلہ نہیں ملا تو اردو میں داخلہ لے لیا۔ ان لوگوں کا مقصد واقعی اردو میں ایم

اے کرنا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں جس استاد نے مجھے نہایت متاثر کیا اور میں سمجھتا تھا ان جیسا استاد شاید اور کوئی نہیں، ان کا نام تھا ڈاکٹر سید عبداللہ۔ وہ ایک گھنٹے کا لیکچر دیتے تھے اور لان میں ٹینٹ لگا کر سوڈیڑھ سولڑکے لڑکیاں ان کا لیکچر سنتے تھے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج میں کلاس رومز میں بھی پردہ لگا ہوتا تھا اور لڑکے ایک طرف اور لڑکیاں دوسری طرف بیٹھتے تھے اور آپس میں بات کرنے کی سخت پابندی ہوتی تھی۔ ہمارے ایک استاد تھے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا، وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھے لیکن انہیں اپنی عمر کم کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے کسی لڑکے کو ڈانٹتے تو کہا کرتے شرم کرو یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں حالانکہ یہ لڑکیاں عمر میں ان کی پوتیوں کے برابر تھیں لیکن وہ انہیں بہنیں ہی کہا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کسی کو یہی کہا کہ یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں تو پچھلے بنچوں سے کسی لڑکے نے کہا ''سر! اگر آپ کی بہنیں ہیں تو ہماری تو پھوپھیاں ہوئیں۔'' اس بات پر زبردست قہقہہ پڑا۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے یہ کہنا چھوڑ دیا۔ ان کے علاوہ میرے اساتذہ میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار شامل تھے۔ یہ سب بہت قابل شخصیات ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے علاوہ ایک اور استاد جس نے مجھے متاثر کیا وہ تھے سید وقار عظیم۔ وہ واقعی ایک عظیم آدمی تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ تدریس ایک بڑا فن ہے۔ اس فن پر سید عبداللہ اور سید وقار عظیم کو جو دسترس حاصل تھی، وہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو بھی نہایت آسان زبان میں بیان کر دیتے تھے اور ہم لوگ جو اس وقت طالب علم تھے، ان کی یہ باتیں بہت آسانی سے سمجھ آ جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ ہمارے ایک اور استاد بھی تھے جن کا کمال یہ تھا کہ وہ آسان ترین مضمون کو بھی مشکل ترین انداز اور زبان میں بیان کر دیتے تھے۔ ان کا نام لینا اب مناسب نہیں۔ خواجہ ذکریا صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میں ان کا شاگرد ہی نہیں، دوست بھی ہوں۔

س آپ نے صحافت کا آغاز سفر امریکہ کے بعد کیا؟

ج جی نہیں، میں امریکہ جانے سے قبل بلکہ اپنے دور طالب علمی ہی میں نوائے وقت میں کام کر چکا تھا۔ ان دنوں میں تعلیمی صفحہ کیا کرتا تھا۔ 1967ء میں میں نے نوائے وقت میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازمت کر لی۔ اسی دوران میں نے پروفیسر کرامت حسین جعفری پرنسپل ایم اے او کالج کا انٹرویو کیا۔ دوران انٹرویو انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟ میں نے کہا جی

عطاء الحق قاسمی۔ انہوں نے کہا کہ بہاؤالحق قاسمی تمہارے کیا لگتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ وہ میرے والد ہیں۔ اس پر انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور کہا کہ تم تو میرے بھتیجے ہو۔ میں تمہارے والد کے ساتھ ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھتا تھا۔ انہوں نے استفسار کیا کہ تم ''ایجوکیشن'' میں آنا چاہتے ہو یعنی ایم اے او کالج میں۔ مجھے شروع ہی سے تدریس سے لگاؤ تھا۔ میں نے کہا کہ آنا تو چاہتا ہوں لیکن میرا امریکہ جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ واپسی کب ہوگی؟ میں نے جواب دیا کہ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس پر وہ بولے اچھا جب بھی واپس آؤ گے تو یہاں تمہارے لئے سیٹ خالی ہوگی۔ اس سے آپ دیکھیں کہ کیسے کیسے شفیق استاد ہوا کرتے تھے ان دنوں۔ میں دو سال بعد واپس آیا تو واقعی انہوں نے میرے لئے سیٹ رکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے ایم اے او کالج سے وابستگی اختیار کر لی۔ ابھی تین ماہ پہلے میں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں اپنے والدین کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا تو مجھے ایک شکستہ حال قبر نظر آئی جو مکمل طور پر زمین میں دھنس چکی تھی۔ میں نے کتبہ پڑھا تو اس پر لکھا تھا ''پروفیسر کرامت حسین جعفری'' میرے دل کو دھچکا لگا۔ ہمارے ملک کا اتنا بڑا نام جس کی تعلیم کے میدان میں بے شمار خدمات اور قبر اس حال میں۔ میں نے گورکن سے پوچھا کہ اس قبر پر کوئی نہیں آتا؟ اس نے بتایا کہ کبھی کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ چنانچہ میں نے اپنے محسن کی قبر کو دوبارہ درست کرایا۔ اب یہ قبر بڑی اچھی حالت میں ہے۔ جعفری صاحب کا احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔

س آپ نے ایم اے او کالج کب جوائن کیا اور پھر وہی بات کہ اس وقت کے اور آج کے ایم اے او کالج میں کیا فرق ہے؟

ج میں ایم اے او کالج سے وابستہ ہوا 1971ء کے آخر میں۔ باقی فرق کوئی زیادہ نہیں پڑا۔ اس وقت لڑکوں کے نیفے میں چاقو ہوتے تھے اور اب پستول ہوتے ہیں۔ اب میں آپ کو دو باتیں بتاتا ہوں۔ ان سے آپ اندازہ لگائیں۔ ایک مذاق کی بات ہے اور دوسری سنجیدہ۔ ایک مرتبہ مجھے اعجاز بٹالوی صاحب کا رقعہ ملا۔ انہوں نے ایک لڑکے کے داخلے کی سفارش کی تھی۔ ان کا یہ رقعہ بڑا دلچسپ تھا۔ انہوں نے لکھا تھا ''قاسمی صاحب! حامل رقعہ ہذا کا خیال ہے کہ انسان کو علم ضرور حاصل کرنا چاہئے خواہ اس کے لئے ایم اے او کالج ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ تو ہوگئی مذاق کی بات لیکن اس سے قطع نظر ایم اے او کالج کی تعلیم کے میدان میں بہت خدمات ہیں۔ اس کالج کے تھرڈ ڈویژن حاصل کرنے والے ان طالب علموں کو اپنے دامن میں جگہ دی جن کو اور کوئی کالج

قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور ان میں سے بہت سے لڑکے ایسے ہیں جنہوں نے آگے چل کر اپنا اور کالج کا نام روشن کیا۔ جہاں تک ایم اے او کالج کے نتائج کا تعلق ہے تو میں نے ایک بار کہا کہ ایک بار گورنمنٹ کالج کے طلباء کو یہاں بھیج دیں اور یہاں کے طلباء کو وہاں بھیج کر نتائج کا موازنہ کریں تو پتہ چل جائے گا کہ کون سا کالج بہتر ہے۔ ہمارا تعلیمی عملہ بہت اچھا ہے لیکن ہم نے ہمیشہ کم نمبروں والے طلباء کو داخلہ دیا۔ اصل میں کالج میں یہ خرابی ہے کہ اس کا محل وقوع بہت غلط ہے۔ یہ کالج عین اس سڑک پر واقع ہے جو سکر ٹریٹ کو جاتی ہے۔ لڑکا کلاس روم سے باہر قدم رکھتا ہے تو روڈ پر ہوتا ہے۔ کلاس روز مز بالکل سڑک کے ساتھ ہیں۔ جب میں وہاں پڑھتا تھا تو ٹریفک کے شور کے باعث پڑھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہاں یہی صورت حال ہے۔

س آپ نے ایم اے او کالج کب چھوڑ بحیثیت استاد؟

ج ناروے سے واپسی پر میری ٹرانسفر ایف سی کالج ہوئی تو میرا اور ایم اے او کالج کا ساتھ ختم ہوا ہے۔ سفارت کے دوران میں ڈیپوٹیشن پر تھا۔ اس کے علاوہ میں نے تدریس چھوڑی نہ نوائے وقت چھوڑا۔ یہ دونوں میری زندگی کے بڑے Passion ہیں۔

س فکاہی تحریر کا عنصر تو آپ کو وراثت میں ملا ہے لیکن ڈرامہ نگاری کی طرف آپ کیسے مائل ہوئے؟

ج دیکھئے دو چیزیں اہم ہوتی ہیں انسان میں، ایک تو وہ جو جینز میں آئے اور دوسری جو ماحول سے ملے۔ علم تو میری جینز میں تھا ہی۔ اس سے تو مفر ممکن ہی نہیں۔ دوسرا ہے ماحول۔ ہمارے گھر کا ماحول بھی اسی قسم کا تھا مثلاً ابا جی جب بھی شہر سے باہر جاتے تو پوچھتے کہ تمہارے لئے کیا لاؤں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا شوق ہوتا ہے جو اس کے فطری رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ میرا فطری رجحان شعر و ادب کی طرف ہی تھا۔ اس لئے میں ان سے کہا کرتا تھا کہ وہ میرے لئے کہانیوں کی کتابیں لائیں۔ ایک چیز تو تھی یہ اور دوسری بات یہ کہ میں نے آٹھویں جماعت ہی سے ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ بھی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے میز یا کسی اور چیز پر طبلہ بجایا کرتا تھا۔ گو یا ردھم سے آشنائی تھی۔ یہ بھی شاعری سے لگاؤ کا اظہار تھا چنانچہ میں سکول کے بینڈ میں ڈرم بجایا کرتا تھا۔ جب ابا جی کو یہ بات پتہ چلی تو مجھے بینڈ چھوڑنا پڑا۔ ویسے اب بھی میں میوزک کی کوئی بیٹ بجا لیتا ہوں۔ یہ چیزیں فطرتاً میرے مزاج کا حصہ ہیں۔ سکول میں ناصر زیدی میرا کلاس فیلو تھا اور ہمارے فارسی کے استاد تھے مسٹر اختر حسین تاباں۔ وہ ہمیں مخاطب کر کے کہا کرتے تھے ”لکھ لو میری بات یہ ریوڑیاں بیچا کرو گے تم لوگ۔ کرو گے کچھ نہیں

کیونکہ تم لوگوں کے لچھن ہی ایسے ہیں۔'' صد افسوس! کہ استاد محترم کی یہ بات سچ ثابت نہ ہوئی۔ ورنہ لچھن ہمارے ایسے ہی تھے۔ سکول اور کالج میں دلچسپ بات یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ حصہ نثر کا ہے۔ جب کہ اس کا آغاز میں نے شاعری سے کیا تھا اور شاعری بھی مزاحیہ۔ گویا مزاح میری ادب دوستی کی بنیاد ہے۔ ویسے ایک سخت دینی گھرانے کا فرد ہونے کے ناتے یہ بات میرے لئے بھی حیران کن ہے لیکن یہ ایک فطری رجحان ہے۔ کالج کے زمانے میں بھی میں نے دوستوں کی ہجو لکھی۔ میرا پہلا کلام جو ہفت روزہ شہاب میں چھپا، میں نے فرسٹ ایئر میں لکھا تھا۔ ایم اے تک میں ہجو یہ شاعری کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی لیکن ذرا کم۔ بعد میں میری شاعری سنجیدہ ہوتی گئی اور نثر کا رجحان بڑھتا گیا۔

س پاک ٹی ہاؤس نصف صدی سے زائد عرصے سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک کا کام دے رہا ہے، کیا آپ کا بھی اس سے کوئی تعلق رہا ہے؟

ج جی ہاں میں بہت عرصے تک ٹی ہاؤس جاتا رہا ہوں۔ بعد میں بھٹو صاحب کے دور میں ٹی ہاؤس دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں میں بھی وہ تحمل اور بات کہنے اور سننے کا وہ حوصلہ اور برداشت نہیں رہی جو ان میں ہونی چاہئے تھی۔ جب میں وہاں جایا کرتا تھا تو بڑے لوگ وہاں آیا کرتے تھے جن میں انجم رومانی، شہرت بخاری، انتظار حسین اور اعجاز بٹالوی جیسے لوگ شامل ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا لیکن ایک بات میں بہت شدت سے محسوس کرتا تھا کہ جو گفتگو میں حلقہ ارباب ذوق میں ایک سال قبل سنتا رہا تھا وہی ایک سال بعد بھی ہو رہی تھی۔ بعد میں حلقے بھی دو بن گئے، ایک ادبی اور ایک سیاسی۔ ادبی کہتے تھے کہ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور سیاسی کہتے تھے کہ سیاست ہی سب کچھ ہے۔ میرے نزدیک دونوں ہی غلطی پر تھے کہ ان دونوں کو ایک توازن میں ہونا چاہئے۔ ادب اور سیاست الگ نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہیں۔ چنانچہ 77ء کے بعد جانا کم ہو گیا۔

س ہمارے ہاں ادبی گروہ بندی میں بھی دو گروپ ہیں یعنی قاسمی صاحب گروپ اور وزیر آغا گروپ، آپ ان میں سے کس سے متاثر ہیں؟

ج دیکھیں بظاہر تو بات کسی اور طرح لگتی ہے لیکن اندر سے ٹٹولیں تو ممکن ہے کہ وہ آدمی اس طرح کا نہ ہو جس طرح کا وہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نہیں سمجھتا کہ میں کبھی غیر نظریاتی

گروہ کا حصہ بنا ہوں۔ میری بڑی عجیب طرح کی گروہ بندی ہے یعنی میں بیک وقت احمد ندیم قاسمی جو ترقی پسند ہیں اور صحافت میں جناب مجید نظامی ایک دوسرے دھارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجیب الرحمن شامی جو اپنا ایک الگ اندازِ فکر رکھتے ہیں۔ نعیم صدیقی جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، سے تعلق رکھتا ہوں اور میرا واحد نقطہ جو میرے پیش نظر رہا ہے وہ ہے پاکستان اور پاکستانیت۔ میرے نزدیک احمد ندیم قاسمی ایک اعلیٰ درجے کے روشن خیال، ترقی پسند اور پاکستان سے محبت رکھنے والے شخص ہیں۔ اسی طرح صحافت میں ان لوگوں سے متاثر ہوں جو پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں چاہے وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے۔ میرے نزدیک دایاں بازو اور بایاں بازو بے معنی بات ہے۔ میرے سامنے دو ہی باتیں ہوتی ہیں Pro Pakistan یا Anti Pakistan۔ میرا وزن ہمیشہ اس پلڑے میں ہوتا ہے جو Pro Pakistan ہے یا میں سمجھتا ہوں کہ وہ پاکستان کا حامی ہے، مخالف نہیں۔

س قاسمی صاحب! میرا سوال اپنی جگہ بدستور موجود ہے؟

ج میں نے عرض کیا نا کہ میں ادبی گروہ بندی کو مانتا نہیں۔ اگر میں ایسی گروہ بندی میں شامل ہوں تو اس کا مطلب ہے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے علمی مرتبے کو تسلیم کرنے سے انکار کردوں جو میں نے آج تک نہیں کیا۔ میں ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا ایک بلند مرتبہ نقاد ہیں اور بہت بڑے Scholar ہیں البتہ بحیثیت مجموعی جس میں ترقی پسندی کے لئے اس کا جیل جانا، ان کا ایک بلند پایا شاعر ہونا، ایک بہت بڑا افسانہ نگار ہونا، امروز کا ایڈیٹر ہونا اور نئی نسل کے بہت سے لوگوں کو پروان چڑھایا ہے۔ اس لحاظ سے قاسمی صاحب کی شخصیت اتنی بڑی بن جاتی ہے کہ ان کا کسی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

س آج کل شاعری میں کچھ نئے تجربات کئے جا رہے ہیں جیسے آزاد اور مکالماتی غزل وغیرہ، آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ج دیکھئے جو گروہ بند لوگ ہوتے ہیں وہ اس طرح کی آراء کو جو آپ علمی طور پر دیتے ہیں، زندگی موت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ میں اس طرح کے بکھیڑوں میں نہیں پڑتا۔ اصل میں ہمارے ہاں تحقیقی لوگ کم ہو گئے ہیں اور اپنے لکھے ہوئے لفظ کی پائیداری پر یقین نہیں۔ اس لئے یہ لوگ تاریخ ادب میں خود کو کسی نہ کسی حیثیت میں زندہ رکھنے کے لئے ایسے سہارے تلاش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں، ایسے علمی تجربات ہونے چاہئیں لیکن ان کو زندگی موت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے۔

س آپ کے اسفار کا آغاز تو امریکہ کے سفر سے ہوا لیکن سفر نامہ نگاری کا آغاز کب ہوا؟

ج اسی سفر امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد سفر نامہ نگاری کا آغاز بھی ہو گیا۔ میں نے نوائے وقت میں پہلا سفر نامہ لکھنا شروع کیا لیکن دو چار قسطوں کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ اخبار اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اگرچہ ان دنوں لکھنے کی بھی بڑی آزادی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ اخبار کے لئے ایک بوجھل چیز ہے اس لئے اس کو بند کر دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے ایک بھرپور قسط لکھی اور احمد ندیم قاسمی کو دے آیا۔ اس وقت میرے ان سے کوئی مراسم نہیں تھے۔ اس بات سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ کس طرح انہوں نے نئے لوگوں کو تیار کیا۔ یہ قسط دینے کے بعد میں بھول گیا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ جا کر ان سے پوچھتا۔ دوست ذکر کرتے تو ان سے پوچھتا کہ آپ نے کہاں پڑھا تو وہ بتاتے کہ قاسمی صاحب نے سنایا ہے۔ جب ان سے ملنے جاؤ وہ تمہارا سفر نامہ کھول کے بیٹھے ہوتے ہیں اور تمہارے جملے سنا سنا کر خود بھی محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتے ہیں۔ اس پر مجھے حوصلہ ہوا اور ان سے ملنے چلا گیا۔ وہ سراپا تحسین تھے۔ انہوں نے یہ سفر نامہ قسط وار فنون میں شائع کر دیا۔ میں بڑا سست آدمی ہوں۔ جب میں لکھنے سے تھک جاتا تو ان سے کہتا کہ اب بس کریں میں اور قسط نہیں دے سکتا تو وہ کہتے کہ اچھا اس بار فنون شائع نہیں کریں گے۔ اسی سے اندازہ لگائیں کہ انہوں نے نئے لکھنے والوں کو کس طرح حوصلہ دیا اور ان کو نکھارا ہے۔ انہی دنوں مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' سیارہ ڈائجسٹ میں چھپ رہا تھا اور میرا شوق آوارگی فنون میں چھپ رہا تھا لیکن کتابی صورت میں یہ سفر نامہ بہت بعد میں آیا۔ اصل میں جب میں نے دیکھا کہ قاسمی کسی صورت بھی مجھے چھوڑنے والے نہیں اور میں لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا اس لئے میں نے ان سے جھوٹ بولا کہ قاسمی صاحب اب تو صرف چند ابواب باقی ہیں۔ اگر میں نے یہ بھی فنون میں دے دیئے تو پھر کتاب نہیں بکے گی۔ اس پر انہوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اس کے بعد میں سات برس تک اسے نہ لکھ سکا۔ پھر یہ ہوا کہ جو سفر بعد میں کئے ان کے سفر نامے پہلے آ گئے اور جو سفر سب سے پہلے کیا تھا اس کا سفر نامہ بہت بعد میں آیا۔ ان سفر ناموں میں آسٹریلیا کا سفر ''دنیا خوبصورت ہے'' یورپ کا ''گوروں کے دیس میں'' پھر بھارت کا ''دلی دور است'' وغیرہ آئے۔ ذاتی طور پر مجھے ''شوقِ آوارگی'' سب سے زیادہ پسند ہے۔

س گویا پہلے پیار کی طرح پہلا سفر ہی سب سے زیادہ پسند ہے؟

ج بالکل یہ ہی بات ہے۔ میرا پہلا سفر نامہ پہلا پیار ہی تو ہے۔

س نثر نگاری میں آپ نے سفر نامہ لکھا۔ کالم نگاری کی۔ ڈرامہ نگاری میں نام کمایا لیکن کبھی افسانہ کی طرف توجہ نہیں دی، کیوں؟

ج میں نے اپنا افسانہ کبھی کسی ادبی پرچہ میں نہیں چھپوایا لیکن ہوتا یہ آیا ہے کہ میرے بے شمار نقادوں نے میری توجہ اس طرف دلائی کہ تم بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں کیونکہ تمہارے بہت زیادہ کالم ایسے ہیں کہ جنہیں شارٹ سٹوریز افسانے شمار کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً میرا ایک کالم ہے ''طوطے ہی طوطے'' پھر ایک اور کالم ہے ''الہ دین کے جن کا زوال'' یہ چند ایسے کالم ہیں جنہیں لوگ افسانے کہتے ہیں لیکن میں انہیں کالم کہتا ہوں۔ چونکہ انہیں اخبار میں چھپنا ہوتا تھا اس لئے میں نے جو کچھ بھی لکھا ہوتا تھا اسے کالم کا عنوان دے کر بھجوا دیتا تھا حالانکہ وہ کالم کے ذیل میں نہیں آتے تھے بلکہ خالص افسانے تھے۔ اسی طرح میرا ایک کالم چھپا ہے وہ درحقیقت دو سو فیصد افسانہ یعنی شارٹ سٹوری ہے۔ اس کا نام ''شینڈ لیئر'' یعنی فانوس۔ اگر میں اسے کبھی بھی ادبی پرچے میں بھیج دوں تو وہ افسانے کے طور پر چھاپ لے گا لیکن میں انہیں کالم کی جگہ چھپواتا ہوں تاکہ لاکھوں لوگ اسے پڑھیں۔ یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے چند افسانے لکھ رکھے ہوئے ہیں جو باقاعدہ طویل افسانے ہیں۔ میں نے ان کو رکھ چھوڑا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ان کو دوبارہ دیکھوں گا۔ اگر پسند آئے تو ٹھیک ورنہ پھاڑ کر پھینک دوں گا۔

س صحافت میں کالم نگاری کے علاوہ آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

ج میں نے 67ء میں نوائے وقت میں کام شروع کیا۔ میں اس میں سب ایڈیٹر بھی رہا۔ اس کے علاوہ میں نے سنڈے میگزین فیچر بھی لکھے۔ جیسے ریاض بٹالوی صاحب ''مشرق'' میں فیچر لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح میں ''نوائے وقت'' میں فیچر لکھا کرتا تھا۔ انہی دنوں میں نے ایک بار ہیجڑوں پر ایک فیچر لکھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔

س قاسمی صاحب! اب آتے ہیں آپ کے ایک اور مورچے کی طرف یعنی سفارت کی طرف۔ یہ بتایئے کہ آپ کب سے کب تک سفیر کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے؟

ج اس کا عرصہ بنتا ہے دو سال۔ 1997ء سے 1999ء تک۔ جانے کی تاریخ تو ٹھیک سے یاد نہیں لیکن غالباً جون یا جولائی 97ء اور واپس آیا ہوں 28 اکتوبر 99ء کو۔

س کن کن ممالک میں؟

ج پہلے ناروے اور پھر تھائی لینڈ۔ تقریباً دو سال ناروے میں اور پھر تین ماہ تھائی لینڈ میں۔

ڈاکٹر علی محمد خاں

ڈاکٹر علی محمد خاں کے فن اور شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ ممتاز ماہر تعلیم، معروف مصنف، نامور محقق، انہیں عہد حاضر کا سب سے بڑا خاکہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔ تخلیق اور تحقیق کا ایسا خوبصورت امتزاج بہت کم اہل قلم کو نصیب ہوتا ہے، جیسا آپ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے درس وتدریس سے منسلک ہیں۔ چھتیس ((36 کتابوں کے مصنف ہیں۔ میرے لئے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میں نے اپنی ایف ایس سی کے دنوں میں ڈاکٹر علی محمد خاں کے ساتھ کالج میگزین ''دبستان'' کے سب ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب شعبہ اردو کے سربراہ ہونے کے علاوہ کالج میگزین کے چیف ایڈیٹر بھی تھے۔ حرف سے شناسائی میں ڈاکٹر صاحب نے میرے جیسے بہت سے طالب علموں کی رہنمائی کی ہے۔ کئی نسلوں نے آپ سے کسب فیض کیا ہے۔ روایت کے مطابق آپ کے شاگردوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ آج کل بھی ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو سے بطور پروفیسر منسلک ہیں اور پوری توانائی سے علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ شعبہ اردو کے چیئرمین کا عہدہ انہوں نے بوجوہ خود چھوڑ دیا تھا۔

س بات ابتداء سے شروع کرتے ہیں۔ یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہئے؟

ج پرانی بات ہے۔ کیا بتاؤں کہ میں پنڈی بھٹیاں سکول میں پڑھایا کرتا تھا۔ میں نے 1962ء میں بغیر تیاری کے ایم اے کا امتحان دے دیا۔ بغیر پڑھے سیکنڈ ڈویژن آ گئی جس سے مجھے غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ میں بڑا لائق فائق ہوں۔ بس وہیں سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ چل نکلا۔ پی ایچ ڈی پر مجھے عمر فیضی نے اکسایا اور استاد محترم سجاد باقر رضوی کے اصرار اور شاگردی سے یہ ممکن ہو سکا۔

س آپ کی تربیت میں زیادہ عمل دخل کس کا ہے؟

ج میرے خیال میں بڑے بھائی جمال محمد خان کا میری تعلیم وتربیت میں سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ وہ مجھ سے سولہ سال بڑے ہیں۔ جس سال میں پیدا ہوا، اس سال انہوں نے حالی مسلم

ہائی سکول پانی پت (ہریانہ) سے انٹرنس کیا تھا۔ بڑے بھائی کے علاوہ عمر فیضی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا مجھ پر بڑا اثر رہا۔

س گویا آپ پانی پت (انڈیا) سے ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں؟ اپنے بچپن کے حالات کے بارے میں اختصار سے آگاہ فرمائیے؟

ج میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں میری تاریخ ولادت 7 ستمبر 1942 درج ہے چنانچہ قیامِ پاکستان کے وقت میری عمر چھ سال بنتی ہے۔ مگر ماں جی کہا کرتی تھیں کہ میں 7 بھادوں بروز پیر پیدا ہوا تھا اور جب بٹوارا ہوا تو میں چار سال کا تھا۔ اس طرح تقویم کے قاعدے سے میری ولادت 22 اگست 1943ء بنتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) میری ولادت پانی پت، ہریانہ (انڈیا) میں ہوئی تھی۔ ہجرت کر کے پاکستان کیسے پہنچا، یہ ایک لرزہ خیز مگر مبنی بر حقیقت داستان ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ جب ہم پانی پت سے لٹے پٹے، خراب حال بادامی باغ (لاہور) کے رفیوجی کیمپ میں پہنچے تو سترہ دن تک حواس باختہ وہیں پڑے رہے۔ سخت سردیاں تھیں، مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ میں اپنی ماں کے ہمراہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پڑے ہوئے پتھر کے کوئلے چنا کرتا تھا۔ شام تک سات آٹھ سیر کوئلے اکٹھے ہو جاتے جن میں سے تھوڑے بہت تو ہم کیمپ میں آگ تاپنے کے لئے رکھ لیتے اور زیادہ مقدار میں بیچ دیتے جس سے سات آٹھ آنے روز مل جاتے۔ کیمپ میں یونہی گزر بسر ہو رہی تھی کہ پھر کسی کے مشورے سے کیمپ کو خیر آباد کہہ دیا اور قسمت آزمائی کے لئے پھرتے پھراتے ڈسکہ کے نواحی گاؤں میترانوالی پہنچے اور وہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہ ڈسکہ سے بجانب مغرب اپر چناب کی ذیلی نہر نوکھر برانچ کے کنارے آباد ہے۔ یہاں کی فضا بڑی خوشگوار اور زمین بڑی زرخیز ہے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے زمانے میں اپنے ہم جماعتوں کو سرکنڈے اور نرسل کی قلمیں بنا بنا کر اور معمولی اجرت پر ان کی کتابوں کی جلد بندی کر کے دیا کرتا تھا۔ میں نے پہلے گاؤں کے پرائمری سکول میں تعلیم حاصل کی اور اسلامیہ ہائی سکول میترانوالی سے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔ میں نے پرائمری، مڈل اور میٹرک میں وظیفہ حاصل کیا۔

س دورِ حاضر میں اردو ہمارے لئے کس حد تک ضروری ہے؟

ج آج کے ترقی یافتہ دور میں اردو ہمارے لئے از حد ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حلقہ اثر کے اعتبار سے اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو

(Unesco) کے اعداد وشمار کے مطابق دنیا کی کل چھ ارب آبادی میں سے کم وبیش ایک چوتھائی لوگ اسے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ بڑی زبردست زبان ہے۔ اس میں سائنس کے تمام مضامین کی تعلیم بآسانی دی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قیام پاکستان سے دس سال قبل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں تمام سائنسی مضامین بشمول علم طبقات الارض (Geology) اور سمندری علوم (Oceanography) اردو میں دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر رضی الدین جنھوں نے پاکستان میں یورینیم کی افزودگی کا پودا لگایا تھا، وہیں کے گریجویٹ تھے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ضرورت کے تحت اردو کی تدریس کے شعبے قائم ہیں اور وہاں اردو میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ آج پاکستان بنے ہوئے 75 سال ہونے کو آئے ہیں مگر پاکستان کی قومی زبان ہونے کے باوجود پاکستان میں اردو کو عملاً وہ درجہ حاصل نہیں ہوا جو اسے ملنا چاہئے۔ 1971ء میں پاکستان دولخت ہوا تو قومی زبان کی افادیت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔ چنانچہ 1971ء کے آرٹیکل 251 کے تحت طے پایا کہ 15 سال کے اندر اردو کو قومی زبان قرار دے کر اسے دفتری زبان کے طور پر نافذ کیا جائے مگر 50 سال گزرنے کے باوجود اردو کو پاکستان میں دفتری زبان کے طور پر نافذ نہیں کیا گیا جو کہ آئین کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

س قومی یکجہتی کے لئے قومی زبان کا کردار کتنا اہم ہوتا ہے؟ اردو زبان اس ضمن میں کیا خدمات سرانجام دے رہی ہے؟

ج اردو ہماری لنگوا فرانکا (Lingua Franca) ہے یعنی پاکستان کے ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان نے غیر مرئی طور پر (Invisibily) عوام کو آپس میں منسلک کر رکھا ہے۔ قومی وحدت اور یکجہتی کو مستحکم کرنے میں یہی زبان بنیادی کردار ادا کر رہی ہے۔ آپ پاکستان کے دوردراز علاقوں میں تشریف لے جائیں۔ آپ کو وہاں کے لوگوں سے ابلاغ (Communication) میں محض اردو کی وجہ سے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اردو پاکستان میں کوچہ وبازار اور کاروباری زبان ہے البتہ ابھی تک یہ سرکاری زبان نہیں بن سکی۔ اگر اربابِ اقتدار فی الواقع ملک کو مضبوط اور مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں، انہیں جلد یا بدیر اسے سرکاری اور دفتری زبان بھی بنانا ہوگا ورنہ ملک کی وحدت، اتحاد اور یکجہتی کو خطرات لاحق رہیں گے۔

اردو اخبارات، اردو شاعری، اردو فلمیں، اردو ڈرامے قومی یک جہتی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا یا مختلف چینلز کا ذریعہ ابلاغ اردو ہے۔ اردو عوام میں دوریوں کو دور کر

رہی ہے اور قربتیں بڑھا رہی ہے۔ اساتذہ، علماء، ٹی وی اور ریڈیو کے میزبان اردو کے ذریعے ہی لوگوں کے دلوں اور دماغوں تک رسائی حاصل کر رہے ہیں۔ اردو میں لکھے گئے قومی نغمے اور ملی ترانے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں ملی وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہر حوالے اور ہر زاویے سے اردو ہی قومی یکجہتی پیدا کرنے والا سب سے بڑا عامل ہے۔

س آپ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں کب سے کام کر رہے ہیں اور کیا آپ شروع سے لے کر اب تک بنائے جانے والے میٹرک اور انٹر لیول کے اردو نصاب سے مطمئن ہیں؟

ج میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کی اردو لازمی کی گیارہویں اور بارہویں جماعتوں کی کتاب کے سلسلے میں 1992ء سے کام کر رہا ہوں۔ 1992ء سے پہلے انٹرمیڈیٹ کی سطح پر جو کتاب پڑھائی جاتی تھی اس کے مؤلفین میں ایک نام پروفیسر عمر فیضی کا تھا۔ فیضی صاحب نے اپنے حصے کا کام میری معاونت سے کیا تھا۔ اس زمانے میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں اردو کے ماہر مضمون سید سجاد رضوی تھے جو ہفت زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و فاضل شخص تھے اور فیضی صاحب کے پرانے دوست تھے۔ جب اردو کا کورس بدلنے لگا تو فیضی صاحب نے نئے کورس کی تیاری کے سلسلے میں بوجوہ معذرت کر لی اور اپنی جگہ میرے نام کی سفارش کر دی۔ اس طرح میں بھی 1993ء میں سے پڑھائی جانے والی کتاب کے مؤلفین میں شامل ہو گیا۔ دیگر ناموں میں ڈاکٹر انور محمود، پروفیسر امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا کے نام اہم ہیں۔ ڈاکٹر عارفہ سیدہ زہرا مذکورہ کتاب کی مدیرہ بھی تھیں۔ ورکنگ ٹیچر ہونے کے ناتے اور دوستوں کے اصرار پر اس کتاب کی تمام مشقیں میں نے بنائی تھیں اور اسی کتاب کے لئے نصاب کے تقاضوں کے تحت ''ماحولیاتی آلودگی'' کے عنوان سے بڑی محنت سے ایک مضمون بھی لکھا۔ یہ کتاب 2003ء تک چلی۔ اگرچہ اس کتاب پر کچھ اعتراض بھی ہوئے مگر بالعموم اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ 2004ء میں پھر کورس بدل گیا اور موجودہ کورس آ گیا۔ میں دم تحریر دسویں جماعت کی اردو لازمی ''بہارِ اردو'' کا مدیر اور بارہویں جماعت کی اردو لازمی کی ''سرمایہ اردو'' کا مؤلف ہوں۔ علاوہ ازیں دسویں اور بارہویں جماعتوں کی اردو اختیاری کی کتابوں کا مدیر ہوں۔ اگر آپ تعلیٰ پر محمول نہ کریں تو عرض کروں کہ ''بہارِ اردو'' اور ''سرمایہ اردو'' کی مشقیں بنانے کا تقریباً تمام کام میں نے سرانجام دیا تھا۔

اب رہی یہ بات کہ کیا میں شروع سے لے کر اب تک بنائے جانے والے میٹرک اور

انٹرمیڈیٹ لیول کے اردو کے نصاب سے مطمئن ہوں تو میرا جواب اثبات میں ہے۔ دراصل ہم جو نصاب تیار کرتے ہیں وہ قومی نصاب کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں تیار کردہ نصاب کے عین مطابق ہوتا ہے۔ پہلے کتاب صوبائی سطح پر ریویو کمیٹی دیکھتی ہے اور پھر اسے قومی ریویو کمیٹی وزارت تعلیم اسلام آباد کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں موثر و معتبر ماہرین مضمون شامل ہوتے ہیں۔ کسی بھی مضمون کی کمزور کتاب ان مرحلوں سے بآسانی نہیں گزر سکتی۔ میں اپنی تیار کردہ کتاب خوشی خوشی پڑھاتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں قوم کے نونہالوں کے لئے نصاب تیار کرنے والوں میں شامل ہوں۔

س آپ کا ادبی ذوق اتنا اعلیٰ ہے، کبھی شعر کہنے کا خیال نہیں آیا؟

ج ہاں شعر مجھے اچھے لگتے ہیں۔ ایک زمانے میں میں نے شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ ایک چھوٹی سی بیاض تیار ہو گئی تھی پھر میں نے اپنے شعروں کا میر تقی میر، غالب اور مولانا حالی کی شاعری سے تقابل کیا۔ مجھے اپنے شعر مولانا حالی کے مقابلے میں جو کہ میری طرح پانی پت سے تعلق رکھتے تھے اور دیگر استاد شعراء جن کو میں پسند کرتا تھا، بڑے پھس پھسے لگے۔ میں نے خود اپنی شاعری کے دیانت دارانہ تجزیے کے بعد شاعری کو خیر باد کہہ دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرا شعبہ نثر ہے۔

س کتابیں کس قسم کی پڑھنا پسند کرتے ہیں؟

ج مشتاق یوسفی اور انتظار حسین مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ ناول مجھ سے نہیں پڑھے جاتے اور ضخیم ناول بالکل بھی نہیں پڑھ سکتا۔ ''علی پور کا ایلی'' میں نے بیچ میں ہی چھوڑ دیا تھا اور ''راجہ گدھ'' جو کہ بانو قدسیہ کا شاہکار ناول ہے، اس میں بھی بس ورق گردانی ہی کی ہے۔ تنقید اور تاریخ میرے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ تاریخ میں ایم اے کرنے کے علاوہ میری اس میں دلچسپی کا سبب پانی پت سے تعلق بھی ہے۔ ہمارے گاؤں کا نام راجہ داہر کے نام پر تھا اور پھر وہاں ابراہیم لودھی اور بابر کی یادگاروں کے علاوہ تاریخ کے بہت سے حوالے پانی پت سے نسبت رکھتے ہیں۔

س غیر ادبی مصروفیات کون سی ہیں؟

ج سیر و سیاحت، میں نے پاکستان کا کونا کونا چھان مارا ہے۔ اس کے علاوہ تہران گیا، کئی دفعہ سعودی عرب، انگلینڈ، آسٹریلیا، آئرلینڈ ایک ہفتہ رہ کر آیا ہوں۔ پھر سکاٹ لینڈ۔ جب بھی موقع ملتا ہے، ہم دونوں میاں بیوی سیر کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ اب آسٹریلیا کا پروگرام ہے۔

OOO

عباس تابش

ہر تہذیب کا سب سے توانا اور مؤثر مظہر اس تہذیب کا ادب ہوتا ہے۔ پاکستانی تہذیب اپنی قدامت کے حوالے سے اور پاکستانی ادب اس قدامت کا مظہر ہونے کے ناطے، ایک عظیم تر ماضی کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم تر حال کا بھی حامل ہے۔ پاکستان ادب بہت سی روایاتِ فکر وفن کے تسلسل کا منظرنامہ ہے۔ عباس تابش پاکستانی ادباء کی اس نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر ہیں جس نے نہ صرف یہ کہ پاکستانی ادب کی آفاق گیر روایات کو اپنی روح میں سمویا بلکہ اپنی جرأت مندانہ ہنرمندی کا بدن بھی عطاء کیا۔ یہ تمہیدی الفاظ خالد احمد کے ہیں کہ عباس تابش اپنی ہنرمندی کے حوالے سے اپنے ہم پیشہ وہم مشرب وہم عصروں سے منسلک ہوتے ہوئے بھی منفرد نظر آتا ہے۔ آنکھ بدن کا چراغ ہے اور عباس تابش پاکستانی ادب کے ہرے بھرے بدن کا تازگی آفرین چراغ ہونے کے ناتے اس جسد کا نور ہے۔ جنوبی پنجاب کی تحصیل میلسی میں 1961ء میں پیدا ہونے والے اس خوش فکر شاعر نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا اور آج کل لاہور میں ہی تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔ اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ارژنگ کے قارئین ان سے ہونے والی گفتگو کو امید ہے ضرور پسند فرمائیں گے۔

س شروع سے بات کی شروعات کرتے ہیں۔ شعری سفر کا آغاز کب اور کیسے کیا؟

ج شاعری کا آغاز 1975ء میں کیا۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے ایک استاد کا تبادلہ ہوا تو مجھے پوچھا گیا کہ آپ نے کچھ کہنا ہے تو میں نے کہا کہ میں نظم پڑھوں گا۔ جسے نظم سمجھ رہا تھا وہ نظم نہیں نثر تھی۔ ایک دن میں اپنے گھر بیٹھا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک بلدیہ کا باغ ہے، وہاں سے کوئی آواز آ رہی تھی، عموماً لوگوں کے بات کرنے کی آواز ہوتی ہے لیکن وہ آواز کافی مختلف تھی تو میں نے والد صاحب سے اجازت لی اور وہاں چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک صاحب کچھ پڑھ رہے ہیں اور باقی واہ واہ کر رہے ہیں۔ میں سنتا رہا اور سوچا کہ یہ کام تو میں بھی کر

سکتا ہوں۔ ایک وجہ تو یہ بنی، دوسرا یہ کہ ہمارے والد صاحب پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن انہیں شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ سورۂ یوسف کی تفسیر جو مولوی عبدالستار اور مولوی غلام رسول نے لکھی ہے۔ وہ رات کو ان کتابوں میں سے اشعار سنا کرتے تھے، اس کے بعد انہوں نے مجھے بانگ درا لے کر دی تو اس کے بھی کچھ شعر یاد کئے۔ ہمارے سکول میں بیت بازی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا تو میں اس میں حصہ لیتا تھا تو ان سب عوامل کے ملاپ سے میرا مزاج بن گیا کہ شاید میں شاعر بن سکتا ہوں۔ میں میٹرک میں تھا تو والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غربت تو گھر میں پہلے ہی تھی جو والد صاحب کے انتقال کے بعد شدید ہو گئی۔ ہم چار بہن بھائی تھے اور والدہ محنت کر کے ہمیں پالتی تھیں۔ والدہ نے کہا کہ تعلیم نہیں چھوڑنی لیکن وہ میری شاعری کے خلاف تھیں۔ وہ سوچتی تھیں کہ شاعر بیکار ہوتے ہیں اور اگر میرا بیٹا اس کام میں پڑ گیا تو پڑھے گا نہیں۔ جب ہم رات کو صحن میں سوئے ہوتے تھے تو میں چاندنی میں انتظار کرتا تھا کہ سب سو جائیں تو میں اٹھ کر شعر لکھوں، ادھر میں کاغذ قلم نکالتا اور ادھر ان کی آنکھ کھل جاتی تو گھر میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی کہ جہاں میں چھپ کر شعر کہوں اور پتہ نہ چلے۔ انہیں دنوں 1978ء میں میں نے ''ماہ نو'' کو غزل بھیجی۔ ماہ نو کی ایڈیٹر کشور ناہید تھیں۔ لوگ کافی ڈرتے تھے کہ کلام نہیں چھاپتیں، لیکن میں نے غزل بھیج دی۔ جب وہ میگزین ملا تو اس میں وہ غزل چھپی ہوئی تھی۔ میں بڑا خوش ہوا۔ کچھ دن بعد مجھے یاد پڑتا ہے کہ 29 روپے کا ایک منی آرڈر آیا۔ میں گھر آیا تو ہمارے گھر میں بڑے دنوں بعد گوشت پکا ہوا تھا۔ میاں نے یہ تو نہیں بتایا لیکن مجھ سے پوچھا کہ شاعری سے کوئی پیسے بھی ملتے ہیں۔ میں نے کہا ماں شاعری سے تو لوگوں نے کاریں کوٹھیاں بنائی ہیں۔ میں نے سوچا کہ ماحول بن رہا ہے تو شاید مجھے اجازت مل جائے۔ تو انہوں نے بتایا کہ تو جس رسالے کا بتا رہا تھا اس کے 29 روپے آئے ہیں، میں تجھے شاعری کی اجازت دیتی ہوں۔ وہ پہلا موقع تھا جب ماں نے مجھے دعا اور شاعری کی اجازت دی۔ اس کے بعد کا سارا سفر ان کی دعا کے طفیل ہے۔

س آپ کی شاعری میں دشت، شجر اور پرندے کے استعارے بہت نمایاں ہیں، اس کا پس منظر کیا ہے؟

ج اس کا تعلق میرے والد صاحب سے ہے۔ وہ چڑیوں کو دانہ ڈالتے تھے۔ روزانہ کی بنیاد پر یہ میری ذمہ داری ہوتی تھی۔ جس دن میں بھول جاتا اس دن اتنی سرزنش کرتے کہ آج بھی یاد کرتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں۔ تو یوں پرندوں سے میرا تعلق بن گیا۔ ایک اور شاعر جس نے مجھے متاثر کیا

وہ ہے شکیب جلالی، ان کے ہاں بھی پرندہ آیا۔ پرندوں کے بارے میں میں نے پڑھا بھی اور انہیں بسر بھی کیا۔ پرندہ غیب کی آواز ہے۔ یگانہ نے اسے ''معنی بے لفظ'' کہا ہے۔ مجھے اس سے بہتر ترغیب آج تک نہیں ملی۔ میں نے ایک واقعہ پڑھا امام رضا کے پاس ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور چڑیوں کا ایک غول آ کر شور کرنے لگا۔ آپ نے سنا اور اس آدمی سے کہا کہ وہاں درخت پر ایک سانپ چڑھ رہا ہے جوان کے گھونسلے میں جا کر ان کے بچوں کو کھانے لگا ہے۔ جاؤ اس سانپ کو مارو اور ان کے بچوں کو محفوظ بناؤ۔ تو وہ چڑیاں امام کے پاس شکایت لے کر آئی تھیں۔ امام اور پیغمبر پرندوں کی آواز اور زبان کو سمجھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی ایک دلچسپی ہوئی اور دشت اور پرندے اکٹھے کیسے ہوئے۔ میں کیونکہ میلسی کا رہنے والا ہوں اور چولستان وہاں سے آگے شروع ہوتا ہے۔ نسل در نسل مہاجر کے اندر سے مہاجرت کا احساس نہیں نکالا جا سکتا اور پرندے کے اندر سے بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ اب بھی جب وہاں سخت موسم آتا ہے تو لاکھوں پرندے نامعلوم منزل کی طرف بڑھتے ہیں اور یہ سوچ کر بڑھتے ہیں کہ ہم اپنے گھروں کی طرف جا رہے ہیں اور جب یہاں آتے ہیں تو شدید گرمی ہوتی ہے۔ تو وہ مر جاتے ہیں۔ تو یہ بات تھی جس نے میرے اندر دشت، پرندے اور پھر شجر کو آپس میں جوڑ دیا۔ ہم سب بڑے درویشی دعوے دار ہیں لیکن دیکھیں تو درخت دھوپ میں جلتا ہے اور دوسروں کو پھل اور چھاؤں دیتا ہے۔ کوئی آ جائے تو یہ نہیں کہتا کہ یہ چھاؤں تیرے لئے ہے اور تیرے لئے نہیں۔ ہمارا ایک بچھڑ جائے تو ہم بے حال ہو جاتے ہیں۔ اس کے لاکھوں پتے بکھر جاتے ہیں، وہ ٹنڈ منڈ کھڑا رہتا ہے۔ اس کی زبان سے اُف تک نہیں نکلتا۔

س ہیمنگ وے کے خیال میں آپ صرف اس وقت اچھا لکھ سکتے ہیں جب محبت میں مبتلا ہوں، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ج میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محبت میں مبتلا ہونے کا فیصلہ کون کرے گا۔ اس حوالے سے میرا اپنا نظریہ ہے کہ ابتداء میں انس ہوتا ہے۔ جب تھوڑی شدت آتی ہے تو پیار بن جاتا ہے اور تھوڑا آگے جاتے ہیں تو محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ محبت کا معاملہ سب وہیں کی پیداوار ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ بڑی شدت سے محبت کر رہے ہوتے ہیں اور جب بریک اپ ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ خودکشی کر لیں گے لیکن چار دن بعد نئی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں یعنی ایک وہم ختم ہوا تو دوسرے نے جنم لیا لیکن اگر کسی نے وہم پر اعتبار کر لیا تو وہ عشق میں مبتلا ہو گیا۔ تو اس وہم پر اعتبار کا نتیجہ چند دن میں نہیں پتہ چلے گا۔ کچھ لوگ ساری زندگی اکٹھے گزار دیتے ہیں اور پھر پتہ چلتا

ہے کہ ہم تو عشق کرتے ہیں۔ فرض کریں مجھے تخلیقی عمل میں ایک نیا تجربہ ہوتا ہے تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ میں اسے لکھ سکوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بیس برس بعد لکھا جائے۔ میں بوڑھا ہوں اور محبت کا شعر کہوں یہ تو ایسا شعر کہنے کی عمر نہیں۔ وہ شاید میرا بیس بائیس سال پرانا تجربہ ہو اور وہ لمحہ میرے اندر ٹھہرا ہوا تھا جواب مجبور ہو کر سامنے آیا۔

س کیا آپ ہم عصروں یا دوسرے لکھاریوں کے ساتھ کوئی مقابلہ محسوس کرتے ہیں؟

ج میں نے ان سے کبھی مقابلہ سمجھا ہی نہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ میرے برابر کے نہیں ہیں۔ میں سب کو بڑا سمجھتا ہوں۔ میں کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا، کئی دوست کہتے ہیں آپ کو فلاں جگہ لگوا دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میری منزل یہ نہیں ہے۔ میں تو ابھی منزل کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور منزل ابھی آگے بھاگ رہی ہے اور میری منزل شعر کہنا ہے۔ میری تو دعا ہے کہ میں شعر کہتا رہوں اور اللہ مجھے تروتازہ رکھے۔ مقابلہ بے وقوف کرتے ہیں۔

س کیا ادبی گروہ بندیاں ہوتی ہیں؟

ج گروہ بندیاں کیا ہوتی ہیں۔ چار لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں اور جوان سے نہیں کرتے وہ کہتے ہیں یہ ایک گروہ ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ گروہ آپ کے خلاف ہے تو اس کو آپ اپنی طاقت بناؤ۔ میرا خیال ہے کہ میں نے خود اپنا اتنا خیال نہیں رکھا جتنا مخالفین نے رکھا ہے۔ مجھے بہت وقت دیتے ہیں اور میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔

س آپ ایک نئے شاعر کو دانشورانہ تربیت کے لئے کیا مشورہ دیں گے؟

ج مشورہ نہیں، گزارش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں شعراء غزل پر محنت کرتے تھے اس لئے کہ فنون کو غزل دینی ہوتی تھی۔ غزل اچھی نہیں ہوگی تو قاسمی صاحب نہیں چھاپتے تھے۔ فنون تین ماہ بعد آئے یا چھ ماہ بعد، کوشش ہوتی تھی کہ انہیں غزل دیں۔ اب معاملہ فیس بک نے بہتر بھی کر دیا ہے اور خراب بھی۔ خراب یوں کہ بہت اچھے شاعر جو محنت کرتے تھے انہوں نے محنت چھوڑ دی ہے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ کاتا اور لے بھاگی۔ ادھر غزل لکھی اور ادھر لگا دی اور پانچ چھ سو کمنٹ بھی آ جاتے ہیں اور وہ بھی یوں جیسے شادیوں میں نیوندرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کام خراب ہوا۔ پہلے مایوسی یہ تھی کہ آواز دنیا تک نہیں جاتی اس لئے ہمیں کوئی بلاتا نہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ آواز سوچنے سے پہلے پہنچ جاتی ہے اور اب بھی اگر نہیں بلایا جا رہا تو مایوسی زیادہ ہوگئی ہے۔ نئی نسل اس طرف راغب ہو رہی ہے کہ باہر جانے والے ہمارا نام کٹوا دیتے ہیں۔

حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نام کوئی نہیں کٹوا سکتا۔ اللہ پر یقین ہو تو کوئی کسی کا راستہ نہیں روک سکتا۔ آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں امریکہ کے ٹور پر تھا۔ ثمینہ راجہ میرے بارے میں کوئی مضمون لکھ رہی تھیں کہ وہ شاعر نہیں ہے، چور ہے وغیرہ۔ مجھے لوگ بتاتے تو میں کہتا کوئی بات نہیں۔ میں جب یہاں آیا تو ایک مشاعرے میں میرے ایک دوست کے ساتھ یہی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں میں تو منہ پر بات کروں گی۔ میں نے کہا آپ جو کہہ رہی ہیں درست کہہ رہی ہیں۔ میں کوئی شاعر وائر نہیں ہوں اور آپ بہت بڑی شاعرہ ہیں۔ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن میں اب بھی کہتا ہوں کہ وہ بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ تو کہتی ہیں کہ میں اس طرح آپ کو شاعر تھوڑی مان لوں گی۔ تو میں نے کہا میں اس لئے تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس مٹی ہے۔ آپ کے پاس سونا ہے۔ اللہ میری مٹی کو سونے کے بھاؤ بیچتا ہے اور آپ کا سونا مٹی کے بھاؤ نہیں بکتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

س مشاعرے بالخصوص بیرون ملک مشاعرے کو ادبی سرگرمی کے طور پر کتنا اہم سمجھتے ہیں؟

ج دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو مشاعرے میں نہیں جاتے۔ وہ مشاعرے کو برا کہتے ہیں۔ جنہیں بلایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں یہ اچھا ہے، جو مخالف ہیں انہیں بھی اگر بلایا جائے تو فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے نام ہیں اور کالموں میں لکھتے ہیں کہ مشاعرہ تو برباد ہو گیا، خراب ہو گیا اور جب بلایا جاتا ہے تو پہلے پوچھتے ہیں کتنے پیسے دیں گے۔ مشاعرے نے اردو زبان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ بمبئی کی فلمی دنیا نے اور مشاعرے نے زبان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ پھر یہ آڈیو ویڈیو سلسلہ ایسا ہے کہ اس کے ذریعے لوگ کہیں نہ کہیں شاعری سے جڑے ہوتے ہیں مثلاً میری کتاب کے کئی ایڈیشن چھپے لیکن پھر بھی کتنی تعداد ہو گی لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میرا ایک ویڈیو کلپ اڑھائی تین لاکھ لوگوں نے دیکھا ہے تو سرشاری ہوتی ہے، میری رسائی کہاں تک ہے۔ اگر میر و غالب کے دور میں یوٹیوب ہوتی تو ہم آج دیکھ سکتے کہ میر صاحب کیسے شعر پڑھتے تھے، کیسے بیٹھتے تھے، آنے والے زمانوں میں کوئی تو ہو گا جو آج کے کسی شاعر کے بارے میں کہے گا کہ اس نام کا ایک شاعر تھا۔ یوٹیوب پر دیکھیں گے تو اس کے مشاعرے آ جائیں گے۔ جو کہتے ہیں مشاعرے کو خراب کر دیا گیا، ان کے لئے مشورہ ہے کہ اس کا حصہ بنیں اور اسے ٹھیک کر دیں۔ مشاعروں میں ضرور جائیں لیکن شاعری اپنے لئے کریں۔ سٹیج سے نیچے عوام کی سطح پر نہیں اترنا چاہئے بلکہ عوام کو اوپر اپنی سطح پر لانا چاہئے۔ اس میں وقت لگتا ہے لیکن لوگ آ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش کو بطور شاعر ادیب، محقق ومترجم تو ایک زمانہ جانتا ہے ،درسگاہوں سے متعلق افراد انہیں ماہرِ تعلیم اور فارسی دانی کے حوالے سے بھی خوب پہچانتے اورمعترف ہیں۔قارئین ارژنگ کو مگر میں ان کا تعارف ایک ایسے سکالر اور عالم کے طور پر کروانا چاہتا ہوں،ادب کے شعبے میں جن کے ہم پلہ نقطہ دان وطن عزیز میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ایک ایسے شفیق استاد جو تدریس کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔میری خوش بختی ہے کہ میں نے ایک سال ان سے فارسی زبان وادب پڑھا اور قارئین ارژنگ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے مکالمے کے لئے ہمیں وقت دیا۔ڈاکٹر علی کمیل قزلباش جیسے ہمہ جہت تخلیق کار اور دانشور پاکستان کی شان ہیں اور ادب کی آبرو ہیں۔

س گفتگو کا آغاز آپ کی ابتدائی زندگی سے کرتے ہیں۔کہاں پیدا ہوئے ؟اور بچپن کہاں گزرا؟اپنے سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے۔

ج میری پیدائش بلوچستان کے علاقے لورالائی کی ہے۔پرورش اور ابتدائی تعلیم بھی لورالائی میں ہی مکمل ہوئی۔میرے والد محنت کش تھے۔ایف سی ملیشیا میں سپاہی بھرتی ہوئے اور اس سے پیشتر وہ مزارع تھے۔پہلے پہل ہم گاؤں میں رہتے تھے۔مگر جب والد صاحب نے ایف سی میں نوکری شروع کر دی تو ہم شہر میں آ گئے۔تعلیم کا آغاز سرکاری سکول میں کیا جسے عرف عام میں ٹاٹ والا سکول کہتے ہیں۔میٹرک کے بعد میں نے ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔مگر امتحان کے دوران ایک طلبہ تنظیم نے ہنگامہ آرائی کی اور بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔حکومت نے تین سال کے لئے ہمارے شہر سے امتحانی مرکز ہی ختم کر دیا۔نتیجتاً مجھے پرائیویٹ ایف اے کرنا پڑا۔اس کے بعد بی اے بھی پھر پرائیویٹ ہی کیا۔سکول میں میرا ایک کلاس فیلو جوتوں کا کام کرتا تھا۔مجھے اس نے دوست ہونے کے ناطے اس کام میں شمولیت کی دعوت دی۔میں نے جوتے بنانے سیکھے اور کافی عرصہ جوتے بناتا رہا۔بعدازاں مجھے محسوس ہوا کہ پڑھائی اور جوتے بنانے کا کام اب ساتھ ساتھ

نہیں چل سکتے ہیں۔لہٰذا میں نے ادبیات کی محبت میں پاپوش سازی چھوڑ دی۔

س: تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج: تخلیقیت اصل میں ایک خدائی صفت ہے۔ مجھے عرض کرنے دیجئے کہ

ع این سعادت بزور بازو نیست

میری نظر میں تخلیقیت یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے انکشاف کے ذریعے کائنات کے انکشاف کی طرف بڑھتا ہے۔تخلیق کار چاہے ادب کے شعبے سے تعلق رکھتا ہو یا پھر کسی بھی اور شعبے سے، یہ ایک کلمہ ہے جو پروردگار کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرتی صلاحیت ہے مگر ایک اچھا تخلیق کار وہ ہے جو مطالعہ کر کے ،الفاظ و معنی پر دسترس حاصل کر کے بہتر انداز میں اپنے خیالات و احساسات کو اور نظریات کو تراش خراش کر کے بہتر انداز میں پیش کرتا ہے۔بصورت دیگر صلاحیت ہونے کے باوجود اور فکر کا حامل ہو کر بھی اگر کوئی محنت اور لگن سے تخلیقی کام اور مطالعہ نہیں کرتا تو وہ بڑا فن تخلیق نہیں کر سکے گا۔

س: کوئی آسودہ لمحہ؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج: میں سیلف میڈ قسم کا آدمی ہوں۔تمام عمر محنت میں گزری ہے۔ میری تو عادت رہی ہے کہ اپنی آسودگی دوسروں پر قربان کر دوں۔کامیابیاں اللہ تعالیٰ نے بہت دیں جسے میں نے ہمیشہ سفر میں سنگ میل ہی سمجھا جس سے آگے بڑھنا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ آسودگی تب محسوس ہوتی ہے جب کوئی اچھی تحریر پڑھتا ہوں۔میرے نزدیک آسودہ ترین عمل مطالعہ ہے۔شاعری میں خصوصاً جب شعر کی پرتیں اور گرہیں آپ پر کھلتی ہیں تو جو لطف محسوس ہوتا ہے وہ میں نے اور کہیں محسوس نہیں کیا۔

س: محسوس ہوتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

ج: میں عرض کروں کہ کتاب بینی اور کتاب خوانی کا رجحان ہمارے

ہاں شروع سے ہی نہیں ہے۔سچ تو یہ ہے کہ کتاب کا رواج یہاں پہلے بھی کم ہی رہا ہے۔ہاں یہ درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے مزید کم ہو گیا ہے۔ پڑھنے والے تو اب بھی پڑھتے ہیں مگر مجموعی طور پر ماحول مطالعہ کرنے کا نہیں ہے۔میں دوٹوک کہہ دوں کہ ہمارے اساتذہ جو پڑھاتے ہیں وہ خود بھی نہیں پڑھتے۔ میں اگر خود نہیں پڑھوں گا تو بچوں کو کیا پڑھاؤں گا، بلکہ عالم تو یہ ہے کہ جو اساتذہ کتابیں لکھ رہے ہیں وہ بھی کتابیں نہیں پڑھتے ہیں۔میں اسلام آباد

کے ایک مصنف کو جانتا ہوں جو تیس، پینتیس کتابیں لکھ چکے ہیں، میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انہوں نے اب تک اتنی کتابیں خود نہیں پڑھی ہوں گی۔ مطالعہ کا رجحان تعلیمی اداروں سے پیدا ہوتا ہے۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہوا ہے اس کی وجہ کیا سمجھتے ہیں؟ کون ذمہ دار ہے اس صورتحال کا؟

ج مشاعرہ شاعری کی ترویج کا ایک بہت بڑا ذریعہ رہا ہے۔ موجودہ دور میں مجھے ایک مصنوعی پن کا راج اسی ضمن میں نظر آتا ہے۔ مشاعرہ جو تھا، وہ مشاہرہ بنتا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں مشاہرہ معاوضے کو کہتے ہیں۔ شاعر حضرات وہیں جاتے ہیں جہاں اچھے معاوضے کی توقع ہوتی ہے۔ میڈیا کی وجہ سے کوریج اور شہرت اس بابت اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مشاعروں پر زوال آنے کی وجہ یہ ہے کہ جو اصل مقصد اور ہدف تھا وہ چلا گیا، اب خودنمائی اور خود پسندی کی ایک صورت ہے۔ فنی اور فکری لحاظ سے سطحیت مشاعروں میں غالب آ گئی ہے۔

س ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج ذاتی تجربات ومشاہدات بہت ہی زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک حقیقی تخلیق کار کے فن پر۔ ذاتی واردات ہو یا پھر معاشرتی تجربہ، اسی بنیاد پر ہی وہ اظہار کر سکے گا۔ تجربے اور مشاہدے کے بغیر تو تخلیقی عمل بہت ہی سطحی اور غیر حقیقی ہوگا۔

س آپ پاکستان میں فارسی زبان کے صفِ اول کے ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایران سے بھی آپ نے ادبیات کی تعلیم حاصل کی ہے، تہران یونیورسٹی میں گزرے دنوں کے بارے میں قارئین کو کچھ بتایئے؟

ج تہران یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں اکثر ادبی محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ گرچہ پی ایچ ڈی کا اپنا نصاب کافی ہوتا ہے مگر میں ادبی انجمنوں میں مسلسل جایا کرتا اور اس کے علاوہ میں نے انہی دنوں میں کافی تراجم بھی کئے۔ غیر ملکی طالب علموں کا تہران یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہے مگر میں اجازت لے کر ایرانی طلباء کو پڑھانے والے ان اساتذہ کی تدریس سے بھی استفادہ کرتا جو ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ بلکہ حال ہی میں وفات پانے والے قیصر امین پور سے میری بڑی دوستی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی نظموں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں انہوں نے میری بڑی مدد کی تھی۔ تہران یونیورسٹی سے میں نے پڑھا ہی نہیں بلکہ ان اساتذہ سے سچی بات یہ ہے کہ پڑھانا سیکھا۔ تحقیق کیسے کی جاتی ہے۔ میرا پی ایچ ڈی کا تھیسز علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک پر تھا۔ 2005 میں واپس پاکستان آ گیا۔ بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تدریس کی دعوت دی جسے میں نے قبول کر کے شعبہ فارسی جوائن کر لیا۔

س پاکستان میں تدریس کا تجربہ کیسا رہا؟

ج میں نے بلوچستان یونیورسٹی میں فارسی کے علاوہ اردو کے شعبے میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ بہت اچھا تجربہ تھا۔ فرقہ ورانہ قتل و غارت کی وجہ سے مجھے کوئٹہ چھوڑنا پڑا۔ یہ جبری ہجرت تھی۔ جو ہمارے نصیب میں لکھ دی گئی ہے۔ 2012 میں اسلام آباد شفٹ ہو گیا۔

س ادب کے حال اور مستقبل سے مطمئن ہیں؟

ج جی! مطمئن رہنا چاہیئے، چونکہ یہ تو نور کا دریا ہے۔ جو ہمیشہ سے بہہ رہا ہے اور مستقبل میں بھی بہتا رہے گا۔ اچھا لکھنے والے بڑے لوگ کل بھی تھے، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ادب کو کبھی زوال آئے گا، گراف اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ ادب پر کل بھی عروج تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اردو ادب کے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے۔ اس کا مستقبل روشن ہے۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا پھر اندرون سے؟

ج سخن ور کو معاشرے اور خارجی ماحول سے تحریک ضرور ملتی ہے مگر فنکار اس کے اندر موجود رہتا ہے۔ اگر اس کے اندر وہ حساسیت، فنکارانہ حسن پرستی اور تخلیقی صلاحیت موجود نہ ہو تو وہ تب تک باہر کی رنگا رنگی اور تحریک محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ رومی نے کہا ہے کہ

ع زندہ معشوق است و عاشق مردہ ای

عاشق کو تو معشوق ہی جگاتا ہے کہ بھئی مجھ میں حسن ہے اور تو میرا عاشق ہو جا۔ اسی طرح شاعر اور ادیب کو بھی باہر کا حسن متاثر کرتا ہے مگر رومی کے شعر کے مصداق عشق کرنے کی صلاحیت تو موجود ہونی چاہئے۔ سورج کے غروب ہونے کے منظر کی ہی مثال لے لیں، اس منظر کا اثر فنکار پر الگ اور ایک عام انسان پر مختلف ہوگا۔

س آغا جان! آپ نے لکھنے کا آغاز کب کیا؟

ج میں میٹرک، ایف ایس سی کے دنوں سے لکھ رہا ہوں۔ ابتداء میں گھر والوں نے حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ خصوصاً بڑے بھائی روکتے تھے کہ پڑھائی پر توجہ دیا کرو اور شعر و سخن سے تمہاری تدریس کا حرج ہوگا۔ میں چھپ چھپ کر ادبی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ رات کو کمرے میں لالٹین جلا کر پڑھتا تھا تاکہ اہل خانہ کو خبر نہ ہو۔ والدہ کہتی تھی کہ اس طرح آنکھیں خراب کر بیٹھو گے۔ کبھی کبھی گھر والے چھاپہ بھی مارتے تھے کہ یہ چھپ کر کہیں پڑھ تو نہیں رہا۔ میں یہاں

بتا تا چلوں کہ ان دنوں میرا ذریعہ معاش فوٹو گرافی تھا۔اصلاح سخن کے لئے میں نے اپنی تحصیل دکی کے کالج پرنسپل کو خط لکھا اور اپنی شاعری انہیں بھجوائی۔انہوں نے تنقید بھی کی مگر حوصلہ افزائی اور اصلاح بھی دیتے رہے۔انہی دنوں ایک ادبی پرچے میں میری شاعری شائع ہوئی جس پر لوگوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔میں نے بڑے بھائی کو جب وہ پرچہ دکھایا تو انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔اور پھر میری حوصلہ افزائی کرنا شروع کردی۔

س ادب میں سوشل میڈیا کے کردار کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا ادب کے فروغ میں بہت اہم اور اچھا کردار ادا کر رہا ہے۔اس نے کئی نئے دریچے کھول دیئے ہیں۔ادب کی ترویج کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا نے تاریخ سے پردہ اٹھانے اور حقائق سامنے لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔گرچہ کچھ غیر معیاری مواد بھی اس پر نشر ہو رہا ہے۔مگر وہ تو ہمارے استعمال پر منحصر ہے،اس میں میڈیا کا کوئی قصور نہیں ہے۔مختصراً یہ کہ ادب کے فروغ میں اس کا کردار مثبت اور اہم ہے۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج میری پہلی کتاب ''شاہکار پشتو افسانے'' کے نام سے کلاسیک لاہور نے شائع کی تھی۔خدا غریق رحمت کرے آغا امیر حسین کو جنہوں نے پہلے یہ تراجم اپنے ادبی میگزین ''سپوتنک'' میں شائع کئے اور پھر ان پشتو افسانوں کے اردو ترجمے کو کتابی شکل میں شائع کیا۔اس کے بعد میں نے ''نہج البلاغہ'' کے پشتو ترجمے،جس کا کام امیر حمزہ خان شنواری کر چکے تھے،اسے ایڈٹ اور مکمل کر کے شائع کروایا۔ڈاکٹر علی شریعتی کی ایک طویل فارسی نظم کو میں نے اردو میں ترجمہ کیا جو کہ بعد از اں کتابی شکل میں شائع ہوگئی۔اردو مقالات کی کتاب ''رگ تاگ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔فارسی مقالات پر مشتمل کتاب بھی میری چھپ چکی ہے۔جس کا نام ''سخن عشق'' ہے۔خواتین شادی بیاہ کے موقع پر جو پشتو میں لوک گیت گاتی ہیں ان کو میں نے ''اَنگئ'' کے نام سے جمع کر کے شائع کیا۔اس کے علاوہ لوک ورثہ کا میں نے انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جو چھپ چکا ہے۔لوک کہانیاں اور پھر لوک ورثہ اسلام آباد سے ایک اور کتاب بھی شائع ہوئی خوش حال خان خٹک کی فارسی شاعری کو میں نے اکٹھا کیا جو ''درکوچۂ ماہ'' کے نام سے شائع ہوئی،اسکا دیباچہ وغیرہ بھی میں نے ہی لکھا تھا۔حال ہی میں ڈاکٹر شفیع کدکنی کی اہم کتاب ''ادوار شعر فارسی'' کا میں نے اردو ترجمہ کیا۔جو کہ چھپ چکا ہے،اس کے علاوہ تراجم اور تحقیق کی تین کتابیں تیار ہیں۔شاعری میں تین زبانوں میں کرتا ہوں۔ادبی سفر کی ابتداء بھی شاعری سے ہی ہوئی مگر ابھی تک شعری

مجموعہ کوئی شائع نہیں ہوسکا۔اس کی وجہ حالات اور میری جبری ہجرتیں ہیں۔

س آغا آپ نے زیب مگسی کا دیوان بھی تو مرتب کیا تھا؟

ج جی ہاں! یاد آیا، زیب مگسی ہمارے بلوچستان کے بڑے زبردست شاعر ہیں۔ان کے کلام پر میں نے زاہدان یونیورسٹی کی ڈاکٹر مریم خلیلی کے ساتھ مل کر کام کیا ہے اور دیوان مرتب کیا ہے۔اس کے علاوہ بلوچستان کی لوک کہانیوں کا بھی میں نے انتخاب کیا ہے جسے لوک ورثہ اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ڈاکٹر علی شریعتی کی نظموں کا ترجمہ بالکل تیار ہے ''دفتر ہائے سبز'' کے نام سے ان کی نظمیں ہیں۔اس کے علاوہ جدید فارسی شعراء کا انتخاب اردو ترجمے کے ساتھ بالکل تیار ہے چھپنے کے لئے۔لوک ورثہ اسلام آباد سے ایک کتاب اشاعت کے مراحل میں ہے۔بلوچستان کی لوک شاعری کی ایک صنف ہے'' کاکڑی غاڑی''اسی نام سے اس صنف کی لوک شاعری کا انتخاب جو میں نے کیا ہے شائع ہو رہا ہے۔

س جبری ہجرت سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج ٹارگٹ کلنگ سے بچنے کے لئے 2012 میں مجھے کوئٹہ چھوڑنا پڑا۔مسلک کی بنیاد پر جب خون ریزی حد سے بڑھ گئی تو مجھے بادلِ نخواستہ جبری ہجرت کرنا پڑی اور میں اسلام آباد آ گیا۔ اسلام آباد میں چند سال علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے منسلک رہا۔اس کے بعد وفاقی یونیورسٹی میں کچھ عرصہ پڑھایا۔اس سال کا آغاز تھا کہ میں اسلام آباد چھوڑ کر واپس کوئٹہ آ گیا ہوں۔

س آپ نے پی ایچ ڈی تہران یونیورسٹی سے اقبال اور خوشحال خان خٹک کے موضوع پر کی ہے۔ایران جا کر پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟

ج دراصل بی اے کرنے کے بعد میں ماسٹرز کے لئے بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ آ گیا۔یہاں ایک شفیق استاد کے مشورے پر میں پشتو میں ایم اے کرنے لگا۔پشتو شعبہ کی کلاسز کا حال مگر پتلا تھا۔ویرانی ہی کا منظر عمومی تھا، کلاسز کم کم ہی ہوتی تھیں۔میں اجازت لے کر اردو کے شعبہ میں لیکچر سنتا رہتا، اسی دوران خانہ فرہنگ ایران نے فارسی سکھانے کا اہتمام کیا تو میں نے بھی داخلہ لے لیا۔اور ایک سال کم وبیش کا عرصہ مسلسل پڑھتا رہا۔ایم اے گولڈ میڈل لے کر کر چکا تو میری سرکاری نوکری بطور پشتو لیکچرار ہوگئی۔اس دوران خانہ فرہنگ سے جو میں فارسی سیکھ رہا تھا۔تو اس میں بھی نمایاں پوزیشن آئی۔ایران جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے تہران یونیورسٹی دیکھی اور معلوم ہوا کہ لوگ یہاں کیسے پی ایچ ڈی کرتے ہیں۔بس میں نے فیصلہ کیا پی ایچ ڈی کرنی ہے۔بغیر تنخواہ کے چھٹی لے کر ایران میں داخلہ لینے کے بعد تہران یونیورسٹی میں

ایک بار پھر طالب علمی اختیار کر لی۔

س پسندیدہ شاعر اور نثر نگار کون ہے؟

ج اردو میں دیکھا جائے تو غالب بڑا شاعر ہے، میں میر تقی میرؔ اور غالب دونوں کا مرید اور معتقد ہوں۔ اقبال کی عظمت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ عہد حاضر میں مجھے افتخار عارف بہت پسند ہیں۔ ناول میں عبداللہ حسین اور افسانے میں انتظار حسین پسند ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ رشید امجد اور منشاء یاد بھی بہت اچھے لکھاری تھے۔ سبھی کی مجموعی چاشنی ہے۔

س اسلام آباد کیوں چھوڑ دیا؟

ج اسلام آباد کے لوگوں میں تصنع اور بہت بناوٹ ہے، بڑے کھوکھلے اور جعلی لوگ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ بڑا شہر ہے، میری بھی گنجائش نکل آئے گی۔ کچھ اچھے دوستوں سے تو پہلے ہی رابطہ تھا۔ جو یہاں مقیم تھے، مگر اسلام آباد آ کر محسوس ہوا کہ بہت ہی مطلب پرست لوگ ہیں یہاں کے رہنے والے۔ تعلیمی اور سرکاری اداروں میں اگلے گریڈ کے لئے یہاں لوگ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اہل آدمی کی یہاں بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی اہل آدمی کسی بھی ادارے میں یہاں آ جائے تو سبھی لوگ اس کے خلاف سازشیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ آپ چاہے لکھ دیں مجھے اسلام آباد کے لوگوں کے کردار دیکھ کر سخت مایوسی اور کوفت ہوئی۔

س کیا کھویا؟ کیا پایا؟

ج مختصر ترین سوال ہے، مگر مشکل ترین سوال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کھونے کو تو جو ہمارا معاشرہ ہے، میں نے انسانی اور مذہبی حوالے سے بہت کچھ کھو دیا ہے، مگر سب سے زیادہ ملال مجھے وقت کے کھو جانے کا ہے۔ میں نے وقت کو کھویا ہے۔ حالانکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ حالات کا جبر تھا۔ مگر ان حالات کی وجہ سے میرا بہت سارا وقت ضائع ہوا ہے۔ بالکل فضول کاموں اور جبری ہجرت کی پریشانیوں میں۔ اس وقت کے کھونے کا مجھے افسوس ہے۔ سب سے قیمتی چیز جو میں نے پائی ہے وہ محبت ہے۔ دوستوں کی بے پناہ محبتیں میرے نزدیک سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کے علاوہ میں کہوں گا کہ فارسی ادب کا سرمایہ جو میں نے پایا ہے۔ ادب کا سرمایہ مجھے ثروت مند ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ دوستوں کی بے لوث محبتیں اور ادب کی رم جھم وہ قیمتیں اشیاء ہیں جو میں نے اس زندگی میں پائی ہیں۔

OOO

علی چوہدری

علی چوہدری اردو زبان کی انٹرنیٹ پر سب سے بڑی اور مؤثر ویب سائٹ (Web site) کے خالق ہیں۔ان کی ویب سائٹ اردو پوائنٹ کے یومیہ قارئین کی تعداد 10 لاکھ سے زیادہ ہے۔انتہائی مقبول کالم نگار اور بے حد متحرک صحافی ہیں لیکن ادبی اور صحافتی گروپ بندیوں سے بہت دور ہیں۔نوعمر ہونے کے باوجود اپنی فکر اور کام کے حوالے سے انتہائی سنجیدہ ہیں۔

س اردو پوائنٹ، ویب سائٹ کی تخلیق کا خیال کیسے آیا؟

ج بنیادی طور پر میرا تعلق انفارمیشن ٹیکنالوجی سے تھا۔بدقسمتی سے انٹرنیٹ پر کوئی بھی معیاری اردو ویب سائٹ نہیں تھی، جو موجود تھیں وہ بھی برائے نام۔ایسے حالات میں مجھے یہ خیال آیا کہ کم از کم انٹرنیٹ پر اردو زبان میں ایک ویب سائٹ ایسی ضرور ہونی چاہئے جو نظریہ پاکستان کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی قارئین کی ضرورتوں کو پورا کرے۔یہ دور میڈیا وار (Media War) کا دور ہے۔ہمارے دشمن ملک انڈیا کی انٹرنیٹ پر بے شمار سائٹیں موجود تھیں، کوئی بھی پاکستانی اور اردو سائٹ نہ ہونا ایک قابل تشویش بات تھی جس نے مجھے ''اردو پوائنٹ'' کی تشکیل و تخلیق کے لئے متحرک کیا۔

س آپ نے مغربی طرز تعلیم اور مغرب کے زیر اثر ماحول میں تعلیم پائی، یہ اردو سے آپ کو لگاؤ کیسے ہوا؟

ج بچپن میں ہی میری اردو انتہائی کمزور تھی اور میں اردو سے بھاگتا تھا حتی کہ کالج کی حد تک بھی یہی حالت رہی۔اردو کی طرف میرے رجحان کی وجہ اردو کی چاشنی و وسعت سے زیادہ جذبہ حب الوطنی تھا جس نے مجھے ''اردو پوائنٹ'' کی تخلیق کے لئے ابھارا۔شروع میں تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس قدر مقبول ہو جائے گی لیکن لوگوں کی دلچسپی اور دلجوئی نے میرا سفر آسان بنا دیا۔

س لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج پڑھنے پڑھانے کا شوق تو مجھے بچپن ہی سے تھا لیکن لکھنے کے بارے میں کبھی بھی سنجیدہ نہ

سوچا تھا۔ جب میں نے ''اردو پوائنٹ'' کی بنیا درکھی تو مجھے بڑی شدت سے کسی بولڈ(Bold) لکھنے والے کی کمی محسوس ہوئی۔ کالج کے زمانے میں لکھتا رہا اور دوستوں نے پسندیدگی کا اظہار بھی کیا لیکن اس عمل میں باقاعدگی نہ تھی لہٰذا میں نے باقاعدہ طور پر لکھنا شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

س سنا ہے آپ شاعری بھی کرتے ہیں؟

ج مسکراتے ہوئے...... میں باقاعدہ شاعر تو نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی کوئی شعر ہو جاتا ہے۔ ویسے شاعری پڑھتا بہت زیادہ ہوں اور شاعری سے لگاؤ بھی انتہائی درجے کا ہے۔

س کیا ہمارے علمی، ادبی اور ثقافتی ادارے آپ کے خیال میں کوئی تعمیری کام کر رہے ہیں؟

ج ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص دوسرے سے مطمئن نہیں ہے۔ ادبی، ثقافتی ادارے اپنی حد تک کچھ کچھ کر ہی رہے ہیں لیکن ان کا آپس میں رابطہ نہیں ہے۔ جیسے گزشتہ دو تین سال میں گورنمنٹ کمپیوٹر پر نیا ''اردو فاؤنٹ'' تخلیق کرنے والوں کے باہمی عدم تعاون کی وجہ سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے جو کہ بلاشبہ ایک قومی المیہ ہے۔ میرے خیال میں ایسے واقعات نہیں ہونے چاہئیں۔

س ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج ترقی پسند تحریک بلاشبہ ایک عظیم تحریک تھی اور اس کے اردو ادب پر بہت زیادہ احسانات ہیں۔ اس تحریک نے ادب کو مقصدیت سے نوازا اور ادیبوں کا ایک متحرک اور با مقصد رویہ Role طے کیا۔ ترقی پسند تحریک کو دوبارہ متحرک کیا جانا چاہئے۔

س آپ کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں، آپ کمپیوٹر پروگرامر بھی ہیں، کالم نگار بھی اور صحافی بھی، آپ کو اپنی شخصیت کی کون سی جہت زیادہ پسند ہے؟

ج کالم نگاری مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔

س معاشرے کو سدھارنے میں ایک ادیب کا کیا کردار ہونا چاہئے؟

ج ادیب جو بھی لکھتا ہے وہی لوگوں کا ایمان بن جاتا ہے۔ لوگ اس بات کو حق اور حقیقت گردانتے ہیں اس لئے ادیب کا کردار انتہائی اہم ہے۔ ادیب کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ مثبت رہے، اپنی سوچ میں، اپنی تخلیق میں اور اپنے کردار میں۔ مزید یہ کہ کالم نگاروں اور صحافیوں کو چاہئے کہ وہ صرف سیاست کے پیچھے ہی نہ پڑے رہیں۔ ہماری قومی زندگی کے اور بھی بے پناہ اہمیت کے حامل موضوعات اور مسائل موجود ہیں ان پر بھی بات ہوئی چاہئے۔ بدقسمتی سے ہمارے بیشتر

ادیب وصحافی حقیقی مسائل پر بہت ہی کم قلم اٹھاتے ہیں۔ سماجی موضوعات پر لکھنے والوں کا بہت بڑا فقدان موجود ہے۔ میرے خیال میں ادب وصحافت کا بنیادی موضوع سیاست کی بجائے سماج اور اس سے منسلک مسائل ہونا چاہئے ملک میں بڑھتی ہوئی غربت، جہالت، فحاشی اور طبقاتی کشمکش ہمارے اصل مسائل ہیں اور بے روزگاری اور افراط زر پر بھی لکھنے والے لوگ ہونے چاہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ادباء وصحافیوں کو حقیقی مسائل سے نظر چرانے کے لئے کبھی تو روپے پیسے کا لالچ دیا جاتا ہے اور کبھی ان کو دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ایک سچا ادیب وہی ہے جو اپنے کام کو ایک مقدس فرض سمجھ کر دھونس دھاندلی سے بے پرواہو کر پوری ایمانداری سے انجام دیتا رہے۔

س کبھی کسی سے عشق کیا اور انجام؟

ج مسکراتے ہوئے ......! عامر صاحب کیوں گھر سے نکلوانے پر تلے ہوئے ہیں، یہ جذبہ تو سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے...... ہونا چاہئے، عشق ہونا چاہئے۔ انسان بہت بدل جاتا ہے۔ عشق بڑی اچھی چیز ہے، انسان کو بڑا اچھا بنا دیتی ہے۔ جہاں تک انجام کا سوال ہے تو شادی عشق کا انجام یا منزل قطعی نہیں ہے۔ شادی ہو یا نہ ہو، عشق میں اس کی حیثیت ثانوی ہے بنیادی نہیں۔ عشق تو چلتا رہتا ہے، چلتا رہا ہے، چلنا چاہئے۔

س محفلوں سے اتنا دور کیوں رہتے ہیں؟

ج بھائی! اصل میں محفلوں میں گروہ بندیاں ہوتی ہیں اور میں گروہ بندیوں سے بھاگتا ہوں۔ محفلوں میں جانے سے آدمی کا کردار متنازعہ ہو جاتا ہے اور میں اس چیز کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ میرے نام کے ساتھ کسی خاص سیاسی پارٹی یا ادبی گروہ کا نام آئے۔ بنیادی اور اہم بات تو تخلیق و تعمیر ہے اور وہ میں الحمداللہ پورے جوش وجذبے سے کرنے میں مشغول ہوں۔

س اس وقت کون کون سے مسائل درپیش ہیں؟

ج مسائل تو پیش آتے رہے ہیں لیکن مستقل مسئلہ فنانس کا ہے چونکہ ہمارے اخراجات بہت زیادہ ہیں لیکن انٹرنیٹ کی لوگوں میں مناسب تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہماری آمدنی کے ذرائع انتہائی محدود ہیں لیکن امید ہے کہ جس رفتار سے لوگوں میں انٹرنیٹ کی تعلیم آرہی ہے تمام مسائل حل ہوجائیں گے۔

س کیا حکومت آپ سے کوئی تعاون کر رہی ہے؟

ج بالکل بھی نہیں حکومت کسی بھی سطح پر کوئی بھی تعاون نہیں کر رہی، ہمارے قارئین کی یومیہ

تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہے لیکن آج تک حکومت نے ہمیں کوئی اشتہار تک نہیں دیا۔

س مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟

ج میں چاہتا ہوں کہ اردو پوائنٹ کو اتنا مضبوط اور موثر ادارہ بنا دیا جائے کہ جب بھی کوئی پاکستانی یا اردو پڑھنے والا انٹرنیٹ کھولے تو سب سے پہلے اردو پوائنٹ کو دیکھے اور پڑھے، ان شاء اللہ اسی سال ہم ہر صوبے میں اپنے صوبائی دفتر کھول رہے ہیں پھر اس کے بعد ڈویژن کی سطح پر بھی آفس کھولنے کا ارادہ ہے تا کہ اسے زیادہ سے زیادہ موثر بنایا جا سکے اور ہر پاکستانی اردو پوائنٹ میں اپنی شمولیت محسوس کرے۔

س ادیب ساتھیوں کے لئے کوئی پیغام؟

ج پیغام تو نہیں درخواست ہے۔ انتہائی مودبانہ گزارش ہے کہ ادیب دوست اپنی گروہ بندیاں اپنے تک ہی رکھیں، انہیں عوام کے سامنے نہ لائیں۔ عوام آپ کو بہت عظیم اور معتبر خیال کرتے ہیں لیکن ذاتی نوعیت کی بیان بازیوں کی وجہ سے لوگ پورے ادبی طبقے کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ادیبوں کو چاہئے کہ وہ سیاستدانوں کی طرح ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی نہ کریں اور تن من سے تخلیقی کام سرانجام دیں جو کہ ایک ادیب کا حقیقی فریضہ ہے۔

OOO

کیپٹن عطا محمد خاں

س کب اور کیسے خیال آیا کہ لکھنا چاہئے؟

ج شعر کہنے میں میرے بڑے بھائی راؤ اختر علی خان (مرحوم) کا بڑا حصہ تھا۔ وہ اکثر شعر کا پہلا مصرعہ پڑھتے اور دوسرا سننے کی فرمائش کرتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ طبیعت اس طرف راغب ہوئی اور مسلسل اس بات کی تحریک ہوئی کہ شعر کہے جائیں۔ اس کے علاوہ گھر کا ماحول بھی ادبی تھا۔ گھر کی فضا میں اکثر اوقات اشعار اور مصرعے گونجتے رہتے تھے۔ ان کے بعد راؤ افتخار خان بھائی جو اس وقت میرے کافی قریب ہیں اور زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں ڈین فیکلٹی آف ایگریکلچر ہیں، ان کے شعری اور ادبی ذوق نے بہت متاثر کیا۔ صحیح معنوں میں سکول کے زمانے کے استاد ماسٹر غلام محمد وہ شخصیت ہیں جنہوں نے میرے شعری ذوق کی آبیاری کی۔ وہ خود بھی اچھے شاعر ہیں اور غالب کے رنگ میں غزلیں کہتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کے ساتھ ہی ادبی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ انہی محفلوں کی وجہ سے شعر کہنے کا شوق مزید بڑھا۔ شروع میں ابتداء کے طور پر اصلاح بھی ماسٹر صاحب سے ہی لی۔

س ابتدائی زندگی کب اور کہاں کیسے گزری؟

ج 3 اکتوبر 1958ء کو عارف والا کے ایک راجپوت خاندان میں پیدا ہوا۔ والد صاحب راؤ انور علی خان محکمہ ماحولیات میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ علاقے کے ایک بااثر زمیندار بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں عام زمینداروں کے برعکس توازن اور اعتدال بہت تھا۔ والدہ بھارت کے صوبہ اتر پردیش سے ہجرت کر کے آئی تھیں۔ والدہ صاحبہ نے شروع ہی سے خوش اخلاقی اور خداخوفی کا درس دیا۔ والد صاحب جہاں دیدہ اور سنجیدہ مزاج بزرگ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اولاد کی جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی غذا کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔ وہ اکثر گھر میں کہا کرتے تھے ''اچھا کھاؤ لیکن سادہ پہنو۔'' میرے والد میری آئیڈیل شخصیت تھے۔ اگرچہ بچپن ہی سے خوش مزاج اور ماحول کو خوش گوار بنا کر رکھنے والا انسان ہوں لیکن والد کے سامنے

ہمیشہ سنجیدہ رہتا تھا۔بچپن عارف والا کی گلیوں میں گزرا۔آج بھی بچپن کی یادیں صفحہ ذہن پر نقش ہیں۔ عارف والا شہر اپنی ریتلی زمین اور خربوزے کے کھیتوں کے باعث پنجاب بھر میں مشہور ہے۔اسی ماحول میں بچپن اور لڑکپن گزارا۔ والد صاحب صبح کی نماز کے بعد جب سیر پر جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ ان کی انگلی پکڑ کر ہرے بھرے کھیتوں میں نکلتا۔ فطرت کے اس رومان پرور ماحول نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فطرت پسندی اور ماحول کی شفافیت نے میرے شاعرانہ مزاج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنے سکول کے زمانے کے دو استادوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ایک قاضی عبدالرحمن تھے جنہیں فارسی اور اردو پر خاصا عبور تھا۔ان کی طبیعت رعب دبدبے والی تھی اور انہیں دیکھ کر ریاض خیر آبادی کا شعر یاد آتا تھا:

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

انہوں نے ہی مجھے اردو کے ابتدائی عروض سکھائے۔ دوسرے استاد ماسٹر غلام محمد صاحب تھے جن کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔ پھر زندگی کے دوسرے موڑ میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے زراعت میں بی ایس سی کی ڈگری لی۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ مجھے شیلے اور ایلیٹ بہت پسند تھے۔

س پہلے فوج اور بعدازاں سول بیوروکریسی ایسے عالم میں شاعری سے رغبت اور ذریعہ اظہار بنانا منفرد بات لگتی ہے، یہ متضاد شعبہ جات، اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج فوج اور سول بیوروکریسی نے زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ شاعری سے رغبت اور اسے ذریعہ اظہار بنانا میرے اندر کے عطاء کی مجبوری تھی۔ ذریعہ معاش کچھ بھی ہو، مجھے شاعر ہی بننا تھا اور میں شاعر ہی بنا ہوں۔ گھر کا ماحول، سکول کا زمانہ، انگریزی ادب کا مطالعہ، ان سارے عوامل نے مجھ پر فطرت کے کئی بھید افشاء کئے ہیں مثلاً دیوان غالب کئی بار پڑھا ہے اور ہر دفعہ اس میں نئی لذت اور نیا کیف پایا ہے۔ بعض اوقات تو اشعار کی نئی نئی تشریحات کھلتی ہیں۔ میر اور غالب کا عاشق ہوں، اقبال کا بھی اچھا خاصا مطالعہ کیا ہے۔ کلیات اقبال ایسی چیز نہیں کہ ایک مرتبہ پڑھ کر پھر طاق پر رکھ دی جائے بلکہ یہ کتاب بار بار اور مسلسل مطالعے کے لائق ہے۔ فیض، ممتاز مفتی، مشتاق احمد یوسفی اور عطاء الحق قاسمی کو بہت پڑھا ہے۔ احمد فراز سے بہت دوستی اور تعلق خاطر رہا۔ اپنی پہلی کتاب ''سرزنداں'' کے کئی شعروں میں فراز کے توجہ دلانے پر ترمیم

کی۔فراز کے انتقال پر کچھ شعر بھی کہے تھے:

زمین زادہ فلک کے سفر پہ جا نکلا
وہ ایک شعر فراز ہنر پہ جا نکلا

س اب تک کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ج اب تک تین شعرے مجموعہ ''سرزنداں، بساطِ خواب، اورتکون'' شائع ہو چکے ہیں۔

س آپ دانشور ہیں، بیوروکریٹ ہیں اور تخلیق کار بھی ہیں، آپ کے خیال میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کون سا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟

ج پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ قومی یکجہتی ہے، کیا ہم ایک قوم بن سکے ہیں یا کوئی حادثہ یا واقعہ یا جنگ ہی ہمیں ایک ہجوم سے ایک قوم کی شکل دے سکتی ہے، ہاں جہاں تک ادبی مسائل کا ذکر ہے تو راستے کی رکاوٹیں ہیں۔ یہاں ذہین بہت ہیں، ان کے اظہار کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ تخلیق کار بہت ہیں۔ ان کا ہنر اجاگر ہونے میں رکاوٹیں ہیں۔ دینے والے ہاتھ بہت ہیں لیکن لینے والے ہاتھوں کے راستے میں رکاوٹیں ہیں۔ پاکستان اس اعتبار سے بہت خوش قسمت ہے کہ یہاں رفاہ عامہ، فلاح یا عام لفظوں میں خیرات کرنے کا جذبہ رکھنے والے بہت ہیں لیکن ان کی خیرات صحیح طریقے سے صحیح حق دار تک نہیں پہنچ پاتی۔

س چاند کو دیکھ کر کس کا خیال آتا ہے؟

ج چاند کو دیکھ کر چاندنی میں نہائے ہوئے ماحول کا حسن یاد آتا ہے۔ دو ہی تو چیزیں ہیں جو فطرت کے حسن کو نکھارتی ہیں۔ ایک چاند کی چاندنی اور دوسری چیز ہے صبح کا منظر۔ جوش صاحب نے کہا تھا:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

س کیا آپ اپنی شاعری کو وہ وقت دے پائے ہیں جس کی وہ متقاضی تھی؟

ج شاعری میری محبت ہے اور محبت لمحاتی احساس کا نام نہیں ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو عمر بھر لہو اور روح میں رچا بسا رہتا ہے۔

س آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

ج ارسطو نے شاعری کو تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ ورڈز ورتھ نے شاعری کو تمام

علوم کی خوشبو کہا ہے۔ آرنلڈ نے شاعری کو زندگی کا ترجمان قرار دیا ہے۔ بہت سے آئمہ، اولیاء، صلحاء، علماء، فلسفیوں، منطقیوں اور عروضیوں نے شاعری کی ہے۔ وجہ یہی کہ شاعری ہر ذوق سلیم رکھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں حساسیت فکر کا جوہر ہے۔ آپ جب گرد و پیش کی دنیا اور خارجی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں یا پھر آپ کے اندر کی حساسیت حصار کو توڑ کر باہر نکلتی ہے تو وہ شعر کا روپ دھار لیتی ہے۔ نظریہ فن میں بہت سی چیزیں آ جاتی ہیں مثلاً روایت سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، ان دیکھے حسن کی جستجو، تخیل کی فراوانی، وفور جذبات، انفرادیت، آزادئ خیال، حسن سے تا بہ حق دار لطف اٹھانے میں آسودگی یا ناآسودگی کا احساس، رنگوں سے مہکتا ہوا ماحول، ہجرت، یہ سب کچھ آپ کے فن کو نکھارتے ہیں۔

س شاعری کے علاوہ اگر کسی اور صنف میں لکھتے تو وہ کون سی ہوتی؟

ج شاعری کے علاوہ کسی اور صنف میں لکھتا تو وہ بھی شاعری ہی ہوتی۔

س کیا پاکستانی ادب ہماری تہذیب، ثقافت اور معاشرت کا ترجمان ہے؟

ج پاکستانی ادب یقیناً ہماری تہذیب، ثقافت اور معاشرے کا ترجمان ہے۔ ہماری شاعری، نثری ادب (خصوصاً ناول، افسانے اور ڈرامے) ہماری اپنی ہی دھرتی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہمارا شاعر اور ادیب اس دھرتی سے جڑا ہوا ہے، کٹا ہوا نہیں۔

س سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں کی اہمیت اور مقاصد کیا ہیں؟

ج سرکاری سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں کی بہت اہمیت ہے۔ پہلے نواب، رؤساء اور امراء شعری محفلیں منعقد کرا کے شاعروں کی مالی اعانت یا سرپرستی کرتے تھے۔ چونکہ یہ ایک مہنگا سودا ہے اس لئے اس کے انعقاد اور فروغ کے لئے سرکاری سرپرستی از حد ضروری ہے۔ مشاعرہ ایک تہذیبی روایت ہے اور اس روایت کو زندہ رہنا چاہئے۔ جب آپ بڑے اور اچھے شاعروں کو سنتے ہیں تو وہ لمحے آپ کی زندگی کے یادگار لمحوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے کسی بھی عام شخص کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ فرداً فرداً شاعروں سے مل سکے لیکن محفل مشاعرہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس سے ہر ادبی ذوق رکھنے والا عام شخص استفادہ کر سکتا ہے۔

س کیا آپ ادب میں تنقید کی اہمیت کے قائل ہیں؟

ج تنقید نکھارتی ہے اسی لئے ہر عہد میں ادبی تنقید کے نئے معیار اور زاویے تراشے جاتے ہیں۔

س اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ قارئین سے شیئر کیجئے؟

ج واقعہ تو ایک لمبی کہانی ہے مگر مختصراً یہ کہ مجھے 1994ء میں کچھ دہشت گرد اغوا کر کے افغانستان لے گئے اور تقریباً پانچ ماہ ان کی سخت ترین قید میں رہا۔ اس دوران جو زندگی اور موت سے متعلق در یچے وا ہوئے، وہ میں نے ''سرِ زنداں'' میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی دوران مجھے ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' کا مفہوم بھی سمجھ میں آیا۔

س قارئین کے لئے کوئی پیغام؟

ج پیغام صرف اور صرف یہ ہے کہ برداشت اور تحمل کا مادہ پیدا کریں اور دوسروں کو آسانیاں تقسیم کریں۔

OOO

ڈاکٹر عائشہ عظیم

س: بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج: میری پیدائش ضلع قصور کے ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی۔ والد اور تایا کی محبت مثالی تھی۔ ہم تایا زاد چچا زاد کا بچپن بھی کھیلتے کودتے اور پڑھتے لکھتے گزرا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تایا زاد بہن بڑی بہن کا کردار ادا کرتے ہوئے میری سکول میں کی گئی شرارتوں کی شکایت سنتی اور گھر میں ہم آل از ویل کا ماحول بنائے رکھتے۔ مالی آسودگی تھی۔ لیکن ماں باپ نے ہر طرح کے حالات میں جینا سکھایا۔ ہر خواہش پوری نہیں کی جاتی تھی۔ خیر کبھی ایسی نوبت نہیں آئی کہ لا حاصل خواہشات نا آسودہ حسرتیں بنتیں۔ میں نے گرما گرم پراٹھے پر مکھن اور سرخ مرچ والی چٹنی رکھ کر بھی کھائی ہے اور جدید ماڈرن ناشتہ سے بھی لطف اٹھایا۔ وہ دور ایسا تھا کہ سب سچے اور اچھے ہوتے تھے۔ موبائل فون نہیں تھا تو لوگ لوگوں سے بات کرتے تھے۔ زندگی جینے کا ڈھنگ بھی ان ہی لوگوں کو تھا۔ آج تو زمانہ چال قیامت کی چل چکا ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ بچہ بھی جانتا ہے کہ اس کی پرائیویسی ہے۔ لیکن ہمارا تعلق اس '' مظلوم '' نسل سے ہے جن کی شادیاں اور اولادیں بھی ہو جائیں تو ماں باپ اسی طرح پیش آتے جیسے ہم پندرہ سولہ سال کی خطرناک عمر میں ہیں اور لغزش کی توقع کسی بھی وقت متوقع ہو۔ میں اپنے بھائی کو بچوں سے بے حد لاڈ کرتے دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ ہمیں باپ کا ''سچا پیار'' نہیں ملا۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اس زمانے کے ابوں کا یہی ماڈل مارکیٹ میں میسر تھا۔

س: ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج: میٹرک سائنس کے مضامین کے ساتھ کیا تو کالج میں قدم رکھتے ہی میں ایف ایس سی پری میڈیکل کی طالبہ تھی۔ اس زمانے میں جو ایف اے کرتا اسے ذہانت کے نچلے درجے پر رکھا جاتا اور ایف ایس سی کرنے والے ذہین و فطین شمار ہوتے۔ سو ما بدولت کو بھی ذہین کہلانے کا شوق چرایا اور میں والد صاحب کی مرضی کے خلاف ایف ایس سی کی طالب علم کہلائی۔ میری اردو لازمی کی

استاد ہوتی تھیں۔مسز ارشد بھٹی۔۔دھان پان سی جسامت،اکثر ساڑھی میں ملبوس ہوتیں،سیاہ اور سفید بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے،ناک پہ چشمہ اور چہرے پر مسکراہٹ یہ ان کی شخصیت کی لازمی چیزیں تھیں۔ان کے طریقہ تدریس نے ایسا متاثر کیا کہ بی اے میں سائیکالوجی کے ساتھ اردو لٹریچر بطور اختیاری مضمون لے لیا۔اور بس ادب تو اب جیسے گھٹی میں پڑنا شروع ہو گیا۔پھر ایم اے اردو ایم فل پی ایچ ڈی۔ادب کو تو جیسے اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے؟

ج چار کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں داؤد رہبر فنی وفکری ارتقا،میرا تحقیقی کام تھا۔ٹی وی ڈراموں کا حشر دیکھا تو عطاء الحق قاسمی صاحب کے ڈراموں شب دیگ اور خواجہ اینڈ سن کو ٹرانسکرائب کر ڈالا۔تدوین کا ایک بڑا کام جو میں اپنے کریڈٹ پر سمجھتی ہوں وہ ''مشاہیر کے خطوط بنام عطاء الحق قاسمی'' ہے۔اس کے علاوہ دو تحقیقی پراجیکٹس اور ایک طنز ومزاح پر مبنی کتاب راستے میں ہیں۔

اور میری فراغت کے منتظر ہیں۔

س اصناف سخن میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی صنف ہے؟

ج پیشہ کے اعتبار سے استاد ہوں۔تمام اصناف سے واسطہ رہتا ہے لیکن،ناول اور طنز ومزاح، یہ دونوں اصناف مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔میں خود مزاح لکھتی ہوں۔یا مزاح لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔طنز ومزاح میں آپ قلم کی نوک پر شگفتگی سجا کر ایسی کاٹ دار باتیں کر جاتے ہیں کہ لوگ ہنستے ہنستے آئینہ دیکھ لیتے ہیں۔اور ان کی طبیعت بھی مکدر نہیں ہوتی۔

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہی ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

ج کسی ادبی تحریک کا تو پتا نہیں لیکن میرا تعلق قاسمی قبیلے سے ہے۔میں نے عطاء الحق قاسمی صاحب سے زندگی جینا سیکھا ہے۔زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قہقہے لگانا سیکھا ہے۔میں نے ان سے اعلیٰ ظرفی سیکھی ہے۔میں نے ان سے حاسدین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا گر سیکھا ہے۔آپ کے سوال کے دوسرے حصے کی طرف آئیں تو میرے نزدیک اہل قلم کو سیاست میں ضرور آنا چاہیئے۔کیوں کہ ان کے پاس احساس کی دولت ہوتی ہے اور اسی احساس سے وہ ملک کی ترقی میں اپنا کردار بہتر انداز میں ادا کر سکتے ہیں۔

س کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا

چلا جا ہے؟

ج جی یہ بالکل درست ہے کہ کتاب کلچر ڈیجیٹل میڈیا گردی کا شکار ہو چکا ہے۔نو جوان نسل نے کتاب پڑھنا چھوڑ دی ہے۔کرونا کے دنوں میں جب زندگی صرف الیکٹرانک اور ڈیجیٹل میڈیا کے گرد گھومنے لگی تھی تو اس وقت پروان چڑھنے والی نسل کا کتاب سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔یہ ہر چیز کو آن لائن اپنی دست رس میں کر لینا ہی کافی سمجھتے ہیں۔رہی سہی کسر مصنوعی ذہانت نے پوری کر دی۔اب ہمیں سب سے فضول کام اپنے ذہن کا استعمال لگتا ہے اس کے لیے ہمیں محنت کرنا ہوگی۔ اس پر کام کرنا پڑے گا۔ورنہ ہم خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار چکے ہیں۔اعلی ادب کی تخلیق اور پھر نو جوان نسل کو اس کی طرف راغب کرنے سے ہی کتاب دوستی کی طرف مائل کیا جا سکتا۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج تخلیق کو عورت سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔اسی احساس سے گزر کر ایک ادیب اپنی تخلیق ادبی دنیا کے سامنے لاتا ہے۔اور وہی وقت اس کی آسودگی کا ہوتا ہے۔ذاتی زندگی میں خود کو مصروف رکھنا میرے لیے آسودگی ہے۔ میں اپنے دوستوں اور اپنے رشتوں کے بارے میں بہت حساس ہوں۔ان کی خوشی میں میں خوش رہتی ہوں۔

س آپ کی زندگی کا ایک حصہ قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن میں کام کرتے ہوئے گزرتا ہے، یہ تجربہ کیسا ہے؟

ج قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں ادب اور لٹریچر کے فروغ کے لیے ہم حصہ بقدرِ جثہ ڈال رہے ہیں۔قاسم علی شاہ صاحب نے جب مجھے فون کیا کہ آپ آئیں اور ہماری فاؤنڈیشن کے اردو سیکشن کو بطور ہیڈ جوائن کریں تو میری حیرانی اپنے عروج پر تھی کہ کیسے ان کے ذہن میں میرا نام آیا۔یہ بھی سچ ہے کہ اس پلیٹ فارم نے میری صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا۔ یہاں کتابوں کی تقاریب پذیرائی کروائی جاتی ہیں۔انٹرویوز اور مشاعرے سجائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سرگرمیاں ادبی ذوق کی آئینہ دار اور تشنگی دور کرنے کا باعث ہیں۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتی ہیں؟

ج میرے نزدیک تخلیقیت سے مراد ادبی دنیا میں نئی بات کہنا ہے نئے خیال کو نئے انداز میں پیش کرنا ہے۔ایک اچھا تخلیق کار وہی ہے جس کا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہے۔وہ اپنے قاری کے ذہن اور دل میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس کے پاس باریک بینی سے مشاہدہ کرنے کی

صلاحیت ہوگی تو وہ بظاہر معمولی چیزوں میں چھپی گہرائی اور خوب صورتی کو تلاش کر لے گا۔ اور اس کی یہی انفرادیت اسے دیگر لکھاریوں سے ممتاز بنا دے گی۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج لکھنے کی بات کریں تو پہلی تحریر کالج میگزین میں دوران بی ایڈ لکھی۔ یہ مزاح پارہ تھا۔ لیکن میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا لکھا ہے۔ اور پھر ایم فل پی ایچ ڈی کی پڑھائی، تحقیقی کام کے مطالبوں اور گھریلو مصروفیات نے اس طرف آنے نہیں دیا۔ میرا سب سے بڑا ٹارگٹ داؤد رہبر پر تحقیقی مقالہ لکھنا تھا۔ میں نے صرف وہی لکھا۔ یہ تو بہت بعد میں گل نوخیز اختر نے لکھنے پر اکسایا کہ آپ مزاح ہی لکھیں۔ اور ابھی تک لکھ رہی ہوں۔ قاسمی صاحب بھی ہمیشہ کہتے کہ ''مزاح باقاعدگی سے لکھو تم اچھا لکھتی ہو'' ان کے یہ الفاظ میرے لیے کسی سند سے کم نہیں ہیں۔ پیشہ ورانہ زندگی کی بات کریں تو دارارقم میں بطور پرنسپل ایک سال کام کیا۔ پھر ایم فل اور پی ایچ ڈی کا شوق مجھے لاہور لے آیا۔ بیکن ہاوس، ایف سی کالج اور لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی میرے ٹھکانے رہے۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

ج دونوں سے۔۔۔۔ لکھاری کو اپنے خارج میں جیسا ماحول ملے گا اس کے اندر کا موسم بھی ویسا ہی ہوگا۔ میر تقی میر کو زمانے نے جو دکھ دیا اس کا حال ان کی شاعری میں آیا اور وہ ''آہ'' کے شاعر قرار پائے۔ میرزا خان داغ دہلوی کو خارج نے شہزادوں کا ماحول دیا تو ان کی شاعری میں نشاطیہ رنگ در آیا۔ بھوکے پیٹ کوئی شخص کیسے کسی بھرے ہوئے پیٹ والے کے احساسات کو بیان کر سکتا ہے۔ اسی طرح بھرے پیٹ والا بھوک سے جنگ لڑتے احساسات کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اسے بھوکا رہ کر محسوس کرنا پڑے گا۔ اس لیے لکھنے کی تحریک تو اسے معاشرہ دے گا لیکن اس میں اس کی مدد اس کا اندرون کرے گا۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج زمانہ بدل چکا ہے۔ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کا اپنا نہایت مضبوط کردار ہے۔ جدید اور عالمی ادب تک رسائی آسان ہو چکی ہے۔ یہ تنقید اور ردعمل کا تیز ترین ذریعہ ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ادب اور ادیب کے لیے بہت سے چیلنجز بھی سر اٹھا چکے ہیں جیسے غیر معیاری اور سطحی ادب کی تخلیق اور سرقہ۔ نئے لکھنے والے راتوں رات گرامی ادیب کہلانے کے چکر میں ہیں۔ سوشل میڈیا نے ادب کو زندہ و متحرک رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ تاہم اس کے مثبت

استعمال کوفروغ دینااور معیاری ادب کی ترویج پر توجہ دیناضروری ہے تاکہ یہ پلیٹ فارم ادبی ترقی کے لیے موثر ثابت ہو۔

س ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج فن کار حساس ہوتا ہے۔اس کے ساتھ جو بیتے گی اور جو معاشرے میں ہوتا دیکھ کر وہ جذب کرے گا۔وہی کچھ وہ رقم کرے گا۔اب چونکہ ہر شخص اورفن کار کے تجربات اس کے ذاتی ہوں گے اس لیے یہ تجربات اور ان کا بیانیہ اسے منفرد شناخت دینے کا باعث بنیں گے۔اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو وسعت ملے گی۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج میں نے '' کھویا'' بھی کھایا اور ''پایا'' بھی میرا پسندیدہ ہے۔(ہنستے ہوئے) زندگی میں کچھ خواب ادھورے رہ گئے۔لیکن آج جب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو دل سے الحمدللہ نکلتا ہے۔

س آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا منصوبے اور ارادے ہیں؟

ج آج کل ایک دوعلمی پراجیکٹس ہیں جن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی تگ ودو میں ہوں۔ مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں آپ جان کر حیران ہوں گے کہ میں مستقبل کی منصوبہ سازی نہیں کرتی۔یہ میری شخصیت کا کمزور پہلو ہے۔میں صرف لمحہ موجود میں جینا پسند کرتی ہوں۔میرا ماننا ہے کہ ماضی کی ناآسودگی پچھتاووں میں بدل جاتی ہے اور مستقبل کے منصوبے آپ کو بے چین رکھتے ہیں۔اس لیے جو ہے وہ آج ہے۔آج کو اچھا گزار لیں۔کچھ ادبی اور تخلیقی کام کر لیں گے تو مستقبل اسی سے جڑا ہوگا۔اور اگر آپ نے سو کر گزار دیا تو مستقبل کے منصوبے آپ کو کہیں مدد نہیں دیں گے۔

OOO

غلام حسین ساجد

س سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج میرا تعلق میاں چنوں کی نواحی آبادی ''بستی کبیر سنپال'' سے ہے۔ میں ستپال ہوں جو سیال راجپوتوں کی ایک شاخ ہے اور گنجی بار کے اس حصے میں صدیوں سے آباد ہے۔ خانقاہی تاریخ سے متعلق لوگ جانتے ہیں کہ خود حضرت میاں چنوں کی نسبت اسی قبیلے سے ہے۔ یہ لوگ زمیندار اور زراعت سے متعلق ہیں اور تعلیم و تعلّم سے انہیں کبھی علاقہ نہیں رہا۔ ان کے مزاج پر قبائلی روایت کا غلبہ تھا اور ہے۔ میں مذکورہ بستی میں یکم دسمبر 1951ء کو مہر سجاول کے گھر پیدا ہوا۔ میری ماں کی خواہش اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کی تھی۔ سو میں نے نواحی گاؤں جراحی اور پکا حاجی مجید میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایم سی ہائی سکول میاں چنوں سے میٹرک، گورنمنٹ کالج ساہیوال سے انٹر، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے ڈگری اور یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے پنجابی اور اردو کئے۔ ادبی ذوق کی بنیاد مطالعہ تھی اور رہنما ادبی کتب۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج عملی زندگی کا آغاز لاہور سے اپریل 1978ء میں ہوا۔ جب میں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے ریسرچ ایسوسی ایٹ منتخب ہونے کے بعد مرکز تحقیق و ترقی نصاب میں تعینات کیا گیا۔ یہاں معروف نقاد اور شاعر صدیق کلیم جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے تھے، ڈائریکٹر تھے۔ میرے مشفق و مہربان رہنما ہوئے اور مجھے عالمی ادب کے مطالعے کی راہ پر لگایا۔ اس سے کئی برس پہلے میں جناب محمد سلیم الرحمن، نجم حسین سید، جناب علی عباس جلال پوری، جناب احمد ندیم قاسمی اور کئی اور معروف لکھنے والوں کے حلقہ ارادت میں داخل ہو چکا تھا۔ سو لاہور میں تعیناتی نے میرے ذوق ادب کو مہمیز کیا۔

س ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج اس کے لئے کسی خاص عمر یا مدت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ میں ابھی تیسری جماعت میں تھا

کہ میرے باپ کے رسوخ کے باعث مجھے سکول میں موجود کتابوں کے مقفل صندوق کو کھلوانے کی سہولت مل گئی تھی۔ پھر شہر آنے پر آنہ لائبریریوں سے کتابیں لے کر پڑھنے اور خود خرید کر پڑھنے میں بھی کوئی دقت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میٹرک تک میں نسیم حجازی، صادق حسین سردھنوی اور رئیس احمد جعفری سے آغاز کر کے کرشن چندر، منٹو اور بیدی تک پہنچ گیا تھا۔ شاعری کا مطالعہ کالج میں آنے کے بعد آغاز کیا۔ مگر اپنا پہلا شعر غالباً میں نے تیرہ برس کی عمر میں کہا تھا اور اسے صحن کی کچی زمین پر اپنی انگلی سے نقش کیا تھا۔ کیونکہ وہ رات تھی اور مدھم چاندنی میں بس مجھے یہی قرطاس دستیاب تھا۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے؟

ج میں اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں ایک جیسی سہولت سے لکھتا ہوں۔ اردو کے ''نو موسم، عناصر، کتاب صبح، آئند، معاملہ، روداد، نیند میں چلتے ہوئے، چہار دریا، اور اعادہ'' پنجابی کے ساتھ ''دنیا پھرے غمازی، پانی رمز بھرے، بیلے وچ چڑیاں، سرسوتی تس راوی تائیں بانے، کسے سفنے دے نال، اور مونجھ وسارے محل'' شعری مجموعوں کے علاوہ ''مہاندر'' (خاکے) ''نیندر بھنی رات'' (کہانیاں) اور ''تائید'' (تنقید) میری طبع زاد کتابیں ہیں۔ چار مرتبہ کتابیں ''نئی پاکستانی نظم، نئے دستخط'' (دہلی، بھارت، لاہور پاکستان) اور ''اردو شاعری کلاسیکی عہد میں، اردو ادب بیسویں صدی میں'' ان کے علاوہ ہیں اور الحمدللہ تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب یا نثر؟

ج عامر صاحب! نثر ہو یا نظم، یہ دونوں اظہار کے وسیلے ہیں اور موضوع ہی اپنے لئے ہیئت اور اظہار کے سانچے کا انتخاب کرتا ہے۔ میرے نزدیک لکھنے والوں کی حیثیت معمول سے زیادہ کی نہیں۔ غزل، نظم، افسانہ یا کوئی اور صنف محض موضوع کو ایک بصری جامہ دینے کا وسیلہ ہے۔ اس لئے مجھے نثر اور نظم یکساں مرعوب ہیں کہ میرے کل کا اظہار کسی ایک اظہاری سانچے پر قانع ہو کر تکمیل پا ہی نہیں سکتا۔ بس میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ نثر ہو یا نظم، اسے زیادہ سے زیادہ بلیغ اور بامعنی بنا سکوں اور اپنے باطنی احساس کو ضعف پہنچائے بغیر قاری تک منتقل کر سکوں۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟ آپ کی رائے؟

ج یہ دوری عارضی اور غیر حقیقی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ترقی پسند ممالک میں کتاب کے سلسلے میں الیکٹرانک میڈیا پر انحصار کم ہو رہا ہے اور اگر نہ بھی ہو تو اس سے ادب کے قاری میں کمی کی

بجائے اضافہ ہورہا ہے۔ کیونکہ میڈیا کی اس نوع کی رسائی آپ کی خلوت میں آپ کے حجرے اورآرام گاہ کی تاریکی تک ہونے پر بھی، کتاب کی ضرورت، اس کی افادیت، ہمہ گیری اورقرب اوردوری میں کسی مصنوعی وسیلے سے آزادرفاقت کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہے گی۔

س آپ نے کبھی اپنی ادبی پروجیکشن کے لئے کچھ نہیں کیا۔الیکٹرانک میڈیا کے مشاعرے ہوں یا بین الاقوامی مشاعرے،آپ مدعوہونے کے باوجودشریک نہیں ہوتے،اس بے نیازی کی وجہ؟

ج صاحب اس میں زیادہ ہاتھ میری کاہلی کا ہے، جواب آہستہ آہستہ ''سوکالڈ بے نیازی'' بن گئی ہے۔ یوں بھی مشاعرے کا آدمی نہیں اورادب کے معاملے میں خوشامداوررواداری سے کام لینا بھی میرے بس سے باہر ہے۔سواپنے حال میں مست رہنے میں عافیت جانتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ آخری فیصلہ کام اورآپ کی تخلیق کے معیار پر منحصر ہے۔ ہزاروں معروف اورمحبوب لکھنے والے آج ذہن پرزوردے کر بھی یادنہیں آتے کہ ان کے کام کی نوعیت ہنگامی اور عارضی تھی۔ میرے خیال میں لکھنے والے کواپنی ذات اورتخلیقی بصیرت پراعتماد کرنا چاہئے اور میں ایسا ہی کچھ کرنے کی سعی کرتا ہوں۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیقیت کی کئی پرتیں ہیں۔ یہ مستقبل بینی بھی ہے اور گزرے وقت کی اسرار کی طلسمی بازیافت بھی۔زندگی اوروقت کی بوقلمونی کا اظہار بھی اوروجوداورلاوجودکی حقانیت کاظہور بھی۔ یہ موجوداورغیرموجود کے ہونے اوراس سے تعلق اورعدم تعلق کی شگفتگی بھی ہے اورفکراورخیال کی ندرت کا مرکز بھی اورایک اچھے تخلیق کارکا کام اس شعلہ مستعجل کواس کی تمام ترصباحت کے ساتھ دوام دینا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ ہر بڑے اوراچھے تخلیق کار کے یہاں وقت ایک حرکی قوت بن کر ظاہر ہوتا ہے اورتجربہ ایک مثالی منظر بن کر ٹھہرنہیں جاتا بلکہ ہمیشہ فعال اور تازہ رہتا ہے۔سو میرے نزدیک ایک اچھا تخلیق کاروہ ہے جواپنی تخلیق میں دوامی جہت پیدا کرنے پر قادر ہواور اس کی تخلیق زمانی شکنجے سے آزاداورخودروہو۔

س کوئی بے حدآسودہ وقت؟تخلیقی سطح پر بھی اورزندگی کی سطح پر بھی؟

ج ایسے کسی لمحے کاتعین کرنا بہت مشکل ہے۔ پہلے شعر کی تخلیق کا لمحہ،پہلی کتاب کی اشاعت،پہلی تخلیق کی اشاعت، پہلے بچے کی پیدائش، اپنے بیٹے کے یہاں پہلی اولاد کی پیدائش، پہلے وصل اور پہلے ہجر کی آزمائش۔غرض سینکڑوں لمحے ہیں جواہم بھی ہیں اور یادگار بھی۔ یوں کہئے کہ مجموعی طور پر

میں آسودگی اور شکر سے بھرا ہوا آدمی ہوں اور اوراس پر خالق کا جس قدر بھی شکرادا کروں، کم ہے۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج مشاعروں کی تہذیب کے بارے میں اقبال نے کم وبیش ایک صدی پیشتر فرمایا تھا ''اردو شاعری کو جو نقصان مشاعروں نے پہنچایا ہے کسی اور نے نہیں پہنچایا'' اور اس کی توضیح یہ ہے کہ مشاعرہ میں سنائی جانے والی شاعری مشاعرے کے سامعین کے ذوق کی تسکین اور فہم کی سطح سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ آج کے عہد میں یہ سطح اور بھی نیچے آ گئی ہے اور اس کا سبب مشاعروں کے منتظمین ہیں جو ذوق شعری کی پرداخت سے زیادہ سامعین کی انٹرٹینمنٹ کو اہم جاننے لگے ہیں اور بدذوقی اور پھکڑ پن کی سطح پر کی جانے والی شاعری کو مشاعرے کی کامیابی کا سبب جاننے لگے ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل مشاعرے میں مزاحیہ کلام کا سنایا جانا بدذوقی کی علامت تھا اور الگ مزاحیہ مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے مگر اب انہیں مشاعرے کی کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ ''ابا، ڈبا اور ببا'' کی سطح کا پھکڑ پن ہی کیوں نہ ہو۔ ذاتی طور پر میں مشاعرے کے کلچر ہی کا قائل نہیں اور آج کل برپا ہونے والے مشاعروں کو محض ایک ''ثقافتی شو'' جانتا ہوں۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ہوتی ہے؟ خارج سے یا اندرون سے؟

ج دونوں سے۔ ادب کسی نہ کسی سطح پر اپنے عہد اور سماج سے جڑا ہوتا ہے۔ میں نے اکادمی ادبیات پاکستان کے ایک مذاکرے میں ''پاکستانی ادب'' کی تعریف کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ ''پاکستانی ادب وہ ہے جو کسی بھی زبان میں پاکستان کی حدود میں لکھا جارہا ہے اس لئے کہ لکھنے کی تحریک باطنی ہو تب بھی اس کی نسبت بیرون سے ہوتی ہے اور اس مٹی اور معاشرے سے، جس پر اور جس میں آپ موجود ہیں۔ یہ ادب زمینی رشتوں کی دین ہے مگر آپ اظہار کے لمحے سے اس رشتے سے آزاد یا ماورا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دائمی حقیقتوں کا ظہور ہمیشہ زمینی صداقتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ سو بڑے ادب میں ظاہر اور باطن کا ادغام لازمی ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج بہت اہم اور کارگر۔ بشرطیکہ سوشل میڈیا ادب کے فروغ میں واقعی اپنا کردار سنجیدگی سے ادا کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی رسائی اور اثر کے لحاظ سے سوشل میڈیا کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور یہ ادب کی ترویج میں بے حد معاون اور فعال کردار ادا کرسکتا ہے۔ مگر اس کے لئے ہمیں اپنی فکر

اور ترجیحات کو بدلنا ہوگا اور یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم اپنے معاشرے کو کس سمت میں لے جانا چاہتے ہیں اور اس تبدیلی میں ادب کا کردار کیا ہونا چاہیئے؟

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج بڑی حد تک......ادیب کی انفرادیت، اس کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے تخلیقی اظہار سے ظہور کرتی ہے۔ اس لئے تخلیق کسی بھی شخص کی ذات کا آئینہ ہوتی ہے۔ خصوصی شعری روایت میں ندرت کا بیج ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہی پھوٹتا ہے۔

س کیا کھویا، کیا پایا؟

ج کسی شاعر نے کہا تھا:

قطرہ دریا ہے، اگر اپنی حقیقت سمجھے
کھوئے جاتے ہیں جو ہم آپ کو پا جاتے ہیں

میں نے بھی اپنے آپ کو کھو کر اپنے آپ کو پایا اور اس پر اپنے خالق کا بے حد شکر گزار ہوں۔

○○○

فہیم ضیاء

س سب سے پہلے اپنے سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج میرے آباؤاجداد قیام پاکستان کے وقت ہندوستان (پانی پت) سے ہجرت کر کے پاکستان (خانیوال) آئے۔میری پیدائش خانیوال میں ہوئی۔خانیوال کے گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے جوان ہوگئے۔ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں میں ہی حاصل کی۔ بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کیسے کیا؟

ج عملی زندگی کا آغاز درس وتدریس سے کیا۔سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔آج کل بیرون ملک مقیم ہوں اور پاکستان سکول عمان، (مسقط) میں بطور اردو معلم اپنے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

س ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج کالج کے زمانے میں غیر نصابی کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا۔آہستہ آہستہ نثر لکھنے لگا اور شعر کہنے لگا۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج میری دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ایک سنجیدہ غزلوں پر مشتمل ہے۔جس کا نام ہے ''قسم لے لو محبت ہے'' اور دوسری مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہے،جس کا نام ہے ''بچہ جمہورہ'' ''قابوس کی جنت'' (سفرنامہ عمان) اور نعتیہ مجموعہ ،اخباری کالموں کا مجموعہ تصنیف کے مراحل سے گزر چکا ہے۔لیکن ذاتی مصروفیت کی وجہ سے ان کتابوں کی اشاعت ممکن نہیں ہو رہی۔اُمید ہے اس برس یہ کتابیں اشاعت کا پل صراط عبور کر لیں گی۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں شاعر بھی،شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج شاعری اور نثر دونوں اظہار کے وسیلے ہیں۔ مجھے دونوں یکساں مرغوب ہیں۔میرے خیال

میں موضوع اور اس کے حجم کو سامنے رکھ کر ہی وسیلہ اظہار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ایک صنف سخن تمام موضوعات کا احاطہ نہیں کر پاتی۔اس لئے آپ کو اظہار کے لئے مختلف اصناف سخن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔موضوع کو بہتر اور موثر انداز میں بیان کرنے کے لئے ہر کوئی مختلف اصناف سخن کا سہارا لیتا ہے۔میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے؟

ج یہ بات سوہان روح ہو چلی ہے۔لوگوں نے بڑی ''رغبت'' سے کتاب بینی ترک کی ہے۔میں تو یہاں تک بھی کہوں گا کہ ریاست جب جرائم کی روک تھام کے لئے اخبارات میں تاکیدی اشتہارات دے سکتی ہے تو معاشرے میں بڑھتے ہوئے بگاڑ کو روکنے تحمل و برداشت کو فروغ دینے اور تہذیبی وثقافتی قدروں کی نمو کے لئے ،الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا کے ذریعے کتاب بینی کو فروغ کیوں نہیں دیتی۔ریاست عوام کے ذوق سلیم کو بہت تھوڑے وقت میں اور بہت بہتر انداز میں پروان چڑھا سکتی ہے۔جس طرح ہمارا الیکٹرونک پرنٹ میڈیا کھلاڑی کو پروموٹ کرتا ہے اگر لکھاری کو پروموٹ کرے تو لوگ کتاب کی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔بطور مسلمان کتاب سے،علم سے،حرف سے،دانائی سے جتنا تہذیبی و تاریخی رشتہ ہمارا ہے شائد کسی دوسری قوم کا نہ ہو لیکن پھر بھی ہم کتاب سے دور ہو گئے ہیں۔

س تخلیق کیا ہے؟ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج میرے خیال میں اچھی تخلیق کی عمارت کئی ستونوں پر ایستادہ ہوتی ہے۔اچھی تخلیق وہی ہے جس کو حقیقت سے کشید کیا گیا ہو۔تخلیق میں جمالیاتی اوصاف بدرجہ اتم موجود ہوں۔قارئین کے معروضی حالات سے مطابقت رکھتی ہو،ابلاغ ہو،خیال کی بلندی،خیال کی ندرت وغیرہ وغیرہ۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج زندگی کی منڈیر پر دھوپ چھاؤں آتی رہتی ہے۔زندگی کرنا مشکل کام ہے۔کم وبیش زندگی میں ہر شخص سخت محنت اور جدوجہد کے عمل سے ضرور گزرتا ہے۔لیکن خدا کبھی کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا،زندگی میں میں نے بھی کچھ عرصہ محنت اور جدوجہد کی۔لیکن اب خدا کا کرم ہے۔اس نے اپنی بے بہا نعمتوں سے نوازا ہے۔میرے خیال میں تخلیقی آسودگی کے لئے یکسوئی ہونا لازم ہے۔اور یکسوئی ذہنی اطمینان سے کشید ہوتی ہے۔ یہ ذہنی اطمینان،معاشی خوشحالی،جسمانی صحت اور کئی دیگر چیزوں سے جنم لیتا ہے۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے، آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج آپ مشاعروں کی بات کرتے ہیں، ہماری تو پوری تہذیبی وثقافتی زندگی پر زوال آیا ہوا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ تہذیبی وثقافتی زندگی کے زوال کے آگے کبھی کسی حکومت نے بند باندھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر ریاست چاہتی بہت کچھ کر سکتی تھی اور کر سکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے حکومت کی ترجیحات میں ثقافتی قدروں کی نمو نہیں ہے۔۔۔ میرے خیال میں ریاست جس طرح جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے ایسے ہی ریاست کو ثقافتی قدروں کی بھی حفاظت کرنی چاہیے۔ وقتاً فوقتاً ضلع سطح پر حکومتی سرپرستی میں مشاعروں کا انعقاد ہونا چاہیئے۔ یہ مشاعرے ہماری روشن روایات کا درخشندہ باب ہے۔ ادبی تنظیموں نے مشاعروں کی روایت کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن ان ادبی تنظیموں سے وابستہ لوگ بھی گھر بار والے تھے۔ آخر کب تک ذاتی جیب سے مشاعروں کا انعقاد کرتے۔ سو آج مشاعرہ ہونا ایک خبر بن گیا ہے۔ مشاعروں کا مسلسل بنیادوں پر نہ ہونے کی وجہ نئی نسل کے ذوق سلیم کی تربیت نہیں ہو پائی۔ جس کی وجہ سے نئے سنجیدہ نوجوان سامعین ادبی نشستوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ خطرناک صورت حال ہے۔ اگر نئے لکھنے والے آرہے ہیں تو نئے پڑھنے والے اور سننے والے بھی آنے چاہئیں۔ اچھے سامعین ہی مشاعروں کا حسن ہیں۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج میرے خیال میں ایک اچھا تخلیق کار اپنے تخلیق کے موضوعات معاشرے سے کشید کرتا ہے۔ معاشرے میں جا بجا پھیلا احساس محرومی، سماجی منافقت، اہل زر کی توقیر، معاشرتی استحصال، معاشی ناہمواریاں، سماجی جبر، غربت وافلاس کی جہالت، معاشرتی طبقات کو جب دیکھتا ہے تو ایک تخلیق کار اندر ہی اندر کڑنے لگتا ہے۔ یہی کرب اس کو تخلیق کی منزل تک لے جاتا ہے۔ منزل پر پہنچ کر تخلیق کار ان موضوعات کو اپنی عینک سے دیکھتا ہے۔ اپنے نظریے سے سوچتا ہے اور تحریر کو اپنا اسلوب عطا کرتا ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟ ذاتی تجربات ومشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج میرے خیال میں عمیق مشاہدہ، گہرا مطالعہ، ذاتی تجربہ اور مسلسل ریاضت ہی اچھی تخلیق کی

اساس ہے۔لیکن آج کل نئے تخلیق کار اپنے تئیں مشق سخن تو ضرور کر رہے ہیں۔لیکن ان کے ہاں مطالعہ کی شدید کمی ہے۔رجحان ساز شاعروں کا سنجیدہ اور مسلسل مطالعہ نئے لکھنے والوں کو نہ صرف اعتماد دیتا ہے۔بلکہ نئی منزلوں کی بشارت بھی دیتا ہے۔حقیقت نگاری تخلیق کو نئی بلندیاں عطا کرتا ہے۔آپ کسی بھی نظریہ فن کے قائل ہوں، مسلسل محنت، ریاضت، عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ ہی تخلیق کو چار چاند لگاتا ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج خدا کی رحمتیں ہمیشہ شامل حال رہیں۔خدا نے مجھے میری حیثیت، ضرورت اور قابلیت سے زیادہ عطا کیا ہے۔میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے حرف لکھنے اور شعر کہنے کی نادر صلاحیت عطا کی۔لاکھوں لوگوں میں منفرد مقام عطاء کیا۔قدم قدم پر شاعری کی بدولت عزت و تکریم ملی، حرف لکھ کر اطمینان قلب ملا۔

OOO

فرحت عباس شاہ

فرحت عباس شاہ کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے نہایت مختصر عرصے میں اپنے قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ اپنے پہلے شعری مجموعے شام کے بعد سے ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے فرحت عباس شاہ کے اب تک بیسیوں شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ فرحت عباس شاعری کے علاوہ تنقید بھی لکھتے ہیں۔ صاف سچی اور کھری بات منہ پر کہنے کی عادت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے کثیر چاہنے والوں کے ساتھ بڑی تعداد میں مخالفین بھی ہیں جو انہیں ادبی پھڈے باز جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ نام نہاد، سکہ بند، روائتی ادیبوں، دانشوروں اور نقادوں کے مخالفانہ رویوں سے دلبرداشتہ ہو کر میدان چھوڑ جاتے اب تک اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی تخلیق کا سفر بھی تیزی سے جاری ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں حالات سے لڑنے کا طریقہ بھی آتا ہے شعر کہنے کا سلیقہ بھی۔

س آپ نے شاعری کو ہی وسیلہ اظہار کیوں بنایا؟

ج میں تنقید بھی لکھتا ہوں اور کچھ دوسرے فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی ہے لیکن فطری میلان شاعری کی طرف زیادہ ہے۔ ایسا قدرتی طور پر ہوا اس میں میری شعوری کوشش شامل نہیں۔

س آپ کے نزدیک ادب میں سنیارٹی کا معیار کیا ہے؟

ج تخلیقی کام اور وابستگی۔ جس کا تخلیقی کام زیادہ ہو جس کی ادب کے ساتھ کمٹ منٹ زیادہ لمبی ہو اس بنیاد پر اس کی سنیارٹی کا تعین ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر عمر کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور پھر کئی بار نہیں رکھا جاتا یعنی طویل العمری کو سنیارٹی کی بنیاد بنانے والے بذات خود کئی دفعہ چھوٹی عمر کے لوگوں کی سنیارٹی کو تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ عمر کے بجائے تخلیقی کام کی ورتھ کو سنیارٹی کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔

س کیا مقدار کی زیادتی معیار کو متاثر کرتی ہے؟

ج اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ ادب یا اعلیٰ تخلیق کم لکھے جانے یا زیادہ لکھے جانے کی

محتاج نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں نے بہت کم لکھا ہے اور بہت بوگس لکھا ہے اور کچھ لوگوں نے بہت زیادہ لکھا ہے اور بہت اچھا لکھا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

س ادب میں سیاست بازی کے رجحانات کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟

ج جو لوگ ادب میں سیاست کر کے مفادات اٹھاتے ہیں وہی اس سیاست کے ذمہ دار ہیں اور سیاست کا فائدہ بھی انہی لوگوں کو ہوتا ہے۔

س اب تک آپ کی کافی کتابیں چھپ چکی ہیں، کیا وجہ ہے کہ آپ کو کوئی نیشنل ایوارڈ نہیں مل سکا؟

ج اس کی وجہ نیشنل ایوارڈ دینے والوں کو پتہ ہوگی، میں نے کبھی اس بارے میں غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

س کیا یہ ایوارڈز میرٹ پر دیئے جاتے ہیں؟

ج میرٹ پر ملتے تو احمد ندیم قاسمی پانچ لاکھ کا انعام اپنے آپ کو کیسے دیتے۔ ان کی بیٹی کو انعام کیسے ملتا جب کہ وہ ایوارڈ ز دینے والی کمیٹی کے منصف اعلی تھے۔ کسی عدالت میں جب کوئی مقدمہ لگتا ہے تو مدعی اور مدعا علیہ کو پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر اس کے جج کے ساتھ فریقین میں سے کسی کا دور دراز کا بھی تعلق یا رشتہ ہو تو دوسرا فریق درخواست دائر کر کے عدالت تبدیل کروالے حتیٰ کہ جب بچوں کے امتحانات ہوتے ہیں تو امتحانی سنٹر میں متعین کئے جانے والے نگرانوں سے لکھوایا جاتا ہے کہ کہیں ان کا کوئی رشتہ دار عزیز تو امتحان نہیں دے رہا۔ اگر ایسا ہو تو اس نگران کو اس امتحانی سنٹر سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں بہت ساری ایسی مثالیں ہیں کہ کسی سلیکشن کمیٹی یا انصاف کمیٹی میں مصنّفین میں کسی ایک کا کوئی عزیز رشتہ دار امیدوار نکل آیا تو اس مصنف نے بذات خود رضا کارانہ طور پر کمیٹی کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا لیکن ہمارے ادیبوں کی بد دیانتی اور سینہ زوری کی انتہا دیکھیں کہ کمیٹی کے منصف اعلیٰ کو سب سے بڑا انعام دے دیا گیا اور اس نے قبول کر لیا پھر ایک انعام اس کی بیٹی کو دے دیا گیا۔ اس نے بھی قبول کر لیا۔ یہاں تو اندھیر نگری ہے۔ چور لٹیرے شاعر اور ادیب بنے بیٹھے ہیں اب میں ایوارڈ کے بارے میں کیا تجزیہ پیش کروں۔

س یہ کمیٹی کس نے بنائی تھی؟

ج اکادمی ادبیات کے چیئر مین نذیر ناجی نے بنائی ہوگی، ادیبوں کی خرید و فروخت آج کل وہی کر رہے ہیں۔

س کچھ عرصہ پہلے آپ کی غزلوں کی ایک کیسٹ مارکیٹ میں آئی تھی، ادبی تاریخ میں شاید یہ پہلا تجربہ تھا کہ کسی شاعر نے اپنی آواز میں اپنا کلام ریکارڈ کروایا ہو، یہ تجربہ کیسا رہا، اس کے بعد آپ کی کوئی نئی کیسٹ بھی تکمیل کے مرحلے میں ہے؟

ج اس کے بعد میری چار پانچ کیسٹیں اس طرح کی آئی ہیں۔ شاعری میں اس طرح کام کرنے کا میرا شوق ہے۔ اس میں ردعمل یا رسپانس کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ بس مجھے ایسے کاموں سے خوشی ملتی ہے۔

س آپ نے حلقہ ارباب ذوق اور دیگر ادبی حلقے ہوتے ہوئے اپنا الگ فورم بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

ج ہم جب آج سے دس سال پہلے پاک ٹی ہاوس میں آنا شروع ہوئے تو دیکھا کہ ایک اجلاس ہے یہاں حلقہ ارباب ذوق اس پر کچھ نامراد اور غیر تخلیقی لوگ قابض ہیں۔ وہ لوگ تنقیدی اجلاسوں میں ایسے لوگوں کو شیڈول کرتے ہیں جن سے کوئی سگریٹ کی ڈبی، پان، بوتل یا چائے کی امید ہوتی تھی۔ خاص طور پر جینوین شاعر ادیبوں کو نظر انداز کرتے تھے خاص طور پر نئے آنے والے بغلیں جھانکا کرتے ان کی تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہم نے اس صورتحال کو محسوس کیا اور اپنا ہفتہ وار اجلاس شروع کیا پھر ہم نے دیکھا کہ پاکستان میں ملکی سطح پر ادیبوں کی صرف دو تنظیمیں یا ادارے ہیں اور وہ بھی دونوں سرکاری ہیں۔ ایک مرا ہوا ادارہ پاکستان رائٹرز گلڈ اور دوسرا کچھ زیادہ ہی زندہ ادارہ اکادمی ادبیات سو ہم نے پاکستان رائٹرز کونسل کی بنیاد رکھی۔ ہماری کونسل خاص طور پر نوجوانوں کی کونسل ہے۔ ہمارے سینئر ادیبوں نے حکومتوں کے ہاتھ مضبوط کر کے مفادات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تخلیقی سطح پر بھی درجہ دوم کا کام کیا ہے۔ اکا دکا لوگوں کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر سینئر تھرڈ کلاس ادیب اور شاعر ہیں۔ سچی بات ہے کہ ہمیں تو اپنے موجود سینئرز میں سے منیر نیازی اور ڈاکٹر انیس ناگی کے سوا کوئی سچا اور میجر شاعر ادیب نظر نہیں آتا۔ منیر نیازی اور انیس ناگی کے دم قدم سے ہماری ادبی دنیا آباد ہے۔ ورنہ بیشتر لوگ تو مر چکے ہیں میرے نزدیک اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور انتظار حسین مردہ ادیب اور شاعر ہیں، بس انہیں دفنانا باقی ہے۔ جس طرح شہید زندہ ہوا کرتا ہے اسی طرح کچھ لوگ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہوا کرتے ہیں۔

س خواتین کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج خواتین نے اچھی شاعری بھی کی ہے۔ اپنی بھی کی ہے اور مانگے کی بھی ہے۔ نوشی گیلانی تو سرے سے شاعرہ ہی نہیں صرف چور ہے اور یہ ظلم منور جمیل نے کیا ہے، اللہ منور جمیل کی مغفرت فرمائے لیکن آپ دیکھئے کہ زیادہ دیر یہ جھوٹ چل نہیں سکا۔ اب نوشی ساری زندگی بھی لوگوں کو قسمیں اٹھا اٹھا کر کہے گی کہ میں شاعرہ ہوں تو بات نہیں بنے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان جو شاعری کے ساتھ سلوک کرتا ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب شاعری اس کے ساتھ وہی کرتی ہے۔

س منور جمیل اور نوشی گیلانی کے درمیان متنازعہ غزلوں کے حوالے سے عدالت نوشی کے حق میں فیصلہ دے چکی ہے، ایسی صورت میں نوشی کو چور شاعرہ کہہ کر کیا آپ توہین عدالت کے مرتکب نہیں ہو رہے؟

ج عدالت کا فیصلہ اپنی جگہ لیکن وقت نوشی گیلانی کے خلاف فیصلہ دے چکا ہے اور وقت سے زیادہ منصف کون ہو سکتا ہے۔

س آپ کے حوالے سے تخلیق پسند تحریک کے بارے میں سننے میں آیا ہے، یہ کیسی تحریک ہے؟

ج ہم نے ادب سے لے کر معاشرے تک میں غیر تخلیقی لوگوں اور رویوں کو آگے آگے اور نمایاں دیکھا ہے، اس کے ردعمل میں اپنی اس تحریک کا آغاز کیا ہے، ہماری خواہش ہے کہ ہمارے معاشرے اور ادب میں تخلیقی لوگ نمایاں ہوں۔

س الیکٹرانک میڈیا ادب کی ترویج کے حوالے سے کہاں تک اپنا کردار نبھا رہا ہے؟

ج یہ کمرشل ادارے ہیں، یہ ادبی حوالے سے اطمینان بخش کیسے ہو سکتے ہیں۔ ان کی مجبوریاں ہیں، یہ تو بیچارے اپنا کام نہیں کر سکتے۔ بیشتر پروڈیوسر شاعر ایسے ہیں جو جوا کھیلتے ہیں تا کہ کسی طرح غالب کی صف میں شامل ہو جائیں۔ باقی کچھ ایسے بھی ہیں جو طوائفوں کی خدمت گزاری میں لگے رہتے ہیں البتہ نیک اور باصلاحیت لوگ بھی ہیں۔

OOO

فاروق طراز

شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات فاروق طراز اوران کی منفرد شاعری سے بخوبی واقف ہیں۔خوبصورت شعر کہنے کے ساتھ ساتھ وہ ان چندخوش بخت تارکین وطن میں شامل ہیں جنہوں نے تمام زندگی پاکستانی زبانوں کودیارغیر میں ترویج اوراپنے ادب کوعالمی سطح پرروشناس کروانے کی کوشش میں صرف کی ہے۔مقبول شاعراورادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کامیاب کاروباری شخصیت بھی ہیں۔میں تواسے خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ کروناوائرس کے عالمی پھیلاؤ کے دنوں میں وہ کیلی فورنیا کی بجائے پاکستان میں ہیں۔ اتفاق سے راقم بھی ان دنوں پاک سرزمین کی کشورحسین یعنی میاں چنوں میں ہے۔اس نادرموقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کورنتینا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فاروق طراز کوقارئین ارژنگ کے لئے انٹرویوکی گزارش کی۔جوانہوں نے شایداس لیےمستردنہیں کی،چونکہ ہم دونوں کی جائے پیدائش ایک ہی گاؤں کی ایک ہی گلی میں واقع ہوئی ہے۔

س آپ کی پیدائش تومیاں چنوں میں ہوئی ،اپنے بچپن اورابتدائی تعلیم کے بارے میں بتائیں؟

ج ابتدائی تعلیم میاں چنوں میں ہی مکمل کی۔کالج سے گریجوایشن کرنے کے بعدمیں امریکہ چلا گیا۔یہ سن 1980 کی دہائی تھی۔جب میں پاکستان سے جاکرامریکہ میں بس گیا۔

س شعرگوئی کی جانب کیسے راغب ہوئے؟

ج:۔ہمارے گھر کے عقب میں اردواورپنجابی کے معروف شاعرسالک ربانی رہائش پذیر تھے۔بچپن سے ان کےساتھ نیازمندی کاتعلق تھا۔چونکہ سالک ربانی صاحب کواردو،پنجابی اور عربی کے علاوہ فارسی زبان پراستادانہ مہارت وعبورحاصل تھا۔ان کے حلقے میں بوٹاانجم،صدیق ربانی جیسے سخنورشاعر تھے۔جس کے سبب ایک ادبی ماحول موجودتھا۔میں نے شروع شروع میں پیروڈی اورمزاحیہ شاعری کی سنجیدہ سی کوشش کی۔توانہوں نے مشورہ دیاکہ تم غزل بھی کہہ

کر دیکھو۔ چنانچہ ان کے مشورے پر میں نے پہلی مرتبہ غزل کہی۔ مجھے سالک ربانی اکثر کئی طرح کے مصرعہ دے دیتے تھے۔ کہ اس پر کوئی غزل کہو اس طرح سے زمانہ طالب علمی میں وہ مری شعری تربیت کرتے رہے۔ وہاں سے ہی شاعری پڑھنے کا بھی شوق ہوا اور اسی طرح سے سخن وری کا یہ سارا سلسلہ شروع ہو گیا۔

س امریکہ کیسے جانا ہوا؟ عمر کا ایک بڑا حصہ وہاں گزرا، وہاں کیسا تجربہ رہا؟

ج میں اسے ایڈونچر کا شوق ہی کہوں گا۔ حالانکہ پاکستان میں معاشی آسودگی میسر تھی۔ مگر دوستوں کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا۔ ویزہ لگوایا اور امریکہ جا پہنچے۔ وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

س آپ نے تمام زندگی شعر گوئی میں گزاری، مگر ابھی تک آپ کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج اس میں میری ہی سستی اور کوتاہی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے وقت بھی نہیں ملا۔ کام کی مصروفیت کچھ اتنی زیادہ تھی کہ میں کاروبار کے منحوس چکر کے علاوہ شائد یہ بھی سمجھتا ہوں کہ شعروشاعری میں خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ بہت شعر کہا مگر ہمیشہ یہی سوچا کہ اس سے بہتر شعر کہنا ہے۔ اسی سبب سے مجموعہ کلام کی اشاعت تاخیر کا شکار ہوتی رہی۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اب میرا ایک شعری مجموعہ زیر طباعت ہے۔ دو مزید اردو شعری مجموعے مکمل ہیں اور پنجابی کے کئی مکمل اور غیر مطبوعہ مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔

س اپنی ازدواجی زندگی کے حوالے سے کچھ قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

ج امریکہ جانے کے بعد میں نے وہاں شادی کی تھی۔ ازدواجی تجربے کے حوالے سے گفتگو تو ہو سکتی ہے مگر میں کسی اور کی ذاتی زندگی ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ اب میں نے پاکستان میں شادی کی ہے۔ الحمداللہ بہت خوشگوار زندگی کا احساس ہو رہا ہے۔ میری ایک بیٹی ہے۔ غزل فاروق اس کا نام ہے۔

س ادب کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

ج میرا ادبی نظریہ شروع سے ترقی پسندی، جدیدیت اور ادب برائے زندگی کا رہا ہے۔ ہجر وفراق کی شاعری بھی اچھا موضوع ہے مگر اس پر رک نہیں گیا۔ آپ کو میری شاعری میں اس لئے ایک آفاقیت محسوس ہوگی۔ میں نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

س آپ کا ڈکشن بڑا خوبصورت ہے، کیا کبھی نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے؟

ج نثر میں نے حال ہی میں لکھنا شروع کی ہے۔ کالم نگاری کرنے کا سوچ رہا ہوں۔ حالات حاضرہ پر تبصرے سوشل میڈیا پر لکھتا رہتا ہوں۔

س آپ وسیع المطالعہ ہیں، کن مصنفین نے زیادہ متاثر کیا؟

ج میں کسی ایک مصنف کا نام نہیں لے سکتا۔ بہت سارے لکھنے والوں کی کتابوں اور تحریروں نے متاثر کیا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ برکلے یونیورسٹی کی آغوش میں پلا بڑھا۔ 1980 کی دہائی میں وہ دور تھا۔ جب پاکستان میں ضیاء الحق کا ظالمانہ مارشل لا نافذ تھا اور ترقی پسند مصنفین یہاں سے ہجرت کر رہے تھے۔ اس میں سے بہت سے برکلے یونیورسٹی کے کیمپس اور سان فرانسسکو کے گردونواح میں آباد ہوئے۔ یہ دنیا کی ٹاپ ٹین یونیورسٹیوں میں ہے۔ یہ بڑا ترقی پسند کیمپس ہے۔ ویت نام جنگ کے خلاف احتجاج سے لے کر دیگر سماجی تحریکوں کا یہ گڑھ رہا ہے۔ بہت سے شعراء پاکستان سے ہمارے پاس آتے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی آپ بیتی میں کبھی ان محفلوں کا ذکر تحریر کروں جو برصغیر کے نامور شعراء اور ادباء کی میزبانی کے دوران ان کے ساتھ میری رہیں۔ احمد فراز اکثر آتے اور ہمیشہ میرے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ فراز صاحب نے مجھے بیٹا بنایا ہوا تھا۔ ہم نے خوب سیر سپاٹے کیئے۔ بہت اچھا وقت گزارا۔ بڑی ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ میرا گھر سان فرانسسکو میں ادب کا گہوارا رہا ہے۔ جس میں بڑے بڑے ادیب شریک ہوتے رہے۔ ان میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، جاوید اختر، شبانہ اعظمی، علی سردار جعفری اور بشیر بدر سے لے کر دلیپ کمار تک ایک طویل سلسلہ ہے۔ ہم نے پاک انڈیا فرینڈشپ سوسائٹی قائم کی۔ جس کا مقصد ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا تھا تاکہ جو پیسہ دونوں ممالک اسلحے کی دوڑ میں خرچ کرتے ہیں۔ اسے لوگوں کی صحت اور تعلیم کی بہتری اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکے۔

س 1980 اور 2020 کے امریکہ میں کیا فرق دیکھتے ہیں؟

ج سن 80 کی دہائی اور آج کے امریکہ میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس میں گیارہ ستمبر 2001 کو نیویارک میں رونما ہونے والے حادثے نے سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اسلاموفوبیا بھی اس کے بعد آیا۔ ایک عرب امریکی دانشور نے اسے بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ 11،9 سے پہلے کے امریکہ کی مثال کنواری دوشیزہ جیسی تھی یہ امریکہ معصوم تھا۔

عمومی طور پر امریکی رحم دل اور پیارے لوگ ہیں۔حکومتی معاملات الگ بات ہے۔مگر جو عوام ہیں وہ خوش آمدید کہنے والے ہیں اور مانتے ہیں کہ تنوع ان کی طاقت ہے۔ہم تو باہر والے لوگوں سے گھبرا جاتے ہیں۔اور ہمارا رویہ محتاط،شکوک وشبہات سے بھر پور ہوتا ہے۔مگر وہاں جو بھی جہاں کہیں سے بھی اٹھ کر آجائے۔بہت خوش ہو کر قبول کر لیتے ہیں۔اسے سسٹم کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ امریکہ اب بھی ''لینڈ آف اپر چیونٹی''ہی ہے۔9,11 کے بعد اگرچہ بہت سارے قوانین تبدیل ہوئے ہیں اور اسلاموفوبیا بھی ایک لہر کی صورت میں چلا ہے۔امریکہ کی خوبصورتی مگر یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں۔چاہے وہ ویت نام جنگ کی ہو۔کالوں کے ساتھ بدسلوکی ہو، یا پھر حالیہ سالوں میں جنگی مہمات ہوں، غلطی کا احساس ہونے پر امریکی قوم اور ریاست اپنی غلطی کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

OOO

فخر زمان

س: ادب کی طرف کیسے آئے؟

ج: اصل میں جب میں گجرات کالج میں پڑھتا تھا تو سب سے پہلے اردو لکھنا شروع کیا۔ یہی افسانہ اور شاعری وغیرہ جو کالج کے ادبی میگزین میں چھپ جاتی، گریجویشن بلکہ ایم اے تک میں نے اردو یا انگریزی میں لکھا۔ اس کے بعد پڑھنے کے لئے باہر چلا گیا۔ میرا پہلا اردو شعری مجموعہ ''زہراب'' 1969ء میں چھپا۔ اس کے تین چار سال بعد ریڈیو کی پروڈیوسر مرحومہ زریں نگار ملک نے ریڈیو کے لئے پنجابی ڈرامہ لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے کہا کہ میں تو پنجابی میں بالکل نہیں لکھتا لیکن ان کے اصرار پر مجھے پنجابی ڈرامہ لکھنا پڑا جو ریڈیو پر چلا اور اتفاق سے بے حد مقبول بھی ہوا۔ پھر اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے پنجابی میں لکھنا چاہئے جس کے بعد پھر میں نے پنجابی میں مسلسل لکھا جس میں کچھ ٹی وی ڈرامے بھی لکھے۔ یہ بھی بتا تا چلوں کہ اس سے پہلے میں پنجابی صوفی شعراء، امرتا پریتم، موہن سنگھ اور شریف کنجاہی وغیرہ کو کافی حد تک پڑھ چکا تھا۔

س: اب تک آپ کی کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں؟

ج: اب تک میری چھبیس کے قریب کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں شعری مجموعے ''زہراب، راستے کی دھول، ٹی وی ڈرائے، دیواریں، سفرنامہ، گردش میں پاؤں'' اور ترجمہ کالعدم تحریریں اردو کی کتابیں ہیں۔ پنجابی میں ''کسنو ویلے دی ونگار، بندی وان'' اور ''بے وطنا'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ''چڑیاں دا چنبہ'' اور ''ون دا بوٹا'' ریڈیو ڈراموں کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے پنجابی ناولوں کے انگریزی ترجمے بھی چھپے ہیں۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران جون 78ء میں میری پانچ کتابوں ''بندی وان، ست گواچے لوگ، اک مرے بندے دی کہانی'' پنجابی ناول اور پنجابی شعری مجموعے ''ونگار'' اور ''کسنو ویلے دی ونگار'' پر پابندی عائد کر دی گئی جس کے خلاف میں نے ہائیکورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کر دی۔ یہ مقدمہ اٹھارہ سال چلتا رہا۔ بالآخر 1998ء میں یہ پابندی اٹھالی گئی۔ میں غالباً دنیا کا واحد رائٹر ہوں جس کی پانچ کتابیں بیک وقت

پابندی کا شکار ہوئیں۔اس کیس میں اعتزاز احسن جو کہ میرے بہت اچھے دوست اور عزیز بھی ہیں، میرے وکیل تھے۔انہوں نے ساری دنیا کے ادب کے حوالے سے بڑی محنت سے سوصفحات پر مشتمل ایک خوبصورت رٹ پٹیشن تیار کی۔ یہ رٹ پٹیشن اب باقاعدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

س آپ کی کتابیں کس بنیاد پر پابندی کا شکار ہوئیں؟

ج جب ضیاء الحق آیا تو میں بھٹو کا سینیٹر تھا اور پیپلز پارٹی کا سرگرم شخص سمجھا جاتا تھا۔اسی وجہ سے میری کتابوں پر پابندی عائد کردی گئی لیکن اس پابندی کا نتیجہ یوں نکلا کہ یہ کتابیں ہندوستان میں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوگئیں۔

س آخری کتاب کب لکھی؟

ج میری اب تک کی آخری کتابی پنجابی ناول ’’کم ذات‘‘ کو چار سال ہو گئے ہیں جبکہ ’’زوال دی گھڑی‘‘ کو تین سال ہو گئے ہیں۔اب میں دو کتابیں، ایک پنجابی ناول جو کہ میرا چھٹا پنجابی ناول ہوگا اور دوسری ’’پنجاب اور پنجابیت‘‘ کے نام سے سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل اردو کی کتاب عنقریب چھپ جائے گی۔پنجاب اور پنجابیت میں میں نے پنجاب کی تاریخ وزبان ثقافت کے حوالے سے جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ملتے جلتے موضوع پر ’’پنجاب کا مقدمہ‘‘ کے نام سے حنیف رامے بھی ایک کتاب لکھ چکے ہیں لیکن میرے خیال میں بجائے فائدے کے اس کتاب نے پنجاب کو نقصان پہنچایا ہے۔’’پنجاب اور پنجابیت‘‘ میں نے پنجاب کے حوالے سے غلط فہمیوں کو بڑے لاجیکل انداز سے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد میری خواہش ہے کہ دیگر صوبوں کے ان لیڈران کو جو پنجاب کے حوالے سے غلط فہمیوں کا شکار ہیں، کتاب کی تقریب رونمائی میں بلا کر اظہار خیال کر دوں۔دیگر لفظوں میں انہیں کہوں گا کہ اس کتاب کا جواب دیجیے۔

س عالمی پنجابی کانفرنس کا خیال کیسے آیا اور اس کے کیا مقاصد ہیں؟

ج عالمی پنجابی کانفرنس لاہور میں 1984ء میں پنجابی زبان کے ادیبوں، دانشوروں اور سکالروں کی طرف سے منعقد کی گئی تھی جبکہ مجھے اس کا پہلا چیئرمین بنایا گیا۔اس تنظیم کے بنیادی اہداف میں پنجابی زبان، ادب، کلچر کی ترقی کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کے بارے میں مغالطوں کو دور کرنا اور پنجاب کی تاریخ کے روشن پہلو کو اجاگر کرنا تھا۔اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صدیوں سے

جو بحران پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اسے ختم کر کے نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا جائے۔ عالمی پنجابی کانفرنس کے زیرِ سایہ منعقد ہونے والی پہلی بین الاقوامی کانفرنس 1986ء میں ہوئی جبکہ دوسری کانفرنس 1992ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ دونوں کانفرنسوں میں تمام دنیا سے آنے والے سینکڑوں مندوبین نے شرکت کی۔ 1986ء اور 1992ء میں جاری کئے جانے والے اعلان ناموں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پنجابی زبان کو پرائمری سطح پر ذریعہ تعلیم کا درجہ دیا جائے۔ اس کانفرنس میں ایک زبان کی بالا دستی سے انکار کرتے ہوئے تمام پاکستانی زبانوں کی وکالت کی گئی۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں قومی ہیں۔ جبکہ اردو رابطے کی زبان ہے۔ پنجابی زبان، پاکستان، بھارت، کینیڈا، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، ناروے، ڈنمارک، سویڈن، ہالینڈ، عرب امارات، ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ وغیرہ میں کروڑوں لوگوں کی زبان ہے اور اسے دنیا بھر کی زبانوں میں دسواں درجہ حاصل ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اسے بیوروکریسی، بالا دست طبقہ اور ایک زبان کے علمبرداروں کی سازشوں کی وجہ سے اس کا جائز مقام نہیں دیا جا سکا۔ پنجابی زبان کی اہمیت کو نظر انداز کرنے والے شاونسٹ اپنے پرانے ناسٹلجیا کی دلدل سے ہی باہر نہیں آ سکے اور لسانی بالا دستی کی برخود غلط ذہنیت رکھتے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبانوں کی ترقی مخالفین، شاؤنسٹ اور نام نہاد دانشوروں کے منفی ہتھکنڈوں پر مبنی نو آبادیاتی ذہنیت ہے جس کے ذریعے وہ ملک کی سلامتی کے لئے مسلسل خطرہ ہیں چنانچہ ہر محب وطن پاکستانی کا جو دھرتی کی زبانوں سے محبت کرتا ہے، فرض منصبی ہے کہ وہ پاکستانی زبانوں کے خلاف کام کرنے والوں اور اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے خواہش مندوں کے مذموم مقاصد کے خلاف اپنے ملک کے طول و عرض میں بولی جانے والی زبانوں کو تسلیم کروانے کی جدوجہد میں حصہ لے۔ عالمی پنجابی کانفرنسیں اسی جہت میں ٹھوس اقدام ہیں۔

س عالمی پنجابی کانفرنس 2001ء اور عالمی پنجابی کانفرنس کے قیام کے حوالے سے کچھ بتائیے؟

ج 2000ء میں چنڈی گڑھ بھارت میں عالمی پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس ہر لحاظ سے ایک کامیاب کانفرنس تھی اور لاہور میں منعقد ہونے والی گزشتہ کانفرنسوں کا پیغام آگے پہنچانے میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ لاہور میں 13 تا 16 اپریل 2001ء کو عالمی پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا بھر سے آنے والے 15 ممالک سے 100 سے زائد مندوبین نے شرکت کی جن میں بھارت سے آنے والے 150 مندوبین بھی شامل تھے۔ اعلان نامہ لاہور میں

دوسرے نکات کے علاوہ پنجابی زبان کو پرائمری سطح پر ذریعہ تعلیم بنائے اور صوبائی مقننہ میں پنجابی زبان اختیار کئے جانے کی بھرپور حمایت کی گئی۔لاہور میں منعقد ہونے والی یہ کانفرنس برصغیر میں لسانی بنیاد پر ہونے والی یہ سب سے بڑی کانفرنس تھی۔اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر اس کی بھرپور تشہیر کی۔اس تاریخ ساز کانفرنس نے بھارت اور پاکستان کے مابین امن کی ضرورت پر بہت زور دیا اور تمام متنازعہ مسائل خاص طور پر مسئلہ کشمیر کو باہمی گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا۔اس کانفرنس کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ رجعت پسند، انتہا پسند، شاؤنسٹ ادبی بنیاد پرست اور خالصیت پسند اپنا حسد اور بغض کسی طرح بھی نہ چھپا سکے۔لاہور کانفرنس 2001ء کے بعد مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی پنجابی تنظیموں نے عالمی پنجابی کانگریس کے نام سے ایک مقتدر تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا جو تمام دنیا میں پنجابی زبان ادب کلچر اور تاریخ کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کی واحد نمائندہ تصور کیا جائے گا۔

س ان کانفرنسوں کے حوالے سے اب تک آپ کو کیا کامیابیاں ملی ہیں؟

ج میں سمجھتا ہوں کہ اب تک ہم اس حوالے سے جتنی بھی کانفرنسیں منعقد کروا چکے ہیں اس کے نتیجے میں پنجابی زبان اور کلچر فروغ ایک گلوبل تحریک بن چکی ہے۔ہم نے دُنیا میں بسنے والے پنجابیوں خواہ ان کا تعلق پاکستان سے ہو یا ہندوستان سے یا وہ دنیا کے کسی بھی ملک میں رہتا ہو ان سب کو اپنی زبان اور کلچر کی حفاظت کے لئے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا ہے اور پہلی دفعہ یہ تحریک بن کر سامنے آئی ہے۔اس کے نتیجے میں ہمیں نہ صرف پاکستان بلکہ باہر بھی عزت ملی ہے۔

س عالمی پنجابی کانفرنس لندن کے حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے یہ کامیاب تھی؟

ج کسی بھی کانفرنس کی کامیابی کا معیار اس کا اعلان نامہ ہوتا ہے۔اس حوالے سے یہ ایک بڑی کامیاب کانفرنس تھی جس میں بارہ ملکوں سے تقریباً 250 مندوبین شریک ہوئے جس میں بڑے اچھے مقالے پڑھے گئے۔اس میں پیش کئے گئے کلچرل پروگرام بہت اچھے تھے۔آخر میں اس کا اعلان نامہ بھی بہت زوردار تھا۔ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کہوں گا کہ الحمدللہ لندن کانفرنس بڑی کامیاب کانفرنس تھی۔ہاں البتہ انتظامی امور کے حوالے سے ہمیں شکایات کا سامنا کرنا پڑا۔دراصل لندن میں انتظامات کے سلسلے میں جس شخص امین ملک کو صدر بنایا گیا وہ اس

ذمہ داری کا اہل نہیں تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک نالائق آدمی تھا اور ذہنی طور پر بھی وہ نابالغ شخص تھا۔ ادیب اور شاعر بھی وہ پورا سا تھا۔ بس یہ ایک ہماری غلطی تھی کہ ایک ایسے شخص پر اتنی بھاری ذمہ داری ڈالی جس کا خمیازہ ہمیں دوستوں کی شکایات کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ بہرحال یہ ساری خامیاں امین ملک کے کھاتے میں جاتی ہیں۔

س یہ بھی سننے میں آیا کہ کانفرنس میں ایسے بندے بھی وہاں گئے جن کا پنجابی زبان وادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں جبکہ اس کے برعکس ڈاکٹر شہباز ملک اور ڈاکٹر یونس احقر جیسے اہم پنجابی دانشوروں کو نظرانداز کر دیا گیا؟

ج ڈاکٹر یونس احقر پنجابی شاعری کا بڑا نام ہے اور میرے بڑے اچھے دوستوں میں ہیں۔ وہ چونکہ سرکاری ملازم ہیں اس لئے وہ کچھ مجبوریوں کی بنا پر لندن کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے اور جہاں تک ڈاکٹر شہباز ملک کی بات ہے تو اس شخص کو میں سرے سے ادیب ہی نہیں مانتا۔ اس کی ادب کی اپروچ انتہائی فرسودہ ہے۔ وہ جماعت اسلامی کا کارندہ ہے۔ اس نے پنجابی ڈیپارٹمنٹ اور پنجابی زبان وادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ کسی ترقی پسند ادیب کو وہ رائٹر نہیں مانتا۔

س پنجابی کے حوالے سے آپ کا دائرہ کار کہاں تک پھیلا ہوا ہے؟

ج پنجابی کانفرنس کے حوالے سے ہمارا دائرہ کار صرف ادبی کانفرنس تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں تاریخ اور سیاسی مقصد بھی شامل ہونا چاہئے اور وہ یقیناً روشن خیالی پر مبنی ہونا چاہئے۔ کیونکہ صوفیاء کے کلام میں کوئی بنیاد پرستی ملازم یا فرسودگی شامل نہیں ہوتی۔ ان کانفرسوں کے ذریعے ہم نے فرسودہ روایات کے حامی یا ان کے نمائندوں کو جو کالم نگار ہوں یا میڈیا سے تعلق رکھنے والوں کو بتایا ہے کہ پنجابی کی بات کرنے سے ملکی سالمیت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ ملکی سالمیت کو خطرہ ان لوگوں سے ہے جو بطور صحافی آئی ایس آئی سے فنڈ لیتے ہیں یا جب فوجی حکومت آتی ہے تو فوجی اداروں میں اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ انہی نظریہ پاکستان کے ٹھیکیداروں کی وجہ سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور انہی کی وجہ سے قائداعظم نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا تھا۔ ایک زبان کی اجارہ داری اور باقی زبانوں کے خلاف بات کرنا نظریہ پاکستان کے حوالے سے کوئی بات نہیں۔ پاکستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ سب کی سب قومی ہیں۔ اردو قومی زبان کے علاوہ ایک رابطے کی زبان بھی ہے اور اس کے علاوہ اس کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہے اس لئے ہمارے لئے محترم ہے۔ یوں بھی اردو ایک خوبصورت زبان ہے۔ میں خود بھی اردو لکھتا

اور بولتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایسی صورتحال میں دیگر زبانوں کی بات کرنا کوئی منفی بات یا نظریہ پاکستان کے خلاف ہے۔ ہمارا اختلاف صرف تب ہوتا ہے جب خود پنجابی اردو کی حمایت میں پنجابی کو نظرانداز کرتا ہے۔ پنجابی زبان کا سب سے بڑا دشمن بذات خود پنجابی ہے۔ میں نے آج تک کسی سندھی کو یا کسی بلوچ کو اپنی زبان کے خلاف بات کرتے نہیں سنا۔ اس کے برعکس پنجابی میں 9 ہزار ایم اے پنجابی بیکار بیٹھے ہیں۔ ان کو نوکری نہیں مل رہی۔ سات کروڑ کی اسمبلی میں آپ پنجابی میں بات نہیں کر سکتے۔ پنجابی کا صرف پرچہ ''بھلیکھا'' نکلتا ہے، وہ بھی ان کی ہمت ہے، پتہ نہیں کیسے نکال لیتے ہیں۔ انڈیا میں پنجابی اخبار ''اجیت'' آٹھ لاکھ کی تعداد میں بکتا ہے جبکہ ہم خود ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمارے مخالفین اپنا کام دکھا رہے ہیں۔ جب تک ہمارے درمیان اتحاد نہیں ہوتا اور ہم خود قائل نہیں ہوتے تب تک کافی مشکلات پیش آئیں گی۔ ہم اینٹی پنجابی کا رویہ بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

س بطور چیئرمین اکادمی ادبیات آپ نے پنجابی زبان کے لئے کیا کیا؟

ج میں جب اکادمی ادبیات کا چیئرمین بنا تو وہاں اردو کے علاوہ باقی زبانوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نے پہلی دفعہ بشمول پنجاب کے تمام پاکستانی زبانوں میں مزاحمتی نظموں کے تراجم چھاپے۔ پھر گوجرانوالہ کے عبدالغنی شوق کی ہیر چھاپی۔ اس کے علاوہ کچھ پنجابی اداروں کی گرانٹ بڑھائی۔ اکادمی کا ایک اصول تھا کہ بہترین کتاب پر اُردو کو چالیس ہزار اور پنجابی کو بیس ہزار روپے دیے جاتے تھے۔ میں نے کہا کہ پنجابی کو بھی چالیس ہزار دینا چاہئے۔ ایک پنجابی ڈکشنری چھاپنے کا پروگرام بھی تھا لیکن انہی دنوں ہماری حکومت ختم ہوگئی۔ میرے بعد جو صاحب آئے نہ ہی انہوں نے اور نہ ہی موجودہ صاحب نے اس حوالے سے کچھ کیا۔ میرے بعد دونوں اصحاب کی ترجیحات میں قومی زبانیں نہیں ہیں۔ کمال فن ایوارڈ صرف اُردو کو دیا گیا۔ جبکہ پنجابی میں احمد راہی اور شریف کنجاہی جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ سنا ہے کہ میرے بعد تو وہاں پنجابی زبان وادب کا نام لینا بھی بڑی مصیبت بن چکا ہے۔ واضح رہے کہ اکادمی ادبیات صرف اردو کا ادارہ نہیں ہے۔ اس میں پاکستان کی تمام زبانیں شامل ہیں۔ میں نے جب ملک کی ساری زبانوں میں کتابیں چھاپیں تو اس کے بعد اسمبلی کے اجلاس میں سینیٹر جمیل الدین عالی نے مجھ سے پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا کہ فخر زمان سے پوچھا جائے اس نے اکادمی ادبیات کے چیئرمین کے حوالے سے پاکستان کی علاقائی زبانوں کو پاکستان کی قومی زبان کے برابر کیوں کھڑا کر دیا ہے۔ پھر انہوں نے اپنا یہی

سوال اپنے کالم میں بھی اٹھایا۔

س مستقبل کے حوالے سے آپ کا لائحہ عمل کیا ہے؟

ج جیسا کہ میں نے بتایا دنیا بھر میں مقیم پنجابی اپنی مادری زبان کو تسلیم کروانے کے عمل میں کئی طرح کے مسائل کا شکار ہیں۔ لاہور کانفرنس 2001 نے اس سلسلے میں یادگار کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں پنجابی لوگ اپنی زبان کے سلسلے میں تشخص کے بحران پر قابو پانے اور زبان کو درپیش مسائل کے حل کے لئے کوشاں ہیں۔ پاکستانی پنجابی بار اپنے پنجابی ہونے، صوفی ورثے، ثقافتی پس منظر، روشن تاریخی روایات پر فخر محسوس کر رہے ہیں اور ایک زبان کے نام نہاد نظریے کو مسترد کر رہے ہیں۔ وہ اپنی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں اور پنجابی زبان و ثقافت کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ پاکستان میں بسنے والے پنجابی دقیانوسیت پسند عناصر اور مغرور افسر شاہی سے نپٹنے کے لئے ہر دم تیار ہیں۔ WPC نے فیصلہ کیا ہے کہ گلوبل پنجابی تحریک کی رفتار کو اگلے چار برسوں 2005ء میں آٹھ کانفرنسوں کے ذریعے تیز کیا جائے جن مما لک میں یہ کانفرنس منعقد ہوگی۔ ان میں بھارت (دسمبر 2002)، کینیڈا (مئی 2003)، ملائیشیا (دسمبر 2003)، ڈنمارک (مئی 2004)، امریکہ (دسمبر 2004)، ناروے (مئی 2005) شامل ہیں۔ ہالینڈ، سنگاپور اور تھائی لینڈ میں اگلے مرحلے میں کانفرنسیں منعقد ہوں گی۔ پاکستان میں چوتھی کانفرنس دسمبر 2005ء میں منعقد ہوگی اور یوں کانفرنسوں کے پہلے مرحلے کا اختتام اور دوسرے مرحلے کا آغاز ہوگا۔ جلد ہی عالمی پنجابی کانگریس کا ویب پیج بھی پنجابی زبان، ادب اور تاریخ کے فروغ کے لئے تیار کیا جائے گا۔

OOO

فرحت پروین

س سب سے پہلے اپنے سوانحی وادبی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج بات تو تھوڑی عجیب ہے مگر مجھے کبھی بھی آباؤاجداد کے دولت وثروت کے قصوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ ابا جی کبھی ذکر کرتے تو میں منہ چڑھی تو تھی ہی، صاف کہہ دیتی ''ابا جی مجھے پدرم سلطان بود سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' اب سوچتی ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ یہ تو گستاخی اور دل شکنی تھی۔ نوعمری میں اپنی شخصیت کا کچھ زیادہ ہی احساس ہوتا ہے۔ طارق بٹ نے کیا خوب کہا ہے:

اپنے ماضی کا کوئی نقص سنبھالے رکھنا
کون تھے کیا تھے بتانا کہیں پڑ جاتا ہے

سو اسے چند لائنوں میں سمیٹنے کی کوشش کروں گی۔ میرے خیال کے مطابق اگر کسی قلمکار کے سوانحی پس منظر میں شعروادب کی کوئی وراثت نہیں تو وہ اتنا اہم نہیں مگر آپ کا کہنا ہے کہ قارئین کو اس میں دلچسپی ہوتی ہے۔ سو میرے آباؤاجداد سرائے نورنگ ضلع بنوں سے تعلق رکھتے تھے۔ گھر میں بول چال کی زبان پشتو تھی۔ ہمارے پردادا خان بہادر سلطان محمود خان رئیس اور جاگیردار تھے جن کی حویلی پر سواری کے لئے گھوڑوں کے علاوہ ہاتھی بھی جھومتے تھے۔

پھر ہمارے دادا خدا بخش خان اپنے دور پار کے رشتہ داروں کو ملنے بھکر آئے جو اس وقت ایک پسماندہ قصبہ تھا۔ یہاں ایک چھوٹی ذات کی لڑکی کے حسن کی چکاچوند نے دیوانہ کر دیا۔ جانتے تھے نہ والد سے اجازت ملے گی اور نہ منگیتر کے خاندان والے زندہ چھوڑیں گے۔ سو اس سے شادی رچا کر بھکر میں ہی مستقل اقامت پذیر ہو گئے کہ واپسی کے راستے انہوں نے خود ہی بند کر دیئے تھے۔ پولیس میں ملازمت کر لی۔ تھانیدار ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھکر سے پہلی ٹرانسپورٹ کمپنی کی داغ بیل ڈالی۔ ''خان ٹرانسپورٹ کے نام سے'' دادا کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ابا جی سب سے چھوٹے تھے۔ یوں تو میں ابا جی کو علاوہ ڈائری لکھنے کے کچھ خاص لکھتے نہیں دیکھا مگر کسی بچے کی پیدائش، سالگرہ اور شادی کے موقع پر منظوم مبارک باد لکھتے تھے۔

گلا بھی خوب پایا تھا۔ جب ترنم سے پڑھتے تو رنگ جما دیتے۔ ایک دو موقعوں پر ترنم سے ایک دو غزلیں بھی سنائیں۔ خدا جانے ان کی اپنی تھیں یا کسی کی۔

ننھیال کا گھرانا بہت پڑھا لکھا اور معزز تھا۔ پاس پڑوس کی بچیاں نانی سے قرآن پاک پڑھنے آتیں۔ دونوں ٹائم بہت بڑا اسکول لگتا۔ یہ لوگ ترقی یافتہ ذہن رکھتے تھے۔ ان میں میں ڈاکٹر اور سرجن بھی تھے۔ خود میرے نانا بہت مشہور دندان ساز تھے، خواتین بھی پڑھی لکھی تھیں۔ بھکر میں لڑکیوں کا پہلا سکول میرے نانا نے اپنے گھر کے ایک حصے میں بنایا تھا جس میں ان کی گھر کی خواتین باضابطہ سکول چلاتی تھیں۔ گھر کی فضا مکمل دینی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ استاد خانہ تھا پورے قصبے میں بہت عزت تھی۔ نانی تو گویا وہاں کی جج تھیں۔ سارے جھگڑے ان کے گھر چکتے تھے اور کوئی ان کے فیصلوں سے انحراف نہیں کرتا تھا۔ ان سب مشاغل کے علاوہ میں نے کسی کو شعر و ادب کی کتابیں پڑھتے نہیں دیکھا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ توبۃ النصوح، قصہ چہار درویش، باغ و بہار، قصہ گل بکاؤلی، داستان امیر حمزہ اور گل پہ صنوبر چہ کرد جیسی کتابیں نانی کی قرآن شریف والی الماری سے ملیں۔ کوئی تو پڑھتا ہوگا، کبھی۔

س ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج یہ تو طے ہے کہ مجھے ادب سے لگاؤ ماحول یا وراثت سے نہیں ملا۔ یہ تو قسام ازل نے یوم الست ہی میرے خمیر میں گوندھ دیا تھا۔ میرا بچپن تو لاہور ہی میں گزرا پھر بوجوہ جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی، ہم بھکر منتقل ہو گئے جس کا خسارہ سب سے زیادہ مجھے ہوا کہ مجھے میری طلب اور پیاس کی نسبت بہت کم کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ سو میں نے اچھا برا جو ملا، کچھ نہ چھوڑا۔ سکول کی لائبریری میں کتابیں بہت زیادہ نہیں تھیں۔ چھوٹا اور پسماندہ شہر تھا شاید اس لئے۔ پہلے تو لائبریری مجھے کتابیں دینے پر راضی نہ تھی لیکن جب میں پڑھ کر جلدی جلدی لوٹانے لگی تو پھر وہ دینے لگ گئی۔ سچ پوچھیں تو مجھے کورس کی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر ذہن اچھا تھا۔ کلاس میں پوری توجہ سے ٹیچر کا پڑھایا ہوا سن اور سمجھ لیتی۔ یہی میرے لئے کافی ہو جاتا۔ ہوم ورک کبھی نہیں کرتی تھی کہ وہ وقت مجھ غیر نصابی کتابیں پڑھنے کے لئے درکار ہوتا تھا۔ سو سارا سال ٹیچر کی ڈانٹ چکنے گھڑے کی طرح سن لیتی مگر ہمیشہ فرسٹ آتی۔ جتنا بھی پڑھا، اعزاز کے ساتھ پانچویں کلاس میں وظیفہ ملا اور بی اے تک یہ سلسلہ بغیر کسی لمبی چوڑی مشقت کے چلتا رہا۔ ہاں ایم اے میں یہ اعزاز قائم نہ رکھ پائی کہ اب زندگی میں بہت مسائل تھے۔ گھر بار، بال بچے وغیرہ تو بات ہو رہی

تھی میرے ادب کے شوق کی ابتداء کی۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ یہ میری مٹی میں گندھا ہوا تھا۔ مطالعے نے اسے صیقل کیا اور کتابیں میری زندگی کی ساتھی بن گئیں۔ البتہ مجھے کچھ کہنے کی تحریک محسوس نہ ہوئی۔ ہاں کلاس میں میرے مضامین سب سے اچھے ہوتے تھے۔ سکول کے فنکشنز میں ایک دو مزاحیہ قوالیاں بھی لکھیں۔ شہر سے باہر ڈبیٹ پر جانے والی لڑکیوں کو تقاریر ہمیشہ میں لکھ کر دیتی تھی۔ ایک دو بار ٹیچرز پر بھی مرزا رفیع سودا کی طرز پر نظمیں کہیں اور اپنی کلاس کو سنا کر داد پائی۔

خود میں بہت شرمیلی تھی۔ سو نہ مباحثوں میں حصہ لیا اور نہ ڈراموں میں، جس پر کئی بار ٹیچرز کی شدید ناراضگی اور سزا بھی برداشت کی مگر اپنے خول سے باہر نہ آئی۔

پڑھنے کا مجھے بے انتہا شوق تھا۔ اب جبکہ میں کئی کتابوں کی مصنفہ ہوں، اگر مجھ سے کہا جائے کہ پڑھنے اور لکھنے میں سے ایک چیز چن لو تو میں ایک سیکنڈ میں سوچے بغیر مطالعہ چنوں گی۔

میری اپنی ایک دنیا ہے جس کے آفاق بہت وسیع ہیں۔

تھوڑے سے دیوانے ہیں ہم، لوگ بھی سچ ہی کہتے ہیں
دل کی ہمارے اک دنیا ہے جس کے اندر رہتے ہیں

تو کم لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ میں ایک خودرو پودا ہوں جس کی آبیاری قدرت کرتی رہی اور یہ پودا بڑھتا پھیلتا رہا اور جب یہ پودا گھنگھنا کر خوب پھل پھول گیا تو ایک صاحب نظر باغبان کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ صاحب نظر پارکھ باغبان احمد ندیم قاسمی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے:

اردو کی محبت تو میرے خون میں گردش کرتی تھی۔ امریکہ کے دوران قیام اپنے بچوں کی وجہ سے کالجوں یونیورسٹیوں سے رابطہ رہتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ نئی نسل کے لوگ صرف انگلش بولتے تھے۔ گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی۔ لگتا تھا کہ وہ اردو کو اور اپنی مادری زبانوں کو بھی مکمل طور پر بھلا دیں گے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا تھا اور پھر میں نے صرف افسوس کرنے کے بجائے عملی طور پر کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ میں اب کوئی شرمیلی لڑکی نہیں، چار بچوں کی ماں تھی۔ کتابوں کی سنگت نے مجھے اعتماد کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ میں نے طالب علموں کو ترغیب دلانے کے لئے ابتداء یونیورسٹی میں ورائٹی پروگراموں سے کی جو اردو میں ہوتے تھے اور پھر ''فیض نائٹ'' جیسا دھانسو پروگرام کیا کہ امریکن پروفیسروں نے بھی شرکت کی اور ہماری شاعری

سے متعارف ہو کر بڑی حیرت سے یہ الفاظ کہے کہ ہمیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے ملک، تمہاری زبان میں بھی اس معیار کی شاعری موجود ہے اور پھر یہ پروگرام یو این کے کلچرل پروگرام کے لئے منتخب کیا گیا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ امریکن پروفیسروں کو اتنی اچھی طرح اردو شاعری کیسے سمجھ میں آ گئی تو میں بتاتی چلوں کہ ہم نے ان نظموں کا انتخاب کیا جن کے انگلش تراجم موجود تھے۔ ایک پاکستانی لڑکا اردو میں نظم پڑھتا تھا پھر سپاٹ لائٹ سٹیج پر پہلے سے موجود امریکن لڑکے پر چلی جاتی اور وہ اسی نظم کی انگلش ٹرانسلیشن پڑھ دیتا۔ شاعری پڑھنے والے سب لڑکے لڑکیوں کو شلوار قمیص میں نے مہیا کی تھی۔ اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ کیا بتاؤں۔ پھر اسی طرح مشاعرے بھی ہوئے اور آخر کار میں نے اردو سوسائٹی بنانے کی ٹھان لی۔ اس کی پہلی میٹنگ اپنے گھر رکھی۔ اچھے اچھے کھانوں کا لالچ دے کر کہا کہ کچھ لکھ کر بھی لانا۔ کچھ بھی جیسے آج کیا کیا؟ تاکہ وہ لکھنا بھی نہ بھولیں۔ لاڈلے منہ چڑھے بچے تھے۔ بولے ''آپ بھی لکھ رکھئے گا آنٹی۔''

اس وقت تک میں مصنفہ نہیں تھی۔

خیر وہ آئے، کھانا بھی ہوا، میٹنگ بھی......سب نے اپنا اپنا لکھا سنایا۔ اب میری باری تھی۔ میں گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں لکھ سکتی تھی۔ ان کو ترغیب دلانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ وہ بضد تھے کہ میں اپنا لکھا سناؤں اور پھر میں نے ایک کاپی اٹھا کر اسے کھول کر زبانی ہی وہ واقعہ سنا دیا جو دو دن پہلے میرے گھر پر ہوا تھا۔ بچوں نے ایئر گن سے ایک ''سکنگ'' کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ سکنگ مرا تو نہیں، بھاگ گیا مگر ایسی ناقابل بیان یادداشت چھوڑ گیا کہ بیان سے باہر ہے۔ دوسرے دن میں نے اس واقعے کو لکھ لیا۔ جب اسے پڑھا تو لگا کہ اس تحریر میں جان ہے۔ پاکستان فون کر کے پوچھا کہ پاکستان میں سب سے اچھا ادبی پرچہ کون سا ہے؟ تو جواملا ''فنون'' جسے احمد ندیم قاسمی نکالتے ہیں مگر وہ صرف اے کلاس رائٹر کو چھاپتے ہیں۔

لاکھ لاپرواہی ہو مگر کچھ نہ کچھ خود آگہی تو ہوتی ہے۔ میں نے جواب دیا ''میں نے صرف پرچے کا نام پوچھا ہے وہ کون سی کلاس کو چھاپتے ہیں، یہ نہیں پوچھا'' اور فون بند کر دیا۔ پھر میں نے اپنی وہی پہلی تحریر احمد ندیم قاسمی کو بھیج دی۔ چار لائنوں کے نوٹ کے ساتھ کہ ''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے یا میں اپنا وقت ضائع نہ کروں۔''

جواب میں ان کا چار صفحے کا خط آیا جس میں انہوں نے بہت تعریفوں کے بعد لکھا کہ یہ

افسانہ تو عالمی مقابلے میں رکھنے کے قابل ہے۔

جب میں پاکستان پہنچی تو میرا پہلا افسانہ ''سکنگ'' کے نام سے فنون کی زینت بن چکا تھا اور جناب احمد ندیم قاسمی ''ادب دوست'' میں میرے فن کی تعریف میں مضمون بھی لکھ چکے تھے۔ اگر وہ صاحب نظر سچا پارکھ میری حقیر کاوش کو وقار نہ بخشتا تو آج میں افسانہ نگار نہ ہوتی۔ میری زندگی کے ہر لمحے پر ان کا قرض ہے۔

گرینڈ انٹری کا تو ذکر ہو گیا۔ اب تصانیف کا بتا دوں۔

اب تک میری جو کتابیں آ چکی ہیں ان میں پانچ افسانوں کی ہیں کیونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ 1: منجمد۔ 2: ریستوران کی کھڑکی سے۔ 3: کانچ کی چٹان۔ 4: صندل کا جنگل۔ 5: بزم شیشہ گراں۔ 6: (عالمی ادب سے کلاسیکس کے تراجم) خواب زمستاں اور ایک امریکن مصنفہ کا ناول سائنس فکشن۔ 7: دی گور۔ 8: (نظموں کا ایک مجموعہ) گفتم۔ کل آٹھ کتابیں ہیں۔

ایک اور طویل تاخیر کے بعد ایک ساتھ تین کتابیں آ رہی ہیں۔ ان میں ایک غزلوں کا مجموعہ، ایک افسانوں کا اور ایک فری تھاٹس کا۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعرہ بھی۔ شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج میرے خیال میں شاعری اظہار کا سب سے خوبصورت ذریعہ ہے۔ شاعر ایک شعر میں جو بات کہہ جاتا ہے، نثر میں اس کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ اختصار کا یہ حسن اس کی تاخیر اور معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

جہاں تک میرا معاملہ ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ میں لکھتی ہوں اور شاعری مجھ سے سرزد ہو جاتی ہے۔ اکثر دفعتہ آن وارد ہوتی ہے۔ غالباً لاشعور میں بھٹکتے ہوئے خیالات صورت پذیر ہو کر قلم کی نوک پر آ جاتے ہیں۔

ویسے تو افسانوں کا بھی یہی قصہ ہے۔ میرا کہنا ہے کہ کہانیاں میں نہیں لکھتی۔ کہانیاں خود کو مجھ سے لکھواتی ہیں۔ وہ اپنا اسلوب لفظیات اور موضوع سب کچھ خود لے کر آتی ہیں اور سامنے بیٹھ کر لکھوا لیتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میرے قلم تک پہنچنے سے پہلے میرے ذہن میں شعور، لاشعور اور خارجی واقعات کے ساتھ مل کر کئی کئی دن تک محفلیں سجاتی اور صلاح مشورے کرتی رہتی ہیں اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ڈھیروں ڈھیر رنگ برنگی کہانیوں کے گرد مڑھا ہوا خول ہوں اور اگر میرے اندر سے ساری کہانیاں نکال لی جائیں تو میں Piniyata

کی طرح صرف ایک کھڑکھڑاتا خول رہ جاؤں گی۔

پڑھنے کا مجھے چسکا ہے۔امریکہ مستقل قیام کے دنوں میں ساتھ لے کر گئی ہوئی کتابیں کم پڑ جاتیں تو میں نے انگلش لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں تو وہ جرمن فرنچ اور دوسری زبانوں کا ہوتا تھا مگر میں ان سب کی انگلش ٹرانسلیشن پڑھتی تھی۔ کچھ کہانیاں مجھے بے انتہا پسند آئیں تو میں نے ان کا اردو ترجمہ کرنا شروع کر دیا کیونکہ میرا دل چاہتا تھا کہ یہ نفیس ادب پاکستان میں بھی لوگ پڑھیں۔ ان کلاسیکس شارٹ سٹوریز کے تراجم ''خواب زمستان'' کے نام سے چھپے اور ایک امریکن رائٹر کا سائنس فکشن بھی ترجمہ کیا۔

اور اب میں اردو ادب میں ایک نئی صنف کو متعارف کرانے والی ہوں۔ پچیس برس پہلے کے ڈپریشن کی کیفیت میں لکھے ہوئے ان فری تھاٹس یا خیال کی آزاد رو کو میں نے چھپوانے کا فیصلہ کیا ہے۔سوچا اتنی ساری کاپیاں بھری پڑی ہیں، کچھ غزلیں بھی منتخب کر کے چھپوا لوں اور نظموں کا مجموعہ تو آ ہی چکا ہے۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے؟

ج بے شک الیکٹرانک میڈیا پر بھی بہت کچھ جاننے اور پڑھنے کو مل جاتا ہے اور یہ ایک اضافی سہولت ہے مگر مجھے اس سے اختلاف ہے کہ اس کی وجہ سے دوری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک جہاں الیکٹرانک میڈیا اپنے عروج پر ہے، وہاں کتابوں سے وابستگی کا یہ عالم ہے کہ ایئرپورٹ لاؤنج میں لوکل ٹرین میں اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں کتابیں ہوتی ہیں۔طویل سفروں میں تو اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ چھپے ہوئے لفظ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔فرعونوں کے زمانے کا ایک درخت کے تنے پر لکھا ہوا قول ہے جو زبانیں ڈی کوڈ ہونے کے بعد پڑھا گیا اور جو آج تک موجود ہے جس پر لکھا ہوا ہے کہ ''اگر آپ کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہیں اور آپ پر سایہ نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ وقت اب آپ کا نہیں رہا۔'' ابھی ہم الیکٹرانک میڈیا کے عبوری دور میں ہیں، سو زیادہ متاثر اور مشتاق ہیں۔ جب اس کے عادی ہو جائیں گے تو کتاب کی قدر و قیمت کے پھر سے قائل ہو جائیں گے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیق ایک الوہی صفت ہے اور خالق کائنات اپنی عنایت خاص سے کچھ لوگوں کو اس صنف سے متصف کر دیتا ہے۔ایک پڑھا لکھا شخص عالم ہوسکتا ہے، کالم نگار اور صحافی ہوسکتا ہے مگر

تخلیق کار نہیں، مصنف نہیں۔

ایک اچھا تخلیق کار وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر کی تحریک کے ساتھ مطالعہ اور مشاہدہ بھی شامل کرتا ہے، اس چیز کا انتخاب کرتا ہے وہ اس کے نقطہ نظر سے مماثل ہوں۔ ایک ہی واقعہ اگر ایک صحافی، ایک کالم نگار اور ایک مصنف دیکھ رہے ہوں تو تینوں اپنے اپنے انداز اور اپنی فکر کے مطابق قلمبند کریں گے جو ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔

تخلیقیت کی صفت مصنف کو ان سب سے ممتاز کرتی ہے۔ اب یہاں ایک اور بات بھی ہے کہ اس الوہی صفت کو کون کتنا صیقل کرتا ہے۔ کون اسے مطالعے سے دقیق بناتا ہے، کون اپنے زاویہ نگاہ کو اس طرح احاطہ تحریر میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس کی بات نہ صرف لوگوں کے دلوں میں اتر جائے بلکہ فکر کے نئے باب بھی وا کرے اور اس کی تو کوئی حد ہی نہیں۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج الاسکا کے کروز میں جب ہم گلیشیئر کے اوپر ہیلی کاپٹر کے ذریعے اترے۔ وہ ایک طلسماتی لمحہ تھا۔ جب میں اپنے وجود سے نکل کر فضا کے تحیر میں گم تھی۔ تلووں میں کیل لگے بھاری بوٹوں کو دھیرے دھیرے قدم جما کر چلتے ہوئے اپنے بدن کے اندر میں نہیں تھی۔ نیلا آسمان، ہلکی نیلی برف اور فضا میں تیرتا ہوا ایک ترار، ایک جادو۔ لگتا تھا مادی زندگی مادی دنیا کا تعلق کسی اور جہان سے ہے۔ بس ایک سکون کا احساس تھا۔ سرگوشیاں کرتی خاموشی تھی جو میری روح سے ہم کلام تھی۔ کیا راز بے پایاں راز و نیاز ہوئے۔ ان کے درمیان، گرم کپڑوں میں لپٹا بھاری بوٹ پہنے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا میرا مادی وجود اس سے بالکل بے خبر تھا۔ کب اور کس طرح میں واپسی ہیلی کاپٹر کے اندر پہنچی، کب لینڈ کیا کچھ احساس نہیں۔ جب مجھ سے جوتے واپس کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو میں اس دنیا میں واپس لوٹ آئی۔ ایک دکھ سا تھا کہ پھر وہی دنیا......!

میرے خیال میں یہ آسودہ ترین وقت تھا۔ دونوں سطحوں پر تھا۔ تخلیق بھی اور زندگی کی بھی۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج اگر چہ یہ ایک متنازعہ سوال ہے مگر میں اس کا جواب دوں گی۔ اس میں تو زیادہ سوچنے والی بات ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے آرگنائزرز جو یہ محفلیں برپا کرتے ہیں تو شرکاء کو اکثر ان کے ادبی یعنی شعری قد کاٹھ کے مطابق مدعو کرنے کے بجائے ذاتی پسند ناپسند اور سفارشوں کی بناء پر ہوتا ہے

کیونکہ بالمشافہ پبلک کے سامنے آنے اور شہرت پانے کا سب سے مؤثر طریقہ ہے۔ سو معیار تو وہ نہیں رہتا جو کہ شعر و سخن کی تہذیب لئے ہو۔ اگر اس پر توجہ دی جائے تو معیاری مشاعرے ہو سکتے ہیں اور خوب سے خوب تر کہنے کی تحریک ہو سکتی ہے۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے۔ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج معاشرے اور اندرون دونوں سے، جیسے دائیں اور بائیں ہاتھ کی مشترکہ حرکت سے کوئی فعل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بالکل ویسے ہی معاشرے کی ابتری یا بہتری کی وجہ سے جو حالات و واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ تخلیق کار کے باطن کو تحریک دیتے ہیں۔ عموماً معاشی ناہمواریاں، ناانصافیاں، ظلم و جبر، مظلوم و مقہور طبقے کی تکالیف و مصیبتیں تخلیق کار کے حساس دل کو بے چین کر دیتی ہیں اور اس کا قلم یہ سب کچھ سامنے لانے اور مراعات یافتہ طبقے کو آئینہ دکھانے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

اصلی، حقیقی تخلیق کار حساس، نرم دل اور حق کا حمایتی ہوتا ہے اور دنیا میں جو تبدیلی اس کے امکان میں ہوتی ہے، لانے کی کوشش کرتا ہے جس کے لئے اس کا سب سے مؤثر ہتھیار اس کا قلم ہوتا ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کیسے دیکھی ہیں؟

ج اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ سوشل میڈیا والے اچھی بری ہر چیز کو شائع اور مشتہر کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ نہ محقق اور نہ نقاد اور ہر وہ شخص جس کی کوئی چیز ایک دو بار سوشل میڈیا پر آ جاتی ہے خود کو بڑا قلمکار سمجھنے لگ جاتا ہے اور کچھ مزید سیکھنے اور محنت کرنے کی کوشش ترک کر دیتا ہے۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج دیکھا جائے تو بنیاد تو ذاتی تجربات اور مشاہدات ہی ہوتے ہیں جو اس کے قلم کو رواں رکھتے ہیں۔ ایک خاص انداز، سوچ اور زاویہ عطا کرتے ہیں۔ اس کے ذہن کو وسعت عطا کرتے ہیں۔ خوشی اور غم کو زندگی کے دوزخ میں ہی، مگر دوسروں کے دکھ کو اپنا سمجھنے کا سلیقہ تب ہی عطا ہوتا ہے جب کوئی خود اس میں گزرتا ہے۔ وہی اس کی تپش کو جان سکتا ہے جو اس آگ میں جل چکا ہو۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی جب میں یہ کہوں گی کہ میں نے کچھ نہیں کھویا، صرف پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سوز و گداز کی دولت عطا کرنے اور احساس کے نفیس جذبے سے اپنی تخلیق کا مقصد

جاننے کا اعزاز بخشا ہے تو یہ پانا ہی ہے!

دولت درد پا کے میں خود ہوں گداز دل ملا
ایسا کبھی نہ آئے دن آنکھ مری نہ نم رہے

جیسا جاوید اختر نے کہا ہے:

غم ہوتے ہیں جہاں ذہانت ہوتی ہے
دنیا میں ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے

سو......

اپنی نظروں میں بھی ہم کچھ معتبر تب سے ہوئے
غم کی خلعت جب ملی اور درد سرمایا ہوا

OOO

فرحت زاہد

س اپنے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج میں بچپن ہی سے عام بچوں سے مختلف تھی۔جن دلچسپیوں میں میرے بہن بھائی یا کزنز حصہ لیتے تھے میں ان سے پرہیز کرتی تھی۔میری طبیعت ذرا ان سے الگ تھی اور میرے خیال میں یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے تھا۔یہ بھی بتا دوں کہ میرا تعلق بہاولپور سے ہے میرے والد وہاں ریلوے کنٹریکٹر تھے۔اور وہ یو پی سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔میری پیدائش بہاولپور کی ہے۔بی اے میں نے بہاولپور ڈگری کالج سے کیا اس کے بعد ایم اے انگلش کے لئے اسلامیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔لیکن تعلیم کے دوران میری شادی ہوگئی۔جس کے بعد باقاعدہ تعلیمی سلسلے کو ترک کرنا پڑا۔

س لکھنے کی طرف کیسے آئیں؟

ج بچپن ہی سے ہمارے گھر میں ادبی رسالے نقوش،فنون اور ادب لطیف آتے تھے۔جن کو میں گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھی۔شائد اسی دوران کہیں لکھنے لکھانے کے جراثیم نے میرے اندر پرورش کے لئے جگہ بنالی۔لیکن اس کا ادراک مجھے ایک سال ہوا کہ میں لکھ سکتی ہوں یا مجھے بھی لکھنا چاہئے۔

س ابھی آپ نے جن ادبی جریدوں کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ آپ ان کو گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھا کرتھیں۔کیا آپ کے گھر میں ادب پڑھنے پر پابندی تھی۔یا پھر ان جریدوں میں کوئی قابل اعتراض مواد چھپتا تھا؟

ج آپ کی دونوں باتیں درست ہوسکتی ہیں وہ ایسے کہ ہمارا گھرانہ ایک کٹر مذہبی قسم کا گھرانہ تھا۔جس میں خاص طور پر خواتین کو دینداری اور امور خانہ کی طرف دھیان دینے کو کہا جاتا ہے۔اس کے ساتھ چونکہ دور طالب علمی میں ایسے جریدے پڑھنے سے پڑھائی کا حرج بھی ہوتا ہے۔اس لئے گھر والوں کی طرف سے ایسی قسم کی کتابیں یا رسالے پڑھنے کی حوصلہ شکنی

ہوتی تھی۔ یوں بھی ان جرائد میں عصمت چغتائی اور منٹو کے افسانے چھپتے تھے۔ اور باوجود اس کے کہ وہ ادبی شاہپارے اور حقیقت کے ترجمان تھے میں آج بھی سمجھتی ہوں کہ منٹو اور عصمت چغتائی کے بعض افسانے ایسے ہیں جن کو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نہ ہی پڑیں تو اچھا ہے۔

س: حالانکہ خود آپ نے وہ افسانے چھپ چھپ کر پڑھے؟

ج: اس لئے ہی تو یہ بات کہہ رہی ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نوجوانی کی عمر دراصل نادانی کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں آدمی کسی بات کی گہرائی میں جائے بغیر اس مسئلے کو صرف اوپری سطح سے دیکھتا ہے۔ بعد میں عمر کے ساتھ ساتھ جب انسان تجربات کی بھٹی سے گزرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ حقیقت گمان سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن عموماً آدمی کو حقیقت کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب وہ عمر کا کافی حصہ گزار چکا ہوتا ہے۔

س: آپ کا مطلب بچوں پر پابندیاں ہونی چاہئیں؟

ج: ہرگز نہیں آپ بچوں کو اعتماد میں لے کر ان کو پیار محبت سے بھی سب کچھ سمجھا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح پرورش پانے والے بچے معاشرے کے بہترین اور کارآمد انسان بن سکتے ہیں۔

س: باقاعدہ طور پر پہلی دفعہ کب لکھا؟

ج: میں شروع سے ہی بورڈنگ میں ہوں۔ وہاں میری کافی لڑکیوں کے ساتھ اچھی دوستی تھی۔ غیر شعوری طور پر میں اپنی دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں کوئی مصرعہ کہہ جاتی تھی۔ میری اکثر سہیلیاں کہتی تھیں کہ تمہاری باتوں میں ردھم ہے۔ تم لکھنے کی طرف دھیان دو۔ انہی دنوں کالج میں قائداعظم کی سوسالہ تقریب کے سلسلے میں کالج میگزین کے لئے میں نے ایک نظم کہی جسے ہماری اردو کی لیکچرار میڈم شمشاد نے بے حد پسند کیا اور وہ نظم میگزین میں چھپنے کے لئے منظور ہوگئی۔ بس یہیں سے میری ہمت بندھی اور مجھے حوصلہ ملا کہ مجھے مزید لکھنا چاہئے۔

س: مشاعروں اور ادبی جرائد میں کب چھپنا شروع کیا؟

ج: یہ بڑی بعد کی بات ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ہمارا گھر مذہبی تھا۔ لہٰذا مشاعروں کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس زمانے میں بہاولپور ریڈیو اسٹیشن کے پروڈیوسر عقیل اشرف تھے۔ جو اب کراچی میں ہوتے ہیں۔ وہ نئے ٹیلنٹ کی تلاش میں مختلف جگہوں کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارے کالج بھی کئی دفعہ آئے۔ خود میرا بھی جی چاہتا تھا کہ میں مشاعرے پڑھوں۔ لیکن مجھے صرف پڑھائی کی اجازت تھی۔ یہ بھی بتا دوں کہ میں بڑی ذہین سٹوڈنٹ تھی۔ میں تھرڈ آوٹ اسکالرشپ ہولڈر تھی۔ لکھنے کا سلسلہ بھی ساتھ چلتا رہا لیکن لکھ کر میں اپنے

پاس رکھ لیتی تھی۔ باقاعدہ نہ تو کسی مشاعرے میں سنایا اور نہ ہی کہیں چھپنے کے لئے دیا۔

س اس حوالے سے کب سامنے آئیں؟

ج یہ غالباً 1981 کی بات ہے 79 میں میری شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد جب میں یو اے ای میں چلی گئی کیونکہ میرے شوہر وہاں آرمی میں تھے ان دنوں وہاں ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں مرحوم سلیم جعفری اس سلسلے میں کافی متحرک تھے۔ دبئی، ابوظہبی میں آئے دن ادبی تقریبات، مشاعرے اور میلے ہوتے رہتے تھے۔ میرے میاں زاہد صاحب خود بھی شاعر تھے۔ اور ان کے تایا شیخ یحییٰ خان بھی شاعر تھے ان کو ایسی تقریبات میں شرکت کے دعوت نامے ملتے رہتے تھے۔ اسی طرح کی کسی محفل میں جب میں نے بھی اپنا کلام سنایا۔ سامعین نے کافی حوصلہ افزائی کی۔ میں نے باقاعدہ مشاعروں میں جانا شروع کر دیا۔

س کتاب چھپنے کی نوعیت کب آئی؟

ج میری پہلی کتاب لڑکیاں ادھوری ہیں کے نام سے چھپی جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔

س ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' یہ نام کیسے تجویز کیا؟

ج کتاب میں میری ایک نظم ہے ''پھلواری'' اس میں یہ لائن ہے۔

''پھول اور شگفتوں پر تتلیاں آتی ہیں\
تتلیاں ضروری ہیں\
خواب گر نہ دیکھیں تو\
لڑکیاں ادھوری ہیں''

س ''لڑکیاں ادھوری ہیں، یہ کہنے کی آپ کو ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

ج لڑکیوں کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں جو ناروا پابندیاں ہیں اسے سامنے رکھ کر میں نے یہ ایک احتجاج ریکارڈ کرایا ہے۔

س امریکہ میں آپ کی ادبی مصروفیات کیا ہیں؟

ج لکھنے لکھانے کے علاوہ یہاں سے جو لوگ امریکا جاتے ہیں ان سے ہمارا بہت ملنا ملانا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم نے وہاں ''کاروان فکر وفن'' کے نام سے ایک تنظیم بنا رکھی ہے۔ جس کے چیئرمین وکیل انصاری ہیں۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام ہم ابتک وہاں کافی لوگوں کو مدعو کر چکے ہیں۔

س یہاں سے جن لوگوں کو آپ اپنے ہاں مدعو کرتے ہیں وہ آپ کے لئے کس قسم کے مسائل

پیدا کرتے ہیں؟

ج اصل میں یہاں سے جانے والے کافی توقعات لے کر جاتے ہیں جبکہ امریکہ میں جو زندگی کی مصروفیات ہیں وہاں کئی مجبوریاں ہمارے آڑے آجاتی ہیں، پاکستانی ادیبوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ان کے نخرے برداشت کئے جائیں۔ پاکستانی شاعر اور ادیب البتہ ایسے گھٹیا پن سے پرہیز کرتے ہیں۔

س ادبی گروہ بندیوں کی وہاں کیا صورت حال ہے؟

ج وہاں بھی گروہ بندیاں ہیں لیکن سب اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہاں پر ہماری تنظیم کے علاوہ حلقہ فروغ ادب، حنیف اخگر، حمیر ارحمان ظفر میموریل سوسائٹی، ریحانہ قمر۔ نیر آپا اور شکاگو میں فاروقی صاحب ہیں۔

س امریکہ میں اردو ادب کے بارے میں عمومی رویہ کیسا ہے؟

ج امریکن ادب سوسائٹی اردو ادب سے خاصی دور ہے۔اس کی وجہ میوزک اور فلم ہے۔ اردو ادب وہاں ابھی متعارف نہیں ہوا۔اس حوالے سے وہاں بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے۔ ساؤتھ ایشین لینگویجز کے نام سے وہاں ایک ادارہ قائم ہے۔لیکن یہ زیادہ تر ہندی کے فروغ کے لئے کام کرتا ہے۔اردو کے فروغ کے لئے وہاں کوئی ادارہ تاحال قائم نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ سفارتخانے کا کام ہے۔لیکن ایمبیسی صرف اس حد تک کام کرتی ہے کہ وہ کسی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر آجاتی ہے۔امریکہ میں اردو ادب کے فروغ کے لئے پاکستانی سفارتخانے کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔البتہ امید کی اک کرن پاکستان مشن کے منصور سہیل کا نام میں ضرور لوں گی۔ یہ کافی اچھے آدمی ہیں۔ان سے اس سلسلے میں کافی توقعات وابستہ ہیں۔

س اتنے طویل عرصے بعد پاکستان آنا کیسا لگا؟

ج بہت ہی اچھا لگ رہا ہے خاص طور پر لاہور آ کر بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ میرا ایک ہفتہ قیام کا پروگرام تھا لیکن یہاں آئے ہوئے مجھے دو ہفتے ہو گئے ہیں۔

س یہاں کے ادیبوں کے حوالے سے کچھ کہیں گی؟

ج پروین عاطف ہی کی بات کروں گی۔انہوں نے مجھ سے کہا کہ فرحت زاہد تمہارے آنے پر پورا لاہور یوں لگ رہا ہے جیسے یہاں بہار آ گئی ہے۔لاہور کے ادیب اور شاعر بڑے زندہ دل کمٹڈ اور ذہین ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اردو ادب کا مستقبل لاہور کے ادیبوں کی وجہ سے روشن ہے۔

قاسم علی شاہ

ہماری آج کی مہمان شخصیت ایک فرد نہیں بلکہ ایک تحریک ہیں۔آپ ایک استاد ہیں، کارپوریٹ ٹرینر ہیں،نوجوان نسل کی تربیت ان کا مطمع نظر ہے۔کام ان کا عشق ہے اور عشق ان کا کام ہے۔لوگ ان سے جینا سیکھتے ہیں،لوگ ان سے بولنا سیکھتے ہیں،ہم بات کر رہے ہیں، جناب قاسم علی شاہ کی۔بغیر کسی طویل تمہید کے قارئین کی خدمت میں ان سے ہونے والی خصوصی نشست کے دوران کئے گئے سوال وجواب پیش کرتے ہیں۔

س آپ بنیادی طور پر انجینئر ہیں مگر آپ نے تحریر وتقریر اور تدریس کے شعبے کو ترجیح دی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

ج یہ میری زندگی کا انتہائی خوبصورت وقت تھا، جب میں اسے یاد کرتا ہوں،مگر جب میں اس وقت کے حالات میں خود کو کھڑا کر کے دیکھتا ہوں تو تب یہ انتہائی مشکل وقت تھا۔کیونکہ بعض اوقات تبدیلی کا وقت بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے، کہ آپ خود کو اسے سمجھا نہیں پا رہے ہوتے، اس وقت میں اس کو معنی نہیں دے پا رہے ہوتے، پھر وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی کوئی شکل بنتی ہے۔میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو میرا یہ وہ زمانہ تھا جب میرے سامنے دو بڑی جدوجہدیں یا مجاہدے تھے،ایک تو غم روزگار، وہ اس لئے بھی اہم تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں میں بڑا بچہ تھا اور میرے تمام بہن بھائی زیر تعلیم تھے،میرے اندر ذمہ داری کا احساس بہت زیادہ پایا جاتا تھا،حالانکہ میرے والد دو، دو نوکریاں کر کے ہماری پرورش اچھے طریقے سے کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔میں سمجھتا تھا میرے ذمہ صرف اپنی ذاتی زندگی نہیں ہے بلکہ بہن بھائیوں کی مدد کرنا اور والد کا ہاتھ بٹانا بھی ہے۔اسی سوچ اور نظریے کے ساتھ میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ پڑھانا میرا جذبہ اور شوق بھی تھا، بلکہ میں اسے ایسا شوق کہوں گا جس پر مجھے فخر ہے،اسے میں اللہ تعالیٰ کی خاص عنائیت سمجھتا ہوں کہ اس نے مجھے پڑھانے اور تربیت دینے کا فن بخشا۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شکل تبدیل ہوتی رہی جو کہ ایک ارتقائی عمل ہے۔یہ تو جدوجہد کا ایک رخ تھا، دوسری

جدوجہد خودشناسی کی تھی۔ یہ خودشناسی بھی پورا پیدائش کا عمل ہے۔ یہ کوئی فوری اور آسان عمل نہیں جسے بٹن دبایا اور خودشناس ہوگئے۔ یہ تو ایسے ہے جیسے آپ گھٹاٹوپ اندھیرے میں دور پڑے چراغ کو دیکھتے ہیں۔ یہ غیب سے دور سے آنے والی آواز ہے آپ جس کا پیچھا کرتے کرتے کسی مقام کو پا لیتے ہیں۔ جب میں خود کو ڈھونڈ تا تھا کہ میں سائنس کا طالب علم ہوں UET میں پڑھتا ہوں، یہ تو میرے من کو نہیں بھاتا تھا۔ اس شعبے کی تمام کہانیاں مجھے تحریک نہیں دیتیں۔ جو سینیئرز کی کامیابی کی کہانیاں تھیں، وہ بھی کوئی غیر معمولی نہیں تھیں، یہی بس کہ اچھی نوکری مل گئی، گھر، گاڑی مل گئے، اس سے آگے تو وہ کہانیاں جاتی ہی نہیں تھیں۔ کوئی معنی خیز بات اور گہرائی ان میں نہ تھی۔ اس دور کی ایک اہم بات یہ تھی کہ میرا اٹھنا بیٹھنا کن لوگوں کے ساتھ تھا، وہ مجلس بڑی بھرپور تھی، لکھنے پڑھنے والے لوگوں کے ساتھ ہی میری محفل رہتی تھی۔ وہ صاحب فکر لوگ تھے۔ یہ میری تیسری جدوجہد تھی کہ جن لوگوں کا ہم جماعت تھا ان سے زیادہ دوستی نہیں تھی اور جن لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اچھا لگتا تھا وہ مختلف اور میرے دل کے زیادہ قریب شعبے سے تھے۔ اس لئے نقطے سے نقطہ ملتا گیا اور ایک تصویر بن گئی۔ دنیا میں لوگوں کو سب سے زیادہ پچھتاوا مرتے وقت اسی بات کا ہوتا ہے کہ جو بننا چاہتے تھے، اس شعبے میں نہیں گئے اور اسی طرف چل پڑے جو اس دور کا ٹرینڈ تھا۔

س شائد اس دور میں کیریئر کاؤنسلنگ کا رواج نہیں تھا؟

ج کیریئر کاؤنسلنگ کا رواج تو آج بھی نہیں ہے۔ یہ خودشناسی اور کیریئر کاؤنسلنگ آج کل متعارف ضرور ہوئی ہیں مگر مارکیٹ کا آج بھی رجحان نہیں ہیں۔ بازار کا رجحان آج بھی رٹے بازی، نمبر، جی پی اے ہی ہے۔ مارکیٹ عبدالستار ایدھی صاحب کے بقول ہم پڑھے لکھے جاہلوں کی فوج پیدا کر رہے ہیں۔ بیس سال پہلے کہے گئے ان کے الفاظ آج بھی سچ ہیں کہ یہ پود نہ اپنے ہنر سے واقف ہے اور نہ ہی اپنی صلاحیت سے آگاہ ہے۔

س بات چل نکلی ہے تو اپنے بچپن کے بارے میں بتایئے؟ گردوپیش کے حالات؟ ابتدائی زندگی؟

ج میرا بچپن ایک جدوجہد سے عبارت ہے۔ متوسط طبقے سے میرا تعلق تھا، والدین کی زندگی بھی بہتر زندگی کی کوشش میں سرگرداں تھی۔ میرے بڑے بوڑھے لاہور شفٹ ہوگئے تھے، گرچہ میری پیدائش گجرات کی ہے۔ تعلیم ابتدائی بھی میں نے لاہور ہی میں پائی اور بچپن کی یادیں بھی

لاہور کی ہی ہیں۔ چھٹیوں میں اکثر گجرات چلے جایا کرتے تھے۔ والدین کی جدوجہد کی یادیں اور محرومیوں کا تذکرہ، دیکھیں محرومی بذات خود تحریک کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ آدمی کو اندر سے جگائے رکھتی ہے اور محنت پر آمادہ کرتی ہے۔ جو چیز نہیں ہے اس کو پانے کے لئے ارادے کی طاقت اکٹھی کر لیتے ہیں، پھر کر کے دکھاتے ہیں۔ میں بڑا شرمیلا تھا۔ کئی چیزیں مگر بڑی دلپذیر تھیں، اچھی کتابیں، اچھے ڈرامے، اشفاق احمد کا زاویہ دل کو چھو لیتا تھا۔ جن سے دوستی تھی بڑی گوڑھی، حساسیت بہت زیادہ تھی طبیعت میں۔ یہ بعض اوقات تکلیف دہ بھی ہوتی ہے کہ حساسیت آپ میں کرب پیدا کرتی ہے۔ ایک غم اور دل ٹوٹنے والی کیفیت پیدا کرتی ہے اور وہیں سے گداز پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں کے لئے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، آپ کسی کے درد کو محسوس کر سکتے ہیں۔

س کیا یہ حساسیت ہی تھی جس نے ادب سے شغف پیدا کیا؟

ج میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا البتہ میں ادب کا ادنیٰ سا طالب علم ضرور ہوں۔ میرے لیکچرز ہوتے ہیں جنہیں کبھی مضامین کی شکل میں بھی لکھا کرتا تھا، اب میری ٹیم نے آسانی کر دی ہے کہ اس کو تحریری شکل میں لے کر آتے ہیں۔

س دب اور تصوف باہمی طور پر کیا منسلک ہیں؟ آپ ادب کی وجہ سے تصوف کی طرف راغب ہوئے یا تصوف کے باوصف ادب کی جانب رجوع کیا؟ یہ جڑت کیسے ہوئی؟

ج میرا خیال ہے کہ یہ ایک مزاج ہوتا ہے انسان کا جس سے پھر تلاش پیدا ہوتی ہے۔ ادب تو راستے میں پڑا ہوتا ہے، پہلے تو یہ تلاش ہے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے ساتھ آتی ہے۔ روشنی کے راستے میں کھڑے سارے روشن لوگوں کو تلاش شروع کرنے پر آمادہ کرنے والی چیز تو مزاج ہے۔ بڑا آدمی کیا ہے؟ بڑے آدمی کی تعریف کیا ہے؟ اسی سے آپ کے کردار کا پتہ چل جاتا ہے۔ آپ کسی سے پوچھیں کہ بڑا آدمی کیا ہے؟ اس کے جواب سے ہی نکل آتا ہے کہ یہ آدمی خود کیا ہے۔ اگر خیر، درویشی اور فقر کے رستے پر چلنے والے لوگوں کو آپ بڑا آدمی سمجھتے ہیں تو پھر ان روشن لوگوں کے روشن رستے کی ایک کرن آپ کو بھی مل جاتی ہے۔

س کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب اور تصوف نے مل کر قاسم علی شاہ کو بنایا؟

ج یہ دونوں ہی مددگار رہیں۔ بے انتہا مددگار

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیں؟ آپ کی کون کون سی تصانیف آپ کے دل کے

بہت زیادہ قریب ہیں؟ کتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں؟

ج میری ہر کتاب کے پیچھے ایک کہانی ہے۔شاید کہانی کے ساتھ ہم سب کا رابطہ، واسطہ بہت زیادہ ہے، میرا تو بہت ہی زیادہ ہے۔پہلی کتاب ''کامیابی کا پیغام'' 2008 میں شائع ہوئی۔تب میری عمر کوئی ستائیس برس تھی۔یہ بنیادی طور پر میرے اخبار میں نوجوانوں کے صفحے پر شائع ہونے والے مضامین تھے،جنہیں لوگوں نے بے حد سراہا۔حالانکہ ان میں کئی فکری مغالطے اور ارتقائی اعتبار سے ایسی باتیں بھی ہیں جن میں تبدیلی آتی ہے مگر میں نے فنی اعتبار سے کمزور چیزوں کو بھی ڈیلیٹ نہیں کیا تا کہ نئے آنے والوں کو حوصلہ ملے کہ ابتدائے سفر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔برٹینڈرسل کا ایک بڑا شاندار جملہ لکھا ہے کہ میں اپنے نظریات کے لئے نہیں مر سکتا، چونکہ ہو سکتا ہے یہ غلط نکلیں، یعنی اتنی گنجائش ہونی چاہیئے۔

س اب تک کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

ج میری اب تک پندرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان میں بڑی تعداد تو ان لیکچرز کی ہے جو مضامین کی شکل میں محفوظ ہوتے گئے اور بعد ازیں کتابی شکل میں شائع ہو گئے۔مضامین کی شکل میں یہ مختلف میگزین ہیں جن میں شائع ہوئے۔بلکہ پچھلے چند سال سے تو پنجابی اخبار میں بھی یہ شائع ہو رہے ہیں جن کا مجموعہ ''اندر بھانبھڑ بال'' اب تیار ہے اشاعت کے لئے۔

س آپ ادب دوست انسان ہیں، کبھی کسی ادبی تحریک سے بھی وابستہ رہے؟

ج میں کبھی کسی ادبی تحریک سے منسلک نہیں رہا مگر مجھے یہ لوگ بڑے پسند ہیں۔مجھے یہ بڑے طلسماتی لگتے ہیں۔امجد اسلام امجد صاحب، عطاالحق قاسمی صاحب، کئی سے میں مل نہیں سکا جیسے ممتاز مفتی، میرزا ادیب، کئی لوگوں سے ملاقاتیں رہیں جیسے اشفاق احمد، بانو آپا۔ مجھے یہ لوگ بڑے لگتے تھے اس لئے کہ یہ لکھ کے، بول کے سوچ بدل دیتے تھے۔

س کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے؟

ج ہر شخص کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے، سیاست میں صد فیصد حصہ لینے کی بات یوں ہے کہ یہ بنیادی انسانی حق ہے کہ اظہارِ رائے کی آزادی ہو اور اس کا احترام بھی کیا جائے۔سیاست ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس میں انفرادی شخص کی اجتماعیت جنم لیتی ہے۔لکھنے پڑھنے والے لوگوں کو تو ضرور حصہ لینا چاہیئے لیکن ہمارا ملک وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی اعتبار سے اس قدر منقسم ہو گیا ہے کہ نا قابل بیان ہے۔اگر کسی لکھنے والے کی اسی فیصد تحریریں ایک ہی سیاسی

قائد کے بارے میں ہیں تو یہ بات غیر مناسب ہے، یہ تو قصیدے والی بات ہو جاتی ہے۔توازن کو برقرار رکھتے ہوئے اگر کوئی مصنف اپنی رائے کسی سیاسی معاملے پر دیتا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔

س آپ کا تعلق کتاب سے بھی ہے اور الیکٹرانک میڈیا سے بھی ہے، کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا چلن عام ہو رہا ہے؟

ج دیکھیں ایسا تو ہو گیا ہے مگر اس کا مطلب قطعاً نہیں کہ کتاب کی اہمیت کم ہوئی ہے۔ کتاب پڑھنے والے آج بھی ہیں اور شائد ماضی کے مقابلے میں زیادہ ہی ہوں گے۔ البتہ اتنے نہیں ہیں جتنے ہونے چاہئیں۔ آپ دیکھیں کتاب میلے ماضی کے مقابلے میں زیادہ ہو رہے ہیں۔ آ کر لوگ کتاب خریدتے ہیں تبھی تو یہ کتاب میلے سجتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اب آڈیو کتب آ گئی ہیں، کتاب سننا پڑھنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لئے لوگ گاڑی چلاتے، واک کرتے، چلتے پھرتے کتاب سن سکتا ہے۔ آج بھی مگر کتاب کی خوشبو اور لمس کی اپنی لذت ہے۔

س تخلیقیت آپ کے نزدیک کیا ہے؟ کسی اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج کچھ نیا سوچنا، کچھ نیا کہنا، کچھ نیا لکھنا، یہی تخلیقیت ہے۔ مکھی پہ مکھی مارتے رہنا تو کوئی کام نہیں۔ بہت سارے لوگ صرف وضاحتوں پہ لگے رہتے ہیں۔ تخلیقیت ختم تو نہیں ہوتی البتہ معیار بعض اوقات گر جاتا ہے۔

س کوئی بے حد آسودہ لمحہ؟ تخلیقی سطح پر بھی اور عام زندگی میں بھی؟

ج میں نے دیکھا ہے کہ وقت ہمیشہ آسودہ ہی ہوتا ہے، اسے آپ نے بس سمجھنا ہوتا ہے۔ جسے مشکل سمجھ رہے ہوتے ہیں اس میں بھی کوئی آسودگی کے سامان پیدا ہو رہے ہوتے ہیں۔ یوں کہہ لیں نئے وقت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہوتی ہے۔ نوک پلک سنواری جا رہی ہوتی ہے۔

س انسان میں اتنی رجائیت اور مثبت فکر کیسے آتی ہے؟

ج توکل ہے، بھروسہ اور زندگی کے معنی، سمجھنے کی بات ہے۔ ویل ڈیورنٹ جو بڑا فلسفی ہے اس کی کتاب ''زندگی کی معنی'' اس بابت بڑی خوبصورت کتاب ہے۔ اس میں خطوط ہیں۔ اس کی کئی لائنیں اور اوراق مجھے بہت پسند ہیں، جن کا نچوڑ یہ ہے کہ زندگی کو معنی دینے پڑتے ہیں۔

س آپ کی شخصیت پر واصف علی واصف کے بڑے گہرے اثرات نظر آتے ہیں، واصف صاحب سے اپنے تعلق خاطر بارے کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟

ج اپنی ذات کی کھوج میں جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں وہ واصف علی

واصف ہیں۔ واصف علی واصف کو میں نے سب سے زیادہ سنا ہے، ان کی آڈیو کیسٹس سے، پچیس سال کے اس سفر میں ان کی بدولت خودشناسی بڑی آسان ہوگئی ہے۔ دراصل کسی اچھے بولنے والے سے، اچھا لکھنے والے سے افراد ہی تیار ہوتے ہیں۔ جو مشن کو آگے لے کر چلتے ہیں۔ میرے لئے واصف صاحب مشعل راہ ہیں کہ وہ ایک انگریزی کے استاد ہیں مگر ان سے کتنے لوگوں کی سوچ بدلتی ہے، کتنے لوگوں کا نظریہ بدلتا ہے، کتنے لوگوں کی زندگی بدلتی ہے۔ لوگوں میں توکل اور عشق رسول بڑھ جاتا ہے۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ اس کے اندرون سے یا گردوپیش کے ماحول سے؟

ج جتنا میں سمجھ پایا ہوں، اندر کو تحریک بھی باہر کے حالات ہی دے رہے ہوتے ہیں۔ آتا اندر سے ہی ہے لیکن حالات واقعات مہمیز دیتے ہیں۔ جیسے کنویں کا ڈول باہر سے آتا ہے مگر پانی اس کے اندر ہی پڑا ہوتا ہے۔ اندر سب کچھ پڑا ہوتا کسی نہ کسی شکل میں، کوئل نے رونا بھی ہے تو سننے والوں کو گیت سنائی دے گا، اس کی آواز ہی ایسی ہے۔

س عہد حاضر میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج بڑا چیلنج ہے۔ اس سے تعمیر معاشرہ کا بہت بڑا کام لیا جا سکتا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم سیاسی مقاصد کے لئے، شدت کو بڑھانے کے لئے، معاشرتی وسماجی تقسیم کو بڑھانے کے لئے اور ایک ہائبرڈ وار کو لڑنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے مثبت کام آٹے میں نمک کے برابر لیا جا رہا ہے۔

س ذاتی تجربات ومشاہدات فنکار کی تخلیق پر کہاں تک اثرانداز ہوتے ہیں؟

ج بہت زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ میں چند دن پہلے آذربائیجان میں تھا تو اس کے عہد حاضر کے سب سے بڑے ادیب سے میری ملاقات ہوئی، انہوں نے اپنی تحریروں کا انگریزی ترجمہ کتابی شکل میں مجھے پیش کیا۔ وہ تمام تخلیقات سوویت روس کے مظالم کے متعلق تھیں یا ان سے متاثرہ تھیں۔

س زندگی میں کیا کھویا؟ کیا پایا؟

ج میرے خیال میں بندہ کھوتا تو کچھ بھی نہیں ہے، پا ہی رہا ہوتا ہے۔ اس کو اس زاویے سے دیکھیں کہ جب ہم آئے تھے تو کیا تھے؟ اور آج سے تقابل کریں تو جواب مثبت ہے۔ تمام

اشارے مثبت ہیں۔اشفاق صاحب کے بقول اپنے پلّے سے تو کوئی بھی کچھ نہیں دے رہا ہوتا، سب اسی کے دیے ہوئے سے دیتے ہیں۔

س قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کے قیام کا خیال کیسے آیا؟اس کے مستقبل کے اہداف کیا ہیں؟

ج یہ 2015 کی بات ہے جب میری ویڈیوز اور لیکچرز وائرل ہو گئے۔میرے دوستوں کا یہ خیال تھا کہ اسی شہرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی خیر کا کام کر جائیں۔یہ دنیاوی شہرت کوئی دائمی چیز تو ہوتی نہیں ہے۔ایک غبارے کی مانند اس نے پھٹ جانا ہوتا ہے۔اللہ نے فضل کیا اور 2017 میں ہم نے بڑے تھوڑے سے وسائل کے ساتھ فاؤنڈیشن بنالی۔وقت کے ساتھ ساتھ لوگ جڑتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔جس عمارت میں ہم موجود ہیں اس کو چھ سال ہو گئے ہیں اور یہ بڑا منظم ادارہ ہے جس سے بہت سارے خیر کے کام ہو رہے ہیں۔

س اس ادارے کے مالیاتی امور کیسے چلائے جاتے ہیں؟

ج ہماری اس فاؤنڈیشن کا ایک بورڈ ہے جو یہ سب مالی معاملات کو فنانس کرتا ہے۔ ہمارا بڑا ہی خوبصورت ماڈل ہے۔لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہ فاؤنڈیشن چندہ نہیں لیتی، ابھی تک ہم نے کبھی کوئی چندہ مہم نہیں چلائی۔یہ بورڈ ممبرز جڑتے گئے اور وہ طلباء کے وظائف، اور دیگر امور اپنے ذمے لیتے گئے۔

س الحمراء کی سربراہی بھی آپ نے کی، وہ تجربہ کیسا رہا؟

ج وہ بڑا مشکل زمانہ تھا، مجھے وزیر اعلیٰ نے یہ منصب سنبھالنے کی درخواست کی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سابقہ چیئرمین اس عمل سے اس قدر دل گرفتہ ہونگے، حالانکہ وہ بڑے بھلے انسان ہیں، رضی احمد صاحب، میں نے حالانکہ انہیں بورڈ ممبر بنایا مگر وہ کام ہونے نہیں دیتے تھے۔ میرے خلاف محاذ کھولے رکھتے، خبریں لگواتے۔وہاں مجھے سیکھنے کا بہت موقع ملا کہ الحمراء جیسا بڑا ادارہ، دو، سوا دو سو ملازمین کے باوجود کیوں کچھ ڈیلور نہیں کر پا رہا۔سات آٹھ ماہ میں نے بھرپور کوشش کی کہ کوئی بہتری کی صورت ہو جائے مگر اس کے بعد وزیر اعلیٰ کو اپنا استعفیٰ دے دیا۔

س مستقبل میں ایسا عہدہ قبول کرنا پسند کریں؟

ج آپ کے ہاتھ سے خیر جاری ہو یہ اصل چیز ہے۔جو آپ سے برا کریں ان سے بھی اچھا کرنے کا مشن میرا مقصد ہے۔عہدے چھوٹی چیز ہیں۔

OOO

قمر رضا شہزاد

س شاعری کا خیال کیسے آیا؟

ج یہ تو شاید میں واضح نہ کر سکوں گا کہ کب مجھے شاعری کا خیال آیا مگر اتنا ضرور ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد ادبی کتابیں دیکھیں۔ میرے والد صاحب ادیب یا شاعر تو نہیں تھے مگر انہیں مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگلش اور اردو لٹریچر کی کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ ان کے پاس تھا جو اب میری لائبریری کا حصہ ہے۔ پڑھنا شروع کیا تو انہی کتابوں سے آغاز ہوا۔ پھر سکول کے زمانے میں میرے ایک استاد شوکت حسین مرحوم جو اگرچہ سائنس پڑھاتے تھے مگر ادبی ذوق کے حامل تھے، انہیں اساتذہ کے سینکڑوں شعر یاد تھے، ہر ہفتے بزمِ ادب کا اجلاس ہوتا تھا جہاں طلباء کے مابین بیت بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ میں ان مقابلوں میں نہایت شوق و ذوق سے شریک ہوتا۔ غالباً یہی وقت تھا جب میں نے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ مقابلے کے دوران جب کسی حرف پر کوئی شعر یاد نہ آتا تو خود ہی شعر گھڑ کر سنا دیا کرتا تھا۔ کالج کے زمانے میں بین الکلیاتی مشاعروں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں طلبا کی اکثریت استاد شعراء سے غزلیں اور نظمیں لکھوا کر مشاعروں میں شریک ہوتی تھی جبکہ میں خود بھی غزل یا نظم کہتا تھا۔ اوّل انعام میرے حصے میں شاید اس لئے بھی آتا کہ اکثر طلباء غزلیں اور نظمیں پڑھتے پڑھتے بے وزن کر دیتے تھے جبکہ میں بالکل درست پڑھتا تھا۔ اگرچہ میں علم عروض کا ماہر نہیں ہوں مگر مجھے ایک کمال ضرور حاصل ہے کہ میرا وجدان شعر کے وزن کے معاملے میں اتنا حساس ہے کہ جب میں شعر نہیں بھی کہتا تھا تو مختلف مقامات پر چھپے ہوئے بے وزن شعر مجھے اذیت میں مبتلا کر دیتے تھے اور میں ان کی اصلاح کر کے انہیں وزن میں کر دیا کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے زمانے تک میرا شاعر بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو ناول نگار یا افسانہ نگار بننا چاہتا تھا۔ مجھے کہانیاں اچھی لگتی تھیں۔ اپنے سکول کے زمانے میں میں نے بچوں کی کہانیاں بھی لکھیں جو بچوں کے رسائل میں شائع بھی ہوئیں مگر بالآخر میرے اندر کے شاعر نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں

شاعری کی طرف آ گیا۔

س ادبی سفر کیسا رہا؟

ج جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ شاعر ہونا میرے ایجنڈے میں کہیں نہیں تھا لیکن جب شعر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو پھر ہمہ وقت شاعری میرے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے آبائی شہر کبیر والہ میں استاد شاعر بیدل حیدری، خادم رزمی، وفا حجازی اور نور اسماعیل جیسے بڑے نام قیام پذیر تھے۔ بیدل حیدری اور وفا حجازی کے مابین معاصرانہ چپقلش اپنے عروج پر تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے خلاف باقاعدہ ہجویہ کلام تحریر کیا جاتا تھا۔ بیدل حیدری کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ تھا جبکہ وفا حجازی شعروں پر اصلاح نہیں دیتے تھے۔ بیدل صاحب نے پاکستان بننے کے بعد انڈیا سے ہجرت کر کے لاہور کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں سے 56ء کی دھائی میں کبیر والہ آئے جبکہ وفا حجازی قیام پاکستان کے فوراً بعد امرتسر سے ہجرت کر کے کبیر والہ آباد ہوئے۔ بظاہر ان دونوں کی معاصرانہ چپقلش سے ادبی ماحول میں ایک کشیدگی تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ کبیر والہ جنوبی پنجاب میں ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ دونوں شاعر ایک دوسرے کے مقابلے میں ایک ہی دن مشاعرے منعقد کرتے تھے اور بیرون شہر سے اپنے اپنے شاعر دوستوں کو بلاتے تھے۔ کبیر والہ کے ادب ذوق افراد کو ہر دو شاعر اپنی طرف کھینچتے تھے اور یوں یہاں کے عام شہریوں میں بھی ادب کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ دوسرے شہروں سے بیدل حیدری کے تلامذہ کی آمد بھی یہاں کے ادبی ماحول میں گہما گہمی پیدا رکھتی تھی۔ اس گہما گہمی کے نتیجے میں تخلیق شعر کے لئے ایک مسابقت کی فضا قائم ہوئی۔ بیدل حیدری کے باقاعدہ شاگردوں میں ارشاد جالندھری، اختر شمار، شکیل سروش، ناصر بشیر اور مظہر بخاری وہ اہم نام ہیں جو آج بھی ادبی میدان میں سرگرم عمل ہیں جبکہ ایسے بھی بہت سے شاعر ادبی منظر پر موجود ہیں جو بیدل حیدری کے باقاعدہ شاگرد تو نہیں تھے مگر جنہوں نے بیدل حیدری کی تنگ دستی سے فائدہ اٹھایا اور شاعری میں نام کمایا، ان پردہ نشینوں کا تذکرہ پھر کسی اور وقت کے لئے چھوڑتا ہوں۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو محکمہ شماریات میں ایک ملازمت مل گئی جس کی بدولت تقریباً 2 سال لیہ قیام پذیر رہا۔ لیہ اگرچہ ادبی مراکز سے دور دراز جنوبی پنجاب کا ایک نسبتاً پسماندہ ضلع تھا لیکن یہاں کے ادبی ماحول میں ڈاکٹر خیال امروہوی، نسیم لیہ غافل کرنالی اور شہباز نقوی جیسے اہم شاعر تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ نسیم لیہ ایک مجلسی آدمی تھے۔ وہ لیہ کی میونسپل

لائبریری میں لائبریرین تھے۔ ان کی لائبریری تو خیر ادبی محافل کا مرکز تھی ہی مگر ہر شام وہ صابر ہوٹل پر بھی ادبی محفل جماتے۔ تمام احباب جمع ہونا شروع ہو جاتے اور رات گئے تک یہ نشست جاری رہتی۔ وقتاً فوقتاً اردو اور سرائیکی مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا جس میں گرد و نواح کے شاعر بھی شریک ہوتے تھے۔ اس حوالے سے یہ خطہ کافی فعال تھا۔ میرے لئے یہ ماحول بہت سازگار تھا۔ یہاں میں نے سرائیکی زبان میں بھی شاعری شروع کی۔ یہاں سے ساہیوال ٹرانسفر ہوا تو ایک مختلف ادبی ماحول میرے سامنے تھا۔ یہ مالی طور پر آسودہ ادیبوں اور شاعروں کا شہر تھا۔ ان دنوں جعفر شیرازی، گوہر ہوشیارپوری، حاجی بشیر احمد بشیر، اکرم خان قمر اور محمود علی محمود جیسے تخلیق کار یہاں موجود تھے۔ سٹیڈیم ہوٹل اور اکرم کلیم کے ہوٹل سیر دان میں ادباء اور شعراء جمع ہوتے تھے۔ جعفر شیرازی مرحوم کے پاکستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں سے رابطے تھے۔ وہ یہاں کی مقامی انتظامیہ سے مل کر کل پاکستان مشاعروں کا انعقاد بھی کرتے۔ ایسے ہی کسی مشاعرے میں پہلی مرتبہ ظفر اقبال نے میری غزلیں سنیں تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا اور بعد ازاں میری شاعری پر نئے شاعر کے ظہور کے عنوان سے ایک تفصیلی کالم تحریر کیا اور یہ کسی بڑے شاعر کی طرف سے شاید میری شاعری کا پہلا باقاعدہ اعتراف تھا۔

ساہیوال آیا تو پھر لاہور جیسے بڑے ادبی مرکز سے میرا رابطہ ہو گیا۔ وہاں علی اکبر عباس نے میری شاعری سنی تو پی ٹی وی کے بڑے مشاعروں میں شرکت کا موقع مل گیا۔ لاہور میں ان دنوں جن ہم عمر شاعروں سے میری دوستی ہوئی اور حلقہ قائم ہوا، ان میں ڈاکٹر جاوید انور، عباس تابش، علی اصغر عباس، اعجاز نقوی، زاہد مسعود، افضال نوید، ضیاء الحسن جیسے احباب تھے۔ فنون کا دفتر ٹھکانہ ہوا۔ وہاں مجھے احمد ندیم قاسمی کی شفقتیں اور محبتیں حاصل ہوئیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آج میں جو کچھ ہوں وہ جناب احمد ندیم قاسمی کے سبب ہوں۔ انہوں نے مجھے مسلسل فنون میں شائع کیا جس کی بدولت مجھے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔

س ادبی سفر میں مشکلات؟

ج دیکھیں جی کسی بھی نئے شاعر کو اپنے ادبی سفر کے آغاز میں سب سے بڑی مشکل جو پیش آتی ہے وہ بطور شاعر اپنی حیثیت کو منوانا۔ کیونکہ اگر وہ اچھا شاعر ہے تو اس پر پہلا الزام ہی یہ عائد کیا جاتا ہے کہ یہ شاعر نہیں ہے بلکہ کسی استاد شاعر سے غزلیں لکھواتا ہے۔ یقیناً مجھے بھی یہ مشکل پیش آئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنی شاعری کے اوائل عرصہ میں اردو اکیڈمی ملتان کے تنقیدی

اجلاس میں اپنی چند غزلیں پیش کیں۔ غزلیں تو پسند کی گئیں مگر چند احباب کی طرف سے یہ آوازیں بھی سننے کو ملیں کہ یہ غزلیں کسی سے لکھوائی گئی ہیں۔ اسی طرح بہاولپور کے مشاعرے میں غزل سنائی تو بہت داد ملی۔ مشاعرے کے بعد کھانے پر ایک بزرگ نے فرمایا کہ آپ نے جو غزل سنائی تھی وہ بہت عمدہ تھی لیکن وہ غزل آپ کی نہیں ہے۔ جس پر میں نے کہا کہ آپ کے یہ الفاظ بھی میری تعریف ہیں کیونکہ میں تو جانتا ہوں یہ غزل میری ہے۔ بعد ازاں کی مشکلات شاید اتنی اہم نہیں ہیں۔ یعنی مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ نام مقام کا جھگڑا، میڈیا پر پذیرائی نہ ہونا، یہ وہ تمام معاملات ہیں جو اس وقت مشکل بنتے ہیں جب آپ کی ترجیحات میں یہ سب کچھ شامل ہو۔ اگر آپ کی ترجیح شاعری ہے تو پھر شاید یہ کچھ بھی نہیں اور خدا کے فضل و کرم سے میرا مسئلہ صرف شاعری ہے۔ یعنی یہی خواہش کہ شاعری ہوتی رہے البتہ اس ضمن میں ایک مشکل ایسی بھی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ آپ جن دوستوں کے ساتھ تخلیقی سفر کا آغاز کرتے ہیں اگر وہ کسی وجہ سے ادبی میدان میں آگے بڑھنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو بعض اوقات ان کی فرسٹریشن، حسد اور رد عمل آپ کے لئے مسائل پیدا کرتا ہے۔ خدا ہر اچھے تخلیق کار کو اس صورت حال سے بچائے کہ وہ اپنے ہی دوستوں کا نشانہ بنے۔

س آپ ادبی مراکز سے دور رہ کر مرکزی دھارے میں کیسے شامل ہوئے؟

ج اگر میں ادبی مراکز سے دور رہ کر ادب کے مرکزی دھارے میں ہوں تو شاید اس کی بنیادی وجہ تو میری شاعری ہی ہو سکتی ہے جو ادبی مراکز تک پہنچی تو اس نے وہاں رہنے والے سینئر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے مسلسل مجھے فنون میں شائع کیا۔ اسی طرح انڈیا میں شمس الرحمن فاروقی نے شب خون میں میری شاعری کو جگہ دی اور آج آصف فرخی صاحب دنیا زاد میں میرا کلام بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ یہ وہ ادبی جرائد ہیں جہاں شائع ہونے کے لئے ایک خاص شعری معیار درکار ہے۔ اسی طرح امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی نے قدم قدم پر میری پذیرائی کی۔ شاکر حسین شاکر اور طاہر نسیم میرے دو ایسے ادبی دوست ہیں جن کے احسانات کا بدلہ میں کبھی چکا نہیں سکتا۔ انہوں نے ہر مقام پر عملاً میرے لئے ایسے حالات پیدا کئے جہاں بطور شاعر مجھے آسانیاں میسر آسکیں۔ عامر بن علی اور نوید حیدر ہاشمی مجھے اپنے بڑے بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جہاں میرے فن کو پذیرائی مل سکے۔ شعیب صادق کا پیار میرا اثاثہ ہے۔ اسی طرح رضی الدین رضی، نوازش علی

ندیم، ذاکر حسین ضیائی، افضل گوہر، اختر رضا سلیمی، شکیل جاذب، ناصر علی، شاہد ذکی، کاشف مجید، احمد کامران، افضل خان، حسنین اصغر تبسم، منیر راہی، علی معین، احمد عطا اللہ، خالد مسعود اور بہت سے دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے جن کی محبتوں کے طفیل میں آج اس مقام پر ہوں۔

س: ادب کے فروغ میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے کیا کردار ادا کیا؟

ج: مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ادب ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی ترجیحات میں کبھی نہیں رہا، کسی زمانے میں اخبارات کے ادبی ایڈیشن کسی نہ کسی حد تک ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے تھے مگر اب اکثر اخبارات نے ادبی صفحات ہی شائع کرنا بند کر دیئے ہیں یا پھر ادب کے لئے جگہ کم کر دی ہے اور اگر الیکٹرانک میڈیا کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی پی ٹی وی قومی دنوں یا مذہبی تہواروں کے موقع پر مشاعروں کا انتظام و انصرام کر دیتا ہے اور وہ بھی شعراء کی ایک مخصوص فہرست سے باہر نہیں جاتا البتہ انٹرنیٹ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس نے فی الوقت دنیا بھر میں بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی تشنگی کو کسی حد تک کم کر دیا ہے۔ فیس بک ایک ایسا ذریعہ ہے جہاں دنیا بھر کی ادبی خبریں، ادیبوں اور شاعروں کی مصروفیات، تازہ ترین تخلیقات اور ان پر ردِ عمل فوری طور پر سامنے آجاتا ہے لیکن اس میں بھی ایک قباحت ہے کہ رطب و یابس کی بہتات ہے۔ اچھے کلام کی تلاش میں کافی سر کھپانا پڑتا ہے۔

س: مشاعروں کا ادب کے فروغ میں کیا کردار ہے؟

ج: مشاعرے کبھی ہماری تہذیبی روایت کا حصہ تھے اور شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہونے والے سامعین اور کلام سنانے والے شاعر دونوں اس کے آداب سے واقف تھے۔ اچھے اشعار پر کھل کر داد دی جاتی اور کمزور اشعار پر خاموش رہا جاتا تھا مگر اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ اکثر مشاعرے ادبی سے زیادہ معاشی Activity میں تبدیل ہو گئے۔ تقاضوں کے حصول کے لئے جس انداز میں منتظمین کی منتیں کی جاتی ہیں وہ انتہائی شرم ناک ہے۔ مشاعروں میں شریک ہونے کے لئے ہر طرح کا حربہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جب سے غیر ملکی مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، صورت حال اور بھی افسوس ناک ہو گئی ہے۔ بہت سے ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جہاں میزبانوں نے بڑی مشکل سے مہمانوں کو اپنے گھر سے نکالا اور آئندہ کے لئے مشاعروں سے توبہ کی۔ بیرونِ ملک بہت سے باکمال شعراء بھی مقیم ہیں اور وہ وہاں عمدہ تقریبات کا اہتمام بھی کرتے ہیں مگر انہیں بھی پروفیشنل شاعروں نے تاراج کیا ہوا

ہے۔جن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر مشاعرے میں شرکت کریں، خدا ہم پر رحم فرمائے۔

س ہمارے ادبی ادارے ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ج جہاں تک ہمارے ادبی اداروں کا تعلق ہے، اکادمی ادبیات پاکستان مقتدرہ قومی زبان مجلس ترقی ادب اور نیشنل بک فاؤنڈیشن ادب کے فروغ کے لئے اپنے وسائل میں کوشاں ہیں۔ ویسے بھی اس وقت ان اداروں کے بیشتر سربراہان کا تعلق ادب سے ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہمارا ادیب اور شاعر بھی بد دیانت ہو جائے تو ادارے کیا کر سکتے ہیں۔ ادیبوں کے معاملات میں میرٹ قائم رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو ان پر اس قدر دباؤ ڈال دیا جاتا ہے کہ ناانصافی خود بخود ہو جاتی ہے مثلاً اگر اکادمی ادبیات وقتاً فوقتاً ادیبوں اور شاعروں کو بیرون و اندرون ملک دوروں کے مواقع فراہم کرے تو اثر ورسوخ رکھنے والے شاعر اور ادیب کسی کو آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ اس طرح کتابوں کی اشاعت اور کانفرنسوں میں شمولیت کا معاملہ ہو تب بھی یہ لوگ کسی نہ کسی انداز میں صاحبان اختیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

س آپ نے نظم بہت کم کہی ہے، کیا آپ نظم کے خلاف ہیں؟

ج جی نہیں، میں بالکل نظم کے خلاف نہیں ہوں۔ اصل میں یہ آپ کے مزاج پر منحصر ہے۔ آپ کہاں سہولت محسوس کرتے ہیں۔ میرے لئے شاید غزل زیادہ آسان ہے سو میں غزل کہتا ہوں۔ میں نے نظمیں بھی کہی ہیں جو خالصتاً میری ذاتی وارداتوں کی کہانیاں ہیں۔ ممکن ہے کسی وقت میں ان میں دوسرے لوگوں کو شریک بھی کرنا چاہوں تو پھر ان کا بھی ایک مجموعہ شائع کر دوں گا۔

OOO

گل نوخیز اختر

س آپ شاعری کرتے ہیں، صحافت کے شعبے سے ایک طویل عرصے سے منسلک ہیں اور پاکستان کے مقبول ترین و مصروف ترین مزاح نگاروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے، ذاتی طور پر کون سا ذریعہ اظہار پسند ہے؟

ج مجھے کالم نگاری زیادہ پسند ہے کیونکہ یہاں میں اپنی بات آسان سے کہہ سکتا ہوں، شاعری دو لائنوں میں پورا اظہار مانگتی ہے، صحافتی بیان بالکل روکھا ہوتا ہے جبکہ میری رائے میں ہلکا پھلکا انداز آپ کی بات کو زیادہ مؤثر طریقے سے آگے پہنچا سکتا ہے۔

س تحریر کو ذریعہ اظہار بنانے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج جب پڑھنا آ گیا تو لکھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ بچوں کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر خود بھی امنگ اٹھی کہ میں بھی ایسا ہی کچھ لکھوں جسے دوسرے پڑھیں۔ 1986ء میں امروز ''بچوں کی دنیا'' میں پہلی تحریر شائع ہوئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ ہتھیار اٹھائے بغیر بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ میں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی لہٰذا قلم کی بیساکھی نے مجھے آگے چلانے میں بڑا سہارا دیا۔

س بچپن کہاں اور کیسا گزرا؟

ج پیدائش ملتان میں ہوئی اور بچپن بھی ملتان ہی میں گزرا۔ ملتان میرے دل میں بستا ہے، یہاں میں نے بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھا۔ اس دور میں بچوں کے صفحات میں کہانیاں لکھنے والے رائٹرز کی اکثریت آج منجھے ہوئے لکھاریوں میں تبدیل ہو چکی ہے اور یہ سارے میرے وہی دوست ہیں جن کے ساتھ ہم کہانیوں کے مقابلے کیا کرتے تھے۔

س اہل قلم کو بنانے میں گرد و پیش کے ماحول کا کہاں تک اثر ہوتا ہے؟ آپ کا ابتدائی ادبی و صحافتی سفر کیسا رہا؟

ج میرا نہیں خیال کہ ماحول کوئی اثر کرتا ہے، مثلاً میرے گھر کا ماحول پڑھا لکھا تھا لیکن اس

کے باوجود لٹریچر کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے بچپن میں اس بات پر مار پڑتی تھی کہ میں ناول کیوں پڑھ رہا ہوں یا پاکٹ منی سے کہانیوں کی کوئی کتاب کیوں خریدی ہے لیکن ہاں......
اگر آپ کے اندر جنون ہے تو آپ اپنا ماحول خود پیدا کر لیتے ہیں، سو میں نے بھی اپنے ہم مزاج لوگوں کو ڈھونڈ لیا جو لکھنے پڑھنے سے عشق کرتے تھے۔ ابتدائی طور پر میں نے صحافتی سفر کا آغاز ملتان کے لوکل روزنامہ ''سنگ میل'' سے کیا۔ اس دوران اردو اکیڈمی کے اجلاسوں میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا، پھر ''کہکشاں'' کے نام سے اپنا میگزین نکالا جس میں پہلی بار ''ادبی اخبار'' کا آئیڈیا پیش کیا۔ اس کا ایک صفحہ ایسا تھا جہاں ادبی خبریں اخباری انداز میں شائع کی جاتی تھیں۔ یہی انداز آگے چل کر ''احساسِ نو'' اور ''مکمل'' ادبی اخبار کی شکل میں لاہور میں سامنے آیا۔

میں مزاح نگار نہ ہوتا تو یقیناً کوئی قاتل ہوتا۔ بچپن کی محرومیوں کا احساس انسان کو مار دیتا ہے۔ مجھے کہانیاں اچھی لگتی تھیں، شاعری پسند تھی اور میوزک سے عشق تھا......لیکن ہمارے گھر میں یہ تینوں چیزیں ''غیر قانونی'' سمجھی جاتی تھیں۔ میرے اندر شروع سے ہی شرارتی پن تھا جس کا اظہار زمانہ طالب علمی میں ہر روز ہوتا تھا۔ یہی شرارتی پن میری محرومیوں پر حاوی ہوتا رہا اور پھر مزاح نگار نے میرے اندر کی آگ کو رفتہ رفتہ ٹھنڈا کر دیا۔ اب میں خود بھی خوش رہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میری تحریر سے دوسرے بھی خوش رہیں۔

س: اب تک آپ کی کون کون سی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں؟

ج: NO خیزیاں، آنکھیں غزل ہیں آپ کی، ڈونٹ وری، شرارتی، رائٹرز ڈائریکٹری، ٹائیں ٹائیں فش، چھار جی اور طلسمہ۔

س: آپ نے اردو زبان میں پہلا مکمل مزاحیہ ناول تحریر کیا، کیسا تجربہ رہا؟

ج: یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا، مجھے اکثر دوست کہتے تھے کہ تمہارا کالم پڑھ کر ہم ہنستے ہیں لیکن یہ ہنسی تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ کالم ختم ہو جاتا ہے۔ تب میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ ایک باقاعدہ مزاحیہ ناول تحریر کیا جائے لیکن اس کے لئے ڈھیر سارا وقت درکار تھا۔ ایسے میں ایک دوست حسن علی نے تجویز پیش کی کہ آپ ہماری ویب سائٹ ''اردوستان'' پر یہ ناول قسطوں میں سٹارٹ کریں۔ یہ آئیڈیا مجھے اچھا لگا اور یوں تین سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے یہ ناول مکمل ہو گیا لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے اتنی پذیرائی ملے گی۔ آج بھی یہ ناول میری ویب سائٹ www.nokhaiz.com پر کتابوں کے

سیکشن میں آن لائن موجود ہے اور احباب اسے انتہائی محبت سے پڑھتے ہیں اور اپنی مسکراہٹوں سے نوازتے ہیں۔

س لوگ کہتے ہیں کہ ناکام عشق آدمی کو شاعر بنا ڈالتا ہے، آپ کیا سمجھتے ہیں؟ آپ کی شاعری کی وجہ بھی تو کوئی ناکام رومانی واردات نہیں؟

ج رومانی وارداتیں تو میری زندگی میں بھری پڑی ہیں لیکن کسی عشق نے مجھے شاعر نہیں بنایا کہ شاعری کے بعد مجھے عشق کا حوصلہ پیدا ہوا۔ میں سمجھتا ہوں ناکام عشق کے بعد انسان شاعر نہیں بندے کا پتر بن جاتا ہے، ناکام عشق کے بعد کی شاعری بھی اکثر ناکام ہی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی محبوب کی یاد میں تڑپنا اور سسکنا شاعر کا پسندیدہ موضوع ہے۔

س آپ کی ادبی وصحافتی زندگی ہمارے سامنے ہے، ایک کمٹمنٹ کے ساتھ آپ اس میدان میں آئے اور اپنے شوق کو کامیاب طریقے سے وسیلہ روزگار بنانے میں کامیاب رہے۔ اس شعبے میں نو واردان کے لئے کوئی مشورہ یا پیغام دیں گے؟

ج لکھنے لکھانے کو وسیلہ روزگار بنانا بہت مشکل اور کٹھن فیصلہ تھا، خصوصاً اس دور میں جب شاعروں، ادیبوں کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے گھروں کے چولہے عموماً ٹھنڈے ہی رہتے ہیں لیکن میرے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ تین چار ملازمتیں کرنے کے بعد احساس ہو گیا تھا کہ عنقریب تخلیقی طور پر اپاہج ہو جاؤں گا لہٰذا سب کچھ چھوڑ کر لکھنے لکھانے کا کام شروع کر دیا۔ ابتدائی طور پر یہ دن بہت کڑے تھے لیکن اب یہ حالت ہے کہ فل ٹائم صرف یہی کام کرتا ہوں۔ نئے آنے والوں سے یہی گزارش کروں گا کہ لکھنے سے زیادہ پڑھنے کو ترجیح دیں، اچھی چیزیں پڑھنے سے اچھی چیز لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں مطالعے کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے لوگ پڑھتے کم اور لکھتے زیادہ جا رہے ہیں۔

س کہا جاتا ہے کہ ہم مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں، کیا آپ بھی مشتاق یوسفی کو عہد حاضر کا سب سے بڑا مزاح نگار سمجھتے ہیں؟ مزاح نگاری میں کن لوگوں نے متاثر کیا؟

ج اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مزاح کے عہد یوسفی میں زندہ ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہم ''سلسلہ قاسمیہ'' کے پیروکار ہیں، میں مزاح میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو اپنا پیرومرشد مانتا ہوں۔ قاسمی صاحب کی محبت کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رہتے ہیں اور خصوصاً مزاح نگاری کے حوالے سے تو یوسفی صاحب کے بعد قاسمی صاحب سے بڑا کوئی نام نہیں۔ ان کے بعد

کے ناموں میں یونس بٹ صاحب نہایت اہم ہیں۔ اشفاق احمد ورک انتہائی چلبلہ فقرہ چست کرتے ہیں، وقار احمد صاحب کا اپنا ایک منفرد انداز ہے، یاسر پیرزادہ بڑا شاندار لکھتے ہیں، حسین احمد شیرازی صاحب بڑا شستہ مزاح لکھتے ہیں۔ نئے مزاح نگاروں میں ناصر ملک صاحب انتہائی زندہ جملہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ علی رضا، حافظ مظفر حسن اور شوکت علی مظفر صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ابرار ندیم صاحب اگرچہ مزاح کم لکھتے ہیں لیکن جس دن وہ اس میدان میں سنجیدہ ہوئے، بہت شہرت پائیں گے۔

س کیا آج کا ادیب اپنی سماجی و معاشی ذمہ داری نبھا رہا ہے؟

ج ادیب بیچارے نے کیا سماجی اور معاشی ذمہ داری نبھانی ہے، 99 فیصد ادیب اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر ادبی نوکری کے محتاج ہیں، سماجی طور پر وہ اپنی تحریروں سے بہت کچھ بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن معاشی طور پر ان کی بدحالی آج بھی قائم ہے۔ پرائیویٹ چینلز آنے سے میرے جیسے کم تر ادیبوں کو کچھ معاشی استحکام ضرور ملا ہے لیکن جینوئن ادیب آج بھی روٹی روزی کے لئے پریشان ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ ہمارے ہاں بیشتر ادیب کمرشل ازم کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ کمرشل رائٹنگ کو گناہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک شاعر اور ادیب جنرل سٹور کا مالک ہے تو وہ وہاں آنے والے گاہک کو شاعری یا افسانہ سنا کر ٹوتھ پیسٹ نہیں بیچتا...... کمرشل ازم بھی جنرل سٹور ہے، اسے جنرل سٹور کی طرح ہی ٹریٹ کرنا پڑتا ہے۔

س ادب میں ترقی پسند تحریک یا کسی بھی تحریک کو کیسے دیکھتے ہیں؟ اہل قلم کو سیاسی ہونا چاہئے؟

ج یہ تحریکیں بہت پرانی ہو چکیں، اب کوئی شاعر ادیب نہ چاہنے کے باوجود بھی ترقی پسندی سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ ہر دور اپنے زمانے کی بات مانگتا ہے۔ روایت سے پہلے بھی کوئی روایت دم توڑ چکی ہوتی ہے لہٰذا روایت ہمی نے بنائی ہوتی ہے۔ جہاں تک اہل قلم کے سیاسی ہونے کی بات ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایک لحاظ سے یہ بہت ضروری بھی ہو جاتا ہے کیونکہ سیاست زمانہ حال سے تعلق رکھتی ہے اور زمانہ حال سے کٹ کر کوئی تخلیق اپنا مقام نہیں بنا سکتی۔

س موسیقی آپ کو بہت پسند ہے، کیسی موسیقی پسند ہے؟ کون سے گلوکار زیادہ پسند ہیں؟

ج مجھے موسیقی سے عشق ہے، ہر قسم کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہوں، نصیبو لعل، شکیرا، مہدی حسن، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، محمد جمن، طفیل نیازی، ابرار الحق، عاطف اسلم، یو یو ہنی سنگھ، شریا گوشال، لتا، نور جہاں، رفیع صاحب، مکیش، کشور...... سبھی کی آواز کا لطف لیتا ہوں۔

لبنیٰ صفدر

س ادب کی فی زمانہ کیا اہمیت ہے؟

ج جس طرح ماضی کے ادب سے ہمیں پچھلی دنیا کے نہ صرف حالات وواقعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ اس وقت کے جغرافیائی، معاشی، معاشرتی و سیاسی اُتار چڑھاؤ بھی ہم پر آشکار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں ادب کسی بھی معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ماضی میں جھانکنے والا ایک روزن ہے۔ مہذب قومیں اپنے ماضی سے پیوست رہتی ہیں اور ان کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔ زبان و بیان کی لطافتوں سے لے کر جذبات واحساسات کی واردات ہمیں بہترین ادب نے ہی مہیا کیے ہیں۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ میں بہت سی چیزوں میں تغیر وتبدل رونما ہوتا رہتا ہے لیکن ادب کی اہمیت و کردار کبھی نہیں بدلتے۔ آج کا حال کل کا ماضی ہوگا۔ ادب کی جو قدر و قیمت ہم نے یا ہمارے آباؤ اجداد نے محسوس کی اور اُس سے استفادہ حاصل کیا آنے والی نسلیں بھی کریں گی۔ اگر ہم مسلمانوں کی ہی بات کر لیں تو مسلمانوں کی یہ ادبی روایت اور اُس میں ادب کا کردار پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک جاری ہے۔ وہ ایک ادیب ہی تھا جس نے اعلان کیا کہ کافروں کے ''الزام کے مطابق اگر حسین کافر ہیں تو ہم بھی کافر ہیں'' یہی ثابت قدمی اور وفا شعاری رموزِ عشق سے آگاہ کرتی ہے۔ ادب کی اہمیت آج، کل اور ہمیشہ رہے گی۔

س کیا غزل اپنے ممکنہ امکانات تلاش کر چکی ہے؟

ج جہاں پہ تلاش کا سفر تمام ہو جائے وہاں سے نئی راہیں نکالنے کی جستجو مر جاتی ہے۔ میرؔ و غالبؔ نے اردو غزل کو نیا رنگ ڈھنگ دیا۔ غزل میں متنوع موضوعات پیش کیے اور غزل عوام و خواص میں مقبول تر ہو گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے شعراء نے غزل میں نت نئے تجربات کیے۔ حسرت موہانی سے لے کر احمد فراز اور آج تک غزل میں تجربات جاری ہیں۔ امکانات تو ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ جدیدیت نے غزل کو نئی کروٹ بٹھایا۔ غزل کے ساتھ پیش آنے والے تعصّبات غزل کو نقصان نہیں پہنچا سکے۔ مختلف الموضوع ہونے کی وجہ سے اسے ''نیم وحشی'' صنف

سخن قرار دیا گیا لیکن ہر دور میں ایک بڑا غزل گو شاعر پیدا ہوتا رہا جو اس کی بقا کا باعث بنتا رہا۔ ہر غزل کے پس منظر میں مسلسل سوچ اور ذہن و شعور کی کئی سطحیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ہمہ گیر ادراک اور ذاتی تجربات غزل کے موضوعات کو وسیع کرتے رہتے ہیں۔ مختصراً یہی کہوں گی امکانات کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے اور اسی میں صنفِ سخن کی زندگی اور بقا کا راز پوشیدہ ہے۔

س آپ کے تھیسز کا عنوان ''پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں'' ہے۔ اس سے متعلق قارئین کو کچھ بتائیں۔

ج ہم جدید شعرا اور غزل کو موضوعِ بحث تو بناتے رہتے ہیں لیکن جدید شعرا اور ان کے کلام کو ابھی تک کسی نے یکجا نہیں کیا تھا۔ اگر چہ چند ایک کتب مل جاتی ہیں جن میں کچھ شعرا کا کلام اکٹھا کیا گیا ہے لیکن میرے ریسرچ ورک میں دورِ جدید کے تمام اچھا لکھنے والے شامل ہیں خواہ ان کا تعلق دور دراز کے مضافات سے تھا۔ اس کے علاوہ چاروں صوبوں سے یکساں شعرا کو بغیر کسی تخصیص کے شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ نئے لکھنے والوں نے موضوعات اور نت نئے اسلوب اور زبان و بیان کے جو تجربات کیے ان میں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات نے موضوعات کو بھی بدلا ہے اور نئے قوافی و ردیف سے بھی آشنائی فراہم کی ہے۔ ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے جو کہ اس کی موجودہ رہائش اور کام کے متعلق ہے۔ یہ لسٹ سینکڑوں میں ہے جن کا تعارف نہیں دیا جا سکا۔ ان کے اشعار بطور تعارف دیے گئے ہیں۔ کیونکہ لسٹ اتنی طویل ہو گئی تھی کہ سب کے بارے میں تفصیل سے لکھنا دشوار تھا۔ ادب کے قاری کے لیے اس ریسرچ ورک میں نہ صرف جدید شعرا کا مکمل تعارف بآسانی دستیاب ہے۔ بلکہ ۷۰ کی دہائی کے بعد لکھنے والے تمام اہم ناموں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ایک تو غزل کے فی زمانہ بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کو پہچانا جا سکتا ہے۔ بلکہ غزل کو جدیدیت کے ساتھ اکیسویں صدی تک لانے والے تمام شعراء کے کلام سے استفادہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

س تراجم کی کیا اہمیت ہے۔ ماضی میں غیر ملکی ادب جس مقدار میں اردو میں ترجمہ ہوا اب ویسی صورت حال نظر نہیں آتی۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج تراجم کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا اور اُس کی وجہ اُردو ادب میں کتب کا بہت کم ذخیرہ ہونا تھا۔ اُردو کتب نایاب تھیں۔ لہٰذا دوسری زبانوں سے بے شمار کتب کو اُردو میں ترجمہ کیا گیا جس سے اردو دان طبقہ کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ کتب آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً

دیگر زبانوں سے تراجم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح دوسرے ممالک میں تخلیق کے گئے ادب اور ادبی رجحان سے قاری کو آشنائی ہوئی۔ اس طرح آپ اپنے اور دوسری زبانوں میں ادبی توازن کا موازنہ بھی کر سکتے ہیں۔ نت نئے امکانات اور موضوعات کو جانتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور دلچسپی بھی۔ ماضی قریب میں ترجمہ کو دوئم درجہ کا کام مانا جاتا تھا اور اسے تخلیقی و ادبی کام ماننے سے بھی گریز کیا جاتا تھا لیکن اب خیالات بدل چکے ہیں۔ لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس طرح دوسری تہذیبوں، روایات اور ثقافت سے متعارف ہوا جا سکتا ہے۔ پھر ایک انسانی گروہ کے تجربات دوسرے انسانی گروہ تک پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ صرفی ونحوی ساخت سے آگاہی ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کو ایک باقاعدہ زبان کے مقام پر فائز کرنے میں تراجم کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ اگر سقراط، افلاطون اور دیگر کی قیمتی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ نہ ہوتا تو یہ قیمتی سرمایہ روم و یونان کے پرانے کھنڈرات میں دب کر کبھی کا فنا ہو چکا ہوتا۔ آج بھی نہ صرف ادبی کتب کے تراجم ہو رہے ہیں بلکہ کاروباری حضرات بھی اپنی مطلوبہ کتب کے تراجم کرواتے ہیں۔

مقتدرہ جامعہ کراچی اور جامعہ پنجاب کا وسیع کام لائبریریوں میں موجود ہے۔ ترجمہ شدہ کتب کو پڑھانے کے لیے ایک مخصوص فضا کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

س کیا ادیب کو روایت شکن ہونا چاہیے یا روایت پرست؟

ج روایت شکنی کا آغاز تحریک علی گڑھ سے ہو چکا تھا۔ 1917ء کے انقلاب نے ہندوستان پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے اور ڈاکٹر صوتی گھوش، ملک راج آنند، ڈاکٹر محی الدین تاثیر اور سید سجاد ظہیر اس تحریک کا حصہ بنے۔ ہٹلر نے جب ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو قید کیا تو اس کے اثرات فاشزم کی صورت میں پوری دنیا کے ادب پر بھی اثر انداز ہوئے۔ ہندوستانی ادباء نے بھی محسوس کیا کہ پچھلی دو صدیوں میں جو ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے وہ ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔

اب ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنانے کا دور تھا۔ ترقی پسند تحریک نے روایات اور قدامت کے بت کو پاش پاش کیا۔ ادب خود کو معاشرے سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا ایک ادیب کو وقت کے ساتھ خود کو بدلتے رہنا چاہیے۔ ادیب بننے کے لیے کسی حد تک روایت پرست ہونا چاہیے لیکن بڑا ادیب بننے اور خالص اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے روایت شکن ہونا بھی ضروری ہے۔ روایت پرستی ٹھہرے ہوئے تالاب کی مانند ہے جس پر کائی جم جاتی ہے۔ جبکہ روایت شکنی بہتے ہوئے پانیوں جیسی ہے۔ اسی طرح ادب اور خاص طور پر شاعری پر جو جمود طاری ہے قدیم

موضوعات کو آج بھی من وعن پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں بھی جدت لانے کی مزید ضرورت ہے۔ نہ صرف شاعری کے موضوعات بلکہ ہیئت کے نئے تجربات بھی ہونے چاہئیں۔

س تنقید کسی بھی تخلیق اور تخلیق کار کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟

ج تنقید کا مقصد کسی بھی ادبی پارے کی صحیح اور مکمل تفہیم ہے۔ اگر فن پارہ اعلیٰ اور معیاری ہے تو اُس کی تحسین ہونی چاہیے اور اگر اس میں کچھ سقم باقی ہے تو ان کی نشاندہی کر کے تحریر کو مزید بہتر بنانے کی تجاویز دی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ تنقید برائے اصلاح ہو نہ کہ تنقید برائے تنقید۔

قدیم وجدید دونوں تنقید کا دیس منصب بھی رہا ہے اور مقصد بھی۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر وشاعری سے جدید تنقید کا آغاز کر دیا تھا۔ شاعری کی طرح تنقید میں بھی نت نئے امکانات کی گنجائش ہمیشہ باقی رہی ہے۔ تنقید کا مطلب بھی ''کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا'' ہے۔ تنقید اور تخلیق دراصل ایک دوسرے کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ارسطو کی ''بوطیقا'' صدیوں تک تخلیق فن کے لیے مشعلِ راہ بنی رہی۔ تنقید کا مقصد صرف تخلیقات کا محاکمہ کرنا نہیں بلکہ تخلیق کے اصول دریافت کرنا بھی ہے۔ انصاف پر مبنی تنقید فن کو سنوارتی ہے اور فنکار کی رہنمائی اور اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ تنقید کا مقصد حوصلہ شکنی ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ حوصلہ افزائی اور رہنمائی ہے۔ لہٰذا بامقصد اور مبنی برانصاف تنقید تخلیق اور تخلیق کار دونوں کے لیے سودمند ہے۔

س اردو غزل میں اتنی مایوسی اور اُداسی کیوں ہے؟

ج عاشق اور معشوق روزِ اوّل سے اردو غزل کے دو اہم کردار رہے ہیں جہاں عشق کی کیفیات ہوں وہاں ہجر و فراق کے قصے بھی ہوتے ہیں۔ ہماری زیادہ تر شاعری چونکہ عشق و محبت کے قصوں پر مشتمل ہے تو غم والم کے واقعات واحساسات بھی اس کا حصہ بنے اور آج تک بنے ہوئے ہیں۔ غالبؔ نے میرؔ کے تصورِ مایوسی اور رنج والم کو اپنی خوش طبعی کے باعث توڑا۔ رنج والم کے مضامین کو بھی ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح پیش کیا کہ دل میں درد رکھنے والے بھی زیرلب مسکرا کر اس سخن کا مطالعہ کرنے لگے۔ دوسرے معاشی وسماجی حالات وواقعات کے ساتھ سیاسی حالات بھی شاعر کے مزاج پر اثرانداز ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ سماجی وسیاسی حالات ادب وشاعر کو لاشعوری طور پر متاثر ضرور کرتے ہیں اور اس کی تحاریر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ غزل جدید دور میں داخل ہوئی تو جام ومینا اور گل وبلبل کے فرضی تصورات سے نکلی۔ اب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے سامنا کرنے کا وقت تھا۔ الغرض قیامِ پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ اور افغانستان سے لے کر روس کے زوال

تک ہر رنج وغم کو بھی غزل نے اپنے دامن میں سمیٹا۔ 65اور 71 کی جنگوں کا اثر بھی شاعری میں نظر آتا ہے۔ 70ء کی دہائی میں کچھ شعرا کے ہاں اساطیری، مذہبی اور تہذیبی رجحان نمایاں ہے۔ جس میں جنگ وجدل، وطن سے دوری اور مذہبی وتہذیبی انحطاط کے مضامین کثرت سے موجود ہیں۔ لہٰذا مایوسی اور اُداسی کا رنگ ان وجوہات کی وجہ سے آج بھی غزل پر نظر آتا ہے۔ اُمید اور حوصلہ کی فضا اگرچہ بہت کم کم ہے اور اس کے رنگ ابھی مدھم ہیں لیکن نوجوان نسل کے ہاں اُمید کی کمی بھی نہیں ہے۔

س کیا آپ پاکستانی اُردو غزل کو ہماری تہذیب وثقافت کا آئینہ دار سمجھتی ہیں؟

ج جی ہاں بالکل سمجھتی ہوں۔ ہر ادیب اور شاعر اپنے معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جیسے دوسری زبانوں کا ادب پڑھنے سے ہمیں وہاں کی تہذیب وثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اردو ادب نے بھی اپنی تہذیب وثقافت کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ آپ ولی دکنی سے ہی اس کا جائزہ لے لیجیے۔ جنہوں نے شاعری کے ذریعہ وہاں کی تہذیب وثقافت سے ہمیں روشناس کرایا۔ ہر معاشرے کی پہچان اُس کی تہذیب وتمدن ہے۔ تو نہ صرف شاعروں بلکہ ادیبوں نے بھی اپنے ناولوں اور افسانوں میں اس کی عکاسی کی ہے۔ پھر خواہ یہ تہذیب وتمدن اسلامی تھا یا روایات اور کلچر پر مبنی۔ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری نے نہ صرف تہذیب وتمدن کی پاسداری کا بیڑہ اُٹھایا۔ بلکہ آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کیا۔ علامہ اقبال کا نظریہ وطنیت، بھی اسی کا عکاس ہے۔ اسی طرح علاقائی رسم ورواج بھی ناولوں اور شاعری کے ذریعے تمدن کی نمائندگی کرتے ہیں۔

س آپ کے چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کے ہاں شعری ارتقاء ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج ادیب یا شاعر کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ مطمئن ہو جانا دراصل فن کی موت ہے۔ سیکھنے کا عمل مرتے دم تک جاری رہتا ہے۔ ارتقا مسلسل سفر کا نام ہے۔ بالکل شروع کی کتب شائع ہوئیں تو کم عمر تھی۔ لہٰذا اس وقت کی شاعری میں بھی کچا پکا رنگ نظر آتا ہے۔ آپ جوں جوں سفر کرتے ہیں آپ کی سوچ میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ آپ کا مشاہدہ بڑھتا ہے آپ چیزوں کو کئی سمتوں سے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ اب مناظر اور اشیاء اور طرح سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ زندگی اپنی حقیقتوں کے ساتھ آپ پر آشکار ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا سوچ بدلنے کے ساتھ ساتھ نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ ماحول بدلے یا سوچ آپ کی تحاریر پر لامحالہ اس کے اثرات تو مرتب

ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا۔ میں سمجھتی ہوں شاعری بھی سوچ اور وقت کے ساتھ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھنے لگتی ہے۔ اب جذبات سے ہٹ کر فکر و سوچ کے رنگ گہرے ہونے لگتے ہیں۔ شروع کی شاعری میں ایک ٹین ایجر کی سوچ نمایاں ہے اور آخری کتاب تک زندگی کی تلخیوں نے اپنی جگہ بنا لی۔ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیاں عشق و محبت پر بعض اوقات غالب آ جاتی ہیں۔ اسی تناظر میں عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر بھی اشعار لکھے۔ جہاں تک مطمئن ہونے کی بات ہے تو میں بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں۔ بہت کچھ ادھورا ہے، بہت کچھ کہنا باقی ہے۔

س غزل، آزاد نظم اور نثری نظم میں آپ کے نزدیک کون سی صنف مستقبل میں شعری حوالے سے اہم ہے؟

ج غزل صدیوں سے مقبول صنف سخن رہی ہے اور آج بھی غزل لکھی اور پڑھی جا رہی ہے لیکن روایت شکنوں نے اس طلسم کو توڑ کر آزاد نظم اور نثری نظم کی طرف رجحان کیا۔ غزل میں ہر شعر میں الگ مضمون کو باندھا جا سکتا ہے۔ دو مصرعوں میں بات بیان کرنا گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے، لیکن مدت سے غزل میں قدیم موضوعات آج بھی اُسی تواتر سے استعمال ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ آزاد غزل اور نثری غزل کے تجربات بھی کیے گئے جو ہمارے ہاں رواج نہیں پا سکے۔ غزل کا آنگن ہمیشہ سے مخالفتوں اور دشمنوں کے وار کے باوجود پر بہار رہا۔ غزل کی آنچ دھیمی ہوتی ہے اور اسے بآسانی گایا جا سکتا ہے، لیکن دوسری طرف اس بات کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ غزل ایک جز ہے۔ جبکہ نظم کو کل قرار دیا گیا ہے۔ نظم دوسری زبانوں سے اردو ادب میں وارد ہوئی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظم کا دامن زیادہ وسیع ہے اس میں لکھنے کا امکانات زیادہ ہیں۔ لفظیات سے لے کر موضوعات تک آپ کو وسیع کینوس فراہم کرتے ہیں۔ جبکہ بہت سی باتیں غزل کی تنگیٔ داماں کے باعث بیان کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ قافیے اور ردیف سے رہائی نظم ہی کی بدولت ملی۔ مغربی شاعری کے زیر اثر اردو شاعری میں ہیئتوں کے نت نئے تجربات کا نتیجہ آزاد نظم ہے۔ اگرچہ نثری نظم کی طرح شروع میں آزاد نظم بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اظہارِ خیال کی آزادی کی خوبی نے آہستہ آہستہ اس کو رواج دیا اور اس کو پسند کیا جانے لگا۔ سب سے زیادہ بحث و مباحثہ نثری نظم کے حوالے سے ہوا۔ ایک بڑا طبقہ تو اس کو شاعری ماننے کو تیار ہی نہیں۔ معنوی اور لفظی آہنگ لیے ہوئے کوئی نثر پارہ شاعرانہ رنگ میں رچا بسا ہو تو اُسے شاعری کہا جا سکتا ہے۔ اگر اسے نظم کہنا بھی پسند نہیں اور نثر بھی نہیں تو اس کا

مناسب نام شاعری تو ہو سکتا ہے شعر کے لیے تخیل کی ندرت، معنوی بلندی، بلاغت و فصاحت درکار ہوتی ہے لیکن نثری نظم میں بھی ان کا اہتمام ہوتا ہے۔ میں اسے شاعری کی تیسری جہت سمجھتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آنے والا دور نثری نظم کا دور ہوگا۔

س اُردو زبان میں نثری نظم کی صنف میں اب تک کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ جیسا کہ آزاد نظم میں میرا جی، ن۔م۔ راشد اور مجید امجد کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ کیا یہ محدود امکانات کی صنف ہے؟

ج جی نہیں! نثری نظم محدود امکانات کی صنف تو نہیں ہے۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ اس میں کچھ کہنے کے امکانات سب سے زیادہ ہیں۔ اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں سرقہ اور توارد کے خطرات بھی موجود نہیں ہیں۔ یہ ایک منفرد اور ذاتی تخیل کی ایجاد ہے۔ تشبیہات واستعارات سے بھرپور اس صنف کو نجانے شاعری کیوں تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ شاعری تشبیہات و استعارات اور تخیل سے پروان چڑھتی ہے۔ تو کیا ہمیں نثری نظم میں اس کی فراوانی میسر نہیں ہے؟ باقی یہاں تک کوئی بڑا شاعر نہ ہونے کی بات ہے۔ تو میرا خیال ہے ابھی ہمارا قاری اور ادیب اس کو اپنانے سے کچھ گریزاں ہے۔ مخالفتوں کے خوف سے شاید یہ فن اس طرح اُبھر کر سامنے نہیں آ رہا لیکن آپ دیکھیں کہ آج اکثر شعراء خوبصورت نثری نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔ اگرچہ اعتراضات کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزی سے اردو میں رواج پائی۔ دراصل حقیقت کچھ اور ہے۔ ٹیگور کی ''گیتا نجلی'' کے توسط سے ہی انگریزی شاعری میں نثری نظم تشکیل پائی۔ نثری نظم آہستہ آہستہ ہماری روایت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ جس طرح آزاد نظم کو شروع میں مسائل کا سامنا رہا۔ بعد میں قاری نے اسے اپنایا تو اس میں بڑے شعرا پیدا ہوئے۔ یقیناً نثری نظم کو اپنانے کے بعد اس میں بھی بڑے شعرا اُبھر کر سامنے آئیں گے۔

س کیا اردو زبان کی عمر 20, 15 برس رہ گئی ہے۔ جیسا کہ ہمارے کچھ ادیب کہہ رہے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج یقیناً حالات پہلے سے بدلے ہیں۔ ذریعہ تعلیم زیادہ تر انگریزی میں ہے اور انگریزی لکھنے پڑھنے اور بولنے والوں کو مہذب سمجھنے کی سوچ ہمارے ہاں کافی پختہ ہے۔ پھر تیز رفتار ترقی کا مقابلہ کرنے اور ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے لیے انگریزی کی اہمیت کو بہت زیادہ خود پر طاری کر لیا گیا ہے۔ اردو دان اگرچہ کم ہوئے ہوں گے۔ مگر حالات اتنے بھی حوصلہ شکن

ہر گز نہیں ہیں۔ آج بھی کروڑوں لوگ اُردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور ایسا صرف پاکستان میں ہی نہیں ہے بلکہ دیگر ممالک کی یونیورسٹیز میں اردو کے شعبے کام کر رہے ہیں۔ اردو زبان شوق سے سیکھی جاتی ہے۔ اگر اردو متروک ہونے والی ہوتی تو کئی ممالک میں اردو کے شعبے اس جاں فشانی سے کام نہ کر رہے ہوتے۔ ہماری یونیورسٹیز میں لاکھوں طلبا اُردو لٹریچر پڑھ رہے ہیں۔ بی اے تک اردو لازمی تعلیم کے طور پر آج بھی پڑھی جا رہی ہے۔ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ دور دراز اور پسماندہ علاقوں میں بھی لوگ اردو کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ جبکہ انگریزی کو سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ تو ایسی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ختم ہونے والی ہے۔ آج بھی اردو کی ہزاروں کتابیں چھپ رہی ہیں اور ان کو خریدنے اور پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتنی کتب چھپ رہی ہیں اردو دنیا کی تیسری بڑی عالمی رابطہ زبان ہے۔ اسے بآسانی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

س کیا ادبی رسائل کی اہمیت اب ختم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ سوشل میڈیا نے لے لی ہے؟

ج اگرچہ سوشل میڈیا نے جہاں اور کئی نقصانات پہنچائے ہیں وہیں ادب میں بھی کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ آج ایک کلک پر قاری کو ہر طرح کا مواد پڑھنے کے لیے بآسانی دستیاب ہے۔ سفر کے دوران، انتظار گاہوں میں، پارکوں اور دفتروں میں وہ جہاں چاہے اپنی پسندیدہ کتب یا رسائل کا مطالعہ بآسانی کر سکتا ہے۔ ایسا زیادہ تر نوجوان نسل میں ہے، لیکن پرانے اور نئے بہت سے لوگ اب بھی کتب بینی کے شائق ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ جو مزہ کتاب پڑھنے میں ہے وہ سوشل میڈیا پر نہیں ہے۔ اگرچہ سوشل میڈیا پر بے بہا غیر معیاری ادب نے اپنی جگہ بنا لی ہے لیکن معیاری اور ادبی رسائل رسالوں سے اپنی اہمیت آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ایسا نہ ہوتا تو آج بھی بے شمار ادبی جرائد شائع نہ ہو رہے ہوتے۔ یہ ہوا ہے کہ سوشل میڈیا پر بغیر اُجرت کے پڑھنے والوں کو جرائد و کتب خرید کر پڑھنا دشوار لگتا ہے۔ خریدنے کا رواج کم ہو گیا ہے لیکن ادبی رسائل آج بھی تواتر سے شائع ہو رہے ہیں اور قاری تک پہنچ رہے ہیں۔

س کتاب کا مستقبل آپ کیا دیکھ رہی ہیں؟

ج جی جیسا کہ ادبی رسائل کے حوالے سے گفتگو ہو چکی ہے یہی حال کتب کا بھی ہے۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے کتب خرید کر پڑھنے کا رواج کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج مصنف کتاب کو تحفے میں دینے پر مجبور ہے۔ کیونکہ مارکیٹ میں کتابیں اب اس طرح سے فروخت نہیں ہوتی جیسی آج

سے چند برس قبل ہوا کرتی تھیں۔ کتاب کا مستقبل زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ فٹ پاتھوں پر نہایت ارزاں نرخ پر کتابیں اپنے قاری کی منتظر نظر آتی ہیں۔

س آپ ''نوائے وقت'' کی مستقل کالم نگار ہیں۔ ایک اچھے کالم کی کیا خوبیاں ہوتی ہیں؟ اور کالم نگار میں کیا خوبیاں ہوں؟

ج دوسری اصناف کی طرح کالم نگاری میں بھی جدت آئی ہے۔ اب ہر موضوع کو کالم میں سمویا جا سکتا ہے۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، علاقائی، اخلاقی غرض ہر طرح کی بات کالم میں بآسانی کہہ کر لاکھوں لوگوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی حالات و واقعات کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تو ایک اچھے کالم نگار کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات وواقعات پر کڑی نگاہ رکھے۔ میں سمجھتی ہوں قلم کا جہاد بہت طاقتور ہے۔ حق اور سچ کی بات کہہ کر کالم نگار مکمل جہاد کرتا ہے۔ حقائق تلخ ہوں بغیر خوف وخطر اپنے نظریات کا اظہار کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں صحافت آزاد ہے۔ اب زرد صحافت کا دور نہیں رہا۔ کچھ بھی کہنے اور لکھنے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ ایک اچھا کالم لکھنے کے لیے موضوع کا انتخاب بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بات مدلل اور اہم ہو۔ قاری کو سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔ تلخ بات کو بھی نرم اور مہذب انداز میں کہنا چاہیے۔

س کہا جاتا ہے کہ کالم کی عمر ایک دن ہوتی ہے۔ تو کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج ہر روز جتنی تیزی سے دنیا کے حالات اور واقعات بدلتے ہیں اتنی ہی تیزی سے خبروں کا سنیر یو بھی بدل جاتا ہے۔ ہر روز نیا واقعہ نیا مسئلہ ہوتا ہے جس پر ہمیں غور وفکر بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کا مناسب حل بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ صرف کالم ہی نہیں شاید ہر خبر کی مدت آج ایک ہی دن ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف بہت سے کالم جہاں شوق سے پڑھے جاتے ہیں وہیں ان میں فکر و بچار کے پہلوؤں کو یاد رکھا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ کام کو شعر کی طرح یاد رکھا جائے۔ نفس مضمون اور کہنے والے کا نظریہ یاد رہنا چاہیے۔ ایک بات لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں اور ہر چیز اپنا لاشعوری طور پر اثر تو چھوڑ ہی جاتی ہے۔ تو یہی چھوڑے ہوئے اثرات ہی کالم کی زندگی ہیں نہ کہ الفاظ اور محض نفسِ مضمون۔ بعض اوقات کالم کی ایک سطر پوری کتاب کا خلاصہ بن جاتی ہے۔

س کیا کالم جلدی میں لکھا جانے والا ادب ہے۔ عموماً یہی کہا جاتا ہے۔ کیا یہ واقعی ادب کی صنف ہے یا نہیں؟

ج جو کالم نگار روزانہ کی بنیاد پر کالم نویسی کو ایک پیشہ کی صورت اختیار کر کے لکھنا شروع کر دیتے ہیں اسے تو واقعی جلدی میں لکھا جانے والا ادب ہی کہا جائے گا۔ اس طرح معیار پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ اچھا اور معیاری کالم لکھنے کے لیے گہرے مشاہدہ اور مطالعہ کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ نیز الیکٹرک میڈیا سے نشر شدہ خبروں اور تجزیوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ کالم کے لیے وقت اور مطالعہ دونوں چاہئیں۔ میں سمجھتی ہوں کالم لکھنا آسان نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مشکل ہے۔ اگر واقعی آپ کالم نگاری سے انصاف کر رہے ہیں۔ کالم میں چونکہ ذاتی رائے ہوتی ہے آپ اسے مضمون کی صورت دے دیتے ہیں۔ ہم نے چونکہ صرف سیاسی حالات پر ہی لکھنے کو کالم تسلیم کر لیا ہے۔ اگرچہ دوسرے ممالک میں ایسا نہیں ہے۔ اس میں ادبی مضامین و دیگر بھی ہوتے ہیں جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے ادب کی صنف قرار دیا جا سکتا ہے۔ ابن انشا نے فکاہیہ کالم لکھے۔ بعض اوقات ایک کالم مکمل ادبی شہ پارہ ہوتا ہے۔ ہمارے نامور قدیم ادباء نے بھی کالم لکھے۔

س کیا شاعر کی طرح کالم نویس بھی پیدائشی ہوتا ہے؟

ج میں سمجھتی ہوں کہ شاعر ہو یا رائٹر وہ پیدائشی ہی ہوتا ہے۔ لکھنے کی صلاحیت محض سیکھنے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ آپ شاعری کر رہے ہیں یا ادب میں کچھ اور تخلیق کر رہے ہیں تو بنیادی چیز تخیل ہے۔ کالم میں بھی مشاہدہ اور تخیل اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپ اپنی تخیل کی آنکھ سے ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں جو عام انسان کی آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں یا اُس طرف ان کی توجہ نہیں جاتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کا مشاہدہ بہت اچھا ہو۔ وہ غور و فکر سے چیزوں کی حقیقت سے بھی آشنا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان خیالات کو لکھنے کی صلاحیت بھی ان میں موجود ہو۔ لکھنا ایک خداداد صلاحیت ہے۔ آپ کے اس تخیل، الفاظ اور ویژن کا خزانہ موجود ہو تو ہی آپ کچھ لکھ سکتے ہیں۔ الفاظ کی بناوٹ کے لحاظ سے مدلل نفسِ مضمون کو بیان کرنا فطری صلاحیت ہے۔

س ہمارے اکثر شعراء نے کالم نویسی شروع کر دی ہے۔ کیا وہ اپنی شاعری سے غیر مطمئن ہیں یا جلد شہرت چاہتے ہیں؟

ج دیکھیں جیسا کہ میں نے کہا کہ لکھنا ایک قدرتی صلاحیت ہے۔ شاعر کی طرح کالم نویس بھی پیدائشی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک اچھا شاعر ایک اچھا کالم نویس تو بن سکتا ہے لیکن ایک اچھا کالم نویس ایک اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ اس لیے شعرا نے کالم نویسی بھی شروع کر دی ہے۔ کیونکہ ان میں لکھنے کی صلاحیت قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ غزل اور دیگر شاعری چونکہ محدود موضوعات کا

احاطہ کیے ہوئے ہے اور کالم میں نہ صرف آپ ہر طرح کے مضمون پر کھل کر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں بلکہ آپ نتائج، نظریہ اور حل بھی ایک ہی تحریر میں پیش کر دیتے ہیں۔ جبکہ شاعری میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ شعرا شاعری سے غیر مطمئن نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کالم میں وسیع سطح پر خیالات کا اظہار انہیں ذہنی تسکین بہم پہنچاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ شہرت کی خاطر ایسا کرتے ہوں تو اگر وہ اچھا کام کر رہے ہیں تو شہرت حاصل کرنے کی خواہش میں قباحت بھی کیا ہے اور یہ خواہش کس شاعر کو نہیں ہوتی خواہ وہ کالم نہ بھی لکھ رہے ہوں۔ دوسری طرف زیادہ طبقہ شاعری سے زیادہ اخبار اور کالم پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے تو ایسے میں یہ ایک اچھا میڈیم ہے۔

س ہمارے ادبی ماحول میں ایک شاعرہ کو نام بنانے کے لیے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج خواتین کو جہاں دوسرے شعبہ جات میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی طرح ادبی ماحول میں اپنی شناخت بنا کر چلنا بھی اُتنا ہی مشکل ہے۔ ماحول خواہ پہلے سے زیادہ ایڈوانس ہو چکا ہے۔ بظاہر لگتا ہے عورت پہلے سے زیادہ آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے لیکن ابھی تک اُسے گھرداری کی ذمہ داریوں میں کئی شوق قربان کرنے پڑتے ہیں۔ ابھی تک مرد اُس کی ذاتی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ اس کا کردار گھر، مرد اور بچوں تک ہی محدود سمجھا جاتا ہے۔ بظاہر کامیاب لکھاری عورت کی ذاتی زندگی میں جب آپ جھانکیں گے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس مقام تک آنے کے لیے بہت کچھ سہا ہے۔ سب کچھ جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہوتا نہیں ہے۔ جس طرح ملازمت کے لیے باہر نکلتے وقت عورت کو مرد کی مختلف ذہنیت سے واسطہ پڑتا ہے۔ خاص طور پر جہاں وہ مردوں کے ساتھ کام کر رہی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ادبی ماحول میں بھی اُسے درپیش ہے۔ ادبی دنیا میں مرد کے ذہن اور سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں۔ اُس کی ذہنی اپروچ خاص طور پر عورت کے حوالے سے ایک مرد کی سوچ سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ ایک جینوئن شاعرہ کو اپنی جگہ بنانے کے لیے نہایت احتیاط سے سوچ سمجھ کر ہر قدم اُٹھانا پڑتا ہے۔ دھیرے دھیرے صبر اور حوصلے کے اس سفر کے بعد وہ اپنے کام سے اپنا نام بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

س بطور شاعرہ اُسے صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے رعایتی نمبر بھی تو ملتے ہیں؟

ج آپ کسی جینوئن رائٹر یا شاعرہ کے لیے ایسا نہیں کہہ سکتے۔ وہ اگر اپنی جگہ بناتی ہے تو محض اپنے کام اور اپنی محنت کی وجہ سے۔ آج جن کا نام ہے ان کے کام کو سراہا جاتا ہے اور تسلیم کیا جاتا

ہے۔ آپ بتائیں کہ کتنی نان جینوئن شاعرات ہیں جنہوں نے شہرت حاصل کی اور پھر یہ شہرت تادیر قائم بھی رکھ سکیں۔ رعایتی نمبر انہی متشاعرات کو ملتے ہیں جن کو مقبول کرنے میں خاص ادبی گروہ یا مبنی بر مفادات رکھنے والے کسی شاعر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں زیادہ اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتی لیکن رعایتی نمبرز متشاعرات کے حصے میں ہی آتے ہیں۔ آج کا قاری خاصا باشعور ہے۔ وہ اچھا کلام پڑھتا ہے اور اسے داد دیتا ہے۔ آج ہماری بہترین شاعرات کو نمبرز اُن کے صنف نازک ہونے کے باعث نہیں ملے۔ انہوں نے اپنے کام سے خود کو منوایا ہے۔

س اپنے خاندانی پس منظر، تعلیم اور ادبی سفر سے متعلق قارئین کو کچھ بتائیں۔

ج میرا تعلق سرگودھا کی جٹ زمیندار فیملی سے ہے۔ میرے والد صاحب مرے کالج سیالکوٹ کے پڑھے ہوئے تھے۔ باقی افراد بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ میری والدہ بھی پڑھی لکھی ہیں۔ لہٰذا گھر کا ماحول والد صاحب کے حوالے سے ادبی بھی رہا۔ کلامِ اقبال کا زیادہ تر حصہ انہیں زبانی یاد تھا۔ زمیندار تھے، مزارع رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا وقت کی فراوانی کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا۔ کچھ وراثت اور کچھ گھر کے ماحول کی وجہ سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق قدرتی طور پر تھا۔ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ پھر منہاج یونیورسٹی سے ایم فل اُردو کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے قبل بی ایڈ، ایم ایڈ اور کمپیوٹر سائنسز میں بھی ڈگریاں لیں۔ ایل ایل بی کیا اور بعد ازاں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے شریعہ لاء میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ رجحان زیادہ اردو لٹریچر کی جانب تھا۔ اسی وجہ سے ایم فل کیا۔ ادبی سفر کا آغاز تو شاید چھٹی کلاس سے ہو چکا تھا۔ بے ساختہ بچوں کے لیے نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ کبھی آسمان اور ستاروں پر کبھی موسموں پر۔ پھر مختصر اقتباسات لکھے۔ مختلف جرائد میں تحریریں بھیجیں اور سالوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسی دوران ایک مقامی پرچہ کے لیے فیچرز اور کالم بھی لکھے۔ مختصر افسانوں کا بھی شوق رہا اور کچھ مختلف پرچوں میں چھپے۔ 2004ء میں شاعری کی پہلی کتاب ''تمہیں تو میرا ہونا تھا'' منظر عام پر آئی۔ یکے بعد دیگرے پانچ مزید کتب شائع ہوئیں جن میں ''محبت آئینہ کرلو''، ''یہ ہجر ہے یا وصال ہے''، ''بارشوں کے موسم میں''، ''خوشبو ہے وہ صندل کی'' اور ''تم محبت کا استعارہ ہو'' شامل ہیں۔ کافی عرصہ سے نوائے وقت کی مستقل کالم نگار ہوں۔ عامر بن علی اور حسن عباسی کے ساتھ ماہنامہ ''ارژنگ'' کے لیے بطور مدیرہ کام کرتی ہوں۔

س کیا ادیب یا شاعر کی تخلیقات کو اس کی اپنی زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے یا معاشرے کا؟

ج: اگرچہ لکھنے کا آغاز ذاتی کیفیات کے کتھارسس کے لیے ہوتا ہے، لیکن ایک حساس شاعر یا ادیب اپنے اردگرد ہونے والے مسائل کو بھی اُسی شدت سے محسوس کرتا ہے جس طرح اپنے ذاتی غم یا مسائل کو۔ اگر ایک ادیب اپنے ذاتی تجربات کو تحریر میں سموتا ہے تو یقیناً ایسے تجربات یا حالات سے اور بھی بے شمار لوگ گزر چکے ہوتے ہیں، گزر رہے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے پڑھنے والے کو وہ اپنی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ ذاتی وجوہات کے باوجود ایک غم یا ایک خوشی بعض اوقات پورے معاشرے یا ایک بڑے طبقے کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ ایک اچھے ادب کو تخلیق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ کر کائناتی وسعتوں میں پھیلے ہوئے درد و غم کو محسوس کیا جائے اور اپنی تحاریر کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ بہت سے لوگ تحریر کے ذریعے اپنی بات یا دکھ کہنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسے میں ادیب پر اپنے علاوہ معاشرے کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ ہمارا بہترین ادب ایسے افسانوں، ناولوں اور شاعری پر مشتمل ہے جس میں ذاتی نہیں معاشرتی عکاسی کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہر اچھے لکھاری نے اپنے گرد ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ 65ء اور 71 کی تحاریر دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ مختلف تحریکوں کے ذریعے تخلیق ہونے والا ادب نہ صرف اپنے معاشرے بلکہ سرحدوں کی قید سے نکل کر تشکیل پایا۔ علامہ اقبال کی شاعری سے بڑی کیا مثال ہوگی۔ لہٰذا بہترین ادیب کو ذاتی واردات سے آگے کا سوچ کر معاشرتی مسائل کا ترجمان ہونا چاہیے۔

س: نئے لکھنے والوں کے لیے چند مفید مشورے جس سے اُن کو مستقبل میں فائدہ ہو۔

ج: اچھا لکھنے کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ آپ کی تمام صلاحیتیں اور آپ کا عمدہ تخیل بھی اُس وقت تک بے کار ہے جب تک آپ دوسرے ادباء اور شعرا کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اس سے آپ کا نہ صرف وژن بہتر ہوتا ہے بلکہ آپ کو پتہ چلتا ہے کہ اچھے ادیب کی کیا خوبیاں ہیں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے یہی کہنا چاہوں گی کہ کتب بینی کی عادت اپنائیں۔ اپنے سینئرز کے ساتھ بیٹھیں، ان سے بات کریں۔ یقین کریں ایک عالم کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنا کئی کتابیں پڑھنے سے بہتر ہے۔ اس کے علاوہ اگر کچھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کسی کو دکھاتے رہیں اور مزید بہتر کرنے کے لیے مشورے لیتے رہیں۔ سیکھنے سے تحاریر میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

OOO

منشاء یاد

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ غالب کے طرفدار بھی ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ مصور، خطاط اور ظروف نگار منشاء یاد کا نام آرٹ سے وابستہ لوگوں کے لئے جانا پہچانا اور معتبر ہے۔ میری ان سے ایک خصوصی نسبت بھی ہے اور وہ یہ کہ میاں چنوں ہم دونوں کی مشترکہ جنم بھومی ہے۔ کئی عشروں سے منشاء یاد کیلی گرافی، پورٹریٹ، سکیچز، بلیو پوٹری اور دیگر متعدد شعبہ ہائے فن میں اپنا تخلیقی سفر بڑی شدّ و مدّ اور محنت و محبت سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ارتقائی سفر ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اب اوج کمال پر پہنچ چکا ہے۔ مقامی، قومی اور عالمی سطح پر ان کے فن پاروں کی بے شمار نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔ بلا مبالغہ دنیا کے درجنوں ممالک کی اہم دیواروں پر ان کے فن پارے آویزاں ہیں جو ان کے فن کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ گرچہ ابتدائے سفر میں وہ پہلے پہل خود ہی کوشش کرتے رہے، پھر معروف خطاط اظہر قلمکار کی شاگردی اختیار کر کے ایک سال تک ان کے ہمراہ کام کرتے اور سیکھتے رہے۔ پھر ایک سال فلموں کے پوسٹر بناتے رہے۔ مگر اس تمام عرصے میں انہیں احساس ہوتا رہا کہ یہ ان کی منزل اور منشاء نہیں ہے۔ کالج ایف ایس سی کے دوران شروع ہونے والا یہ سفر جب وہ ساہیوال میں گریجوایشن کر رہے تھے تب بھی جاری و ساری رہا اور ایم ایس سی شعبہ شماریات میں ان کی صلاحتیں مزید نکھر آئیں۔

اسلامک خطاطی کی جانب ان کا رجحان تو ابتدائے سفر فن سے ہی تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے محسوس کیا کہ یہی ان کا اصل خداداد تحفہ اور صلاحیت ہے۔ مقابلے کا امتحان پاس کرنے سے پہلے وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی کے بعد بھی ان کا تعلیم کے شعبہ سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ مگر ان کا اصل تخلیقی جوہر اور جذبہ جنون قلم اور موئے قلم سے جڑا ہوا رنگوں اور کینوس سے متعلق ہی رہا۔ ان کے تخلیقی سفر میں ایک اہم موڑ ظروف نگاری کی طرف آیا۔ ملتان کی تاریخی اور روایتی نیلے رنگوں کی مشہور زمانہ بلیو پوٹری

وسرامک کوانہوں نے اسلامک خطاطی سے ہم آہنگ کر کے اک نیا تخلیقی رچاؤ پیدا کیا ہے۔ یہ ان کی اپنے فن سے کمٹمنٹ ہی تھی جس نے انہیں فن خطاطی میں استعمال ہونے والے تمام اہم خطوط سیکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کے فن پارے دیکھیں تو آپ کو خط ثلث، خط کوفی، خط نسخ، خط شکستہ، خط رقعہ اور خط دیوانی میں ان کا کیا ہوا خوبصورت تخلیقی کام نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انہی خطوط کو برش اور کینوس پر فقط رنگوں سے آرٹ کا شاہکار نہیں بنایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سرکنڈے کے قلم اور قرطاسِ ابیض پر بھی ایک سے بڑھ کر ایک تخلیقی نمونہ ان کی آرٹ گیلری میں ملتا ہے۔ کورین آرٹ میں اسکرین پرنٹنگ میں بڑا تخلیقی کام ہوتا ہے، منشاء یاد نے اس شعبۂ فن میں بھی بہت کام کیا اور کمال مہارت حاصل کی ہے۔ قرآنی آیات کی خطاطی سے انہیں خصوصی لگاؤ ہے اور ان کا یہ فن خیرہ کن ہے۔ 2003 میں خانہ فرہنگ ایران کی جانب سے منعقدہ نمائش میں انہوں نے حصہ لیا اور بہترین آرٹسٹ کا ایوارڈ جیت لیا۔ جب کہ الحمراء آرٹس کونسل میں منعقد ہونے والی متعدد نمائشوں میں بھی بارہا حصہ لیا اور انعامات حاصل کئے۔ کئی برادر اسلامی ممالک کے سفارتخانوں کے لئے ان سے اسلامی خطاطی کے نمونے بنوائے گئے۔ ایران و عرب میں ان کے فن کو بہت پذیرائی ملی ہے۔

منشاء یاد کا فن پاکستان کا فخر اور نشان ہے۔ ارباب اقتدار اور حکومت کے ذمہ دار اہلکاروں کو چاہیے کہ ان کے تخلیقی کام کو سرکاری سرپرستی فراہم کریں۔ سفارت خانوں اور دیگر اہم سرکاری دفاتر میں ان کے فن پارے سجانے کے قابل ہیں۔ ان کا فن ہماری ثقافت اور فنکارانہ عظمت کا بھی ثبوت ہے، نگار خانوں اور عجائب گھروں میں ان کا کام پہنچائے جانے کا حق دار ہے۔ یہ منشاء یاد کے اعتراف فن تک محدود بات نہیں ہے بلکہ نوجوان نسل کو ایک مثبت جہت سے روشناس کرانے کی کوشش بھی ہے۔ ایسی ہی کوشش میاں چنوں میں آرٹ گیلری کی صورت میں انہوں نے پیش کی ہے، جس کا مقصد نوجوان نسل کی رہنمائی کے علاوہ اسلاف کی درخشندہ روایات کی آبیاری بھی ہے۔

OOO

مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ پاکستانی ادب اور میڈیا کا ایسا حوالہ ہیں جن کا تذکرہ کئے بغیر ہمارے عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ان کا تعارف کروانا تکلف زائد محسوس ہوتا ہے۔سفرنامہ نگاری کی بات کریں تو ہمارے ملک میں انہوں نے اس صنف کو نا صرف ایک نئی جہت عطا کی ہے بلکہ بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔اردو ناول نگاری کو انہوں نے اعتبار بخشا۔انتہائی مہربان انسان ہیں اور اسی مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے انٹرویو کے لئے وقت دیا۔صبح سویرے ماڈل ٹاؤن سنٹرل پارک لاہور جب سات بجے میں ''تکیہ تارڑ'' پہنچا تو یہ وہی وقت تھا جب ہم بچپن میں ہر صبح سکول جانے سے پہلے پی ٹی وی پر انہیں دیکھتے تھے۔راقم سمیت تمام پاکستان کے بچوں کے وہ ''چاچا جی'' تھے۔یاد دہانی کرواتا چلوں کہ ہمارے ملک میں مارننگ ٹرانسمیشن کے وہ بانی اینکر پرسن ہیں۔اگرچہ وہ آج کل موجودہ مارننگ شوز سے اعلانِ لاتعلقی کر چکے ہیں۔جس کی وجہ غالباً ان دنوں کی غیر معیاری اور لچر پن پر مبنی صبح کی نشریات ہیں۔ہزاروں باتیں اور سوال تھے مگر ان کے دوستوں اور ارادت مندوں کی ایک قابل ذکر تعداد بھی ان سے ملنے کی خواہش مند تھی۔وہاں موجود اس لئے میں نے گفتگو کا دائرہ ادب تک ہی محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔

س: کیا آپ سفرنامے کو ادب کا حصہ سمجھتے ہیں؟ یا پھر سفرنامہ ادب میں شمار نہیں ہوگا؟

ج: بات یہ ہے کہ میں اصناف میں یقین نہیں رکھتا، بالکل ایسے ہی جیسے میرے نزدیک گرائمر کوئی چیز نہیں ہوتی۔اگر آپ باصلاحیت اور عظیم لکھاری ہیں تو پھر آپ ان اصناف سے آگے نکل جاتے ہیں، میں خود کو عظیم مصنف قرار نہیں دیتا مگر میں ایک باصلاحیت لکھاری ضرور ہوں۔اچھے مصنف گرائمر اور اصناف سخن سے آگے نکل جاتے ہیں۔جبکہ منشی لوگ گرائمر میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس کو ایسے لکھنا ہے، یہ فقرہ اور لفظ ایسے آئے گا۔یہ اصناف سخن اور گرائمر تو بنیادی طور پر طالب علموں کو سکھانے پڑھانے کے لئے ہوتی ہے۔لکھاری کے لئے باصلاحیت اور تخلیقی صلاحیت کا حامل ہونا بنیادی شرط ہے۔انگریزی کا ایک مشہور معقولہ ہے'' Singer not a

Song ''اگر گلوکار بڑا ہے تو وہ جو بھی گائے گا بڑا ہوگا۔ گانے والا اگر استاد بڑے غلام علی خان ہے تو وہ اگر آپ کی غزل بھی گائے گا تو بڑی ہو جائے گی اور گلوکار اگر فلاں ہے تو وہ اگر غالب کو بھی گائے گا تو اس کا بیڑا غرق کر دے گا۔ اسی طرح مصنف اہم ہے، دیکھنا یہ ہے کہ کون ہے۔ جو یہ لکھ رہا ہے اگر تخلیقی سطح پر وہ ایک بلند معیار پر کھڑا ہے تو پھر وہ جو بھی لکھے وہ ادب کی اصناف ہیں۔

س: آپ بتائیں مرزا غالب کے خطوط ادب کی صنف ہیں کہ نہیں ہیں؟

ج: میرے خیال میں تو غالب کے خطوط ادب میں داخل ہوتے ہیں۔ اس بات کا تعین آپ نے نہیں کرنا ہے، وہ اردو نثر کی بنیاد ہیں۔ اب ادب کی اصناف میں خطوط تو نہیں پڑھائے جاتے، اگر قراۃ العین حیدر دھوبی کے کپڑوں کا حساب لکھ کر دیتی ہے تو وہ ادب ہوگا، اگر آپ اس بات کو نچلی سطح پر لے کر آئیں تو مجھ سے بھی پوچھا گیا کہ کیا سفرنامہ ادب کی صنف ہے کہ نہیں؟ میرا جواب تھا کہ مجھے کیا پتہ؟ میں کوئی ادب تخلیق کرنے کے مقصد کو لے کر تو نہیں لکھ رہا ہوں۔ میرے اندر جو جذبہ ہے اس کو بیان کر رہا ہوں، مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ یہ ادب ہے یا نہیں۔ میری کوئی نیت نہیں ہے کہ میں ادب تخلیق کروں۔ میں تو اپنے اندر لگی چناروں کی آگ اپنے تجربات اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو دکھاؤں جنہوں نے یہ نہیں دیکھا، یا دکھانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن میں ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ مجھے بتائیں کہ قراۃ العین حیدر کا ''کوہ دماوند'' ادب ہے کہ نہیں ہے؟ یہ ایک سفرنامہ ہے۔ شفیق الرحمان کی دجلہ یا پتھر برساتی ادب کا حصہ ہے یا نہیں ہے؟ اس کا مطلب ہوا کہ اس کا انحصار اور دارومدار اس بات پر ہے کہ لکھ کون رہا ہے۔ میرے پاس درجنوں افسانوں کے مجموعے اور ناول آئے ہیں، میں انہیں ادب نہیں سمجھتا۔ کیونکہ وہ برے ہوتے ہیں۔ برے لکھاریوں کے برے لکھے ناول یا افسانے ادب نہیں کہلا سکتے۔ Singer not a Song۔

س: آپ کی طبیعت میں اتنی روانی ہے کبھی شاعری کرنے کا خیال نہیں آیا؟

ج: کبھی بھی نہیں۔ اس کی دو تین وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں اسے شاعری نہیں کہتا جو میں لکھتا ہوں جیسے ''اے غزال شب'' میں گیت ہیں خانہ بدوشوں کے، وہ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ مجھ میں ایک حس ہے کہ میں جو چیز بھی لکھی دیکھ لوں، اس طرز پر میں لکھ سکتا ہوں۔ خانہ بدوشوں کے گیت میں نے پڑھے ایک دو اور پھر اسی طرز پر میں نے وہ گیت لکھ ڈالے۔ میں صبح کی نشریات میں عموماً کسی موضوع پر آزاد نظم سی کہتا تھا، ناظرین میں سے کسی نے شکایت کی کہ

میں شاعر کا نام اس لئے نہیں لیتا چونکہ میں خود فکشن نگار ہوں۔ مجھے ہیڈ آفس سے فون آ گیا کہ یہ اعتراض آ رہا ہے۔ میں نے وضاحت کی کہ یہ تو میں وہاں بیٹھے بیٹھے ہی لکھتا ہوں، اب کیا بتاؤں کہ یہ میں نے لکھا ہے؟ میری ایک نظم ہے، میں اسے نثر ہی کہتا ہوں کہ ''اے موت ذرا توقف کر'' یہ ''ماہنامہ تسطیر'' میں بھی شائع ہوئی ہے اور میری ایک کتاب میں بھی۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ امریکہ میں مقیم تھا کہ مجھے گلزار صاحب کا فون آیا کہ میں نے آپ کی نظم پڑھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے جاری رکھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں کوئی شاعر نہیں ہوں۔ اس پر گلزار نے کہا کہ دیکھیں، آپ نے فکشن میں جہاں پہنچنا تھا، پہنچ گئے۔ اب آپ شاعری پر توجہ دیں۔ میں نے معذرت کی کہ جناب میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ بس ایک لمحے کا غبار تھا۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ اگر آپ پڑھیں گے گلزار صاحب تو میں لکھوں گا۔ اس پر ان کا جواب تھا کہ یہ نظم پڑھنے کے لئے آپ نے مجھ سے کہا تھا؟ الاسکا ہائی وے پر میں نے منظر دیکھا۔ وہ کچھ گرفت میں نہیں آ رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ امراء القیس کچھ شاعری میں ایسی منظر نگاری کی ہے۔ میں نے امراء القیس کو پڑھا اور پھر اسی طرز پر میں نے اس منظر کو لفظوں میں پیش کر دیا۔ مگر میں اسے نثر ہی سمجھتا ہوں۔ ایک مسئلہ یہ ہے جو شاعری سے متعلق ہے، شاعری ہمیشہ بالواسطہ (Indirect) ہوتی ہے۔ وہ کبھی موضوع پر اس طرح بات نہیں کرتی جیسے فکشن یا نثر میں ہوتی ہے۔ آپ پورا روسی لٹریچر پڑھیں مگر آپ کو اگر نپولین کی مہم جوئی کے متعلق پڑھنا ہے تو پھر وہ شاعری میں نہیں ملے گا، اس کے لئے آپ کو ٹالسٹائی کا ''جنگ اور امن'' ناول پڑھنا پڑے گا۔ فیض احمد فیضؔ نے مشرقی پاکستان پر لکھا

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد

مگر یہ غزل تو کہیں بھی اپلائی ہو سکتی ہے۔ آج کے کشمیر پر بھی، غزہ پر بھی وغیرہ وغیرہ۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر میں نے ناول راکھ لکھا تھا۔ ڈائریکٹ بات کرنے کے لئے نثر نگاری ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں فوج نے وہاں کیسے آپریشن کیا اور زمینی حقائق کیا تھے۔ شاعر کی جان آسانی سے چھوٹ جاتی ہے مگر نثر نگار پکڑا جاتا ہے، چونکہ وہ اپنی FIR اپنے ہاتھ سے خود لکھتا ہے۔ شاعری میرے لئے کافی نہیں مگر میری نثر شاعری کے بغیر مکمل بھی نہیں ہوتی۔ غالبؔ، بلھے شاہ، شاہ حسین اور میاں محمد بخش کے بغیر میری نثر بھی ادھوری ہے۔ مثلاً میری ایک کتاب ہے، ''منہ ول کعبے شریف'' اور ''غارِ حرا میں ایک رات'' حج کا سفر نامہ ہے یہ، اس میں جتنے عنوان

ہیں غالب کے مصرعے ہیں،

تپش شوق نے ہر ذرے میں دل باندھا

''اب ہم ہوئے پریم نگر کے شاعر'' یہ شاہ حسین سے لیا گیا ہے۔ شاعری کے بغیر میں مکمل نہیں ہوں مگر اس میں تجریدی بات کی جاسکتی ہے۔

میری کتاب کا عنوان اقبال کا مصرعہ ہے۔

نکلے تیری تلاش میں قافلہ ہائے۔۔۔۔۔

س کالم نگاری کی طرف آپ بڑی دیر سے آئے، اس کی وجہ؟ کالم نگاری کا کیا سکوپ دیکھتے ہیں؟

ج سچ تو یہ ہے کہ میں نے کالم لکھنا تب شروع کیا جب مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی۔ میں نے کبھی مفت کالم نہیں لکھا۔ پانچ، چھ جگہ لکھا۔ کوئی پچیس سال پہلے اخبار جہاں سے فون آیا کہ ابن انشاء ہمارے لئے لکھتے تھے، ہماری خواہش ہے کہ ان کی جگہ آپ لکھیں۔ میرے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی اس لئے میں نے یہ آفر قبول کر کے ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کر دیا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ کالم ادب نہیں ہوتا اور اسکی زندگی بھی بہت مختصر ہوتی ہے۔ چنانچہ کالم میرے لئے اتنا ضروری نہیں ہے چاہے آپ اس میں جو مرضی کمال کرلیں۔ حالانکہ میرے 12 مجموعے ہیں کالموں پر مبنی۔ علاوہ ازیں میرے کالموں اور ایک مصری صحافی کے کالموں کے تقابلی جائزے پر پی ایچ ڈی ہو رہی ہے۔ جامعۃ الازہر میں تحقیق کا کام ہو رہا ہے، جو شائد کسی بھی اور پاکستانی کالم نگار پر نہ ہو رہا ہو، مگر میں پھر بھی کہتا ہوں کہ کالم ایک دن کا ادب ہوتا ہے، بلکہ میں تو اسے ایک دن کا ادب بھی نہیں سمجھتا۔ دوسرے کالم نگاروں کے کالم ہوسکتا ہے ادب ہوں میں اپنے بارے میں یہ دعویٰ نہیں رکھتا۔

س ادبی حلقوں میں بھی دوستیاں رہی ہوں گی؟

ج میرے واحد ادیب دوست عبداللہ حسین تھے۔ میری شاعروں ادیبوں سے زیادہ دوستی نہیں ہوتی، مجھے مصور زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ شاعروں ادیبوں میں ایک خاص طرح کی رعونت ہوتی ہے۔ کوئی ایک آدھ اچھے شعر کہہ لے یا پھر ناول لکھ لے تو مزاج آسمان پر چڑھ جاتا ہے ،مصوروں میں یہ رعونت نہیں ہوتی۔ صادقین جیسا مصور بھی، جو کہ میرا بڑا اچھا دوست تھا، اس میں یہ رعونت نہیں تھی۔

س آپ کی کتابوں کے دیگر زبانوں میں تراجم بھی ہوئے ہوں گے؟ تراجم کے بارے

میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: تراجم کا اسی صورت میں فائدہ ہے جب کوئی عالمی سطح کا اشاعتی ادارہ اسے شائع کرے اور یہ بیرون ملک مارکیٹ ہو، ورنہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میری کتاب ''اے غزال شب'' کا انگریزی کا یہاں ترجمہ ہوا اور پھر اکیڈمی آف لیٹرز نے میرے ناول ''بہاؤ'' کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے، مگر وہ یہاں بس محدود دائرے تک ہی رسائی حاصل کر پائی ہے۔ فائدہ ترجمے کا جبھی ہے اگر اسے کوئی عالمی سطح کا اشاعتی ادارہ شائع کرے اور وہ غیر ملکی نمایاں اشاعتی ادارہ ہو تب ہی اس کا فائدہ ہے۔ ورنہ ان تراجم کا کوئی فائدہ نہیں۔

س: کس ادیب نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟ کسی خاص لکھاری کا آپ کی تحریر پر بھی اثر آیا ہو؟ پسندیدہ تحریریں؟

ج: میرا بہت زیادہ مطالعہ رہا ہے۔ میں نے سارا اردو ادب پڑھا ہے۔ اور پھر اس سے زیادہ انگریزی لٹریچر پڑھا ہے۔ میں نے نویں جماعت تک تمام اردو ادب پڑھ ڈالا تھا۔ سولہ سال کا تھا جب پڑھنے کے لئے برطانیہ چلا گیا اور پھر چھے سال تک وہیں زیرِ تعلیم رہا اور انگریزی ادب بھی پڑھتا رہا۔ منٹو صاحب میرے ہمسائے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے اندر خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ادیب بننا چاہیئے۔ منیر نیازی مجھے بڑے پسند تھے۔ شفیق الرحمان کی کتاب ''برساتی'' کو میں اپنی پہلی تصنیف کی ماں قرار دیتا ہوں۔ میں نے سب سے سیکھا ہے، بیدی کرشن چندر سے سیکھا ہے۔ ٹالسٹائی، گبریل گارسیا مارکیز سے بہت کچھ سیکھا اور اسی طرح البانیہ کے اسماعیل کادارے نے بہت متاثر کیا۔ لیکن میں نے کبھی ان کے انداز میں لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ سوائے ''پکھیرو'' کے ان دنوں وجودیت کا بڑا چرچا تھا، جس کا انداز اپنانے کی کوشش کی تھی۔

س: ہمارے ادب میں ایک وقت ایسا گزرا ہے جب مختلف نظریاتی تحریکیں زوروں پر تھیں، آپ نے کبھی کسی تحریک میں حصہ لیا؟

ج: اگر آپ میری شخصیت اور فن کو بیان کرنا چاہیں تو میں کہوں گا کہ میں ترقی پسند تحریک کی ایک شاخ ہوں۔ باقی جدیدیت ہے، چونکہ ہم پڑھتے بہت زیادہ ہیں۔ مگر مجھے یاد نہیں رہتا، کبھی کبھی کسی ناول کا ایک سو صفحہ پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ ناول پڑھ چکا ہوں۔

س: ساری دنیا گھومے، کون سا ملک، کون سا شہر زیادہ پسند آیا؟ اگر کسی کا نام لینا پڑے؟

ج: کسی ایک جگہ کا نام تو نہیں لوں گا چونکہ اس کا انحصار بہت سی چیزوں پر ہے کہ آپ کی کیفیت

اور طبیعت کیسی تھی؟ کھانا کیسا کھایا؟ واش روم صاف ملا کہ نہیں؟ لوگ کیسے تھے جو آپ کو ملے، بنیادی طور پر بستیاں نہیں مکین پسند آتے ہیں۔ اگر پہاڑوں کی بات کی جائے تو پھر مجھے پاکستان کے شمالی علاقہ جات پسند ہیں۔ یقین کریں کہ الاسکاان کے مقابلے مین کچھ بھی نہیں ہے۔ چند سال پہلے جب میرے چند خطرناک آپریشن ہوئے تو میں نے داکٹر سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! کیامیں پہاڑوں پر دوبارہ جاسکوں گا؟ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ مگر واپسی پر مجھے ہرنیا کی شکایت ہوئی تو ڈاکٹر نے کہا کہ میں تو سمجھا تھا کہ آپ مری، نتھیا گلی تک جائیں گے مگر آپ تو بہت زیادہ اونچائی پر چلے گئے میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب مری کوئی پہاڑ تھوری ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی شہر یا علاقہ ایسا نہیں ہوتا جس کو آپ اپنا دل دے بیٹھیں۔

س لکھنے کے علاوہ بھی کوئی پیشہ ورانہ مصروفیت رہی؟

ج زندگی میں کوئی نوکری نہیں کی، کوئی کاروبار نہیں کیا یا پڑھا ہے یا لکھا ہے، بس یہی کام کیا ہے۔

س آپ پر تحقیق بھی بہت ہوئی، اس بارے میں کچھ بتائیں گے؟

ج پاکستانی تعلیمی اداروں میں سب سے زیادہ ریسرچ مجھ پر ہو رہی ہے۔ ایک سو دس ایم فل کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ میں پہلا زندہ آدمی تھا، جس پر پشاور یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی ہوئی، سری نگر یونیورسٹی میں مجھ پر پی ایچ ڈی ہو رہی ہے۔

س اب تک کتنی تصانیف شائع ہو چکی ہیں؟

ج 70 کتابیں ہیں جو اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

س آج کل بھی کچھ لکھ رہے ہیں؟

ج شاید عمر کی وجہ سے لکھنے بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ بھگت سنگھ کی زندگی پر ایک پنجابی ناول میں نے شروع کیا ہوا ہے، وہ مکمل کرنے کی کوشش ہے۔

OOO

مشتاق صوفی

مشتاق صوفی پاکستانی ادب اور میڈیا کا ایک ناقابل فراموش حوالہ ہیں۔ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔انگریزی اخبار میں مختلف موضوعات پر مستقل کالم لکھتے ہیں۔پنجابی زبان کی ترویج کے لئے ہمہ وقت متحرک رہتے ہیں۔تمام زندگی شعروسخن کی آبیاری میں گزری ہے اور آج بھی ان کا تخلیقی سفر پوری آب وتاب اور ولولے سے جاری ہے۔ادب کا بہت گہرا مطالعہ اور سیاسی وسماجی زندگی کا بہت قریبی مشاہدہ رکھتے ہیں۔گزشتہ ایک برس سے ان کا انٹرویو کرنے کی کوشش جاری تھی جو آج آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

س بات کا آغاز ابتدائی زندگی سے کرتے ہیں۔بنیادی تعلیم وتربیت اور بچپن کہاں گزرا؟

ج میری پیدائش ساہیوال میں ہوئی تھی۔ہمارا گاؤں شہر کے پاس ہی تھا۔چند کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔لکھاں والی روڈ پر ہمارے گاؤں کا ساہیوال سے فاصلہ چار اور ہڑپہ سے دس کلومیٹر دوری ہوگی۔یاد رہے یہی وہ قدیمی سڑک ہے جو لاہور کو ملتان سے ملاتی ہے۔کسان گھرانہ تھا ہمارا۔گزراوقات کاشتکاری پر ہوتی تھی۔میرا بچپن وہیں گزرا اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ایف اے میں نے ساہیوال سے کیا اور پھر تھرڈ ایئر میں آ کر لاہور میں داخلہ لے لیا۔گریجوایشن اور ماسٹرز پھر لاہور سے ہی مکمل کیے۔

س یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ تحریر کو ذریعہ اظہار بنایا جائے؟ لکھنے کی طرف کب اور کیسے راغب ہوئے؟

ج دلچسپ بات ہے ،لکھنا، پڑھنا اور شعروسخن تو بچپن میں دور کی بات لگتی تھی۔ہمارے گاؤں میں ایک نائی ہوتا تھا۔وہ ہر دس، پندرہ دن بعد ہمارے بال کاٹنے کے لئے آتا تھا۔ بڑا ہینڈسم اور خوبصورت جوان تھا۔اس کی عادت تھی کہ بال کٹنے کا خوف ہم بچوں کے دل سے دور کرنے کے لئے وہ ہمیں ہنسانے کی کوشش کرتا تھا،لطیفے اور شعر سناتا تھا۔خدا بخش نائی کا یہ ہنر مجھے بہت لبھاتا تھا شعر تو اتنا سمجھ میں نہ آتے تھے مگر ان کا ردھم اچھا لگتا تھا۔وہاں سے کچھ

سمت ملی اور طبیعت میں موزونیت تو شاید پہلے سے ہی موجود تھی۔ چونکہ شعر سننا اچھا لگتا تھا۔ شاعری باقاعدہ طور پر میں نے اس وقت شروع کی جب گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھنے کے لیے آیا۔ یہ ایم اے کرنے کے دوران زیادہ نکھر کر سامنے آئی۔

س گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھنے کا تجربہ کیسا رہا؟ اس دور کو کیسے دیکھتے ہیں؟ آپ کی شخصیت میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اس درس گاہ میں پڑھنے سے؟

ج میرے نزدیک اس دور میں گورنمنٹ کالج کے تعلیمی معیار سے بھی بڑھ کر اہم اس کا کلچر تھا۔ مجھے اس ماحول نے بہت متاثر کیا۔ وہاں بات کرنے کی آزادی تھی۔ چھوٹے شہروں میں بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ اس دور میں جیلانی کامران ہمیں پڑھاتے تھے۔ ان سے بہت سیکھا۔ پھر فرانس سے پڑھ کر آئے ہوئے لئیق بابری جو ہمیں فرانسیسی پڑھاتے تھے، بہت ہی عمدہ اور نفیس آدمی تھے۔ میری طرح پنجابی میں شاعری کرتے تھے، یہی باہمی دلچسپی ہماری قربت کی وجہ بھی بن گئی۔ گورنمنٹ کالج کی سب سے خوبصورت بات حریت فکر کی روایت اور سوچنے کی آزادی، مکالمے کی حوصلہ افزائی تھی۔ یہ بات ساہیوال میں نہیں تھی اور آپ کے میاں چنوں میں بھی شاید نہیں ہوگی۔ اختلاف رائے کی برداشت نے مجھے جی سی میں بہت متاثر کیا۔

س آپ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو میڈیا سے تعلق بھی ہے۔ میڈیا کی جانب کیسے آئے؟

ج گورنمنٹ کالج لاہور کے اکثر طلباء کا شوق تو سول سروس میں جانے کا ہوتا ہے۔ اکثر جی سی والوں کو طاقتور بابو بننے کی جانب مائل دیکھا۔ مگر زمانہ طالب علمی میں ہی ہمارے دوست لکھنے پڑھنے والے لوگ بن گئے۔ بائیں بازو کی سوچ رکھنے والے دانشور اور شاعر حلقۂ احباب میں آنے کا یہ اثر ہوا کہ ہم نے فیصلہ کیا کہ سول سروس کی طرف نہیں جانا ہے۔ ان دنوں پی ٹی وی بہت بڑا ادارہ تھا۔ یہ واحد ٹیلی ویژن چینل ہوا کرتا تھا پورے ملک کے اندر۔ تمام بڑے مصنفین، گلوکار، موسیقار اور بڑے بڑے فنکار اس سے وابستہ تھے۔ ان دنوں پی ٹی وی نے پہلی مرتبہ پروگرام پروڈیوسر براہ راست بھرتی کرنے کا اعلان کیا۔ میں بھی بغیر کسی سفارش کے چلا گیا۔ اسلم اظہر نے انٹرویو کیا۔ بڑے شاندار، روشن خیال اور سخن فہم آدمی تھے۔ حالانکہ میری کوئی سفارش بھی نہیں تھی پھر بھی منتخب ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ باقی لوگ بھی بغیر سفارش کے ہی بھرتی ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بغیر سفارش کے بھی لوگ بھرتی ہو جایا کرتے تھے۔ وجہ یہ بھی تھی کہ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد گھر والوں سے پیسے مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔

س پنجابی زبان وادب کی طرف رجحان کب اور کیسے ہوا؟

ج جن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرتعلیم تھا تو میرا قیام نیوہوسٹل میں تھا۔معروف لکھاری اجمل نیازی بھی ان دنوں نیوہوسٹل میں ہی رہتے تھے۔ مجھ سے سینئر تھے اور کورس مکمل کر کے جا رہے تھے۔ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ تم پنجابی کونسل کے سیکرٹری کیوں نہیں بن جاتے؟ میں نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کردی۔ چونکہ عمر کے اس حصے میں آدمی اپنی اہمیت بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔لہذا میں نے آمادگی اورشوق ظاہر کیا تو انہوں نے کالج انتظامیہ اور پنجابی سوسائٹی کے انچارج سے بات کی۔عام طور پر تو ماسٹرز کے طالب علم کو جنرل سیکرٹری رکھتے ہیں لیکن مجھ سے ملاقات کے بعد انہوں نے میرے ادبی رجحانات کو مدنظر رکھتے ہوئے منتخب کر لیا۔افتتاحی سیشن کے لئے انہوں نے میرے ذمے لگایا کہ معروف پنجابی شاعر نجم حسین سید کو مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی دعوت دیں۔ وہ ان دنوں اے جی آفس میں ایک بڑے سرکاری افسر تھے۔ میں ملنے کے لئے گیا تو دربان کے ہاتھوں اپنا تعارفی رقعہ بھیجا۔نجم حسین سید صاحب نے مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا اور گورنمنٹ کالج ہماری دعوت پر آنے کی آمادگی بھی ظاہر کردی۔ مجھے بہت اچھا لگا پھر جب وہ تشریف لائے تو ان سے بہت ساری شاعری بھی سنی۔ بہت پسند آئی چونکہ پنجابی اور شاعری بے شک میرا شعبہ نہیں تھا مگر دیہاتی ہونے کے ناطے زبان پر مجھے اچھی شدبدھ حاصل تھی۔ایک لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اجمل نیازی میرے پنجابی شعروسخن اور زبان کی جانب راغب ہونے کا بنیادی محرک ہے۔ یہ وہی ایام تھے جب میں نے پنجابی شاعری کا آغاز کیا تھا۔

س آپ کی پہلی کتاب نثر کی تھی یا شاعری کی؟

ج شاعری کی کتاب پہلے شائع ہوئی تھی۔نثر کی جانب بعد میں آیا۔

س کس زبان میں تھی یہ پہلی کتاب؟

ج پنجابی زبان میں ہی شاعری کرتا ہوں۔اردو میں صرف ایک ہی نظم آج تک لکھی ہے۔ یہ کتاب بھی پنجابی زبان میں ہی تھی۔

س آپ کو روشن خیال اور ترقی پسند مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ برصغیر میں ترقی پسند تحریک کا ادب کی ترویج میں کیا حصہ ہے؟

ج پہلی بات تو یہ ہے کہ میں خود کو معروف معنوں میں ترقی پسند ادیب نہیں سمجھتا ہوں۔ ترقی

پسند تو ہر ادیب ہوتا ہے مگر میں آرتھوڈوکس بائیں بازو کا کارکن نہیں ہوں۔ خود کو ترقی پسند کی بجائے عوام دوست کہلوانا پسند کرتا ہوں۔ ترقی پسند تحریک ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ میرے خیال میں جو ادیب انسان دوست نہیں وہ اچھا ادب تخلیق ہی نہیں کرسکتا۔ ہماری جوانی کے دنوں میں دائیں بازو اور بائیں بازو کے لکھاریوں میں تقسیم بڑی واضح تھی۔ پھر بائیں بازو میں بھی ماسکو نواز اور چین نواز دھڑے تھے۔ میرا دونوں کے ساتھ تعلق تھا مگر میں مکمل طور پر کسی گروہ کا بھی حصہ نہیں تھا۔

س پنجابی زبان کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

ج معاصرانہ پنجابی زبان کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے۔ ہمارے ملک کی اور کوئی بھی زبان اتنی قدیم نہیں ہے۔ اس وقت کی پنجابی سندھی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ پہلی ادبی دستاویز ہمیں جو پنجابی زبان میں ملتی ہے وہ گیارہویں صدی عیسوی کی ہے۔ آج سے ایک ہزار سال قبل جب ملتان میں اسماعیلی مسلک کی حکومت تھی تو وہاں پر یہ مذہبی گیتوں کی کتاب ''گنان'' کے نام سے مرتب ہوئی۔ اس زبان پر عربی کے بھی اثرات تھے چونکہ سندھ پر عربوں کی حکومت تھی اور اسماعیلی حکمران بذات خود بھی عرب تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس وقت کی پنجابی پر فارسی کے اثرات بھی نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ لاہور کے گورنر کا ایک معتمد خاص تھا مسعود سعد سلمان، زیر عتاب آنے کے بعد اس نے حبسیات پر ایک دیوان لکھا قید کے دوران جو کہ فارسی میں لکھا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک ہندوی دیوان بھی تھا۔ اب مگر ناپید ہے۔ بارھویں صدی میں بابا فرید نے باقاعدہ شعری روایت کے خدوخال طے کیے۔ رنجیت سنگھ کے دور تک تو اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر انگریز نے پنجابی زبان کی بے توقیری کی تھی۔ امید ہے اتنی بڑی زبان مرے گی تو نہیں چونکہ سکھوں کی تو یہ مذہبی زبان بھی ہے۔

س آپ کا پسندیدہ شاعر اور مصنف؟

ج کس زبان میں؟

س پنجابی زبان سے اگر ابتداء کریں؟ عہد حاضر کے شعراء جو پسند ہوں؟

ج نجم حسین سید، امرتا پریتم، شوکمار بٹالوی، پاش، نسرین انجم بھٹی، زمرد ملک اور راجہ صادق اللہ مجھے زیادہ پسند ہیں۔

س اردو میں شاعری کے تین عہد بیان کیے جاتے ہیں، میر، غالب اور اقبال یا پھر فیض

احمد فیض کا موجودہ عہد ہے۔ پنجابی زبان میں بھی کلاسیک ادب کو اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

ج پنجابی کلاسیکی ادب میں فنی اعتبار سے بڑے شعراء کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اردو کی طرح پنجابی میں ایسی تقسیم کرنا اس لئے شاید ممکن نہ ہو۔ آپ دیکھیں دامودر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ جس نے پہلی پہلی مرتبہ ہیر کا کردار تخلیق کیا اور پہلی ہیر لکھی۔ اسی کی پیروی میں وارث شاہ اور دیگر نے پھر پیروی کرتے ہوئے لکھا داستان گو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جس میں حافظ برخوردار، میاں محمد بخش۔ مترنم شاعری میں گرونانک، فرید، بلھے شاہ، علی حیدر، ہاشم شاہ، سلطان باہو، رزمیہ شاعری کی بات کریں تو اس بابت نجابت کی نادر شاہ دی وار اہم ہے۔ لہذا پنجابی میں کسی ایک شاعر کا نام لینا ماسوائے بابا فرید کے، جو کہ اس شعری روایت کے بانی ہیں، پورا عہد کسی ایک شاعر کے نام جوڑنا ممکن اور مناسب نہیں ہوگا۔ بڑے فن والے بہت شاعر ہیں۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

ج میری بارہ، تیرہ کتب اب تک شائع ہو چکی ہیں شاعری اور نثر دونوں ہی ان میں شامل ہیں۔ زیادہ تر پنجابی اور انگریزی میں ہیں۔ تنقید کے موضوع پر دو کتابیں اور انگریزی میں مزید دو کتابیں اس وقت زیر طبع ہیں۔ میں نے تراجم بھی کئے ہیں۔ ان میں میاں کمال دین کی کہانیوں کا ترجمہ آج کل انگریزی زبان میں زیر طبع ہے۔ بہت ہی خوبصورت داستان گو گزرے ہیں میاں کمال دین۔

س سوشل میڈیا کو ادب کے فروغ میں معاون سمجھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا کی رسائی تو بہت زیادہ ہے۔ اس کی رسائی سے تو انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر اس میں وہ سنجیدگی نظر نہیں آتی۔ کسی حد تک ہمارا سوشل میڈیا ہمارے سماج کی ہی جھلک دکھا رہا ہوتا ہے؛ جیسے ہم ہیں ویسا ہمارا سوشل میڈیا ہے، فیس بک کی نسبت ٹوئیٹر پر بہتر ذہنی استطاعت کے لوگ جمع ہوتے ہیں، مگر وہ زیادہ سیاسی فورم ہے۔

س پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ؟

ج آبادی میں بے پناہ اضافہ ہمارا مسئلہ نمبر ایک ہے۔ اتنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کو نہ تو مناسب صحت کی سہولیات فراہم کرنا ممکن ہے اور نہ ہی معیاری زیور تعلیم سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی سہولیات کی فراہمی بھی اس قدر تیزی سے بڑھتی بے پناہ آبادی کو فراہم کرنا ممکنات میں سے نہیں ہے۔ اس بابت ہمیں بنگلہ دیش سے رہنمائی لینی چاہیئے کہ انہوں نے

کیسے اپنی آبادی پر کنٹرول کیا ہے، اس کے بغیر ترقی کی راہ پر چلنا ممکن نہیں ہے۔

س آپ مترجم بھی ہیں، بحثیت ادیب اور قاری آپ کی نظر میں تراجم کی کیا اہمیت ہے؟

ج جس طرح معیشت، سماج، ثقافت ہر شعبے میں زبانوں کے تراجم کی اہمیت بہت زیادہ ہے آج کل اسی طرح ادب میں بھی ترجمہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ انہی کے سبب ہی ہمیں دنیا بھر کے ادیبوں سے آشنائی وتعارف ہوتا ہے، تراجم کی بدولت ہی ہم غیر ملکی زبانوں کے ادب سے متعارف ہوتے ہیں۔ میری نظر میں جو تحریر ترجمے کے ذریعے کھڑی نہیں ہوسکتی اس میں کوئی بنیادی کمی ہے۔ ممکن ہے اس میں مقامی رنگ ہو یا پھر استعارے جو ترجمے کے بعد اپنا رنگ وحسن کھو دیتے ہوں۔ مگر پھر بھی بڑی تحریر تو وہی کہلائے گی جو ترجمے کے بعد بھی کھڑی رہے۔ بائیں بازو کے نظریات کا آپ نے ذکر کیا ہے، اگر ناظم حکمت، پابلو نرودا ترجمے کے بعد بھی یہاں مقبول ہو سکتے ہیں تو پھر فیض احمد فیض کیوں ترجمہ ہونے کے باوجود بیرونی دنیا میں ویسی شہرت اور پذیرائی حاصل نہیں کر سکے؟ اس پر ہمیں سوچنا چاہئے۔ ہم اسے غیر ملکی قارئین کا قصور تو قرار نہیں دے سکتے، یقیناً کلام میں ہی کوئی کمی ہے۔

OOO

منوّ بھائی

انیس جنوری منو بھائی کی برسی کا دن ہے۔وزیر آباد میں پیدا ہونے والا عہد ساز صحافی، رجحان ساز ڈرامہ نویس،خوش نوا شاعر اور ترقی پسند مصنف ایک با مقصد اور جدوجہد سے بھرپور زندگی گزار کر چند سال پہلے اسی روز دیارِ عدم روانہ ہوئے۔منو بھائی سے جب کوئی ان کا سن پیدائش پوچھتا تو مذاقاً ہٹلر کے جرمنی میں برسرِاقتدار آنے کے واقعے کو ساتھ ملا کر 1933 بتایا کرتے تھے۔جس منیر احمد قریشی کا نام احمد ندیم قاسمی نے منو بھائی رکھا، وہ چھ دہائیاں صحافت میں بھرپور طریقے سے سرگرم رہے مگر ان کے بدترین مخالف بھی ان کی دیانت کی گواہی دیتے تھے۔نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی کہنے پر مجبور تھے کہ اس شخص نے کبھی اپنے نظریات کی قیمت وصول نہیں کی، قلم کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیا۔تمام زندگی انہوں نے اپنے قلم کو غریبوں کے حقوق اور کمزوروں کی حمایت کے لئے استعمال کیا۔بے کسوں، مسکینوں اور لاچار و نادار لوگوں سے ان کی خصوصی محبت تھی۔تمام زندگی اس مجبور و محکوم طبقے کے لئے وہ قلمی جہاد کرتے رہے۔میری خوش قسمتی ہے کہ میرا ان کی صحبت میں کافی وقت گزرا۔ان کے ساتھ عقیدت مندی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے شروع ہو گیا تھا۔انہی ملاقاتوں میں ایک دن میں نے اور ابرار ندیم نے منو بھائی کے گھر ان کی بیگم کی موجودگی میں ان کا انٹرویو کیا جو کہ ماہنامہ ارژنگ میں شائع ہوا۔دوبارہ اشاعت کا مقصد خراجِ تحسین پیش کرنا ہے اور قارئین کو یاد کرانا ہے کہ ایسے بلند کردار بھی اہلِ قلم گزرے ہیں۔

س اپنی زندگی کے ابتدائی سفر کے متعلق کچھ بتائیں؟

ج میری پیدائش 6 فروری 1933 کی ہے۔یہ وہی دن ہے جب جرمنی میں ہٹلر کی چانسلرشپ ہوئی۔میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس سے ہے۔میرے والد ریلوے میں ملازم تھے۔اس دور میں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔تحریک آزادی ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں میں شعور بڑھ رہا تھا۔میرے دادا امام مسجد تھے لیکن ان کا پیشہ کتابوں کی جلد بندی تھا۔امامت ان کا پیشہ نہیں تھا۔وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ان کا نام میاں غلام حیدر تھا۔انہوں

نے گیتا کا پنجابی ترجمہ بھی کیا۔وہ مہاراجہ کشمیر کے فارسی کے اتالیق بھی رہے۔ پنجابی کے ممتاز لکھاری شریف کنجاہی میرے ماموں تھے۔ان کی وجہ سے میرا ترقی پسندوں سے تعلق بنا جن میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں۔جن کو میرے بارے میں علم تھا کہ گھر میں مجھے منو کہا جاتا ہے۔انہوں نے میرا نام منو بھائی رکھا اور امروز میں میری ایک نظم چھاپی۔

س بچپن کن شہروں میں گزرا اور اخبار میں کیسے لکھنا شروع کیا؟

ج میری پیدائش وزیر آباد کی ہے۔اس کے بعد راولپنڈی اور پھر لاہور میں وقت گزرا۔بچپن میں راولپنڈی سے ''تعمیر'' اخبار نکلتا تھا جس میں لکھنے کی ابتداء کی۔

س ''سونا چاندی'' آپ کا ایک یادگار ٹی وی ڈرامہ ہے جس کے بعد اب ایک عرصہ سے آپ نے ٹی وی کے لئے ڈرامہ نہیں لکھا اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج موجودہ دور میں ٹی وی پر کمرشل بریک آیا ہوا ہے،جس میں ہمارا کوئی کام نہیں۔اب یہ بریک ختم ہونے والا ہے۔وہ ڈرامہ جو اشفاق احمد کے ساتھ قبر میں اتر گیا تھا وہ دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔اب میں جیو کے لئے سونا چاندی اینڈ کمپنی کے نام سے دوبارہ ڈرامہ لکھ رہا ہوں جس میں گلیمر کی بجائے اصل کرداروں کو سامنے لاؤں گا۔جو معاشرے کی اصل تصویر ہیں۔

س پنجابی کے علاوہ اور کس زبان میں شاعری کی؟

ج میں نے شاعری پنجابی زبان میں ہی کی ہے اور وہی میری پہچان بنی ہے۔اس شاعری پر مجھے پرائیڈ آف پرفارمنس ملا ہے۔میرا پنجابی مجموعہ ''اجے قیامت نئیں آئی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

س شاعری کے لئے آپ نے پنجابی زبان کا ہی انتخاب کیوں کیا۔اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج پنجابی میری مادری زبان ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے لئے اپنی ماں بولی میں اظہار زیادہ آسان ہے۔میں نے اس حوالے سے فیض صاحب سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ''خواب کس زبان میں دیکھتے ہو؟''

تو میں نے کہا ''پنجابی میں''

انہوں نے کہا ''بس پھر پنجابی میں ہی لکھو۔''

س شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں آپ کو کونسا تعارف زیادہ پسند ہے؟

ج ڈرامے میں میری پذیرائی بہت زیادہ ہوئی لیکن میرے خیال میں کالم نگاری میں میں بہتر انداز میں اظہار کرسکتا ہوں۔

س ایک کالم نگار کے لئے غیر جانبدار رہنا کس حد تک ضروری ہے؟

ج میرے خیال میں ایک کالم نگار کے لئے غیر جانبداری ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر میں جانبدار نہیں تو کالم نگاری کیوں کررہا ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے بے انصاف نہیں ہونا چاہئے۔ جو چور کے خلاف، جہالت کے خلاف ہے ناانصافی کے خلاف ہے وہ غیر جانبدار نہیں ہوسکتا۔ کالم نگار کو چاہئے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو انصاف سے کام لے۔

س آج کے دور میں ترقی پسند تحریک کا وجود ہے؟

ج آج ترقی پسند تحریک اپنے اس انداز میں تو موجود نہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس دور میں اس تحریک کے انداز کو اپنایا وہ آج نامور حیثیت میں موجود ہیں۔

س اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج:۔ جو بھی انسان کی محرومی، آرزوؤں، خواہشوں کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ وہ منٹو ہو، فیض ہو یا انتظار حسین ہو، میرے خیال میں ہر وہ لکھنے والا جو انسان کے حق کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ ان معنوں میں میں انتظار حسین کو بھی ترقی پسند سمجھتا ہوں۔

س پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟

ج ہمیں ماضی کی طرف لے جایا جارہا ہے۔ جبکہ ہم مستقبل کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔ یہ جو انتہا پسندی جیسے رویے ہیں یہ ہمیں ماضی کی طرف لے جانے والے رویے ہیں، میرے خیال میں بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کی یہ آخری ریل چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل راستے کی طرف واپس آئیں گے اور پاکستان کی تعمیر اصل معنوں میں کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی تحریک پاکستان چل رہی ہے۔ آج کا پاکستان قائداعظم، علامہ اقبال اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں ہے۔

س رمشا کیس کے حوالے سے آپ کا کیا موقف ہے؟

ج پہلی دفعہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء نے حق اور انصاف کی بات کی ہے۔ ایک ایسی بچی کے بارے میں جو کہ ذہنی طور پر نارمل نہیں یہ کہنا کہ توہین قرآن پاک کی مرتکب ہوئی ہے اپنی جگہ خود ایک ابنارمل رویہ ہے۔ پہلی دفعہ اس کیس میں نظر آرہا ہے کہ جج بغیر کسی دباؤ کے فیصلہ کرسکیں گے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ قیام پاکستان سے پہلے ہم ہندوستان میں خود ایک اقلیت تھے۔ آج ہمیں اقلیتوں کو تنگ کرتے وقت شرم محسوس کرنی چاہیے۔

مولانا محمد اکرم اعوان

س کب سے شاعری کر رہے ہیں؟

ج مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میں نے شعر کہنا کب شروع کیا لیکن یہ یاد ہے کہ میرا شعری مجموعہ 80ء کی دہائی میں شائع ہوا۔

س کس شاعر نے متاثر کیا؟

ج شاعری میں دو شعبے ہوتے ہیں۔صوفیانہ شاعری اور دنیاوی شاعری۔صوفیانہ شاعری ایک خاص سٹیج پر آتی ہے۔اس سٹیج پر یکسوئی اور قلب میں مخصوص صلاحیتیں دوسروں سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔اس میں شاعر دوسروں کی تکلیفیں اور حالات اپنی ذات کے پردے میں بیان کرتا ہے جس سے پڑھنے والے پر گہرا اثر ہوتا ہے اور اس کو وہ شاعری اپنے دکھوں، تکلیفوں اور ذات کا عکس لگتی ہیں۔اس کے مقابلے میں دوسرے شاعر وہ ہیں جو عام آدمی کے مقابلے میں فطری طور پر تو زیادہ حساس ہوتے ہیں مگر وہ جو شاعری کرتے ہیں، اس میں نسبتاً وہ گہرائی اور تاثیر نہیں ہوتی جو صوفیانہ شاعری کی خاصیت ہے۔جس طرح فلمی گیت بن جاتے ہیں یا اس طرح کی اصناف کی دیگر چیزیں وہ اس میں آتے ہیں۔ ہمارے ہاں شعراء کا بیشتر طبقہ اس میں آتا ہے۔اس طرح جب آپ پسندیدہ شاعر کا پوچھتے ہیں تو اس کا جواب میں کچھ یوں دوں گا کہ ذکر اذکار طلب الٰہی اور تصوف سے ہٹ کر جو شاعری ہے اس میں عہد کا سب سے بڑا شاعر فیض احمد فیض ہے اور جو شاعری تصوف کی آخرت کی یا حب الٰہی کی ہے اس میں علامہ اقبال میرے پسندیدہ ہیں۔

س کلاسیکی شاعروں میں آپ نے شاہ حسین اور وارث شاہ کو بھی پڑھا ہوگا، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ ان کو صرف شاعر سمجھتے ہیں یا صوفی شاعر؟

ج جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ دونوں بہت بڑے صوفی شاعر ہیں۔ جہاں تک شاہ حسین کے آخری عمر میں شریعت سے ہٹنے کی بات ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ صوفیوں پر ایک وقت

ایسا آتا ہے جب انھیں وہ روحانی کیفیات میسر آجاتی ہیں جوان کی جسمانی برداشت سے باہر ہوتی ہیں۔ وہاں جا کر ان کی عقل ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ تصوف کی زبان میں ان کو مجذوب کہا جاتا ہے یعنی ان پر جذب وارد ہو جاتا ہے اور جذب وارد کمال نہیں بلکہ صوفیوں کے نزدیک کمزوری ہے۔ کسی نبی پر کبھی جذب وارد نہیں ہوا کیونکہ نبی کامل ہوتا ہے۔ کوئی نبی مجذوب نہیں ہوا۔ ہر نبی ساری کیفیات سے گزرتا ہے مگر مجذوب نہیں ہوتا، عام آدمی مجذوب کو کامل سمجھتا ہے لیکن صوفیوں کے نزدیک مجذوب ہونا کمزوری ہے۔ مجذوب پاگلوں میں شمار ہوتا ہے۔ مجذوب ہونے کے بعد شرعی طور پر اس کے اعمال شمار نہیں ہوتے، اس لئے مجذوب ہونے کے بعد ان سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں ان کو زیر بحث نہیں لانا چاہئے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ شریعت کسی صاحب عقل کو اس کے اتباع کی اجازت نہیں دیتی۔

س آپ کی شاعری میں ہجر و فراق کے مضامین زیادہ ملتے ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج اصل بات یہ ہے کہ جتنے اللہ اللہ کرنے والے لوگ ہیں ان پر وصال کے لمحات بہت کم آتے ہیں جس میں وہ راحت محسوس کریں گے کیونکہ انسانی زندگی میں بے شمار مصروفیات ہیں جو اسے وصال کی کیفیات سے الگ رکھتی ہیں اس لئے ہمارے بہت سے صوفیوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، ترک دنیا کر کے جنگلوں میں نکل گئے کیونکہ وہ اس کیفیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے لیکن شریعت انسان پر مسلط ہے، کسی ایک کیفیت کے لئے معاشرے کو چھوڑ دینا یہ اس کی کمزوری ہے اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے نامور بزرگان دین جب وہ دنیا سے الگ ہوئے تو مقامات تصوف میں جس مقام پر وہ دنیا سے الگ ہوئے، اس میں آگے ترقی نہیں ہوئی کیونکہ ترقی محتاج تھی دنیا میں رہ کر عمل کرنے کی، جب دنیا سے الگ ہوئے اس میں آگے ترقی نہیں ہوئی۔ ایک طرح سے اعمال وہاں جا کر رک گئے تو یہ جو فراق کی کیفیات ہیں اس سے گھبرا کر یہ لوگ دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ اسے سہنا، اسے برداشت کرنا، اس میں رہنا، اس میں جینا اصل کمال ہے۔ یہ اللہ کی توفیق ہوتی ہے جنہیں وہ عطا کرتا ہے وہ اس ہجر و فراق کی کیفیت کو جھیلتے رہتے ہیں اور دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ عام آدمی کو جب ہم متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو ہماری نظر میں کیونکہ وہ فراق میں ہے مگر اسے اس کا احساس نہیں اللہ کی ذات سے دوری اور اس کی یاد سے محرومی ایک ایسی کیفیت ہے جو فراق کی ہے مگر ایسا مرض ہے جس کا احساس مریض کو نہیں ہے۔ تو

ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ میں کس کیفیت میں ہوں۔ ہوسکتا ہے پھر وہ اس سے نکلنے کی سعی کرے۔

س عام لفظوں میں ہجر و فراق کی اس کیفیت کو ہم بے چینی یا بے سکونی کہہ سکتے ہیں جس کا تقریباً سارا معاشرہ شکار ہے۔

ج بالکل ہم اس کو بے چینی یا بے سکونی کا نام دے سکتے ہیں کہ آدمی سبب نہیں جانتا لیکن وہ اکثر بے سکون یا بے چین رہتا ہے لیکن جب اس کو یاد الٰہی کا راستہ مل جاتا ہے یا اس پر کچھ لمحات ایسے گزرتے ہیں جب وہ خود کو اللہ کو پاس پاتا ہے تو اسے قرار آجاتا ہے۔

س آپ نے نثر بھی لکھی ہے، نثر اور شعر میں سے ابلاغ کا بہترین ذریعہ کسی کو خیال کرتے ہیں؟

ج میں نے جو نثر لکھی ہے وہ زیادہ تر مذہبی موضوعات کے متعلق ہے یا پھر میں نے دیارِ غیر کے جو سفر کئے ہیں وہاں کی معاشرت کے بارے بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ نثر بہت کم لکھتا ہوں۔ کسی خاص موضوع پر مضمون لکھنا پڑا تو لکھ لیا ورنہ میں زیادہ تر شعر کہنے میں سہولت محسوس کرتا ہوں۔

س آپ کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ آپ نے شکار میں چیتے بھی مارے ہیں، شاعروں کے حوالے سے ڈینگیں مارنا تو سنا تھا مگر جرأت اور بہادری کا عملی مظاہرہ شاید ہی کسی شاعر نے کیا ہو، اس تناظر میں کسی شاعر کے لئے چیتا مارنا کیا ایک مختلف اور انوکھا کام نہیں؟

ج میری زندگی میں جو شعبے فی الوقت چل رہے ہیں وہ تقریباً سولہ سترہ کے قریب ہیں جو سارے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ یہ مجھے بھی سمجھ نہیں آتی کہ میں کیسے چلا رہا ہوں لیکن الحمد اللہ چل رہے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی ربط نہیں بنتا مثلاً یہی شعر کہنا اور شکار کرنا یا بزنس کرنا اور جہاں گردی بھی کرنا، تو یہ سارے الگ الگ شعبے ہیں لیکن زندگی کے شعبے ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ فرصت کا جو لمحہ ملے اسے استعمال کرنا چاہئے اور تخلیقی کام جتنے بھی ہو سکتے ہیں جس میں کسی ایک انسان کا بھلا ہوتا ہے وہ کام کرنے چاہئیں۔

س ''ادب برائے ادب'' یا ''ادب برائے اصلاح'' میں سے کس نظریے پر یقین رکھتے ہیں؟

ج دیکھیں جی شعر کسی بھی شاعر کے مزاج کا عکس ہوتا ہے۔ شعر کو آپ تقسیم کر کے نہیں کہہ سکتے کہ ایک شاعر کا مزاج سنگین ہے اور وہ بات اصلاح کی کرے۔ ایک آدمی ایسا ہے اس کو اصلاح احوال کی فکر ہے، اپنی بھی دوسروں کی بھی، وہ عشق و محبت کا شعر بھی کہے گا تو اس میں کہیں نہ کہیں

کوئی اصلاح کا پہلو نظر آئے گا۔ شاعر کا جو مزاج ہے وہ شاعری میں منعکس ہوتا ہے۔

س بقول معروف شاعر خالد احمد، خوبصورت شکل وصورت کا انسان کسی اضطراب کا شکار نہیں ہوتا، اس کے مقابلے میں کم شکل لوگ اپنی شخصیت کی کمی دور کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں جیسے شعر کہنا، افسانہ لکھنا، کالم نگاری وغیرہ، اس تناظر میں آپ اس سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں کہ تخلیق کار احساس کمتری کا شکار ہیں؟

ج میرا خیال نہیں کہ ایسا ہے۔ احساس کمتری کا شکار کوئی تخلیقی کام کر ہی نہیں سکتا۔ میری رائے میں جو بندہ احساس کمتری کا شکار ہوگا اس کے لئے نارمل زندگی بسر کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے، وہ کوئی تخلیقی کام کیسے کرے گا۔ تخلیقی کام کرنے والے جو لوگ ہوتے ہیں، ان میں ایک خاص استعداد ہوتی ہے اور یہ بالکل فطری ہوتی ہے۔

س آپ نے شاعری میں کسی سے باقاعدہ اصلاح لی؟

ج میرا ایک عجیب مزاج ہے کہ میں جو لکھ دیتا ہوں اس کو کاٹتا نہیں ہوں۔ میں نے کبھی رَف لکھ کر نیٹ نہیں کیا، کبھی کسی سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی۔ کتاب چھپنے جاتی ہے تو دوست احباب خود ہی اسے دیکھ لیتے ہیں۔ اس میں گا، گے، گی، کوئی اوپر نیچے ہو تو ٹھیک کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی میں باقاعدہ شاعر نہیں ہوں، مزاج میں کوئی بات آ جاتی ہے تو اسے ربط میں لا کر شعر کہہ دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے تک میری بات کا ابلاغ ہو جائے۔ وہ شعری اصناف پر پوری اترتی ہے یا نہیں، میں ان چکروں میں نہیں پڑتا نہ ہی مجھے کوئی شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔ بس یہ خیال رکھتا ہوں کہ دوسرے تک بات سلیقے سے پہنچ جائے ورنہ باقاعدہ شاعری کے لئے اصلاح ضروری ہے لیکن مجھے ایسا کوئی شوق نہیں لیکن الحمدللہ ایک بار جو لکھ دیا اس کو کاٹنا نہیں پڑا

س آپ کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ آپ باقاعدہ طور پر دنیاوی و دینی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن آپ کے ادبی وعلمی کارناموں سے یہ بات بالکل عیاں نہیں ہوتی اور قرآن پاک کی تفسیر لکھنا تو خیر آپ کا بہت بڑا کام ہے؟

ج میں نے باقاعدہ پڑھا نہیں ہے بلکہ میں نے جب ایف اے میں داخلہ لیا تو حالات ایسے ہو گئے کہ مجھے کالج چھوڑنا پڑا اور کسی دینی و دنیاوی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بس جو ذہن میں آتا ہے لکھ دیتا ہوں۔ تیس پارے قرآن پاک کی تفسیر ذاتی شوق، جستجو اور لگن کی بدولت ہے۔

س عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عشق میں ناکامی آدمی کو شاعر بنا دیتی ہے، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

ج ناکامی بھی ایک بات ہے لیکن ناکامی کا تصور خواہشات میں ہے عشق میں نہیں۔ عشق ایسا جذبہ ہے جو بدلہ نہیں چاہتا عشق حقیقی میں تو ناکامی کا سرے سے تصور نہیں۔ آپ کو جو توفیق ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ اللہ کو طلب کریں، دوسرا سرا آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ باقی رہ گئی بات عشق مجازی کی خاکی انسان جہاں نفرت کرتا ہے وہاں وہ انسان سے محبت بھی کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کے راستے میں معاشرتی رکاوٹیں آجاتی ہیں لیکن شاید اسے ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے بھی عشق کا روبار یا سودے بازی نہیں ہے، گھاٹے اور نفع کی باتیں کاروباری لوگوں کی ہیں عاشقوں کی نہیں۔

OOO

منیر نیازی

منیر نیازی شعر وسخن کا ایسا جاوداں حوالہ ہیں جن کے بغیر اردو اور پنجابی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہمارے ماہنامہ ارژنگ کی پوری ٹیم کے ساتھ نیازی صاحب کے ذاتی قلبی مراسم تھے۔جیسی باکمال ان کی شاعری تھی، ویسی ہی بے مثال ان کی گفتگو بھی تھی، پورا سچ بولتے تھے اور نفع ونقصان سے بے نیاز ہوکر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے تھے۔ان کی بذلہ سنجی پر باآسانی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ان کے بارے میں ادبی حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ بندہ ضائع کردیتے تھے مگر جملہ ضائع نہیں کرتے تھے۔لیلائے قضا اگر کچھ تاخیر کرتی، کچھ دیراور نہ آتی توان دنوں وہ اپنی 92ویں سالگرہ منارہے ہوتے۔میری رائے میں فنکاروں کو یاد کرنے کے لئے برسی کی بجائے جنم دن زیادہ مناسب موقع ہے۔ چونکہ حقیقی فنکارتو اپنے فن کی بدولت امر ہوجاتا ہے۔جب کہ برسی تو مرحومین کو یاد کرنے کے لئے منائی جاتی ہے۔

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور

منیر نیازی کے فن اور شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے دو دہائیاں قبل ان سے کی گئی گفتگو قارئین کی بصارتوں کی نظر کرتا ہوں۔

س شعر کس لئے کہتے ہیں؟

ج کچھ پتہ نہیں ہے کہ شعر کس لئے اور کیوں کہتا ہوں۔

س ہمارے ہاں ناقدین کے کردار سے مطمئن ہیں؟

ج میرے خیال میں ہمارے ہاں ناقدین مکمل طور پر علم سے بے بہرہ ہیں۔انہیں اپنے فن تنقید کی الف ب کا بھی نہیں پتہ۔پچھلے باون سالوں میں اورینٹل کالج میں جو جو تنقیدی رویے پڑھائے جارہے ہیں۔اب تک ان سے باہر نہیں نکلے۔جب کہ اس دوران دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔تنقید نگاری تخلیقی جوہر مانگتی ہے۔لیکن ہمارے ہاں کوئی خاص تنقیدی جوہر والا پیدا نہیں

ہوا۔کسی شخص نے تنقید کا نیا جو ہر قائم نہیں کیا۔نقاد طے شدہ اصولوں سے باہر ہو تو اسے رد کر دیتے ہیں۔مغرب میں بھی تنقید ہوتی ہے لیکن ان کا مقصد تخلیق کے حسن وقبیح پر بحث کرنا اور مرکزی خیال کو ڈسکس کرنا ہوتا ہے جو کہ اصلاح وتخلیقی کام ہے۔ہمارا نقاد یہیں پر غلط ہے۔ یہاں دوسرے لوازمات کو پرکھا جاتا ہے حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیکھا جائے کہ شاعر نے کونسا نیا خیال پیش کیا ہے۔اس کی یہ تخلیق تخیلاتی جمود کو توڑنے میں کامیاب ہوئی ہے یا نہیں؟ ہمارا نقاد ہائیکو، ماہیا،غزل اور نظم کو ایک ہی معیار پر پرکھتا ہے اور یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا کہ شاعر نے خیال پر کس حد تک زور دیا ہے۔لیکن ہمارے نقاد کو یہ زحمت کرنا ہوگی اور گہرائی میں جانا ہوگا۔ تعصب کے بغیر بے لاگ فنی تنقید کرنا ہوگی کیونکہ تنقید مداری کا کھیل نہیں ہے۔

س ناقدین کی نظر میں آپ نظم کے شاعر ہیں۔آپ اس رائے سے متفق ہیں؟

ج میں شعر کہتے وقت شعوری کاوش نہیں کرتا اور نہ کوئی خاکہ ترتیب دیتا ہوں کہ مجھے غزل کہنی ہے یا نظم۔اس میں یہ ہوتا ہے کہ مجھے انسپیریشن ہوتی ہے اور میں لکھتا ہوں۔یہ ضروری نہیں کہ میں جو لکھنے جا رہا ہوں وہ حکمرانوں کے جبر کے بارے میں ہو یا اس میں غربت وامارات کا ٹکراؤ ہو۔ میں آزاد ہوں۔مجھے جو چیز انسپائر کرتی ہے اسی کے بارے میں لکھتا ہوں۔میں پابند ہو کر نہیں لکھ سکتا۔فیض صاحب ترقی پسند دور کے بہت بڑے شاعر تھے۔ان کی تخلیقات پر سوشلزم کا سایہ محسوس کیا جا سکتا ہے کیونکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو لکھنے کے دوران ان کا فرض یاد رہتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انجمن ترقی پسند کے مقاصد کو اپنی تخلیقات کے ذریعے آگے بڑھایا۔

س تو اس لحاظ سے کیا تمام ترقی پسند شعراء کا کلام توارد کے زمرے میں آتا ہے؟

ج توارد چوری کے زمرے میں آتا ہے۔میں ترقی پسند شعراء کے کلام کو سرقہ اور توارد کے زمرے میں نہیں لاتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ موضوعاتی شاعری اس ذیل میں نہیں آتی جو گہری شاعری ہوتی ہے۔جبکہ ترقی پسندوں کی تمام تر شاعری موضوعاتی ہوتی ہے۔شاعری میں ہم کوئی چیز نامعلوم سے معلوم میں لاتے ہیں۔ہیگل، مارکس وغیرہ کے فلسفے کی بنیادیں بھی اس شاعری کی مرہون منت ہیں جو کہ ڈوب کر کی گئی ہے۔

س آپ نے اپنے پنجابی کلام کے اردو تراجم بھی لکھے ہیں۔کیا یہ شعوری کوشش نہیں؟

ج جی ہاں میں نے اپنے پنجابی کلام کے اردو تراجم بھی لکھے ہیں۔یہ شاعری میں خود پر طاری جمود کو توڑنے کی ایک شعوری کوشش تھی۔مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ میں ان تراجم سے انصاف

نہیں کرسکا۔ میرے کچھ نظموں کے تراجم دوسرے شعراء نے بھی کیے ہیں کئی جگہ یہ تراجم مجھ سے بہتر ہیں۔

س آپ نے نثر میں دو مختصر پنجابی ڈرامے بھی لکھے جو کافی سراہے گئے۔ باقاعدہ کبھی ڈرامہ لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

ج اپنے بچپن میں بزرگوں سے سنے قصوں میں سے دو کو میں نے ڈرامے کی صورت نثر میں لکھا جسے کافی سراہا بھی گیا۔ ان قصوں کو میں نے منظوم بیان کرنے کے بجائے نثر میں اس لئے لکھا کیونکہ میرا خیال ہے کہ اگر میں انہیں شعر میں بیان کرتا تو وہ مصنوعی لگتے۔ جہاں تک باقاعدہ ڈرامہ نہ لکھنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ کہوں گا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ جب میں لکھنے بیٹھنے لگتا ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ بس ایسی ہی کسی کیفیت میں مجھ سے وہ ڈرامے لکھے گئے۔ دوسرا ویسے بھی مجھے عام کام پسند نہیں جبکہ ڈرامہ ایک عام صنف رہ گئی ہے۔ جس کو دیکھو ڈرامہ لکھ رہا ہے۔

س آپ کے خیال میں ادبی اخبارات، رسائل اور ادبی ایڈیشن ادب کی کس حد تک خدمت کر رہے ہیں؟

ج ادب کی خدمت تو ایک طرف الٹا یہ سراسر پراگندگی پھیلا رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ادبی ایڈیشنوں و رسائل کے انچارج وہ لوگ بن گئے ہیں جو ذہنی اور شعری سطح پر نالائق اور نکمّے ہیں۔ ہاں البتہ اگر میرٹ پر ان ادبی ایڈیشنوں کے انچارج مقرر کئے جائیں تو صورتحال بہتر ہو سکتی ہے۔ مگر ایک تخلیقی ذہن کا آدمی ان جھنجھٹوں میں نہیں پڑے گا۔

س اپنے اب تک کے کام سے مطمئن ہیں؟

ج میں قسمت، مقدر اور مقسوم کا قائل ہوں۔ میرے حالات نے مجھے شاعر بنا دیا۔ میں ہشیار پور کا مہاجر ہوں۔ میں نے ساہیوال میں بکسٹال بنایا۔ سات رنگ کے نام سے مجلہ نکالا۔ ارژنگ پبلشرز کے نام سے پبلشنگ ادارہ قائم کیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر ان چکروں میں نہ پڑتا تو شاید مالی لحاظ سے آسودہ ہوتا۔ میں گھر سے کسی اور کام سے نکلا تھا۔ لیکن میرے راستے میں شاعری آ گئی، یہ کام مجھے پسند آ گیا۔ اب تک میری سولہ کتابیں آ چکی ہیں۔ میں نے بہت لکھا ہے لیکن مجھے تسکین نہیں، مجھے اور لکھنا ہے۔ گھر کے گورکھ دھندوں سے فرصت نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود لکھنا میری مجبوری ہے۔ جلد ہی میرا نیا شعری مجموعہ ''دھوپ کا چوکور ٹکڑا'' منظر عام

پر آ رہا ہے۔

س سرکاری ادبی اداروں کے کردار سے مطمئن ہیں؟

ج بالکل نہیں! کچھ لوگوں نے اپنی سیاسی وابستگیوں اور اثر و رسوخ استعمال کر کے ادارے بنوائے ہیں اور اب یہ لوگ گدھوں کی طرح ان پر قابض ہو کر ان کو نوچ رہے ہیں۔

س ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں کیا رائے ہے اور یہ کہ آپ کا تعلق کس گروہ سے ہے؟

ج ہم ایک منتشر صورتحال میں رہ رہے ہیں۔ قیاس میں زندہ رہنے کے لئے گروہ بندی ضروری ہے۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ میرا کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ دیگر شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی ایک مافیا سرگرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرائڈ آف پرفارمنس اور ستارہ امتیاز جیسے تمغوں کی فراوانی ہے۔ یقین جانیے اس صورتحال میں مجھے اپنے ستارہ امتیاز پر شرم آنے لگی ہے۔

س خواتین شاعرات میں سے کس نے متاثر کیا؟

ج ہمارے ہاں بے شمار شاعرات لکھ رہی ہیں۔ ان میں شمیم اختر اور کزئی، فاطمہ حسن اور فہمیدہ ریاض کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ غزل میں شبنم شکیل اور شاہدہ حسن بہتر غزل لکھ رہی ہیں۔

OOO

مشکور حسین یاد

مشکور حسین یاد اردو شعر و ادب کا ایک ناقابل فراموش حوالہ ہیں۔ ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف۔ تمام زندگی حرفوں کی تخلیق اور تدریس میں گزاری ہے۔ صحافت سے ان کی وابستگی بہت پرانی ہے جب پاکستان بنا تو اس وقت 1947ء میں بھی ایک سرکاری اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ربع صدی گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا جہاں سے ان کے شاگرد ہر شعبہ زندگی میں گئے۔ ان کے شاگردوں میں موجودہ وزیر اعظم پاکستان سمیت بہت سے وزراء اور اہم حکومتی و غیر حکومتی افراد شامل ہیں۔ گزشتہ دنوں ہم نے لاہور کے علاقے ظفر کالونی میں ان کی رہائش گاہ پر ارژنگ کے قارئین کے لئے ایک انٹرویو کیا۔

س ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ج میرے والد صاحب پولیس میں تھے۔ یہ 1925ء کی بات ہے جب ان کی تعیناتی ضلع حصار کے علاقے بھٹنڈا میں تھی تو وہیں موضع منڈی ڈوالی میں میری پیدائش ہوئی۔

س تعلیم کا ابتدائی سلسلہ بھی وہیں شروع ہوا؟

ج ابتدائی تعلیم تو والد صاحب کی سرکاری نوکری کی تعیناتی کے ساتھ چلی۔ سکول میں داخلہ دوسری جماعت میں لیا تھا، اس کے بعد سکول تو تبدیل ہوتے رہے مگر سب سرکاری سکول ہی تھے جن میں میں نے تعلیم حاصل کی۔

س آپ نے بتایا کہ والد صاحب پولیس میں تھے، پھر آپ کا ادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

ج میرے نانا اچھے خاصے ادیب اور توانا شاعر تھے۔ میرے خیال میں شاید ننھیال کی طرف سے یہ چیز آئی ہے مگر میرے دادا بھی شعر و ادب سے متعلق آدمی تھے اور دادی تو لکھنؤ کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ پھینکا بیگم کے نام سے لوگ انہیں جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا تعلق لکھنؤ سے بھی بنتا ہے۔ ویسے میرے خاندان کا تعلق ضلع مظفر نگر کے قریب بڑاؤلی گاؤں سے ہے۔ اس گاؤں کے علاوہ بھی ہمارے پاس تین مزید گاؤں تھے جو نواب نے دیئے تھے۔ اچھے خاصے

جاگیردار تھے۔

س آپ جاگیردار خاندان سے تھے، پھر لکھنے پڑھنے کو کیریئر بنانے کا خیال کیسے آیا؟

ج میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ ضلع حصار میں واقع ہمارے سکول میں ترانہ پاکستان کے خالق حفیظ جالندھری آئے، انہوں نے مجھ سے غزل سنی اور داد دیتے ہوئے کہا کہ تم تو بہت زوردار شاعر ہو۔

س پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی تھی یا نثر کی؟

ج پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی، نثر کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا۔ اب تو ساٹھ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب تک غزل کے بارہ مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ نثر میں بہت سارے موضوعات پر لکھا۔ انشائیے پر بھی کافی کام کیا۔ اردو انشائیے کا تو مجھے موجد کہا جاتا ہے۔

س آپ معلم اور ماہر تعلیم بھی ہیں، موجودہ پرائم منسٹر نواز شریف بھی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں، تدریس کا تجربہ کیسا رہا؟

ج ذہین طلباء اساتذہ کو پڑھانا سکھاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی تمام زندگی پڑھایا اور یہ میرے لئے ہمیشہ ایک اعزاز کی بات رہی ہے۔ میں نے پچیس سال وہاں پڑھایا مگر کبھی ایک کلاس بھی مس نہیں کی۔ ایک بھی ناغہ نہیں کیا۔ یہ جو آج کل کہتے ہیں کہ شاگرد استاد کی عزت نہیں کرتے، یہ بالکل غلط اور فضول بات ہے۔ اساتذہ اپنے فرض کو نبھا کر تو دیکھیں، شاگرد اب بھی بہت عزت کرنے والے ہیں۔ ایک دفعہ حفیظ جالندھری اپنی بیگم کے ساتھ میری کلاس میں آ کر پیچھے بیٹھ گئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں کیسے پڑھاتا ہوں۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ آپ پڑھائیں مگر انہوں نے ضد نہ چھوڑی اور مجھے پڑھاتا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ بعد ازاں بہت تعریف بھی کرتے رہے۔

س آپ کی جوانی کے ایام میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کا بہت چرچا تھا۔ آپ بھی روشن خیال آدمی ہیں۔ کیا اس تحریک سے بھی تعلق رہا؟

ج انجمن ترقی پسند مصنّفین کے تمام سرکردہ لوگ میرے دوستوں میں شامل تھے مگر کبھی اس تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں بنا۔ سچ بتاؤں تو ہم خود بڑے ’’پانے خان‘‘ تھے ان دنوں میں۔

س عشق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج ارے بھائی! جس نے عشق نہیں کیا وہ تو بالکل گدھا ہے۔ ہم نے تو زندگی میں بہت سارے

عشق کیے۔ عشق کے بغیر تو انسان مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔ میں تو ہمیشہ ہی عشق کے لئے تیار ہوں۔

س آپ کے گھنے بالوں، چستی اور سدابہار جوانی کا کیا راز ہے؟

ج میرے ابا گنجے تھے، دادا گنجے، نانا گنجے اور دادی بھی گنجی۔ جوانی کے دنوں میں جب میں بال بناتا تو اماں طنز کرتیں کہ بیٹا یہ چند دن کے مہمان ہیں، پھر نہیں رہیں گے۔ میں کہتا اماں میرے بال ہمیشہ قائم رہیں گے۔ میں نے دیکھا ہے آپ اپنے بارے میں جیسا گمان کرتے ہیں ویسا ہی ہوجاتا ہے۔

س آج کل بھی کچھ لکھ رہے ہیں؟

ج بہت کچھ لکھ رہا ہوں۔ لکھنے والا تو لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خیر میرے پاس زندگی تھوڑی بچی ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کررہا ہوں۔

س پارٹیشن کی کیا یادیں ہیں؟

ج میں اپنے 35 اہل خانہ میں سے اکیلا زندہ بچ کر پاکستان پہنچا تھا۔ ضلع حصار سے جب ہم نکلے تو میری ماں، بہن، بھائی، نانا، نانی سب مارے گئے تھے۔ میں ان دنوں حصار میں ایک اخبار ''پکار'' کا ایڈیٹر تھا۔ ہمارا گھر سٹیشن کے پاس تھا۔ بڑا اچھا علاقہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ محفوظ ہے مگر بلوائی وہاں بھی پہنچ گئے۔ جب بلوائی حملہ آور ہوئے تو میں زمین پر گر پڑا تھا، ٹھوکر لگی تھی۔ وہ سمجھے کہ میں مرگیا ہوں۔ سب اہل خانہ کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے تسلی کے لئے دوبارہ نیزے اور برچھیاں ماریں۔ اتفاق سے جب انہوں نے مجھے نیزہ مارا تو وہ زمین میں جا کر پیوست ہو گیا۔ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ پھر میں گرتا پڑتا لاہور پہنچ گیا۔

س قیام پاکستان سے قبل ادبی منظرنامے پر کون لوگ نمایاں تھے؟

ج بہت سے لوگ تھے مگر مجھے جگر مرادآبادی زیادہ پسند تھے۔ باقی سب سے بھی ذاتی تعلق یوں تھا کہ میں نے اورینٹل کالج لاہور سے فارسی اور اردو میں ایم فل کیا جہاں یہ سب لوگ آتے جاتے تھے۔

س سنا ہے ایشوریا رائے آپ سے بہت متاثر ہیں؟

ج ہاں! بمبئی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ کہنے لگیں باقی سب لوگ مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہیں، آپ سیدھا دیکھتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کی شوقین ہیں مگر ایشوریا کو چھوڑو بمبئی میں ہی میری ملاقات گاندھی جی سے بھی ہوئی تھی۔ میں سروجنی نائیڈو کے ساتھ تھا۔ گاندھی جی گورے، چٹے آدمی تھے اور لڑکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ میں نے سروجنی نائیڈو سے پوچھا کہ اس آتما کو مہاتما بنانے میں لڑکیوں کا کتنا حصہ ہے؟

مشتاق احمد یوسفی

س اردو میں مزاح نگار کچھ کم نہیں؟

ج ڈنک مارنے والے کم ہی ہونے چاہئیں۔

س آپ کی تحریر میں بعض لوگوں پر جارحانہ جملہ بازی ہوتی ہے۔ایسا کیوں؟

ج: میں نے اپنی تحریر میں کسی پر حملہ نہیں کیا کیونکہ میں شاید جوابی حملے کی تاب نہیں رکھتا۔پھر یہ بھی کہ تحریر میں تلخی آجائے یا قلم کو طیش آجائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔یہ چیز نعرہ وغیرہ ہوجاتی ہے یا کچھ اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔

س آپ نے ابوالکلام آزاد کی نثر کو جناتی زبان قرار دیا۔کیا یہ زیادتی نہیں؟

ج مولانا ابوالکلام آزاد مذہبی عالم بھی تھے اور ادیب بھی۔میں نے ادیب کی حیثیت سے بات کی تھی۔اور ان کی نثر کو جناتی قرار دیا تھا۔مولوی عبدالحق (بابائے اردو) تو اس بناء پر ان کو سب سے بڑا اردو دشمن کہہ گئے ہیں کیونکہ ان کے بقول اس طرح کی اردو اصل میں اردو کی ترقی راہ میں رکاوٹ ہے۔میں بھی مولوی عبدالحق کا حامی ہوں اسی طرح میں آج کے دور میں میرامن اور رتن ناتھ سرشار کی زبان لکھنے کے بھی خلاف ہوں۔یہ تو ایسے ہی ہوگا کہ آج کی دلہن کا سنگار سو سال پہلے کی دلہن کی طرح کیا جائے یعنی اسے آملے کا تیل لگا کر چپکا یا جائے تو کیا ایسی دلہن کو آج کا دولہا قبول کرے گا۔

س تو پھر اردو کے معیاری نمونے کیا ہونگے؟

ج ہمارے لئے نثر کے عمدہ نمونے سر سید احمد خان،مولوی عبدالحق،سعادت حسن منٹو،غلام عباس اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی تحریروں میں ہیں۔بیدی کبھی کبھی اردو لہجے سے انحراف کرتے ہیں مگر ان کی تحریر جاندار بہت ہے۔اس لحاظ سے میں اسے پہلے نمبر پر رکھتا ہوں۔جبکہ کرشن چندر کو چھٹے نمبر پر بھی نہیں رکھتا۔یہ میری ذاتی رائے ہے اور میری رائے کی بہر حال زیادہ اہمیت نہیں کیونکہ میں محقق یا نقاد نہیں ایک عام قاری ہوں۔میں تو فارسی بھی نہیں جانتا۔اسی لئے کہتا

ہوں کہ میری رائے ایک عام قاری کی رائے ہے۔

س آپ نے کچھ عرصہ قبل دبستان لاہور کو مستند کہا۔تو یہ بات مذاق میں کہی یا۔۔۔؟

ج میں نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی۔زبان جامد شے نہیں ہوتی۔اس میں تغیر آتا رہتا ہے۔ہم بنا بنایا سانچہ پیش کر کے لوگوں کو اسکا پابند نہیں کر سکتے۔اردو کا فروغ گزشتہ ستر سال سے پنجاب میں ہو رہا ہے۔وہاں بہترین شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔وہاں کے ناشرین تو آزادی سے پہلے بھی نمایاں تھے۔اس لئے اب اردو کا محاورہ وہیں بنے گا۔ممکن ہے یہ محاورے نئے لگیں مگر اردو کو اب یہ جذب کرنا ہوں گے۔مگر یہ انجذاب فطری ہوگا تو کامیاب ہوگا۔ انگریزی زبان جہاں گئی وہاں اس میں تبدیلی ہوتی رہی۔انگریزی نے برصغیر سے ہزاروں الفاظ لئے۔(اس پر چھ سات سو الفاظ کی ایک مکمل ڈکشنری تیار ہو چکی ہے)ماضی میں دلی اور لکھنو اردو کے مراکز تھے مگر اب تو لکھنو میں کوئی سائن بورڈ بھی اردو میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔وہاں کے بچے اردو پڑھنے سے عاری ہیں اب اردو ویسی ہی بولی جائے گی جیسا کہ اس کو استعمال کرنے والے بولیں گے۔اور ظاہر ہے پنجاب اس میں نمایاں ترین ہے۔مستقبل میں بھی پنجاب میں اس کا فروغ نظر آ رہا ہے۔انگریزی میں ویسٹ انڈین کا یعنی جیمیکن کا لہجہ اپنا اور آکسفورڈ کا اپنا ہے۔ ہر جگہ ایک سا لہجہ نہیں ہو سکتا۔میں نے اس نظریے پر اپنی کتاب ”آب گم“ میں لوک لہجہ کے نام سے ایک پیراگراف لکھا ہے۔میرے نزدیک اردو کا ہر لہجہ لطف دیتا ہے۔اور یہی سب کچھ برقرار رہنا چاہئے۔میرا من یا رجب علی سرور کا لہجہ اپنانے پر ہر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔اردو ارتقاء پذیر ہے۔یہ اپنے طریقے خود بنائے گی۔اس پر تردد کی ضرورت بھی نہیں۔اب کلاسیکی زبان کے محاورے ختم ہو رہے ہیں۔میں نے اپنی تحریر میں ایک جگہ ایک محاورہ ”نجک چاٹنا “لکھا تو افتخار عارف

کو عجیب لگا تھا حالانکہ ہمارے بچپن میں یہ محاورہ عام تھا۔اردو میں محاورے اور ترکیبیں وغیرہ اسی طرح بنتے بگڑتے اور مٹتے رہتے ہیں۔اب لفظ خلفشار ہے تو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے مگر یہ مستعمل ہے۔ممکن ہے کہ یہ خلل اور فشار سے مل کر بنا ہو۔اس طرح سنسنی خیز بھی غلط ہے مگر مستعمل ہے۔جوش ملیح آبادی لفظ رہائش کے خلاف تھے مگر اس کا استعمال جاری ہے۔اور یہ سب الفاظ اچھے بھی لگتے ہیں۔گرائمر کے مطابق لفظ ادائیگی کی بجائے ادائی ہونا چاہیے۔مگر ادائیگی مروج ہے اور بھلا لگتا ہے۔ویسے پاکستان میں اردو کی حیثیت میں تضاد

ہے۔اس پر اکیڈمی آف لیٹرز میں بھی بحث رہی تھی۔ میری رائے میں محاورہ بولی جانے والی زبان سے بنتا ہے نہ کہ معدوم زبان سے۔ پاکستان میں موجودہ اردو وہی ہوگی جو بولی اور لکھی جائے گی۔ اردو کی سند اب قلعہ معلیٰ سے نہیں لاہور کے قلعے سے لی جائے گی۔ کیونکہ کروڑوں اہل پنجاب اب لہجہ اپنا رہے ہیں اور وہاں سے یہ اردو ہر جگہ پھیل رہی ہے۔البتہ پوری طرح اس کا انجذاب آہستہ آہستہ ہوگا۔

س آپ کی اتنی گہری دلچسپی کس وجہ سے ہے؟

ج مجھے لفظوں کی تلاش اور کھوج میں مزا آتا ہے۔اس سے اور کئی الفاظ کی گرہیں کھلتی ہیں مثلاً جس کھیت میں بیج ڈالے جائیں یا نئے نئے پودے نکلے ہوں تو وہاں ان کو پرندوں سے بچانے کے لئے صلیب نما ڈھانچے پر قمیض ڈال دی جاتی ہے تاکہ پرندے اسے انسان سمجھ کر اس سے ڈریں اور دور رہیں تو مجھے اس کا نام نہیں آتا تھا۔ پتہ چلا کہ اردو میں اسے الگ الگ نام دیئے جاتے ہیں۔ پنجابی میں اسے بڈاوا بھی کہتے ہیں اور کچھ اور بھی ،اس طرح میں نے ایک لفظ لکھا ہریال عورت میرے علم کے مطابق یہ پنجابی اصطلاح ہے مگر بہت سے پنجابیوں کو اس کا پتہ نہیں۔ اردو میں اس کا متبادل ہرا چگ بتایا گیا ہے۔میرے نزدیک اس وقت پاکستان میں زبان کی تحقیق کے معاملے میں سب سے بڑی سند مشفق خواجہ اور شان الحق حقی ہے۔میں اکثر و بیشتر انہی سے سند لیتا ہوں۔

س اب آپ کے ہاں لفظوں میں اختراعی پہلو بہت زیادہ ہے۔جو پہلے نہیں تھا۔آپ لفظوں سے یہ تخریب کاری کیوں کرتے ہیں؟

ج لفظوں سے کھیلنا پرانی عادت ہے۔اودھ پنچ والے یہی کرتے تھے۔میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ صرف لفظوں کا کھیل نہ ہو بلکہ ساتھ فکر بھی ہو تاکہ ہنسنے کے ساتھ ساتھ قاری کچھ سوچے بھی۔ اس طرز میں جو میرے نظریات جھلکتے ہیں ان کو ایک عام آدمی کے نظریات سمجھیں۔میں کتابوں کا عاشق ہوں۔میری لائبریری میں دس ہزار سے زائد کتب ہیں مطالعے کا عاشق ہوں۔مگر میں ہر کتاب کو فرض سمجھ کر نہیں پڑھتا بلکہ جو پسند نہ آئے اسے پڑھتا ہی نہیں۔

س طنز و مزاح کے ساتھ آج کے قاری کا رویہ کیسا ہونا چاہئے؟

ج یہ تو قارئین ہی بتائیں گے ہم تو لکھتے جا رہے ہیں۔میرے مشاہدے کے مطابق کراچی، لاہور اور لندن کے اردو کے قارئین میں یہ صنف کافی مقبول ہے۔سنجیدہ نثر سے مزاحیہ

نثر زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ شاید اسی وجہ سے گزشتہ دنوں کراچی میں مجھ سے ایک مصور نے اپنی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کرایا کہ میری وجہ سے لوگ زیادہ آئیں گے۔

س آپ کی نئی تصنیف کب آ رہی ہے؟

ج نئی کتاب تیار ہے۔ مگر میں کتاب لکھ کر تین چار سال تک پڑی رہنے دیتا ہوں اور پھر اس کی خواندگی کر کے خامیاں دور کرتا ہوں۔ سو یہ کتاب آج کل اسی مرحلے میں ہے۔

س آپ نے کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا؟

ج میری والدہ میمک تھیں یعنی دوسروں کے لہجے کی بڑی اچھی نقل کر لیتی تھیں، وہیں سے مجھے تحریک ملی اور جب کچی آ جائے تو آتی ہی چلی جاتی ہے میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔

س آج کے فنکاروں کے بارے میں رائے دیں گے؟

ج شاعروں میں افتخار عارف بہت متاثر کر رہا ہے۔ جب کہ عطاء الحق قاسمی سے اچھا کالم کوئی نہیں لکھ رہا۔ زبان و بیان کی تحقیق میں شان الحق حقی اور مشفق خواجہ سب سے نمایاں ہیں۔

س آپ کا اپنے فن کے معیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج مجھے اپنے بارے میں کوئی مغالطہ نہیں۔ مکمل نئی تخلیق کوئی نہیں کر سکتا۔ ہر بات پہلے ہو چکی ہوئی ہے۔ بس اس کو ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں لکھ رہا ہے۔ میرا تخلیقی سیکرٹ یہ ہے کہ جب میں کسی موضوع پر لکھتا ہوں تو پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ لوگ اس پر کیسے لکھتے ہیں۔ پھر میں یہ کرتا ہوں کہ ان کے اسالیب کو نظر انداز کر کے نیا پن لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی میں اس میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو کبھی ناکام۔ میں پہلے سامعین میں اپنی تحریریں سناتا نہیں تھا۔ پھر سنانا شروع کر دیا۔ میں نے ٹی وی کے لئے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ویسے اگر نثر میری ہی طرح پڑھ کر سنائی جائے تو اس کا انجام بھی آج کل کے مشاعروں جیسا ہی ہوگا۔ پہلے مشاعروں کے لئے شاعر اپنی سطح سے گفتگو کرتا تھا اب وہ یہ دیکھتا ہے کہ لوگ اس کو کیسے لیں گے۔ پھر وہ ویسا ہی لکھتا۔ اس سے معیار میں کمی آئی ہے۔ صرف لوگوں کی پسند کا خیال رکھ کر تیار کی جانے والی چیز کی عمر کم ہوتی ہے۔ سو میں جب لکھتا ہوں تو قاری کے ردعمل کی پروا نہ کرتے ہوئے لکھتا ہوں۔ البتہ کہیں کچھ سنانا ہو تو پھر سچی بات ہے کہ میں سامعین کا کچھ خیال کر کے لکھتا ہوں اور یہ ہر شہر کے لئے الگ الگ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو چیزیں دوحہ میں پسند کی جائیں ضروری نہیں کہ وہ ساہیوال میں بھی کامیاب رہے۔

س آپ اپنی کتابوں میں تصویر کیوں نہیں دیتے؟

ج چراغ تلے کے پہلے ایڈیشن میں تو دی تھی پھر نہیں۔اصل میں بات یہ ہے کہ میں اپنی تصویریں سنبھال کر رکھتا ہی نہیں۔سوغات میں میرے لئے خصوصی گوشہ شائع کرنا تھا مگر میں ان کو اپنی تصویر فراہم نہ کر سکا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گوشہ تو شائع ہوا مگر اس کا اداریہ میرے خلاف لکھ دیا گیا۔فوٹو گرافی حالانکہ میرا شوق ہے۔مگر میں صرف تصویریں کھینچتا ہوں، کھنچواتا نہیں۔اس حوالے سے میں نے ایک بار لکھا بھی تھا کہ اپنی صورت دیکھ کر خدا پر میرا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔میں نے آخری تصویر غالباً 1976 کی کھنچوائی ہوئی ہے۔بعد میں نہیں کھنچوائی۔اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ قراۃ العین حیدر کی طرح میں بھی اپنی تصویر دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔(قراۃ العین بھی نئی تصویر نہیں بنواتی بلکہ کتاب پر پرانی تصویر ہی دے دیتی ہیں) مگر عورتوں کو بہر حال اس طرح کے حربوں کا حق حاصل ہے۔

OOO

محسن بھوپالی

برصغیر پاک وہند کے ممتاز شاعر محسن بھوپالی کا کہنا ہے کہ پچھلے دور کے مقابلے میں آج کی جمہوریت لاکھ درجے بہتر ہے۔LFO کی حمایت کرتا ہوں، اس سے 18 سال کے نوجوانوں کو ووٹ ڈالنے کا حق ملا۔نواب لیاقت علی خان عظیم لیڈر تھے۔شاعری سے گھر چلانا ممکن نہیں۔فیض احمد فیض اور احمد فراز کو بھی ملازمت کرنا پڑی۔سیاسی قطعات کے ذریعے بین الاقوامی شہرت ملی۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے دیے گئے ایک خصوصی انٹرویو میں کیا۔ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ 1988ء میں میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہوا۔ مجھے گلے کا کینسر ہو گیا تھا جس کا اسی سال لندن گلاسکو میں کامیاب آپریشن ہوا۔آپریشن کے بعد اب با قاعدہ چیک اپ کرانا پڑتا ہے۔ایک سوال کے جواب میں محسن بھوپالی نے کہا کہ جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اس وقت سے شاعری کر رہا ہوں۔اب تک سات مجموعے شائع ہو چکے۔ پہلا مجموعہ کلام 1961ء میں شائع ہوا جس کی تقریب رونمائی حیدر آباد سندھ میں کرائی گئی۔دوسرا مجموعہ قطعات کا شائع ہوا اور یوں سلسلہ جاری وساری ہے۔ میں نے کبھی فلمی شاعری نہیں کی۔شاعری کوئی کمرشل چیز نہیں البتہ گلوکارہ گلبہار بانو، استاد حامد علی، اے نیر، طاہرہ سید نے میری غزلیں گائی ہیں۔جو بہت مقبول بھی ہوئیں۔ پاکستان میں بہت بہتر شاعری ہو رہی ہے۔شاعری کا مستقبل روشن ہے۔کچھ شعراء صرف مشاعروں کے لئے شاعری کر رہے ہیں۔ یہ شاعری کے ساتھ اچھا عمل نہیں ہے۔محسن بھوپالی نے مزید کہا کہ ہجرت میرے ہاں ذہنی سطح پر ہے اور میرا خاندان 1947ء کو لاڑکانہ پاکستان میں منتقل ہو گیا تھا۔ 1958ء میں شادی کی ،شادی رشتہ داروں میں ہوئی۔لاڑکانہ سے کراچی بارات آئی۔شادی سے پہلے نہ بیگم کو دیکھا نہ ہی تصویر دیکھی تھی۔ 4 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، سعودی عرب، قطر، متحدہ عرب امارات، بحرین، بنگلہ دیش اور بھارت میں منعقدہ ادبی تقریبات اور عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکا ہوں۔ایک اور

سوال کے جواب میں محسن بھوپالی نے بتایا کہ مجھے زندگی میں کبھی عشق نہیں ہوا۔ میری شاعری میں رومان کا عنصر پہلے بالکل نہیں اور اب بھی بہت کم ہے۔ میں نے شاعری کو ہی بنیادی طور پر تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مجھے شہرت عام اس قطعے سے ملی۔

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

محسن بھوپالی سے مندرجہ بالا گفتگو 2003ء میں ہوئی تھی جو ماہنامہ ارژنگ میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی اچانک وفات سے پاکستان ایک عظیم شاعر اور انشاء پرداز سے محروم ہو گیا ہے۔

○○○

ممتاز راشد

س آپ قطر میں کس ادبی ماحول میں سرگرم تخلیق ہیں؟

ج میں 1977ء میں لاہور سے قطر گیا تھا اور اب 34 برس ہو گئے ہیں۔ اس دوران وہاں پہلے روایتی شعری نشستوں میں شرکت رہی پھر تصنیفی سرگرمیاں بھی بڑھیں۔ ادبی انتظامی امور کا تجزیہ بھی ہونے لگا۔ کچھ ادبی یا نیم ادبی لوگوں سے مقابلہ بازی یا محاذ آرائی بھی رہی۔ تب وہاں ایک ہی تنظیم تھی ''بزم اردو قطر'' پھر ہر دو تین سال بعد ایک تنظیم کا اضافہ ہونے لگا اور اب وہاں درجن بھر ادبی تنظیمیں ہیں۔ چار پانچ تو خاصی متحرک ہیں۔ ہر ماہ ایک طرحی مشاعرہ ہوتا ہے اور دو تین غیر طرحی مشاعرے ہو جاتے ہیں۔ ہر چند ماہ کے بعد وہاں کسی ادیب و شاعر کی کتاب چھپ کر آ جاتی ہے۔ خود میری اب تک سولہ کتب چھپ کر آ چکی ہیں۔ قطر سے اب تک 85 کتب شائع ہو چکی ہیں۔ دو تین رسالے بھی ہیں۔ میں جنوری 1995ء یعنی پندرہ سال سے سہ ماہی رسالہ خیال و فن (لاہور/دوحہ) شائع کر رہا ہوں۔ 2010ء میں دو نئے رسالوں کا اجرا ہوا ہے۔ ان کا بھی ایک ایک ہی شمارہ آیا ہے۔ غیر ملکی شعراء اکثر قطر آتے رہتے ہیں۔ قطر کے کئی شعراء بھی بیرون ملک جا کر مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔ خود میں نے ایسے درجن بھر مشاعرے پڑھے ہیں۔ بس اسی طرح کے ماحول میں یہ سفر جاری ہے۔

س ہم وطن اہل قلم کے رویوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج پاکستان میں اہل قلم خوب متحرک ہیں۔ کتابوں کی اشاعت بھی زوروں پر ہے۔ قارئین کی کمی کا شکوہ بھی ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ میں سال میں ایک بار قطر سے ضرور اپنے وطن آتا ہوں۔ سب بڑی محبت سے ملتے ہیں پذیرائی کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو شاید کچھ زیادہ ہی توقعات ہوتی ہیں اور اس وجہ سے ان کو کچھ شکایت رہتی ہے۔

س ہم وطن ادبی اداروں اور ادبی تنظیموں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج جو سرکاری ادبی ادارے ہیں ان کا تو زیادہ دھیان وطن میں مقیم اہل قلم پر ہی مرکوز ہوتا ہے۔ بیرونِ پاکستان مقیم اہل قلم کے بارے میں کسی ادارے کا کوئی خاص شعبہ نہیں جو ان کے بارے میں ڈیٹا جمع کرے۔ ان کے کاموں کو پرکھے اور پھر ایوارڈز اور اعزازات کے حوالے سے ان کو بھی یاد رکھے۔ غیر سرکاری ادبی ادارے محدود رہتے ہوئے اپنے اپنے طور پر کافی کام کر رہے ہیں۔ ادبی تنظیموں کی بھی کمی نہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ لاہور کے مختلف علاقوں کی ادبی تنظیمیں ماہانہ مشاعرے کرا رہی ہیں اور ان کی تعداد بیس اکیس ہے۔ ادبی رسائل بھی تسلسل سے نکل رہے ہیں مثلاً معاصر، الحمراء، ارژنگ، سانجھاں، بیاض، ادب لطیف، نقوش، ہم عصر، تاریکین وطن، سویرا انٹرنیشنل، لہراں، آئینہ، ترنجن وغیرہ یہ تو لاہور کے ہیں۔ دیگر شہروں کے رسائل بھی کافی ہیں البتہ فنون، اوراق، افکار اور نقوش وغیرہ کا ماضی غلغلہ اب نظر نہیں آیا۔

س آپ کی پسندیدہ کتب کون سی ہیں؟

ج نثر میں شہاب نامہ، مزاحیہ نثر میں مشتاق احمد یوسفی کی ''آب گم''، شعری مجموعوں میں جون ایلیا کی کتب اور مزاحیہ شاعری میں انور مسعود کی قطعہ کلامی وغیرہ۔

س خلیج کے نمایاں شعراء کی پسندیدہ کتب کون سی ہیں؟

ج بحرین میں مقیم باباجی سعید قیس سے بڑھ کر تو کوئی بھی نہیں جو کہ تقریباً اسی برس کی عمر میں بھی منفرد اور معیاری شاعری کر رہے ہیں۔ دوبئی، ابوظہبی سے شفیق سلیمی تو واپس آ چکے ہیں۔ اب یعقوب روش اور ظہور الاسلام وغیرہ ہیں۔ جدہ سے نسیم سحر واپس آ چکے ہیں۔ اب قمر حید رقمر سرگرم ہیں۔ قطر میں امجد علی سرور، شفیق اختر، شادا کولوی، شوکت ناز، عزیز نبیل، فہیم الدین، افتخار راغب، ندیم جمشید، قلق، منصور، فرید ندوی اور زوار حسین زائر نمایاں ہیں جبکہ رشید نیاز واپس آ چکے ہیں۔

س آپ کی قطر سے واپسی کب تک متوقع ہے؟

ج میں وہاں بجلی کے سرکاری محکمے کہربا (جو کہ اب کہرما کہلاتا ہے) میں ہوں۔ اس کا ڈرائنگ اینڈ سروے سیکشن اب کمپیوٹر کے دور میں ڈیٹا سیکشن کہلاتا ہے۔ یہ بجلی گھروں، زمین دوز تاروں اور سب اسٹیشنوں وغیرہ کی ڈرائینگز کو اپ ڈیٹ کرتا ہے اور مستقبل کے لئے ڈرائنگز بناتا ہے۔ میں بھی یہ ریکارڈ ''ڈیجیٹلائز'' کرنے والے آٹھ نو افراد میں شامل ہوں۔ 57 سال کی عمر ہو گئی ہے۔ تین سال بعد ریٹائر ہونا ہے۔ شاید ایک سال کی توسیع مل جائے اور پھر ان شاءاللہ اپنے پیارے

شہر لاہور میں بسیرا رہے گا۔

س آپ چونتیس سال سے قطر میں ہیں، اس دوران ادبی لحاظ سے کوئی نمایاں کامیابیاں پائیں اور آپ کے کیا کیا اختصاصات رہے؟

ج پہلی کامیابی تو یہی ہے کہ اس دوران سرگرمیوں میں تسلسل رہا۔ یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں۔ پھر مشاعروں کے بارے میں یہ ہے کہ قطر میں مقیم شاعروں میں سب سے زیادہ مشاعرے میں نے ہی پڑھے ہیں۔ ان میں بڑے مشاعرے بھی ہیں اور چھوٹے بھی اور گھریلو نشستیں بھی۔ 2004ء سے میں تین تنظیموں، بزم اردو قطر، حلقہ ادب اسلامی قطر اور انجمن شعراء اردو ہند قطر کے ماہانہ مشاعرے پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ ہر ماہ ایک دو دوسرے مشاعرے بھی ہو جاتے ہیں تاہم اوسطاً ماہانہ اگر تین مشاعرے ہی لئے جائیں تب بھی اول 2004 سے 2010 تک کے سات برسوں میں کوئی اڑھائی سو مشاعرے پڑھے ہیں۔ 2004ء سے قبل کے اوسطاً مشاعرے دو بھی ہوں تو 25 برسوں میں 800 سے زائد وہ ہیں اس طرح کل ہزار گیارہ سو مشاعرے وہاں پڑھے ہیں جو کہ کسی اور شاعر کے ریکارڈ میں نہیں ہیں۔ بزم اردو قطر اپنے آغاز ہی سے ماہانہ طرحی مشاعرے کرا رہی ہے۔ میں 1978ء سے ان کا حصہ ہوں۔ کئی سال سے یہ بزم اب ہر سال سالانہ نظمیہ مشاعرہ، سالانہ حمدیہ طرحی مشاعرہ، سالانہ نعتیہ طرحی مشاعرہ، سالانہ طرحی مشاعرہ اور سالانہ مزاحیہ طرحی مشاعرہ بھی کرا رہی ہے۔ باقی طرحی مشاعرے غزلیہ ہوتے ہیں۔ بزم کے ان مشاعروں میں سے چند ایک گنتی کے ہوں گے جن میں، میں نے حصہ نہ لیا ہو۔ اس لحاظ سے قطر میں زیادہ طرحی مشاعرے بھی میں نے ہی پڑھے ہیں۔ شاعروں میں سب سے زیادہ 34 سال گزارنے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ مشاعرے پڑھنے کا اعزاز بھی مجھے ہی حاصل ہے۔

س مشاعروں سے ہٹ کر دیگر ادبی سرگرمیوں میں آپ کے اختصاصات کیا ہیں؟

ج قطر میں مقیم اہل قلم میں سب سے زیادہ میری ہی کتب شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تعداد سولہ سترہ ہے۔ ان میں درجن بھر شعری مجموعے ہیں۔ میرے بعد وہاں جس شاعر کے زیادہ شعری مجموعے ہیں ان کی تعداد چار ہے۔ پھر تین، دو اور ایک ایک شعری مجموعے والے شعراء ہیں۔ قطر میں مقیم شعراء میں سے سب سے زیادہ بیرونی دورے بھی میں نے ہی کئے ہیں۔ 2010ء تک میں بحرین کے سات، عرب امارات کے دو اور سعودی عرب و کویت کا ایک ایک دورہ کر چکا

ہوں۔قطر میں مقیم شعراء میں سے پاک و ہند وغیرہ کے ادبی رسائل میں سب سے زیادہ خصوصی گوشے بھی میرے ہی فن وشخصیت کے بارے میں شائع ہوئے۔ادبی مجلہ ''سلسلہ'' کراچی نے 2001 میں میرے حوالے سے کوئی پونے تین سوصفحات کا خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔خصوصی گوشے ان رسائل میں ماہنامہ'' دنیائے ادب کراچی''، سہ ماہی ''انتساب'' سرونج (مدھیہ پردیش)، ماہنامہ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی، ماہنامہ''شاعر'' بمبئی، سہ ماہی''ادبی شاخیں'' بھوپال، ماہنامہ ''اردوڈائجسٹ'' لاہور، ماہنامہ''آئینہ'' برطانیہ، ماہنامہ''الراعی'' لاہوراور ماہنامہ''شاندار'' اعظم گڑھ۔

OOO

محسن مگھیانہ

اردو ادب کی روایت رہی ہے کہ نو وارداان اپنے فنی سفر کا آغاز عموماً شاعری، مضامین نویسی یا پھر کہانی وناول نویسی سے کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا یہ منفرد اعزاز ہے کہ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مزاحیہ آپ بیتی کی اشاعت سے کیا۔ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل سرجن ہیں مگر عموماً ادب کے قارئین انہیں پی ایچ ڈی ڈاکٹر سمجھتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے بقول بیرون ملک مقیم پاکستانیوں میں ان کے متعلق یہ غلط فہمی زیادہ عام ہے کہ وہ طبیب نہیں بس ادیب ہیں۔ان کی اب تک گیارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مزید کتب پر ان کا کام جاری ہے۔ ایک قومی روزنامہ اخبار میں مستقل کالم بھی لکھتے ہیں۔ان کا اصل نام نیاز علی خاں مگھیانہ ہے مگر ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام محسن مگھیانہ کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ان کی پیدائش 1956ء میں پنجاب کے تاریخی شہر جھنگ میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اپنا مستقل قیام بھی اپنے آبائی شہر میں ہی رکھا۔ادب اور ادب کے متعلق کئی قومی اور عالمی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ان کے ساتھ حال ہی میں ہونے والی مختصر سی غیر رسمی گفتگو ''ارژنگ'' کے قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

س روایتی تعلیم تو آپ نے میڈیکل کے شعبے سے حاصل کی مگر آپ کی وجہ شہرت ادبی شعبہ بنا۔ سب سے پہلے توان دو مختلف شعبوں جنہیں متضاد بھی کہا جا سکتا ہے، اپنے تعلق کے متعلق ہمیں بتائیں؟

ج لکھنا تو میں نے آٹھویں جماعت سے ہی شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں میں بچوں کے اخبارات کے علاوہ کوہستان، مشرق اور جنگ میں بچوں کی کہانیاں اور لطیفے وغیرہ لکھ کر بھیج دیا کرتا تھا۔ مشق سخن تو تب سے جاری ہے۔اس وقت مجھے یہ تو نہیں پتہ تھا کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ان دنوں ٹیلی فون اتنا عام نہیں تھا اور انٹرنیٹ ابھی نہیں آیا تھا۔ قلمی دوستی کا دور تھا۔ نویں جماعت میں تھا جب ہم نے سولہ صفحات پر مشتمل رسالہ ''شہید'' شروع کیا۔ مجھے گھر سے جو بھی پیسے ملتے، سب کے سب انہی کاموں میں خرچ ہو جاتے تھے۔

س کالج کا زمانہ کیسا تھا؟

ج گورنمنٹ کالج جھنگ سے میں نے ایف ایس سی کی تھی۔ کالج میں داخل ہوا تو میگزین کا ایڈیٹر بن گیا۔ کارواں کے نام سے شائع ہونے والا یہ بڑا بھرپور پرچہ تھا۔ آپ کو بتا تا چلوں کہ گورنمنٹ کالج جھنگ وہی کالج ہے جہاں سے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام نے تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے اپنے دور میں یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

س آپ اپنی کتابوں کی تفصیل قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

ج میری پہلی کتاب تو مزاحیہ آپ بیتی تھی جو ''انوکھا لاڈلا'' کے نام سے شائع ہوئی تھی اور جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کے بعد ''بھنبھیری'' کہانیوں کی کتاب تھی جو پنجابی اور ہندی میں شائع ہوئی۔ طنز و مزاح کی کتاب ''چھیڑ خانی'' اردو میں شائع ہوئی۔ اسی طرح ''دیسی ان ولایت'' میرا سفرنامہ تھا۔ ''مسئلہ ہی کوئی نہیں'' طنز و مزاح پر مبنی میرے کالموں کا مجموعہ۔ اسی طرح انیندرے، اٹکھیلیاں، چھنّا، الف میم (حج کا سفرنامہ) یہ کیسی محبت ہے، موتی رولن مرے، پنجابی ماہیئے کی کتاب ہے۔ حسن مصر، تیرے باجھوں اور خالی ہاتھ زیر طبع ہیں۔

س کیا آپ کی تخلیقات پر کوئی تحقیقی کام بھی ہوا ہے؟

ج اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں میری مزاحیہ آپ بیتی ''انوکھا لاڈلا'' کے موضوع پر ایم اے کا تھیسس ہوا ہے۔ یونیورسٹی کی فیکلٹی تو میری شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی اور ایم فل بھی کروانا چاہتی تھی مگر جس پر پی ایچ ڈی کرنا ہو اس شخصیت کا وفات پا جانا ضروری ہے اور ایم فل طالب علم صرف اس ادیب پر ہی کر سکتے ہیں جو ساٹھ سال کی عمر سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے میں نہ تو فوت ہوا ہوں اور نہ ہی ساٹھ سال کے سنہری ہندسے کو پہنچا ہوں اس لئے ایم اے کی سطح پر ہی میرے فن پر کام ممکن ہے جو کہ ہو بھی چکا ہے اور مزید ہو بھی رہا ہے۔

س جھنگ سے آپ کا تعلق بڑا جذباتی محسوس ہوتا ہے، کیا کہیں گے اس پر؟

ج جھنگ ہیر رانجھا، مرزا صاحباں اور سلطان باہو کی سرزمین ہے۔ دوسری طرف جھنگ کے دو سائنسدانوں کو نوبل پرائز ملا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام اور ہرگوبند کھرانہ، اتفاق کی بات ہے کہ دونوں کو فزکس کے شعبے میں ہی انعام ملا ہے۔ ایسی متمول تاریخ اور روایات کا شہر جب آپ کا جنم استھان ہو تو اس رشتے میں جذباتیت کا عنصر تو لازمی ہو گا۔

س آپ میڈیکل سرجن ہو کر ڈاکٹر عبدالسلام اور ہرگوبند کھرانہ کی روایت نبھا رہے ہیں اور شعر

وسخن کو رقم کر کے سلطان باہو کے قافلے میں بھی شامل ہیں مگر یہاں رہتے ہوئے کبھی ادبی مراکز سے دوری کا احساس نہیں ہوا؟ میرا مقصد یہ ہے کہ میڈیا کے مراکز تو لاہور، کراچی، اسلام آباد ہیں؟

ج یہاں رہتے ہوئے میڈیا میں آواز پہنچانا تو واقعی بڑا مشکل ہے، حالانکہ ہمارے ہاں ٹیلنٹ اتنا زیادہ ہے کہ شعراء کی بڑی تعداد کے سبب ہمیں مشاعرہ کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں روٹری کلب کا صدر تھا تو مجھے انتظامیہ کے لوگ کہتے کہ شعراء کی تعداد کم کریں مگر میں اپنی معذوری ظاہر کرتا کہ یہ سبھی سٹیج پر چڑھنے کے حق دار ہیں۔ باقی ہمارے میڈیا میں کوریج کے لئے ذاتی واقفیت ہونا ضروری ہے۔ یہ المیہ تو بہرحال ہے کہ مجید امجد سے لے کر عفت سلطان تک لائم لائٹ میں نہیں آئے۔ حال ہی میں ظفر سعید فوت ہوئے جو بڑے جاندار شاعر تھے لیکن کوریج سے محروم رہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ مجید امجد کو لائم لائٹ میں لانے کا سہرا بھی خواجہ محمد زکریا کے سر پر ہے۔ اگر خواجہ زکریا نہ ہوتے تو مجید امجد بھی شاید لائم لائٹ سے محروم رہتے۔

س ادیب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہئے؟ کیا ہمارا ادیب اپنا سماجی کردار صحیح طور پر نبھا رہا ہے؟

ج ادیب بے چارہ تو اپنی طرف سے لکھ رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کا پیغام ہی عوام تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ معاشرے میں ادیب کو صحیح مقام اور عزت نہیں دی جا رہی۔ سماجی اعتبار سے دیکھیں تو ہمارے معاشرے کا رویہ بھی غیر مہذبانہ ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ انقلاب فرانس میں اتنے ادیب تھے اور انقلاب روس میں میکسم گورکی کے کردار سے لے کر تمام اس عہد کے اہل قلم کا انقلاب میں کلیدی کردار ہمارے سامنے تقابلی مطالعے کے لئے رکھا جاتا ہے۔

ارے بھائی! جس ملک میں کتاب کی تعداد ہی پانچ سو پر مشتمل شائع ہوگی، وہ کیا انقلاب لے کر آئے گی؟ خوش قسمتی سے میری کتابیں بکتی ہیں مگر اس کے باوجود اگر میں چاہوں کہ میری کتابوں کی مناسب انداز میں تشہیر و ترسیل ہو جائے تو شاید میں جو کچھ کماتا ہوں، سب پبلشرز کی نذر ہو جائے۔ یہاں تو پڑھے لکھے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ میں نے ایک ڈاکٹر دوست کو اپنی کتاب پیش کی۔ انہوں نے کتاب پر سرسری نظر ڈال کر مجھ سے کہا کہ یار محسن...... پنجابی کون پڑھے؟ آپ دیکھیں کہ ملالہ یوسف زئی کی کتاب لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کا اثر بھی اسی تناسب سے ہوگا۔ ہمارے ہاں تو چند گنے چنے منیر نیازی اور مشتاق یوسفی جیسے لوگ ہیں جن کی کتابیں کچھ نہ کچھ بکتی رہتی ہیں، باقی اہل ادب کے لئے تو قارئین تلاش کرنا ہی مشکل منزل ہے۔

محمد حسن معراج

س بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج پیدائش لائل پور کی ہے۔ گردوپیش کے حالات ویسے ہی تھے جیسے 80 کی دہائی میں وسطی پنجاب کی شہری آبادیوں میں ہوا کرتے تھے۔ ابا سرکاری افسر تھے لیکن اسکے ساتھ شام کے اوقات میں کاروبار سے بھی وابستہ تھے۔ حساب کتاب کے آدمی تھے لیکن انسانی معاملات میں سود و زیاں سے ماورا تھے۔ اماں چوکا باسن کرنے سے جب فارغ ہوتیں تو کوئی کتاب پڑھتی تھیں۔ بس سادہ سا گھر تھا۔ ایک بوڑھی دادی تھی، جس کی جھریوں میں واقعی صدیوں کا پھیرا تھا۔ میں اور وہ ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے بڑے بوڑھے ہو رہے تھے۔

س ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج ابا کی کتابیں گھر کے ایک کونے میں موجود ہوتی تھیں۔ وہاں سے پڑھنا شروع کیا، پی اے ایف کالج تک جاتے جاتے تقریباً عادت بن گئی تھی۔ کالج میں خاصا وقت تھا لہٰذا عادت پختہ ہو گئی۔ ادب سے شوق کی بنیادی وجہ لکھنے والوں کے مشاہدے اور اس کا اظہار ہے۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج پہلی کتاب ریل کی سیٹی، تقسیم کے پس منظر میں ریلوے سٹیشن سے جڑی شہروں اور قصبوں کی کہانیاں۔

س اصناف سخن میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی صنف ہے؟

ج ناول

س کسی ادبی تحریک کا بھی کبھی حصہ رہے؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے؟

ج جی نہیں، شاید میں خود کو اتنا آدرشی نہیں سمجھتا کہ کسی ادبی تحریک کا حصہ بن سکوں اور اس کے نصب العین کی طرف کوئی خاطر خواہ پیش قدمی کر سکوں۔ سیاست ایک بہت متنوع چیز ہے۔ اس بارے میں دو آراء ہیں، ایک تو یہ کہ لکھنے والے کو غیر سیاسی ہونا چاہیئے۔ وگرنہ اس کی تحریر ایک

خاص طرح رنگ لے کر آتی ہے اور ایک موقف کی تائید کرتی ہے جبکہ دوسرے کی تنقیص۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اہل قلم یا فکری یا شعوری صلاحیت کے حامل افراد کو بہر حال سیاسی نظریے سے لاتعلقی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

س کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج جی اس کا سیدھا جواب میرے لئے دینا مشکل ہے۔ ایک بات بہر حال طے ہے کہ موبائل کی وجہ سے فارغ اوقات میں کتاب پڑھنے کا رجحان ختم ہو رہا ہے۔ مثلاً کسی نے اگر کسی کلینک پہ جانا ہو، سفر پہ نکلنا ہو، انتظار گاہ میں وقت گزارنا ہو تو پہلے وقتوں میں وہ کتاب پڑھ لیتے تھے، اب وہ سارا وقت موبائل پہ گزرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادبی میلے، تخلیق سے جڑے دوسرے شغف ایسے ہیں کہ لکھنے والوں کو پذیرائی پہلے سے زیادہ مل رہی ہے۔ تخلیق کی عمومی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ میری رائے ہے اور میں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج جی ''داستان'' ہمارا گھر ہے۔ چھوٹا سا جنگل ہے، وہاں گزرنے والا ہر لمحہ آسودگی سے سرشار ہے۔ تخلیقی طور پر بھی اور زندگی کے اعتبار سے۔ جہاں تک آپ کے سوال کا زمانی پہلو ہے تو شاید وہ وقت جب میں صرف اپنے لئے لکھتا تھا۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج میرے نزدیک تخلیق کا سفر انفرادی سرشاری سے شروع ہو کر اجتماعی نمو تک کا دورانیہ ہے۔ اب ایک ایسی چیز وجود میں لاتے ہیں جو آپ کو خود بھی طمانیت سے بہرہ ور کرے اور اس کے بعد جہاں تک پہنچے وہاں بھی لوگ اس سے فیض یاب ہوں۔

س برطانیہ میں قیام کے دوران آپ نے اردو زبان کے فروغ کے لئے کام کیا؟ کیا آپ کو اپنی اس محنت کے کوئی اثرات محسوس ہوتے ہیں؟

ج جی میں نے باقاعدہ طور پر کوئی کام نہیں کیا۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ج 1999 میں پاکستان کی مسلح افواج میں شمولیت اختیار کی۔ 2016 میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کے بعد لکھنے پڑھنے سے وابستہ رہا۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج جی داخلی طور پر ایک اور طرح سے تحریک ملتی ہے اور خارجی طور پر ایک اور طرح سے بڑھاوا ملتا ہے۔ خارجی طور پر جو آپ کے سامنے ہو رہا ہو، اچھا یا برا وہ آپ کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ داخلی طور پر ایسے کہ آپ ایک حد تک اس عمل سے گزرتے ہیں کہ میں لکھوں یا نہ لکھوں؟ پھر آپ کو ادراک ہوتا ہے کہ اگر نہ لکھا تو آپ کڑھتے رہیں گے سو آپ لکھتے ہیں۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا کا بہت توانا کردار ہے۔ ابلاغ کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس نے وقت اور ادارہ جاتی بندشوں سے لکھنے والے کو آزاد کر دیا ہے۔ دیکھئے نا پہلے شاعر نظمیں، غزلیں لکھتے تھے، پھر وہ رسالوں میں چھپتی تھیں، پھر چھاپہ خانہ پہنچتی تھیں۔ پھر شہرت کا معاملہ شروع ہوتا تھا۔ اب یہاں یہ رہا نہیں۔ اب سویرے نظم کہیں اور شام کو اس کے ٹک ٹاک مارکیٹ میں آ چکے ہوتے ہیں۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج بہت زیادہ، میں سمجھتا ہوں کہ آدمی بہت سے واقعات، حالات اور عناصر سے مل کر تخلیق پاتا ہے۔ یہ جزیات اس کے کل کو مکمل کرتی ہیں۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج بہت بڑا سوال ہے، بہت کچھ کھویا ہے لیکن کافی کچھ پایا بھی ہے۔ جو پایا ہے اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں لیکن بہرحال ایک شکر گزاری کا احساس ہے۔ جو کھویا ہے اس کا تاسف دل سے اُتارنے کی کوشش جاری ہے۔

س آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟ مستقبل کے کیا ارادے اور منصوبے ہیں؟

ج ایک کتاب ہے اور کچھ تھیٹر سے متعلق کام ہے۔ جنگ عظیم اول میں ہندوستانی سپاہیوں کے متعلق کتاب ہے، جبکہ تھیٹر موجودہ صورتحال کے بارے میں ہے۔

OOO

نازبٹ

س سب سے پہلے تو اپنے ادبی اور سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج میرا تعلق کراچی اور لاہور دونوں شہروں سے ہے۔ 15 اکتوبر کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی۔ سینٹ پیٹرکس کالج سے انٹر سائنس، کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد لاہور میں ایم اے انگلش کیا، نہایت ادبی ماحول میں پرورش ہوئی۔ والد صاحب شاعر تھے اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر جبکہ والدہ درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ تھیں۔ والد صاحب انتہائی باذوق شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں عربی اور فارسی پر بھی عبور حاصل تھا اور اقبال سے عشق بھی...... سو نہایت غیر محسوس طریقے سے انہوں نے اقبال کو ہماری زندگیوں میں شامل کر دیا۔ یوں سمجھیں کہ سکول کی کتابوں کے ساتھ ساتھ بانگ درا، بال جبریل، ارمغان حجاز، شکوہ جواب شکوہ، پیامِ مشرق اور جاوید نامہ کے درمیان آنکھ کھولی۔ والدہ شام میں ہمیں سکول کے ہوم ورک کی تیاری کرواتی تھیں جبکہ رات کو والد صاحب ہوتے تھے، اقبال اور ہم بہن بھائی...... وہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے ایک ایک مصرع کی تشریح اور تفسیر ہمیں اس طرح سمجھاتے تھے کہ ازبر ہو جاتا اور میرا دل کرتا تھا کہ یہ سیشن کبھی ختم نہ ہو۔ مصوری سے میری دلچسپی بھی والد صاحب کی طرف سے وراثت میں ملی۔

ذہین طالبہ رہی، سکول اور کالج کے زمانے میں نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ سکول کالج کی نمائندگی بھی کرتی رہی اور انعامات بھی حاصل کئے۔ اردو انگریزی تقریری مقابلوں میں بھی اپنے کالج کی نمائندگی کرتی رہی، ایتھلیٹ بھی تھی، والدہ کی خواہش پر کراٹے کلاسز جوائن کیں اور بلیو بیلٹ حاصل کی۔

س ادب سے لگاؤ کے بارے میں بتائیے، کب سے شعر کہہ رہی ہیں اور باقاعدہ شاعرہ ہونے کا احساس کب ہوا؟

ج ادب سے لگاؤ کا کیا کہا جائے...... آپ کو بتایا کہ اٹھان ہی ایسے ماحول میں ہوئی۔ کتابوں

سے محبت کرنا ہماری گھٹی میں شامل تھا۔ والد صاحب شاعر تھے سونہ صرف شاعری کا جنون ان کی طرف سے میرے خون میں شامل ہے بلکہ مصوری کی صلاحیت بھی والد صاحب ہی کی طرف سے ہی منتقل ہوئی اور جہاں تک بات ہے شعر کہنے کی تو کچھ پتہ نہیں کب سے شعر کہہ رہی ہوں، میرا سارا بچپن، لڑکپن تعلیمی دور دور سمندر کی لہروں سے عشق میں گزرا، آٹھ دس دن بعد سمندر کی سیر کو جانا معمول تھا۔ سب گھر والے سمندر انجوائے کرتے تھے اور میں سمندر سے کچھ فاصلے پر کھڑی سمندر کی اداسی، خموشی اور تنہائی اپنے اندر اتارا کرتی تھی۔ مجھے چپ سی لگ جاتی تھی سمندر کو دیکھ کر، یہ کیفیت آج بھی اسی طرح ہے۔ آج بھی سمندر سے والہانہ عشق ہے۔ خیر بات سکول کے دور کی ہو رہی ہے تو میں واپس جا کر اپنی ساری کیفیت کو اپنی ڈائری میں اتار کر آنکھیں موندلیا کرتی تھی، احساس بھی نہیں تھا کہ کیا لکھا، کیوں لکھا، بس لکھنے کی بے چینی اور لکھنے کے بعد سکون...... پھولوں، تتلیوں، تاروں کی باتیں، خوشبو سے عشق...... تمام سرگوشیاں ڈائری سے۔

والد صاحب نے ایک دن ڈائری دیکھی تو محبت سے ماتھا چوم لیا۔ درحقیقت ڈائری میں اپنی کیفیات میں سے ٹوٹی پھوٹی نظمیں تشکیل کیا کرتی تھی جس کا مجھے ادراک تک نہیں تھا، میری اس ڈائری کے کچھ صفحات آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔

میر، درد، غالب، آتش، حسرت کو سکول کے زمانے میں پڑھا اور خوب پڑھا بلکہ ایک ایک شعر کی چار چار صفحات پر تشریح کر کے ٹیچر کو حیران کرنا معمول تھا۔ اچھا لگتا تھا جب وہ کہتی تھیں ناز! تمہارے اندر ''شاعری کے جراثیم'' بہت زیادہ ہیں۔ بس تو پھر غیر ارادی طور پر اشعار بھی ہو جاتے۔ اس وقت قافیے اور وزن کی تو اتنی سمجھ نہ تھی لیکن معصومیت کا یہ حال تھا کہ ذہن میں ایک ردھم سی بنا کر یہ خیال رکھتے ہوئے کہ ردھم میں سانس ٹوٹنے نہ پائے۔ صرف ردیف کی پابندی کے ساتھ پانچ چھ اشعار کہہ کر اپنے تئیں خود کو بھی شاعرہ تصور کر لیا جاتا کہ چلو جی ''غزل'' ہوگئی۔ فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا تو والد صاحب ہمیشہ کے لئے ساتھ چھوڑ گئے، دنیا اندھیر ہوگئی اور یوں ہوا کہ پھول، خوشبو اور سمندر کے حسن کی جگہ آنسوؤں اور آہوں اور سسکیوں نے لے لی۔ غم کی شدید کیفیت میں غزل ہوئی جس کا ایک شعر جسے میں اپنا پہلا باقاعدہ شعر مانتی ہوں:

''زندگی شام الم کی وسعتوں کا نام ہے
زندگی بے درد کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں''

کبھی کبھار اپنی کوئی نظم اخبار میں بھی بھیج دیا کرتی تھی۔ فیض، میرا، ن۔م۔راشد، فراز،

امجد اسلام امجد، ناصر کاظمی اور پروین شاکر کی شاعری سے عشق ہوا جو آج بھی اسی طرح ہے۔ محسن نقوی کو بہت پڑھا، ساغر صدیقی کو پڑھ کر روتی تھی۔ پروین شاکر اور امجد اسلام امجد کی نظمیں میرے اندر بستی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کا جنون بھی پروان چڑھتا رہا اور نکھار بھی آتا گیا، موقر ادبی جرائد میں کلام مستقل چھپتا آیا ہے۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے گا؟

ج حرف لفظوں میں اور لفظ شعروں میں کب ڈھلنے لگے، پتہ ہی نہ چلا البتہ لفظوں کو سینت سینت کے رکھنے کا عمل ''وارفتگی'' کا موجب ٹھہرا۔ نظموں اور غزلوں پر مشتمل میرا شعری مجموعہ ''وارفتگی'' منظر عام پر آ چکا ہے جبکہ نظموں کا ایک مجموعہ پائپ لائن میں ہے۔

س شاعری کیا ہے؟ نظم یا غزل دونوں میں سے آپ سہولت کہاں محسوس کرتی ہیں اور اس سہولت کی وجہ؟

ج شاعری عطیہ خداوندی ہے، آمد ہے، ایسی عطا ہے جو خاص لوگوں کو ودیعت ہوتی ہے، رومنز تو شاعری کو الہام کا درجہ دیتے تھے......

شاعری بشر کے ذاتی، وجدانی المیہ کا بیان ہی تو ہے۔ شاعری جیسے دیوار گریہ کی تلاش۔ یہ میرا عشق بھی ہے جنون بھی۔ میرے اندر کی صداقتوں کے اظہار کا ذریعہ بھی۔ میرے اندر کی سچائیوں کو کائنات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی بھی۔ روح بدن میں پھیلتی محبت کی سرشاری بھی اور قطرہ قطرہ زندگی سے زہر کشید کر کے۔ رخصت کی راہ بھی اور احساسات و جمالیات کا اظہاریہ بھی۔ وہ جو دل کے اندر اک دنیا ہوتی ہے نا، اس کا سکون بھی۔

میں سمجھتی ہوں کہ خیال اپنی ساخت ساتھ لاتا ہے، سوچ سمجھ کر یا ارادتاً کچھ نہیں ہوتا، بس کیفیت ہوتی ہے، کبھی قرطاس پر بکھرتے بکھرتے نظم کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو کبھی دو مصرعوں میں آپ کے خیال یا کیفیت کی مکمل ترسیل ہو جاتی ہے۔ دراصل غزل دو کناروں کے درمیان کا سفر ہے...... جبکہ نظم سمندر کا سفر ہے، جانے کب کہاں بہا لے جائے آپ کی کیفیت آپ کو...... آپ کب ڈوبتے ہو، کب ابھرتے ہو کچھ پتہ نہیں چلتا...... بس لہروں کے مدوجزر پر...... رواں! مزاج چونکہ نظم سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے سو سمندر کی لہروں کا سفر زیادہ سرشار کرتا ہے۔

اک بے کلی سی، اداسی، اضطراب، ہمیشہ ساتھ رہتا ہے لیکن جب میں اپنے اندر کی کیفیت کو لفظوں میں ڈھال لیتی ہوں تو اداسی کی کیفیت سے نکل آتی ہوں اور کئی کئی دن تک اپنی تخلیق کے

سرور میں رہتی ہوں۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعر بھی، شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج یہ تو بالکل ایسا ہی سوال ہے کہ گڑیا زیادہ عزیز ہے یا سلمان، منا!

س آپ اخبار سے منسلک رہی ہیں، ایک کامیاب مدیر رہی ہیں، اب یہ بتایئے کہ صحافت میں دلچسپی کب اور کیسے ہوئی؟ کالم لکھنے کب شروع کئے؟

ج شعیب بن عزیز صاحب نے خاصا زور دیا کالم لکھنے پر کہ آپ کی نثر بہت اچھی ہے، کالم لکھا کریں۔ گھر سے بھی یہی آواز تھی۔ سعید آسی صاحب نے کالم لکھنے کی ترغیب بھی دی اور تحریک بھی۔ نوائے وقت کالم لکھنے شروع کر دیئے۔ صحافت میں کچھ خاص دلچسپی تو نہ تھی لیکن بس باتوں باتوں میں ہی اخبار سے منسلک ہو گئی۔ سنڈے میگزین کی مدیر کی ذمہ داری سنبھال لی اور اپنے مزاج میں نفاست اور پرفیکشن کی وجہ سے بہت کامیاب بھی رہی کیونکہ کمٹمنٹ اور معیار پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

س آپ کو بطور خاتون لکھاری میدان ادب میں کس قسم کی مشکلات درپیش آئیں؟

ج ایک تو عورت ہونا اس پر اس کا تخلیق کار ہونا اور وہ بھی بغیر کسی ''استاذ'' کے......مشکلات کا باعث تو بنتا ہی ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے میں مردوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو عورت کو اسیر رکھنے میں ہی اپنی ذہنی تسکین حاصل کرتا ہے، کجا وہ عورت ان کو کسی خاطر میں ہی نہ لائے......!

اللہ کا شکر ہے کہ مجھے گھر سے تو کبھی بھی کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکلات کا سامنا نہیں ہوا اور باہر کی مشکلات کو میں کسی گنتی میں اس لئے شمار نہیں کرتی کہ میری اپنی ایک سوچ ہے، مزاج، شعور اور معیار، میرے اپنے کچھ اصول بھی ہیں۔ میں اپنے مزاج کے خلاف کبھی نہیں جاتی اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتی۔ اللہ پاک نے اچھے برے کی تمیز دی ہوئی ہے، الحمدللہ! جو راستہ پسند نہ آئے وہاں ٹکراؤ کے بجائے خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتی ہوں۔ شہرت کے بجائے ہمیشہ اپنی عزت اور وقار کو ترجیح دی۔

اکثر سنتی ہوں کہ تخلیق کار صرف تخلیق کار ہوتا ہے مرد یا عورت نہیں۔ یعنی gender کی تخصیص نہیں، لیکن میں ایک پل کے لئے بھی اپنے عورت ہونے کو نظر انداز نہیں کر پائی اور مجھے فخر بھی ہے اپنے عورت ہونے پر اور الحمدللہ جتنی عزت اور محبت اللہ پاک کے فضل و کرم سے مجھے ملی

ہے اس کے لئے میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فن کار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟ دکھ کیا ہے؟ ذاتی؟ اجتماعی؟

ج میں بنیادی طور پر محبت کی شاعرہ ہوں......کومل اور لطیف جذبوں کی شاعرہ...... پھول، خوشبو، بادل، سردیوں کی بارش، سمندر، پہاڑ، خنک ہوائیں، فطرت کا حسن، محبت کی لطافت و سرشاری میرے ذوق جمالیات کی تسکین کرتے ہیں......اور ایسے میں شاعری اترنے لگتی ہے، جتنی شدت سے کوئی کیفیت اترتی ہے، اتنی ہی شدت سے وہ کیفیت قرطاس پر منتقل ہوتی ہے۔

لیکن یہاں بات چونکہ دکھ کی ہے تو اتنا ہی کہوں گی کہ چونکہ انسانی سرشت زود رنج واقع ہوئی ہے اور اک شاعر کا احساس دوسروں کی نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ سو اس کی یہی حساسیت اس کے غم کو شدت بخشتی ہے اور غم کی یہ شدت اس کی شاعری کو جلا بخشتی ہے......مشاہدہ تجربے سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے، تخلیق کار وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو ظاہر کی آنکھ نہیں دیکھتی......سو ''خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر!'' کے مصداق دل بھیگتا ہے، لفظ رونے لگتے ہیں......آنکھیں بین کرنے لگتی ہیں۔

بات چونکہ دکھوں کی ہو رہی ہے تو اتنا ہی کہوں گی کہ

دکھ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں، دل میں پلتے، روح میں گھلتے، بدن میں پھیلتے، آنکھوں سے چھلکتے، قطرہ قطرہ پگھلتے دکھ!

دکھ...... جو شاعر کے لئے اثاثہ بھی ہیں، نعمت بھی۔ اس کے لفظوں کا حسن بھی اور شاعری کا نکھار بھی۔

سڑک کے کنارے چھوٹے بچے کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کا دکھ، کوڑے پر بکھری پڑی زینب کی آہ و پکار کا دکھ، مکتب میں خون میں لتھڑے ہوئے گلابوں کا دکھ، کہیں بوڑھے ماں باپ کے آگے ناخلف اولاد کی زبان درازی کا دکھ، کبھی اپنے پیاروں کو اپنے سامنے سے جاتے ہوئے دیکھنے کا دکھ...... بوڑھے باپ کے کاندھے پر جوان بیٹے کی لاش کا دکھ، کشمیر، فلسطین، شام کے مسلمانوں کا دکھ، اپنی عزت بچا کر دارالامان سے فرار ہونے والی سڑک پر بچھی ہوئی اس سولہ سالہ بچی کا دکھ جو بھیڑیوں سے فریاد کر رہی تھی کہ مجھے میرے گھر بھیج دو......آہ!

بعض اوقات غم کی شدت انسان کو پتھر کر دیتی ہے......آنکھیں آنسوؤں سے ہی مکر جاتی

ہیں، انسان کو درد کا احساس ہی نہیں ہوتا...... وجودسن...... کوئی درد...... درد ہی نہیں لگتا، بلا کی حساسیت ہے میرے اندر...... جو عام زندگی میں نقصان تو پہنچا سکتی ہے مجھے، لیکن میرے قلم کو طاقت بھی دیتی ہے......اورلفظوں کوشدت عطا کرتی ہے۔

س ادب میں تنقید وتحقیق کی کیا اہمیت ہے، فروغ ادب کے لئے تنقید کہاں تک کارآمد ہوسکتی ہے؟

ج آج کل کے اکثر تنقیدی رویے سطحی ہیں، سامنے والے کو نیچا دکھانے کے لئے تنقید کا سہارا لے لیا جاتا ہے، اصل تنقید سے مراد ایسی صحت مند تنقید ہے جس میں اصلاحی پہلو نمایاں ہو، صحت مند تنقید تخلیق کار کے فن کو جلا بخشتی ہے۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل شاعری کے نام پر جو کچھ مشاعروں میں پیش کیا جارہا ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ اور یہ بھی بتایئے کہ مشاعروں اور تقریبات میں کم کم شریک ہونے کی کوئی خاص وجہ؟

ج اس سوال کے جواب میں تو پوری کتاب لکھ سکتی ہوں۔ مختصراً یہی کہ نہیں میں مطمئن نہیں ہوں۔ حالانکہ میں نے بے شمار کل پاکستان اور بین الاقوامی ''معیاری'' مشاعروں میں شرکت کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹی وی چینلز کے مشاعروں میں بھی شرکت کی ہے۔ پڑوسی ملک بھارت میں بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکی ہوں لیکن دو تین سالوں سے بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ زیادہ تر مشاعرے اب سنجیدہ شاعری کا پلیٹ فارم ہی نہیں رہے۔ خودنمائی، خودستائشی اور ڈرٹی پالیٹکس کا شکار ہو چکے ہیں، شارٹ کٹس سے راتوں رات مشہور ہونے کے لئے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے جارہے ہیں، یہ سب کچھ دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی، شکر میرے مالک کا کہ میرا یہ مزاج نہیں، میں کبھی بھی کسی بھی قسم کی دوڑ میں شامل نہیں رہی، کوئی لالچ، کوئی ہوس نہیں۔ ہوس چاہے دولت کی ہو یا شہرت کی، آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے...... انسان ایک اندھی دوڑ میں شامل ہو جاتا ہے اور الحمدللہ مجھے آنکھیں کھول کر چلنے کی عادت ہے اور ویسے بھی اہمیت تو ہمارے لفظوں کی ہے۔ یہی لفظ ہماری پہچان ہیں، ہمارے بعد ہمارے لفظوں نے ہی زندہ رہنا ہے۔

س لاہور رائٹرز کلب کے بارے میں بتایئے؟

ج تین برس قبل شعیب بن عزیز صاحب کی سرپرستی میں ''لاہور رائٹرز کلب'' کے نام سے ہم نے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ تنظیم کا نام بھی شعیب صاحب نے تجویز کیا۔ لاہور رائٹرز کلب

کے صدر قمر رضا شہزاد صاحب، نائب صدر فرحت پروین، سیکرٹری جنرل میں ہوں اور فنانس سیکرٹری وسیم عباس ہیں۔ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے اپنے اس پلیٹ فارم سے ہم معیاری ادبی تقریبات کا انعقاد کرلیا کرتے ہیں۔ ہماری اس تنظیم کا مقصد گروہ بندیوں سے بالاتر ہوکر صرف اور صرف جینوئن تخلیق کاروں کی تخلیقات کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہے۔ ہم نے طے کر رکھا ہے کہ جو کام بھی کرنا ہے، معیاری کرنا ہے۔

س آخر میں ایک ذاتی سا سوال کہ آپ نے اس سارے سفر میں کیا کھویا، کیا پایا؟ اور زندگی سے مطمئن ہیں؟

ج زندگی نفع نقصان سے ماورا ہے اور قربان جاؤں اپنے اللہ کے کہ اس پاک ذات نے مجھے عزت، شہرت اور بے پناہ محبتوں سے نواز کر اک ذرے کو آفتاب کیا۔

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا
کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

OOO

نیلما ناہید درانی

س سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے۔عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟ادب سے شوق کی ابتداء؟

ج میں لاہور میں پیدا ہوئی،امی کا خاندان لاہور میں بڑانڈرتھ روڈ پر رہتا تھا،امی کے دادا حکیم محمد ذکریا انجمن حمایت اسلام طبیہ کالج کے پرنسپل تھے......امی کے والدین ان کے بچپن میں وفات پا گئے تھے،ان کی پرورش ان کے دادااوردادا کے بعدان کے چچانے کی تھی......شادی بھی چچانے کروائی۔

میرے والدکا خاندان امرتسر سے لاہورآیا تھا،پاکستان بننے کے بعد،

میرے دادا مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی،خطیب اہل بیت تھے۔ان کا تخلص احقر امرتسری تھا......ان کی کتابیں چھپ کر گھر میں آتی تھیں۔

''شان عزا''اور''یادحسین''ان کی دو کتابوں کے نام ہیں۔

میرے والد آغا اعجازحسین درانی کو شاعری،افسانہ گارنگاری اورمصوری سے لگاؤ تھا،امرتسر میں اے حمیداورسیف الدین سیف سے دوستی تھی،وہ گفتگو کے دوران اقبال،غالب کے اشعار پڑھا کرتے جوبچپن میں ہی ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو گئے تھے۔گھر میں کتابوں کی فراوانی تھی،بہت سارے رسائل بھی آتے تھے۔ہمیں ہر ماہ بچوں کی دنیا،تعلیم وتربیت،ہدایت لے کر دیئے جاتے۔ان دنوں گلی محلوں میں آنہ لائبریری بھی ہوتی تھی،ہم وہاں سے لاکر بھی کتابیں پڑھتے،یوں والداوردادانے ہمیں مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کی ترغیب بھی دی۔ پہلی کہانی ماہنامہ ہدایت میں چھپی جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔رسالہ کے ایڈیٹر جناب نظر زیدی تھے۔پہلی نظم 1965ء کی جنگ کے بارے میں لکھی۔

پہلا مشاعرہ،ریڈیو پاکستان لاہور کے ہفتہ اطفال کے مشاعرے میں پڑھا جس کی صدارت صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے کی،پروگرام کے پروڈیوسر بشیر زیدی اسیر تھے۔

پہلا بڑا مشاعرہ سکول کے زمانے میں ہی ایمبیسڈر ہوٹل لاہور میں پڑھا جس کا اہتمام مشیر کاظمی نے کیا تھا.....صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی کی تھی۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیے؟

ج میری پہلی کتاب 1986ء میں شائع ہوئی،''جب تک آنکھیں زندہ ہیں۔''

2.....جب نہر کنارے شام ڈھلی

3.....تمہارا شہر کیسا ہے

4.....واپسی کا سفر

5.....قطرہ قطرہ عشق

6..... چانن کتھے ہویا۔(پنجابی شاعری)

7.....دکھ سبھا ایہ جگ۔(پنجابی شاعری)

8.....اداس لوگوں سے پیار کرنا

9.....راستے میں گلاب رکھے ہیں

10.....جنگل،جھیل اور میں

11..... چڑھدے سورج دی دھرتی (سفر نامہ جاپان)

12..... چاند، چاندنی، چندی گڑھ (سفر نامہ بھارت)

13.....ٹھنڈی عورت (افسانے)

14..... بلجیئم میں بیس دن (افسانے)

15.....عقیدت (نعت، سلام، مرثیہ)

س آپ نثر نگار بھی ہیں، شاعر بھی.....شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج مجھے اچھی تحریر پڑھنا اور لکھنا مرغوب ہے خواہ وہ شاعری کی صورت میں ہو یا نثر میں۔ شاعری، مصوری، مجسمہ سازی، کہانی کاری یہ سب فنون لطیفہ کی مختلف اقسام ہیں.....افکار کے بہتے ہوئے دھارے کو جو بھی اظہار یہ ممکن ہو وہ اس میں ڈھل جاتا ہے.....مجھے شعر کہنا اس لئے پسند ہے کہ کم الفاظ میں بڑا موضوع بھی ایک شعر میں بیان کیا جا سکتا ہے.....شاعری کے لئے وقت جگہ کی پابندی بھی نہیں ہوتی.....جبکہ نثر لکھنے کے لئے جگہ اور زیادہ وقت درکار رہوتا ہے.....شاعری میں اثر آفرینی بھی زیادہ ہے.....اسے ساز اور آواز کے ذریعے عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

س الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج الیکٹرانک میڈیا ہی صرف کتاب سے دوری کی وجہ نہیں ہے...... کتاب کا مہنگا ہونا اور عام آدمی کی دسترس سے باہر ہونا بھی ایک وجہ ہے...... جن ممالک نے الیکٹرانک میڈیا کی بنیاد رکھی، وہ تو کتاب پڑھتے ہیں...... ہر محلے میں لائبریری موجود ہے...... جہاں ہر عمر کے لوگوں کے لئے الگ الگ سیکشن ہیں...... خاص طور پر بچوں کے حصے کو بچوں کے لئے پرکشش بنایا جاتا ہے...... بچوں کی ممبرشپ بھی ہوتی ہے...... وہ کتابیں گھر بھی لے جا سکتے ہیں...... اگر پاکستان میں بھی اس طرح لائبریریاں ہوں تو کتاب سے دوری ختم ہو سکتی ہے......

پبلشرز نے بھی رنگین سرورق والی مہنگے کاغذ پر کتاب چھاپ کر اسے عوام سے دور کر دیا ہے...... منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ، منشی پریم چند اور جتنا بھی ادب ہم نے پڑھا وہ نیوز پرنٹ پر چھپی ہوئی...... پیپر بیک جلد والی نہایت سستی کتابیں ہوتی تھیں...... اب کتاب صرف دیکھنے یا شیلف میں سجانے کی چیز بن گئی ہے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیق وہ واردات ہے جو کسی حساس انسان کے ذہن و دل پر اس کے اردگرد ہونے والے واقعات، حادثات اور اثرات کے نتیجے میں اس کے قلم سے وجود میں آتی ہے...... دنیا میں آنے والا ہر انسان اپنے اردگرد کے حالات، موسم، زندگی کی خوشیوں، غموں، سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے...... مگر ایک فنکار قلم...... اس کا برش ان لمحوں کو اپنے لفظوں یا رنگوں میں قید کر لیتا ہے...... اس کو تخلیق کہا جاتا ہے...... اچھا تخلیق کار وہی ہے جس میں کوئی انفرادیت ہو...... وہ اپنی الگ ڈکشن لے کر اپنی الگ پہچان بنا سکے۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج

ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں آ گئے آنسو
خوشی کے ساتھ یہ غم کا حصار کیسا تھا

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج کچھ عرصہ سے محسوس ہو رہا ہے کہ ہر شعبہ میں غیر سنجیدگی کی فضا ہے...... کچھ لوگ فیشن کے

طور پر اس شعبہ میں آ گئے ہیں...... ان کا نظریہ شہرت حاصل کرنا ہے...... کچھ گروہ بندیاں ہیں......اصل نقل کی پہچان ختم ہوگئی ہے...... نیا منظر نامہ عجیب سا ہو گیا ہے......لیکن کہیں کہیں کبھی کبھار بہت سنجیدہ مشاعرے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں...... جیسے میاں چنوں میں آپ کے زیر اہتمام ہونے والا مشاعرہ ایک یادگار مشاعرہ تھا جو فجر کی اذان تک جاری رہا اور ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔ معیاری اور خوبصورت شاعری پیش کی گئی...... ایسے مشاعرے اب خال خال ہی دیکھنے سننے کو ملتے ہیں۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج دونوں سے...... شاعر اور ادیب اپنے قلبی، باطنی اور بیرونی، موسمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، ناگہانی واقعات سے تحریک لیتا ہے اور ان کو اپنی تحریر میں ڈھالتا ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا ایک اچھا ذریعہ ہے......ادب کے فروغ کے لئے......اس کی وجہ سے ہم اپنی بات، اپنی تحریر، اپنی تخلیق دنیا کے ہر کونے میں موجود لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں......لیکن یہاں بھی کچھ غیر سنجیدہ لوگ...... اقبال یا مختلف اساتذہ کے نام سے منسوب بے وزن اور بے تکے اشعار پوسٹ کر رہے ہیں...... جو ادب کی بجائے بے ادبی پھیلا رہے ہیں...... ادبی سرقہ بھی بڑھ گیا ہے...... کچھ لوگ اصل شاعر کے نام کی بجائے کسی کی بھی شاعری لگا کر داد وصول کرتے ہیں...... جب انہیں احساس دلایا جائے تب بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔

س ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج تخلیق کار کی ہر تخلیق اس کے ذاتی تجربات، مشاہدات، محسوسات اور واقعات ہی کا نتیجہ ہوتی ہے......اس میں زیب داستاں کے لئے رنگ بھرے جا سکتے ہیں، کچھ تصوراتی کردار اور واقعات بھی گھڑے جاتے ہیں......لیکن ہر تخلیق اپنے خالق کے تجربات و مشاہدات کا ہی مظہر ہوتی ہے۔

س کیا کھویا کیا پایا؟

ج یہ بڑا دلچسپ سوال ہے......کیا کھویا کیا پایا؟...... میں نے زندگی کے ہر لمحے سے، ہر انسان سے، ہر واقعہ سے کچھ نا کچھ سیکھا ہے...... کسی دکھ نے مجھے شعر دیا ہے...... کسی واقعہ نے کہانی......لہٰذا میں نے کبھی کچھ کھویا نہیں ہمیشہ پایا ہی ہے......

OOO

نوشی گیلانی

س با قاعدہ شعر کہنے کا آغاز کب کیا؟

ج با قاعدہ طور پر شعر کہنے کا آغاز میں نے شعور سنبھالنے کے ساتھ کیا۔اس کے بعد جوں جوں عمر بڑھی، تجربے اور مشاہدے کے حوالے سے موضوعات میں تبدیلی آتی گئی۔

س محبتیں جب شمار کرنا'' آپ کا پہلا شعری مجموعہ ہے،اس کے بعد حال ہی میں آپ کا دوسرا مجموعہ ''اداس ہونے کے دن نہیں'' منظر عام پر آیا ہے،آپ کے دونوں مجموعوں کا تقابلی جائزہ لیں تو دوسرے مجموعے میں آپ کے ہاں ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے،اس کی کوئی وجہ ہے؟

ج اگر آپ نے ایسا محسوس کیا ہے تو میرے لئے حوصلہ افزائی کی بات ہے۔ جہاں تک اس کی وجہ کا تعلق ہے تو میں یہ کہوں گی کہ اس کی وجہ شعوری نہیں ہے کہ میں بتا سکوں ایسا کیوں ہوا ہے۔ ہاں البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ عمر کے گزرتے لمحوں کے ساتھ حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں انسان میں مثبت تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ میرے نئے مجموعے میں آپ کو جس خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا ہے اس کی وجہ بھی شاید تجربات کی روشنی ہے۔

س شعر میں فن کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں یا خیال کو؟

ج شعر کہنے میں محرک آپ کا جذبہ ہوتا ہے۔اس کی شدت ہی آپ کو تخلیق کے عمل کی طرف اکساتی ہے۔ ہاں مگر اس کے ساتھ فنی تقاضوں کو پورا کرنا بھی ایک ذمہ داری ہے گو جذبے کی اہمیت زیادہ ہے لیکن جذبے اور تکنیک کا توازن میں ہونا شعر کو مؤثر بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

س بگڑتی ہوئی ادبی صورتحال کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟

ج یہ وہ لوگ ہیں جو ادب صرف ذاتی نمود و نمائش کے لئے لکھ رہے ہیں۔ان لوگوں نے اپنی منافقانہ اور اوچھی حرکتوں سے سنجیدہ فکر قاری کو ادب سے دور کر دیا ہے۔ایسے لوگوں کو فوری طور پر بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے جو اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر دن رات ادب کے تناور پودے کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ مستقبل میں ادب کو پروان چڑھانے کے لئے ضروری

ہے کہ اسے پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک مشن کے طور پر لیا جائے۔

س شاعری میں اصلاح کے عمل کو کس حد تک جائز سمجھتی ہیں؟

ج شاعری میں اصلاح عروض کو سیکھنے کی حد تک تو بہتر عمل ہے مگر فکری حوالے سے اصلاح لینا میرے نزدیک خطرناک عمل ہے۔اس سے اصلاح لینے والے کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں نئے شاعروں کی شاعری پر ان کے استادوں کا رنگ غالب ہوتا ہے۔دوسرا اصلاح کے لئے فکری صلاحیتوں کا پہلے سے موجود ہونا از حد ضروری ہے، باقی کسی بھی شاعر کی بہترین تربیت معاشرہ کرتا ہے۔اس سلسلے میں مطالعہ سے شعور کو کافی جلا مل سکتی ہے اس لئے میں نئے آنے والوں کو مشورہ دوں گی کہ اساتذہ کے چکر میں پڑنے کی بجائے وہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کی عادت اپنائیں اس سے انہیں بڑی مدد ملے گی۔ یوں بھی جس طرح کے اساتذہ اور شاگرد فی زمانہ میسر ہیں۔ادب کو ان دونوں کی ذات سے کوئی فائدہ نہیں۔

س ادیب برادری میں پروان چڑھتے ہوئے منافقانہ رویوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ج اصل میں پورا معاشرہ خاص طرح کی بے یقینی کا شکار ہے۔اس طرح ادیب بھی اس معاشرے کا ایک فرد ہے۔منصب کے اعتبار سے ادیبوں کو یہ غیر معمولی حرکت زیب نہیں دیتی۔ ان کے ہاں منافقانہ رویئے کسی طرح بھی پسندیدہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔میرے نزدیک ادیبوں میں ایسے منفی رویوں کے پروان چڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ شاید تخلیق سے ان کا ایمان اٹھ گیا ہے۔ہم دیگر حربوں سے ادبی تاریخ کا حصہ بننا چاہتے ہیں اور حرف کی توقیر کے ساتھ اپنے بنیادی فرض کو نظر انداز کرتے جا رہے ہیں۔

س کس حد تک خواتین کی آزادی کی حامی ہیں؟

ج انسان فطرتاً آزاد ہے اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ خواتین کو اس کی صنف کے اندر پوری پوری آزادی ملنی چاہئے مثلاً پانی دو کناروں کے اندر ہے تو دریا ہے اور کھیت سیراب کرتا ہے، پانی کناروں سے باہر آ کر سیلاب بن جاتا ہے تو بستیاں اجاڑ دیتا ہے۔اصل میں ہمارے ہاں آزادی کا غلط مفہوم میں لیا جاتا ہے۔

س موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار رہ گیا ہے؟

ج مشاعروں کا شاعری کو مقبول بنانے میں اہم کردار ہے لیکن وہ مشاعرے جو چند افراد مخصوص نمائشی مقاصد کے لئے ترتیب دیتے ہیں۔اس سے نہ تو شاعری کی کوئی خدمت ہوتی ہے اور نہ شاعری سننے والوں کی کوئی تربیت ہو سکتی ہے۔

س ادب میں در آنے والی سیاست کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج ادب میں نظریاتی بنیاد پر سیاست کے حق میں ہوں جبکہ شخصی بنیاد پر ادبی سیاست بازی کو قابل مذمت سمجھتی ہوں۔ گروہ بندیوں پر یقین نہیں رکھتی ہوں۔

س فلمی شاعری کو ادب شمار کرتی ہیں؟

ج فلمی شاعری کی پوری تاریخ کو دیکھیں تو ایسی چیزیں نکل آتی ہیں جو ادبی معیار کی ہیں۔اس کے برعکس فی زمانہ جو لکھا جارہا ہے اور دھڑا دھڑ بغیر سوچے سمجھے کتابیں چھپ رہی ہیں، اس کو شاعری نہیں کہا جاسکتا۔ میرے نزدیک شاعری وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلے نہ کہ وہ چیز جو کتاب میں چھپ جائے وہ ادب کہلانے کی حقدار ہوجاتی ہے۔ادب ایک مختلف فلسفیانہ عمل ہے۔ کسی اور دنیا کی بات ہے جس میں انسان کا دل اور روح یکجا ہو کر کسی خیال کو پوری شدت سے پروان چڑھاتے ہیں۔

س آپ نے حالیہ مجموعہ دینے میں قدرے تاخیر سے کام کیوں لیا؟

ج میں ٹھہراؤ اور عمل کی ریاضت سے گزرنے کے بعد کتاب لانے کو بہتر سمجھتی ہوں۔ میرے خیال میں صرف کتابوں کے انبار لگا دینے کا کوئی فائدہ نہیں، سچائی ہمیشہ موثر ہوتی ہے کثیر نہیں۔

س موجودہ دور میں مردوں کی نسبت خواتین کی شاعری میں تصوف کا رنگ نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟

ج عورت چونکہ نسبتاً زیادہ حساس ہے اس لئے روحانی اقدار کو زیادہ سنجیدگی سے لیتی ہے جبکہ آج کا مرد پہلے کی نسبت مادی ضرورتوں کا زیادہ اسیر ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ روحانی قدروں سے دور ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی نسبت آج کے مردوں کے بجائے عورتوں میں تصوف کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔

س بنیادی طور پر آپ کا تعلق پنجاب سے ہے، کیا وجہ ہے آپ کا ابھی تک کوئی پنجابی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا؟

ج زبان کوئی بھی ہو، محترم ہے۔ میرے نزدیک شاعری بے ساختہ ہوتی ہے۔ ہمارا وجدان جب تخلیقی لمحوں کے زیر اثر ہو وہاں یہ طے کر کے نہیں لکھا جاتا کہ کس زبان میں یہ بات ہونی چاہئے۔اس حوالے سے میں سمجھتی ہوں کہ ادیب کو آزاد خیال ہونا چاہئے اور محدود نہ رہے، خواہ وہ پنجابی لکھے، اردو لکھے یا سرائیکی۔

س پنجابی کو سرائیکی سے الگ زبان سمجھتی ہیں؟

ج جی بالکل، پنجابی اور سرائیکی دو الگ زبانیں ہیں۔

ناصر بشیر

س ناصر بھائی! سب سے پہلے اپنے سوانحی وادبی پس منظر کے بارے میں آگاہی دیجئے؟

ج میں 6 اکتوبر 1968 کو (آج سے پچپن سال پہلے) ملتان میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوا۔ میرا ددھیال شہر لائل پور تھا جو اب فیصل آباد کہلاتا ہے۔ والد گرامی بشیر احمد راٹھور لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں۔ انہوں نے کتابیں جمع کرنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ اگر تمہارے ابو ہر روز دو تین کتابیں لانے کے بجائے ہر روز ایک اینٹ خریدتے تو آج ہمارا بھی ایک ذاتی مکان ہوتا۔ آپ سن کر حیران ہوں گے ہمارا پورا خاندان آج بھی کرائے کے مکان میں مقیم ہے۔ والد صاحب بھی کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور میں بھی۔ اس کے باوجود اپنے وطن سے ہماری محبت ہر روز دو چند ہوتی جا رہی ہے۔ میری پہچان پاکستان سے ہے اور الحمد اللہ میرے پاکستان کی شعری وادبی شناخت میں ہوں۔ مجھے دنیا بھر میں ایک پاکستانی شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ محترم مجیب الرحمان شامی تو مجھے ''شاعر پاکستان'' کا خطاب دے چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری غزل آج پاکستان کی تخلیقی گواہی ہے۔ میں خود کو مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الہٰ آبادی، اقبال، ظفر علی خان، فیض احمد فیض، احمد فراز اور حبیب جالب کا مقلد سمجھتا ہوں۔ مقلدی شاعری کو تخلیق کا مرتبہ دینا کوئی ان شاعروں سے سیکھے۔ کم از کم میں نے تو سیکھ لیا ہے۔

بچپن کتابوں میں گزرا۔ اس لئے صحافت اور شعر و ادب ہی کی طرف آنا تھا۔ ملتان میں زمانہ طالب علمی ہی میں روزنامہ ''امروز'' اور روزنامہ ''نوائے وقت'' میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرا چھٹی جماعت کا ایک کلاس فیلو مئی کی شدید گرمی میں عام خاص باغ ملتان فٹ بال کھیلتے ہوئے انتقال کر گیا تو میں نے پورے واقعے کی خبر بنائی اور روزنامہ ''امروز'' کے دفتر میں مرزا ابن حنیف اور ولی محمد واحد کے پاس لے گیا۔ میری بنائی ہوئی خبر دیکھ کر دونوں ہی بے ساختہ بولے ''بھئی یہ تو بہت اچھی خبر ہے'' میں سن کر حیرت میں پڑ گیا کہ جو خبر گھر والوں پر بجلی بن کر گری ہے اخبار

والوں کے لئے وہ بہت اچھی خبر ہے۔اسی دن مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میرے اندر ایک خبر نگار،صحافی موجود ہے۔شاعری کا جوہر بھی بچپن سے میرے اندر موجود تھا۔ساتویں آٹھویں جماعت میں تھا جب میری ٹوٹی پھوٹی شاعری ملتان کے مقامی اخبارات میں چھپی تھی۔ 1985 میں انٹر کرنے کے لئے گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان گیا تو وہاں انور جمال جیسے ذہین استاد اور نہایت عمدہ شاعر سے اردو لازمی اور اردو اعلیٰ پڑھی۔انہوں نے میری شاعری کے جوہر کو پہچان لیا تھا۔سو مجھ پر کچھ زیادہ ہی توجہ دیتے تھے۔1986ء میں اطہر ناسک میرے والد صاحب کے کہنے پر مجھے بیدل حیدری مرحوم کے پاس کبیر والہ لے گیا۔میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ بیدل صاحب مجھے اپنے حلقہ تلامذہ میں شامل کرلیں۔بیدل صاحب نے کہا کہ پہلے میں تمہارا امتحان لوں گا۔اگر کامیاب ہوگئے تو ٹھیک ورنہ گھر چلے جانا۔میں نے امتحان سے گزرنے کا فیصلہ کرلیا۔انہوں نے کاغذ پر ایک مصرع لکھا جو بے معنی سا تھا۔وہ مصرع یہ تھا:

کہاں ہے، کہاں ہے، کہاں ہے ابھی

بولے ''اس مصرع کو بامعنی مصرع لگا کر مکمل شعر بنادو'' ہاف سیٹ چائے آچکی تھی جس میں سے تین کپ بنالئے گئے۔ایک کپ مجھے تھمادیا اور کہا کہ ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ جاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر گرہ لگاؤ۔اتفاق دیکھئے کہ یہ مصرع دیکھتے ہی مجھے ایک مصرع سوجھ گیا۔میں نے وہ بیدل صاحب کے مصرعے کے نیچے لکھ دیا اور کاغذ کا ٹکڑا بیدل صاحب کے سامنے دھر دیا۔کاغذ دیکھ کر انہوں نے پریشانی کے عالم میں اپنے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ناسک نے دیکھا تو بولا ''بیدل صاحب!ابھی بچہ ہے۔ایک موقع اور دے دیجئے''۔بیدل صاحب بولے ''نہیں بھئی!اس کا لگایا ہوا مصرع دیکھو'' جب بیدل صاحب نے مصرع سنا تو ناسک نے بھی خوب داد دی۔مصرع لگانے کے بعد شعر یوں مکمل ہوا تھا۔

کہاں ہے، کہاں ہے، کہاں ہے ابھی
یہ دنیا جہاں تھی وہاں ہے ابھی

اطہر ناسک نے میرے بازو پر رومال باندھا۔پاؤ بھر برفی منگوائی گئی جو ہم تینوں نے مل کر کھائی۔دوبارہ چائے پی گئی۔یہ تھی میرے استاد گرامی کی رسم شاگردی۔بی اے میں نے گورنمنٹ ایمرسن کالج سے کیا۔پروفیسر افتخار حسین شاہ سے اردو زبان و ادب کا اختیاری مضمون پڑھا۔عامر سہیل میرا کلاس فیلو تھا جو آج خود پی ایچ ڈی ہے اور سینکڑوں شاگردوں کو ایم فل اور پی

ایچ ڈی کرا چکا ہے۔

یہ بات آپ کے لئے شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ میٹرک کے بعد میرے والد صاحب نے مجھے ریلوے روڈ ملتان کے ایک موٹر سائیکل مکینک کے پاس کام سیکھنے کے لئے بٹھا دیا تھا۔لیکن رزلٹ آیا تو میری فرسٹ ڈویژن تھی۔ سو مجھے انٹر میں داخلہ دلوا دیا گیا۔انٹر کے امتحان کے بعد والد صاحب نے وہاڑی روڈ کی ایک مشہور ٹیکسٹائل ملز میں بھرتی کروا دیا لیکن رزلٹ ایک بار پھر اچھا آیا۔اس لئے بی اے میں داخل کروا دیا گیا۔ بی کے بعد والد صاحب نے پکا فیصلہ کرلیا تھا کہ تعلیم کا سلسلہ موقوف کر کے مجھے کسی کام پر لگوا دیں گے لیکن میں نے بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں داخلے کی درخواست دے دی۔صدر شعبہ ڈاکٹر انوار احمد شاید میرے والد صاحب سے ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے ایم اے اردو میں داخلہ نہیں دیا۔ میں غالباً ان کے میرٹ پر پورا نہیں اترتا تھا۔ان کا میرٹ کیا تھا۔ساری دنیا جانتی ہے۔تبھی تو پنجاب کے ایک گورنر خالد مقبول نے انہیں سرائیکی کا ڈیپارٹمنٹ بنا کر دے دیا تھا۔بی زیڈ یو کے رجسٹرار عرش صدیقی صاحب نے مجھے میرا این او سی بنا کر دیا اور کہا پنجاب یونیورسٹی یا گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لو۔ لاہور میں رہو گے تو دیکھنا جو لوگ تمہیں آج داخلہ نہیں دے رہے کل تمہیں حیرت سے دیکھا کریں گے۔ مجھے انوار صاحب سے آج کوئی گلہ نہیں۔ میں آج بھی ان کا احترام اسی طرح کرتا ہوں جیسے کل کرتا تھا۔سبب اس کا یہ ہے کہ وہ میرے لاتعداد دوستوں کے استاد ہیں۔آج الحمدللہ میری شاعری پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی میٹرک کی اردو کی کتاب میں شامل ہے۔ہم نے تو یہ سنا تھا کہ میٹرک اور انٹر میں صرف انہی شاعروں کی نظمیں شامل ہوتی ہیں جنہیں مرے ہوئے چالیس پچاس برس گزر چکے ہوں۔

س میٹرک کی کتاب میں آپ کی کون سی نظم شامل ہے؟

ج ان نظم کا عنوان ہے ''بہادر بچے'' اس کا مطلع ہے:

پاکستانی بچے ہیں، امن سے اتنا پیار ہمیں
اپنے اندر کے دشمن سے لڑنا ہے اس بار ہمیں

یہ نظم میں نے سانحہ پشاور کے پس منظر میں لکھی تھی۔میرے تین بچوں نے میٹرک میں یہ نظم پڑھی ہے۔چوتھا شاید اگلے سال پڑھے۔

س پھر آپ نے ایم اے اردو کہاں سے کیا؟

ج فیصل آباد کی پہچان ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے مجھے لاہور جاتے ہوئے فیصل آباد ہی میں روک لیا۔ گورنمنٹ کالج دھوبی گھاٹ میں ایم اے میں داخلہ بھی دلوادیا اور روزنامہ ''عوام'' میں اٹھارہ سو روپے ماہوار پر ملازمت بھی دلوادی۔ یہ 1988 کی بات ہے۔ اٹھارہ سو روپوں میں سے ایک ہزار روپے کی بچت کر کے گھر بھیجتا رہا۔ ''عوام'' اخبار نے میری صحافتی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ روزانہ کسی مقامی موضوع پر اداریہ لکھنے سے میری قوت تحریر بے پناہ ہوگئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کاغذ اور قلم سے جتنا میرا رشتہ ہے شاید ہی کسی اور کا ہو۔ ہر روز کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔ غزلیں کہتا ہوں۔ نظمیں لکھتا ہوں۔ اخبار کے لئے کالم نویسی کرتا ہوں۔ کتابوں پر تبصرے کرتا ہوں۔ لوگوں کے انٹرویوز کرتا ہوں۔ حتیٰ کہ بہت سا کام میں دوسروں کے لئے بھی کرتا ہوں۔ مجھے آپ سخن مزدور یا قلم مزدور کہہ سکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو اصلاح کے نام پر غزلیں لکھ کر دیتا ہوں۔ روزی روٹی کے لئے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بہت کچھ کراتی ہیں۔

س پھر لاہور کس طرح آئے؟

ج 1990 میں ایم اے فائنل ایئر کے پیپر دے کر میں لاہور آ گیا۔ یہاں آتے ہی روزنامہ ''پاکستان'' میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں یہ اخبار نیا نیا نکلا تھا۔ پاکستان میں میں نے بہت بڑے بڑے صحافیوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان کے ساتھ کام کیا۔ یہ یادداشتیں کبھی ضرور لکھوں گا۔

س درس وتدریس کی طرف کیسے آئے؟

ج مجھے شروع ہی سے لیکچرار بننے کا شوق تھا۔ تبھی تو ایم اے اردو کیا تھا۔ ایم اے کرنے کے پانچ برس بعد 1995 میں مجھے پنجاب پبلک سروس کمیشن نے لیکچرار سلیکٹ کیا۔ پہلی پوسٹنگ پتوکی میں ہوئی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی ان دنوں روزنامہ ''پاکستان'' میں میرے رفیق کار تھے۔ ایک دن کہنے لگے ''یار! کالج دے منڈے تیرے کولوں ڈر جاندے نیں؟'' میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں منڈیاں نوں پڑھان جاناں واں ڈران نئیں جاندا'' اس پر انہوں نے بھرپور قہقہہ لگایا اور بولے ''یار! اسیں تے اج تک نئیں پڑھایا۔ ساڈے کولوں تے پرنسپل وی ڈردا اے''۔ آج مجھے پڑھاتے ہوئے پچیس سال ہوگئے ہیں۔ ان دنوں گورنمنٹ دیال سنگھ کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوں۔ 2028 میں بشرطِ زندگی ''ساٹھ برس کی عمر میں سبک دوش ہوجاؤں گا اور نئے ارادوں کے ساتھ زندگی گزاروں گا۔

س آپ کی شاعری کے اب تک کتنے مجموعے چھپ چکے ہیں؟

ج آپ حیران ہوں گے کہ میرا اکلوتا شعری مجموعہ ''منظر بدل گئے'' 1994 میں چھپا تھا۔ آج 26 سال گزر گئے دوسرا مجموعہ نہیں چھپ سکا۔ شاعری کے انتخاب کا موقع نہیں مل رہا۔ شاعری کروں یا کتاب مرتب کروں؟ اب سوچ رہا ہوں کہ 2021 میں شاعری کے دو ایک مجموعے لے ہی آؤں ''منظر بدل گئے ہیں'' اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس پر احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، ظفر اقبال، روحی کنجاہی، خالد احمد اور عباس تابش کی مختصر اور مفصل آراء درج تھیں۔ اس کتاب کی رونمائی شیزان ہوٹل میں قتیل شفائی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب میں حامد میر نے اپنی زندگی کا پہلا ادبی مضمون پڑھا تھا جو بعد میں روزنامہ پاکستان میں ''قلم کمان'' کے عنوان سے کالم کی صورت میں چھپا تھا۔ گم شدہ افسانہ نگار شمس آغا پر میں نے ایم اے کا مقالہ لکھا تھا جو بعد میں ''شمس آغا کی کہانی'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپا۔ 2006 میں ''اشفاق صاحب کے زاویے'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تو علامہ اقبال کے پوتے طیب اقبال کی طرف سے نوٹس آ گیا کہ اشفاق احمد کے بارے میں آپ کو کتاب چھپوانے کا کوئی قانونی حق نہیں۔ یہ کتاب بازار میں دستیاب ہے۔ میرے لئے اقبال سے یہی نسبت کافی ہے کہ مجھے اقبال کے پوتے نے قانونی نوٹس بھیجا۔ بعد میں ایک تقریب میں طیب اقبال نے مجھے شاعری پر ایوارڈ دیا۔

س اقبال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج اقبال شاعری کی وہ بلند چوٹی ہے جسے آج تک کوئی سر نہیں کر سکا۔ جو اس چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ سد پارہ کی طرح گم ہو جاتا ہے۔

س آپ نے دو سفرنامہ ہائے حجاز بھی تو لکھے تھے؟

ج جی ہاں! 2016 میں میرا عمرے کا سفرنامہ چھپا۔ اس سفرنامے کو بھی الحمد للہ بہت مقبولیت ملی۔ اس کے اب تک دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس سفرنامے کا ممتاز مفتی کے ''لبیک'' سے موازنہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ''لبیک'' دراصل صرف داخلیت کا مظہر ہے جبکہ پہلی پیشی داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہے۔ عمرہ کر کے آنے والا کوئی اور شخص جب ''پہلی پیشی'' کا مطالعہ کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

2018 میں میرا سفرنامہ حج ''حج بیتی'' چھپا۔ یہ دونوں کتابیں میری اپنی سرمایہ کاری سے چھپیں۔ اگر مجھے بھی مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور احمد فراز کی طرح کوئی بے لوث اور بہادر پبلشر میسر آ جائے تو میرا بہت سا کام سامنے آ سکتا ہے۔ سنگِ میل والے افضال احمد میرے دیرینہ مہربان ہیں۔ لیکن پاس کی چیزیں دوستوں کو کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔

س آپ نے اب تک کن کن ملکوں کے دورے کئے؟

ج نومبر 2000 میں، مجھے جمشید مسرور کی دعوت پر ناروے جانے کا موقع ملا۔ 2004 میں دو دفعہ انڈیا گیا۔ دو ہی بار سعودی عرب گیا۔ ان اسفار سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر آپ کسی پاکستانی میں حب الوطنی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اسے کم از کم ایک ہفتہ کے لئے انڈیا بھیج دیں۔ وہاں کے ہندو اور مسلم عوام کی حالت زار دیکھ کر اسے پاکستان سے پیار ہو جائے گا۔ اگر آپ کسی کو اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو اسے ایک ہفتے کے لئے کسی یورپی ملک بھیج دیں۔ وہاں وہ دیکھ لے گا کہ وہاں کس طرح شہری قوانین کی پابندی کرتے ہیں اور اگر کسی کو عبادت گزار مسلمان بنانا چاہتے ہیں تو عمرے کے لئے سعودی عرب بھیج دیں۔

س اب تک آپ کو کتنے اعزازات مل چکے ہیں؟

ج اعزازات اب ملتے نہیں، چھیننے پڑتے ہیں۔ آپ کا اہل سیاست سے تعلق ہو تو آپ ایک گانا گا کر بھی پرائیڈ آف پرفارمنس حاصل کر سکتے ہیں۔ میں لاتعداد قومی نغمے لکھ چکا ہوں۔ کشمیر پر میرا لکھا ہوا ایک نغمہ بیک وقت ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی پر چلتا ہے۔ لیکن صدارتی ایوارڈ کے لئے شخصیات کا انتخاب کرنے والوں کی نظر ہم جیسوں پر نہیں پڑتی جو کرائے کے مکانوں میں رہ کر بھی حب الوطنی سے سرشار شاعری کرتے ہیں۔ فی الوقت یہ اعزاز حاصل ہے کہ حلقۂ ارباب ذوق جیسے ادارے کا سینئر رکن ہوں۔ الحمرا ادبی بیٹھک کی ممبر شپ سکروٹنی کمیٹی کا رکن رہا ہوں۔ الحمراء کی سکرپٹ کمیٹی کا رکن ہوں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ایک بار مجھے شاعری پر پچاس ہزار روپے کا انعام دیا۔ 2014 سے نیشنل بک فاؤنڈیشن کا ایک ایمبسڈر رہوں۔ ایم اے اور ایم فل کے مقالے مجھ پر لکھے جا رہے ہیں۔ یہ نہایت مزے کی بات ہوگی کہ میں ان دنوں جس یونیورسٹی سے ایم فل کر رہا ہوں، اس یونیورسٹی میں میری شخصیت اور فن پر ایک طالبہ ایم فل کر رہی ہے۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج شاعر عام طور پر، نثر سے کتراتے ہیں لیکن میں نثر بھی مزے لے کر لکھتا ہوں۔ شاعری اور نثر دونوں میں میرا دل دھڑکتا ہے۔

س الیکٹرانک میڈیا سے دوری کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہو چلا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہیں؟

ج بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ کتاب سے دوستی دراصل ایک کلچر کا نام ہے۔ یہ کلچر آپ خود ہی پیدا کر سکتے ہیں اور خود ہی ختم بھی کر سکتے ہیں۔ میرے مکان کے پانچوں کمروں میں ہر وقت بے شمار کتابیں موجود رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ ہمرے کچن میں بھی دو چار کتابیں ضرور پڑی رہتی ہیں۔ میرے بچے بھی نئی نسل کے پروردہ ہیں۔ لیکن وہ تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانے اور موجودہ ادیبوں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ کتاب پڑھنا ایک نشہ ہے۔ جسے ایک دفعہ لگ جائے وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ آج سے بیس سال پہلے کی نسبت زیادہ کتابیں چھپ رہی ہیں اور بک رہی ہیں۔ ہر سال منعقد ہونے والے کتابی میلوں میں کروڑوں روپوں کی کتابیں بکتی ہیں۔

س ہمارے سرکاری ادبی اداروں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج یہ ادارے بہت کمزور پڑ چکے ہیں۔ یہ اپنی بقاء کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے دور میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے لئے اعزازی طور پر اتنا کام کیا کہ اس ادارے سے تنخواہ پانے والوں نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ اب یہ ادارہ دم توڑ چکا ہے۔ اس محکمے کے وفاقی وزیر شفقت محمود کو ایک بار میں نے اپنے کام میں جھنجھوڑا تو انہوں نے لاہور کے ادیبوں سے ملاقات کی محفل برپا کی۔ یہ بات مجھے ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے بتائی تھی۔ اگر ان اداروں کی سربراہی سینئر اور معزز و محترم ادیبوں شاعروں کو دے دی جائے تو یہ ادارے آج بھی اپنی ساکھ بحال کر سکتے ہیں۔ اس حکومت نے ان ادبی اداروں کو ہائر ایجوکیشن کمیشن کی یونیورسٹیاں سمجھ لیا ہے۔ اس لئے ان کی سربراہی کے لئے پی ایچ ڈی شخصیات کو ڈھونڈ رہی ہے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج ایک معمولی سی بات کو بہترین اسلوب میں بیان کر دینا تخلیقیت ہے۔ ایک عام آدمی اپنے دل کی بات چند لگے بندھے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ جبکہ ایک تخلیقی شاعر یا ادیب ایک ہی بات کو کئی اسالیب میں بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج جب میں مرغی کی طرح انڈے دے کر فارغ ہوجاتا ہوں تو خود کو بہت آسودہ محسوس کرتا ہوں۔ زندگی میں ہر سفر کا ہر لمحہ میرے لئے آسودگی کا لمحہ ہے۔ یہ سفر ہی ہے جو مجھے تخلیقی طور پر نئے نئے رنگوں سے آشنا کرتا ہے۔ بقول میر:

سرسری ہم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

جب میں تخلیق کے عمل سے گزرنے کے بعد اپنے بچوں کے درمیان بیٹھتا ہوں تو خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہوا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جارہا ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج ہمارے مشاعرے کی روایت کو نئے میڈیا چینل کی روایت نے توڑا ہے۔ ان چینلوں نے اس روایت کو توڑا ہی نہیں مسخ بھی کیا ہے۔ پھکڑ پن کو مزاح کے نام پر پیش کیا جارہا ہے۔ اس صورت حال میں مجھے پی ٹی وی کے مشاعرے اچھے لگنے لگے ہیں جو کبھی کبھار ہوتے ہیں لیکن تمام ادبی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر منعقد کئے جاتے ہیں۔ اگر پی ٹی وی مزاحیہ مشاعروں کی بھیڑ چال سے باہر نکل آئے تو ادب کی مزید خدمت کر سکتا ہے۔ میرے پی ٹی وی کے سینئر پروڈیوسروں سید محسن جعفر، آغا قیصر عباس اور سید اظہر فرید سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ میرے یہ تینوں دوست نہایت ذمہ داری سے پی ٹی وی کی ساکھ بنانے میں مصروف ہیں۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ مشاہدے سے یا اندرون سے؟

ج زندگی کا مشاہدہ شاعروں ادیبوں کو لکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ لکھنا صرف اندر کی بات ہے۔ جس طرح بدن میں روح ہوتی ہے اس طرح لفظوں میں جان ڈالنے کے لئے آپ کو اپنے دل پر بہت سے زخم سہنا پڑتے ہیں۔ درد برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہی زخم اور درد آپ کے مردہ لفظوں کو زندہ کرتے ہیں۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا کا تخلیق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تخلیق کاروں کے باہمی رابطے کا ایک ذریعہ تو ہو سکتا ہے تخلیق کا باعث ہر گز نہیں ہوسکتا۔ سوشل میڈیا نے ہمارے ادیبوں شاعروں کو نہایت خطرناک قسم کی خود پسندی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب وہ سیکھنے سے محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔

س ادب کے حال اور مستقبل سے آپ مطمئن ہیں؟

ج بالکل مطمئن ہوں۔ ہمارے ہاں اچھی نثر لکھنے اور اچھا شعر کہنے والے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ آج بھی موجود ہیں۔ بس یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ بہت جلد مقبول ہو جاتے تھے، پہلے تخلیق کار کو نقاد میسر آ جاتے تھے۔ آج نقادوں نے جینوئن تخلیق کاروں کے بجائے اپنے دوستوں کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ جامعات نے تنقید کو برباد کر دیا ہے۔ میں ترا حاجی بگوئم، تو مرا ملا بگو کی کیفیت ہے۔

س کس ادیب یا شاعر کی طرز تحریر یا نثر نگاری سے متاثر ہیں:

ج مجھے قدرت اللہ شہاب جیسی سیدھی سادھی نثر اچھی لگتی ہے۔ جو سادگی کے باوجود آپ کو جکڑے رکھتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر چراغ تلے، خاکم بدہن اور زرگزشت تک تو مزہ دیتی ہے۔ لیکن بعد میں آنے والی ان کی دونوں کتابوں میں بوجھل پن پایا جاتا ہے۔ کالم نگاری میں ابن انشاء اور عطاالحق قاسمی میرے پسندیدہ ہیں۔ قاسمی صاحب نہایت سہولت سے بڑی سے بڑی بات کہہ ڈالتے ہیں۔

یاد رکھئے قاسمی صاحب کے بارے میں یہ بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں جب قاسمی صاحب کسی سرکاری عہدے پر فائز نہیں۔ آج یہ بھی توقع نہیں کہ وہ پرائیڈ آف پرفامنس کے لئے میرا نام بھیج دیں گے۔ میں کالم لکھتے ہوئے ہمیشہ قاسمی صاحب کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

○○○

ڈاکٹر نجیب جمال

ڈاکٹر نجیب جمال شعروسخن کا ایک ممتاز اور روشن حوالہ ہیں۔تحقیق کے حوالے سے ان کے کام کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔عمر کا زیادہ تر حصہ ادب پڑھتے اور پڑھاتے گزرا۔خوبصورت شعر کہتے ہیں اور باکمال نثر نگار ہیں۔ان جیسا وسیع اور گہرا مطالعہ ہمارے عہد میں کم کم سخن وروں اور اساتذہ کا اعزاز ہے۔ان کا خصوصی شکریہ کہ ہماری فرمائش اور درخواست پر انہوں نے انٹرویو کے لئے وقت نکالا۔اس حقیقت کے سبب سے اور بھی زیادہ مشکور ہیں کہ وہ اس وقت امریکہ میں ہیں۔سفر میں ہونے کے باوجود انہوں نے ہم سے کیا ہوا وعدہ نبھایا اور قارئین کے ذوق مطالعہ کے لئے مکالمے کا اعزاز بخشا۔سرتاپا محبت میں رچے بسے ایک ایسے تخلیق کار اور تنقید نگار جن کا دم قوم و وطن کے لئے غنیمت ہے۔

س آپ شاعر ہیں نثر بالخصوص تنقید، تحقیق اور ادب کی دیگر اصناف میں بھی کافی کام کیا ہے۔ان اصناف میں سے دل کے زیادہ قریب کون سی ہے؟

ج میرا دل سب سے زیادہ شاعری کے نزدیک رہا ہے۔میں نے 1976 میں بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کیا تھا۔اور اب تک میں نے شاعری کو زیادہ رغبت سے پڑھا اور پڑھایا ہے۔طالب علمی کے زمانے میں بہت شعر کہے۔انٹر کالجیٹ مشاعروں میں ٹرافیاں اٹھائیں مگر پھر میرے اندر کا نقاد غالب آتا گیا اور اس نے ہی مجھے سمجھایا کہ نوجوانوں کے جذبات سے کھیلنے کی بجائے، کچھ منفرد بہتر اور کچھ سب سے الگ کہنے کے لئے بقول میر صاحب ''خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے تب نظر آتی ہے اک مصرعہ کی صورت'' سو میں نے شاعری ترک کی مگر شاعری سے دل بستگی برقرار رہی اور اب تک ہے۔بعدازاں میں نے جتنی بھی تنقید لکھی اس کا موضوع شاعری ہی رہا، تاہم کلاسیکی شاعری پر توجہ زیادہ رہی۔میری کچھ کتابوں ''اردو شاعری کی تہذیب'' ''پنج آہنگ''، ''ماہ و سال عندلیب'' (غالب کی شاعری اور فن پر مضامین'' اور ہمارا اقبال کا موضوع کلاسیکی شاعری لاآہنگ ہی رہا۔تنقید سے میں تحقیق کی طرف

گیا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ ''یگانہ'' کے بارے میں لکھا۔ ڈگری تو 1988 میں ملی۔ مگر یہ شائع 2013 میں ہوا اور اسی سال اس پر یو بی ایل ایکسی لینس ادبی ایوارڈ ملا۔ یوں مجموعی طور پر اٹھارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ کتابیں مدون بھی کیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے تحقیق وتنقید ہی اب میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ تحقیق وتنقید میرے نزدیک اعلیٰ درجے کی سنجیدگی اور یکسوئی کا تقاضا کرتی ہے۔ جس کے لئے مطالعہ، محنت، عرق ریزی اور لگاؤ کی ضرورت ہے یعنی ''یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جا سکتا''۔ تخلیقی سطح پر کچھ کام شخصیت نگاری اور یک بابی ڈرامہ کی صورت کیا رکھا ہے۔

س بچپن کہاں گزرا؟ گردو پیش کے حالات کیسے تھے؟

ج میں 3 مئی 1952 کو لائل پور میں پیدا ہوا۔ میرے والد عبدالمجید وہاں لائل پور کاٹن ملز میں ٹیکسٹائل کے شعبے سے وابستہ تھے۔ لائل پور کاٹن ملز کی ایک شاخ بھی اوائل بیسویں صدی میں قائم ہوئی تھی۔ میرے والد قیام پاکستان سے قبل دہلی سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آ گئے تھے۔ تاہم میرے دادا، دادی، والدہ اور دیگر افراد خانہ پاکستان بننے کے بعد لائل پور منتقل ہوئے جہاں ہماری رہائش ملز کی کالونی میں تھی۔ میں نے ابتدائی تعلیم ایل سی ایم ماڈل ہائی سکول لائل پور سے ہی حاصل کی۔ میٹرک اسی سکول اور پھر ایف ایس سی گورنمنٹ کالج سے کیا۔ میرے بچپن کی خاص بات لائل پور کاٹن ملز کا سالانہ مشاعرہ تھا جو ہر سال مارچ کے مہینے میں سالانہ میلے کے ساتھ منعقد ہوتا تھا جس میں اس وقت کے تمام ممتاز اردو شعراء اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے دنوں میں جگر، اصغر، فیض، جوش، احمد ندیم قاسمی، مجروح، ساحر وغیرہ کو یہیں پر دیکھا اور سنا۔ قاسمی صاحب نے اپنی معروف نظم ''پتھر'' اسی سالانہ مشاعرے میں سنائی تھی۔ پھر ہر سال 'پتھر' 'پتھر' کی آوازیں سنائی دیتیں اور قاسمی صاحب اپنی نظم پتھر سے شعر سنایا کرتے تھے۔ فیض صاحب کی زبانی ''مجھ سے پہلی سی محبت''۔ جوش صاحب سے ''فتنہ خانقاہ'' ساحر سے ''چلو اک بار پھر اجنبی بن جائیں ہم دونوں'' (بعد میں علم کا حصہ بنی) بھی میرے حافظے کا حصہ ہیں۔ قاسمی صاحب کو جب میں نے بتایا کہ پانچ سال کی عمر میں میں نے پتھر سنی تھی اور پھر ہر سال سننے کی وجہ سے وہ نظم میرے حافظے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔ تو وہ میرا تعارف ہی نظم ''پتھر'' کے پہلے سامع کے طور پر کرایا کرتے تھے تو اس طرح میرا بچپن گزرا۔

س ادب وصحافت سے شوق کی ابتداء؟

ج یہ تو کہنا بہت مشکل ہے کہ ادب سے شوق کی ابتداء کب ہوئی۔بچپن ہی سے کچھ چیزوں کو پڑھنے کی چاٹ لگ گئی تھی۔گھر میں سب بہن بھائیوں کے لئے بچوں کے رسائل ''تعلیم وتربیت''۔''کھلونا''اور''بچوں کی دنیا''خریدے جاتے تھے۔مجھے بھی کہانی لکھنے کا شوق ہوا۔ جس کہانی نے بہت متاثر کیا وہ عزیز اثری کی لکھی ہوئی''عالی پر کیا گزری''تھی۔میرے بڑے بھائی کو جاسوسی ناول اور خاص طور پر ابنِ صفی کے ناول پڑھنے کا چسکا تھا۔ہر ماہ عمران سیریز اور فریدی سیریز کے دو ناول شائع ہوئے تھے۔جنہیں میں اپنے بھائی سے بھی پہلے پڑھ چکا تھا۔خود اپنے ہاتھ سے بچوں کا ایک مکمل رسالہ لکھا کرتا تھا۔شروع ہی سے خوش خط تھا اس لئے یہ کام بہت شوق سے کرتا اور ہم جماعتوں کو وہ رسالہ پڑھواتا تھا۔آٹھویں جماعت میں بزم ادب کا صدر منتخب ہوا۔اور میٹرک تک مسلسل تین سال تک رہا۔اس زمانے میں سکول کے اردو کے استاد شوکت موہانی جو مسرت موہانی کے رشتہ دار بھی تھے اور انگریزی کے معروف نقاد اور شاعر افسر ساجد کے ماموں تھے،نے میری خصوصی تربیت اور رہنمائی کی ابتدائی طور پر شعر ونثر کی قرأت کا قرینہ میں نے انہی سے سیکھا۔

س اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

ج میری پہلی کتاب''غالب کی شکن اور یگانہ''یگانہ کی مشہور زمانہ تصنیف''غالب شکن'' کی تدوین پر مشتمل تھی۔جسے کاروانِ ادب نے شائع کیا۔اس کے بعد تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''نگاہ''اور محاسن''کے عنوان سے بیکن بکس ملتان سے شائع ہوئے۔پانچ کلاسیکی شاعروں (ولی، آتش، غالب، مومن اور یگانہ) پر''پنج آہنگ''اور غالب پر''ماہ وسال عندلیب''کے ٹائٹل سے دو کتابیں سطور پبلی کیشنز ملتان نے اور بہاول کے چھے شاعروں پر کتاب''شش جہات''اور قیام مصر((1998-2002 کے دوران وہاں ادبی کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔بارہ تحقیقی وتنقیدی مضامین''ندوۃ النسیل''کے عنوان سے دو کتابیں اردو اکیڈمی بہاولپور نے شائع کیں۔تین کتابیں اظہار سنز لاہور سے شائع ہوئیں۔ان کے نام بالترتیب''کتاب سے پہلے''(ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اپنی کتابوں پر لکھے گئے دیباچوں کی تدوین)''کتاب کے بعد(ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دوسرے شاعروں کی کتابوں پر دیباچے)اور''یگانہ''،تحقیقی وتنقیدی مطالعہ(پی ایچ ڈی کا مقالہ)ہیں۔یگانہ کے کلام کا انتخاب نیشنل بک فاؤنڈیشن نے کیا۔عرب طالب علموں کے لئے ایک کتاب''آیئے اردو بولیں''مصر میں پاکستان کے سفارت خانے نے شائع کی۔دو کتابیں

''امیر خسرو سے میر من تک اور الشعر الاردی'' بھی مصر کے مطابع ''الکمال'' سے شائع ہوئیں۔ اردو شاعری کی تہذیب'' کو چولستان علمی وادبی فورم بہاول پور نے شائع کیا۔ ان کے علاوہ دو سو سے زائد تحقیقی وتنقیدی مضامین نقوش، فنون، اوراق، ماہ نو، غالب، الحمراء، قومی زبان اور دیگر رسائل کے علاوہ جامعات کے ہائر ایجوکیشن سے منظور شدہ جرنلز میں شائع ہوئے ہیں۔ ادبی خدمات کے سلسلے میں حکومت پاکستان نے صدارتی ایوارڈ تمغۂ امتیاز 2016 میں عطاء کیا۔ استنبول یونیورسٹی نے 2015 میں اردو کی سو سالہ تدریس کے موقع پر بین الاقوامی اردو کانفرنس کے موقع پر لائف ٹائم ایوارڈ بھی دیا۔

س کسی ادبی تحریک کا بھی حصہ رہے ہیں؟ کیا اہل قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے؟

ج میں ذہنی طور پر ترقی پسند تحریک کے قریب تر رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ اب چونکہ ترقی پسندوں کے کئی دھڑے بن چکے ہیں۔ اس لئے عملاً باقاعدگی کا سلسلہ تو قائم نہیں ہے تاہم وابستگی اور دلچسپی کا عالم اب پہلے جیسا ہے۔ درحقیقت میں میری ادبی تربیت میں فیض، جذلی، ساحر، ندیم، مجاز، مجروح، احتشام حسین، علی عباس حسینی، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اہل قلم معاشرے کا حساس ترین طبقہ ہیں۔ انہیں ہر صورت سیاسی وسماجی صورتِ حال کو موضوع بنانا چاہیئے۔ تاہم کسی پروپیگنڈے یا نظریے سے بالاتر ہو کر یہ کام صورت احوال کے پیش نظر سمت نمائی کے نقطہ نظر سے کرنا چاہیئے۔ آج سے ین سو سال پہلے میر وسودا کی شاعری اس کی مثال ہے۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج کہا تو یہ جا رہا ہے کہ شاید کتابوں سے عشق کی یہ آخری صدی ہے۔ مگر میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ تاہم جہاں کتاب کی ماہیت میں تبدیلی آرہی ہے۔ وہاں کتب بینی کے قرینے بھی بدل رہے ہیں۔ ہمیں ان تبدیلیوں کو ڈیجیٹل دور کے مطابق قبول کرنا ہوگا۔ الیکٹرنک میڈیا نے ہی ہمیں کارپوریٹ کلچر اور ہائپر ریلیٹی (تشکیلی حقیقت) کے تصورات نے بھی میڈیا کو بہت طاقتور بنا دیا ہے۔ مگر لکھے ہوئے لفظ کی تاثیر ابھی تک قائم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے دور میں لکھے ہوئے لفظ کے مستند معنی کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ اب متن کے نامختتم معنی یا معنی کے تسلسل کا زمانہ ہے۔ اسی وجہ سے نئے نئے علوم جنم لے رہے ہیں اور کثرت آرائی کا تصور جنم لے رہا ہے۔ اب اکہرے متن، اکہری شخصیت اور اکہری زندگی کا زمانہ گزر چکا ہے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج تخلیقیت کے بارے میں میں بہت واضح تصور رکھتا ہوں۔ یہ وہ جوہر ہے جو تخلیق حسن اور معنی آفرینی کو بیک وقت پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ذوق جمال کی تسکین کرتا ہے۔ اور ہمارے شعور حیات میں اضافہ کرتا ہے۔ زندگی کو ہمارے لئے گوارا ہی نہیں شایان شان بناتا ہے۔ ایک اچھا تخلیق کار اسی عمل سے ہمارے دکھوں، محرومیوں، تنہائیوں، حسرتوں اور الجھنوں کا مداوا کرتا ہے اور زندگی کو ہمارے لئے آسان بناتا ہے۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج یہ درست ہے کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے کہ نارسائی کا دکھ شائد زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے۔ مگر اس کے باوجود تخلیق کار کے لئے تخلیقی کرب سے گزرنے کے بعد آسودگی کا لمحہ آتا ہے۔ جب اسے اطمینان ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ اسے کہہ سکا ہے۔ یہی معاملہ تخلیق اور تنقید کا بھی ہے جو نامعلوم اور نادریافت شدہ حقیقتوں کا سراغ لگاتی ہے۔ دریافت کا لمحہ ہی زندگی کی سطح پر بامرادی کا احساس جگاتا ہے۔ اور سرشاری طاری کرتا ہے۔

س عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے ہوا؟

ج میں نے ایم اے اردو گورنمنٹ کالج جواب ایمرسن یونیورسٹی ہے سے 1974 میں کیا۔ 1975 میں ملتان یونیورسٹی قائم ہوئی تو میں اس میں اردو کا لیکچرار منتخب ہوگیا۔ اس کے بعد 1995 میں پروفیسر اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس ہوکر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور چلا گیا۔ 1998 میں حکومت پاکستان نے اردو چیئر پر چار سال کے لئے جامعہ ازہر مصر بھیج دیا۔ واپسی پر اسلامیہ یونیورسٹی میں اپنی ریٹائرمنٹ 2012 تک ڈین فیکلٹی آف آرٹس رہا۔ بعد ازاں اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد میں دو سال چیئرمین شعبہ اردو رہنے کے بعد تا حال فارمن کرسچین کالج یونیورسٹی میں اردو کے پوسٹ گریجوایٹ پروگرام کا انچارج ہوں۔

س کسی لکھاری کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

ج لکھنا لکھانا خالصتاً اندرونی معاملہ ہے۔ لکھاری سب سے پہلے اپنی ذات کے اسرار جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے داخل میں جھانکتا ہے۔ اور اپنے باطن کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہے، میر صاحب کا ایک شعر ہے۔

ایک دل کو ہزار داغ لگا
اندرونے میں جیسے باغ لگا

ایک تخلیق کار کے اندر یہ سب داغ روشن ہو کر چراغاں کرتے ہیں اور وہ ان کی روشنی میں سب سے پہلے اپنی ذات کے جگ مگ ہونے کا نظارہ کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد زمانہ، زندگی، مطالعہ، کمٹ منٹ، تربیت اور ریاض اس کے بعد جوہر کو چمکاتے ہیں۔ وحشت کلکتوی کا کیا عمدہ شعر ہے۔

فروغ طبع خداداد ہے مگر وحشت
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لئے

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا کا کردار دودھاری تلوار کی طرح ہے۔ اس میں موجود شدت اور بے بنیاد خبریت نے اس کے کردار کو مشکوک بنا دیا ہے۔ اسلم انصاری کا ایک شعر ہے

ہمارے عہد کی نیکی ہے مرضیٔ گفتار
صباء کے لہجے میں حرفِ دل نشین کہا

یوں لگتا ہے کہ سوشل میڈیا نے ہمیں اس نیکی سے محروم کر دیا ہے تاہم اس کا مثبت رخ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بعض غیر معروف نوجوان یا کم وسائل رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم میسر آ رہا ہے اور ہر طرح کی تخلیقات کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ معیار دراصل مقدار ہی سے جنم لیتا ہے۔ کئی نو آموز لکھنے والوں کو میں سوشل میڈیا کے ذریعے معروف ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ اس کچھ سے جہاں ابتداء ہی سے کچھ لوگوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ وہاں کئی لکھنے والے سنجیدگی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

س ذاتی تجربات مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

ج فن کا سلسلہ بھی عجب ہے یہ اپنی ذات سے شروع ہو کر زمانے پر محیط ہو جاتا ہے۔ اور ذات میں ہی زمانے کے نمود کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ میر نے اس سلسلے میں کمال کی بات کہہ رکھی ہے!

کیا تھا شعر کو پردہ سخن وہی آخر کار ٹھہرا فن ہمارا

یعنی شعر کو انہوں نے راہ سخن بنایا تھا مگر رفتہ رفتہ ان کی ذات پیچھے ہوتی گئی اور ان کا فن

نمودار ہوتا گیا۔گویا ذاتی تجربات ومشاہدات ہی بالآخر آفاقیت میں ڈھلتے ہیں اور فن کا چہرہ نکھرتا جاتا ہے۔

س کیا کھویا؟ کیا پایا؟

ج

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جاں کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

س ایف سی کالج میں پڑھانے کا تجربہ کیسا رہا؟

ج میں نے ابتک پبلک یونیورسٹیوں میں پڑھایا تھا۔ایف سی یو میں امریکن منجمنٹ کے ساتھ پرائیویٹ سیکٹر یونیورسٹی میں پڑھانے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔یہاں آ کر پتہ چلا کہ پرفارمنس کی بنیاد پر استاد کی گریڈنگ کیسے ہوتی ہے۔ایف سی یو پاکستان بھر میں لبرل آرٹس ایجوکیشن کا بڑاادارہ ہے۔اس ادارے سے انسلاک میری خوش بختی ہے۔

OOO

وصی شاہ

ڈرامہ ''آہن'' سے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے وصی شاہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا، تو بے جا نہ ہوگا۔ وصی شاہ اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ اس نے جو بھی کام کیا، قسمت نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ ابھی لوگ ڈرامہ آہن میں اس کے کردار کو نہیں بھولے تھے کہ اس کے شعری مجموعہ ''آنکھیں بھیگ جاتی ہیں'' نے چھپ کر نہ صرف ملک گیر مقبولیت حاصل کر لی بلکہ فروخت کے نئے ریکارڈ بھی قائم کئے مگر وصی شاہ کی اب تک کی کامیابیوں کو محض ان کی خوش قسمتی کا مرہون منت قرار دینا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی، خوش قسمتی اپنی جگہ، وصی شاہ کی کامیابیوں میں اس کی محنت، لگن اور خلوص کو بھی برابر کا دخل ہے جس کا اعتراف عہد حاضر کے نامور ادیب اور اساتذۂ فن کر چکے ہیں۔

س ادب کی طرف کیسے آئے؟

ج مجھے شروع ہی سے موسیقی سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ گانوں کی دھنیں وغیرہ بنانے کے دوران مختلف شعراء کا کلام پڑھنے اور سننے کا اتفاق ہوا جس سے قدرتی طور پر لکھنے پڑھنے کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ اس لئے میرے خیال میں ادب کی طرف میں حادثاتی طور پر آیا۔

س عوام میں آپ کی پہلی پہچان بطور ڈرامہ نگار اور اداکار کے ہے، اس کے بعد آپ کے پہلے مجموعے ''آنکھیں بھیگ جاتی ہیں'' نے فروخت کے ریکارڈ قائم کئے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کی شہرت میں ڈرامہ یا شاعری میں سے کس کا ہاتھ زیادہ ہے؟

ج اس حوالے سے میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں شہرت دی۔ جب ٹی وی پر میرا پہلا ڈرامہ سیریل ''آہن'' چلا تو لوگوں نے مجھے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار دونوں حیثیتوں میں سراہا۔ اس کے بعد جب میرا پہلا شعری مجموعہ ''آنکھیں بھیگ جاتی ہیں'' شائع ہوا تو لوگوں نے میری توقع سے بڑھ کر بہت زیادہ پذیرائی کی۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آج کل لوگوں میں میری پہچان کس حوالے سے ہے، تو میرے خیال میں لوگ مجھے بطور شاعر زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت ڈرامہ نگار اور اداکار کے۔

س آپ بیک وقت نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی، آپ کی پسندیدہ صنف کون سی ہے؟

ج میرا مسئلہ پہچان یا پیسہ نہیں ہے، میں کام پر یقین رکھتا ہوں خواہ وہ کسی فیلڈ میں ہو۔ اس لئے لکھتے ہوئے کبھی طے کر کے نہیں لکھا کہ اس صنف ادب میں لکھوں۔ میرے خیال میں اظہار کی قوت یا تخلیق صنف ادب کا اپنے لئے خود تعین کر لیتی ہے۔ جب آپ پہلے طے کر کے لکھیں گے تو پھر وہ تخلیق اوریجنل نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مجھے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار کے لوگوں نے کافی سراہا، میں ڈرامہ نگاری یا اداکاری کو ہی پکڑ کر نہیں بیٹھ گیا۔

س اپنے کام کے حوالے سے کسی سے باقاعدہ اصلاح لی؟

ج باقاعدہ طور پر تو میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، لیکن اپنے سینئرز کا کام دیکھ کر اور کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ باقی کچھ دوستوں سے مشاورت وغیرہ چلتی رہتی ہے جس میں کام کے حوالے سے خامیوں کا پتہ چلتا رہتا ہے۔

س بطور ڈرامہ نگار آپ کے پسندیدہ رائٹر؟

ج ویسے تو سبھی لکھنے والے میرے لئے محترم ہیں اور میں ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہوں لیکن خاص طور پر ڈرامہ میں جو لوگ مجھے پسند ہیں ان میں اصغر ندیم سید، ڈاکٹر ڈینس آئزک، گلزار، امجد اسلام امجد اور نورالہدیٰ شاہ کے نام اہم ہیں۔

س اور بطور شاعر؟

ج بے شمار ہیں مثلاً فیض، ساحر لدھیانوی، ساغر صدیقی، احمد فراز، امجد اسلام امجد اور پروین شاکر۔

س اپنے ہم عصروں میں سے آپ نے کسی کا نام نہیں لیا؟

ج میرے خیال میں تقریباً سبھی اچھا لکھ رہے ہیں۔

س بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج اس کا جواب میں ایک شعر کی صورت میں دوں گا۔ شاعر کا نام البتہ مجھے اب یاد نہیں، شعر کچھ یوں ہے:

راستو کیا ہوئے وہ لوگ کہ آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

میرے خیال میں اس سلسلے میں دونوں دھڑوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے، دونوں کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے۔ جونیئرز کو بڑوں کی عزت اور سینئرز کو جونیئرز کے ساتھ شفقت کا رویہ رکھنا چاہئے۔

س ادب میں گروہ بندیوں کو کیسا خیال کرتے ہیں؟

ج گروہ بندی کسی بھی حوالے سے ٹھیک نہیں۔ خواہ ادب میں ہو یا سیاست میں۔

س آئندہ صدی میں غزل یا نظم میں سے کس کا مستقبل روشن ہے؟

ج جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے تخلیق صنف کی محتاج نہیں ہے۔ جس تخلیق میں جان ہو گی وہ زندہ رہے گی خواہ غزل ہو یا نظم۔

س ہمارے ہاں بین الاقوامی مسائل کے حوالے سے بہت کم لوگوں نے لکھا ہے، اس کی وجہ؟

ج پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے ہاں ایسا کچھ ہے۔ دراصل ساری بات زبان کی ہے۔ ہماری زبان چونکہ بین الاقوامی زبان نہیں ہے اس لئے باوجود اس کے کہ ہمارے ہاں تقریباً ہر موضوع پر لکھا جا رہا ہے۔ یہی سمجھا جا رہا ہے کہ جیسے ہم لوگ صرف اپنی ذات تک یا اپنے خطے تک محدود ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس بات کو کسی حد تک درست بھی مان لیا جائے تو اس کی بڑی وجہ ہمارے داخلی مسائل ہیں، ہم لوگ ابھی روٹی، کپڑے کے مسائل سے ہی باہر نہیں نکل سکے۔ داخلی مسائل سے ہمیں فرصت ملے گی تو خارجی امور کی طرف توجہ دیں گے۔ وہ ایک محاورہ ہے نا کہ

تجھے پرائی کیا پڑی پہلے اپنی تو نبیڑ

س نثری نظم کو شاعری سمجھتے ہیں؟

ج میں نے چونکہ کبھی نثری نظم کہی نہیں ہے اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ میں اس بارے میں رائے دینے کا کوئی استحقاق رکھتا ہوں یا شاید پھر اس طرح کسی کو بھی رائے دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کا بہتر فیصلہ وقت کرے گا۔

س جدت کے نام پر ہمارے ہاں ادب میں فحش نگاری کا رجحان چل پڑا ہے، اس بارے

میں کیا کہیں گے؟

ج یقین کریں اس قسم کا کوئی لٹریچر مجھے پڑھنے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے سینئرز کا لکھا ہوا ادب ہی اتنی زیادہ مقدار میں ہے کہ اسے پڑھنے سے فرصت نہیں ملتی۔ اور دوسری بات یہ کہ مجھے واہیات لٹریچر پڑھنے سے ویسے ہی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

س آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

ج ادب برائے زندگی، میں سمجھتا ہوں کہ ادب برائے ادب وقت کا ضیاع اور نری بکواس بازی ہے۔

OOO

یاسر پیرزادہ

یاسر پیرزادہ کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کالم نگارں میں ہوتا ہے۔ بڑے مختصر عرصے میں انہوں نے بطور سنجیدہ تجزیہ کار اور اینکر پرسن اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ بحیثیت ڈرامہ نگار بھی کامیابی نے ان کے قدم چومے اور ان کے تحریر کردہ ڈرامے عوام سے سند قبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ادب وصحافت کے حوالوں کے علاوہ وہ ایک بیوروکریٹ بھی ہیں۔ پچھلے دنوں اس روشن دماغ اور ہمہ جہت باصلاحیت شخصیت سے گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا۔ قارئین کرام کی خدمت میں یہ بات چیت پیش کی جارہی ہے۔

س آپ کا تعلق ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے مگر ذاتی طور پر آپ کو یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ تحریر کو ہی ذریعہ اظہار بنانا چاہیئے؟

ج تحریر کو ذریعہ اظہار بنانے کا خیال تو یوں آیا کہ میں بچپن سے اپنے والد صاحب کو کالم نگاری کرتے دیکھ رہا تھا اور گھر کا ماحول خاصا ادبی تھا۔ دوسری وجہ وہ نالائق کالم نگار تھے جن کی بری تحریروں کی وجہ سے میں نے احتجاجاً کالم نگاری شروع کردی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر یہ نالائق کالم نگار لکھ سکتے ہیں اور ان کا کالم اخبار میں چھپ بھی جاتا ہے تو پھر میں یقیناً ان سے تھوڑا سا تو بہتر ہی لکھ سکتا ہوں۔ ویسے میں ان نالائق کالم نگاروں کا بہت شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے بہت موٹیویٹ کیا۔

س عطاء الحق قاسمی صاحب سے ہماری ذاتی عقیدت مندی سے قطع نظر، اگر کوئی بھی شخص پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے چار، چھ کالم نگاروں کی فہرست بنائے تو یقینا ترتیب کا فرق ہوسکتا ہے مگر ان کا نام ضرور شامل ہوگا۔ اتنے بڑے نام کی موجودگی میں خوف محسوس نہیں ہوا کہ آپ Servive کر پائیں گے؟

ج ہاں! خوف تو موجود تھا اور ایک خوف اس سے بھی بڑا تھا کہ جب آپ اپنے اوپر یہ چیک لگا

لیتے ہیں کہ لوگ جب یہ پڑھیں گے اور سوچیں گے کہ یہ قاسمی صاحب کے بیٹے کی تحریر ہے تو اس سے لکھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی دوسرا شخص لکھنا چاہے تو اس کے لئے یہ نسبتاً آسان ہوگا مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہے کہ جب آپ اپنے اوپر ایک کوالٹی چیک لگا لیتے ہیں تو پھر بہتر سے بہتر تحریریں سامنے آتی ہیں۔ باقی یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس کو وہ عطا کر دے۔

س آپ ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ کالم نگار، دانشور، ادیب، ڈرامہ نگار اور بیوروکریٹ، آپ کو اپنا کون سا تعارف زیادہ پسند ہے؟

ج مشکل سوال ہے مگر آسان جواب یہ ہے کہ بطور کالم نگار ویسے تو اگر نوکری بھی تہذیب اور ایمانداری سے کی جائے تو وہ بھی باعث اطمینان ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس ملک میں جو تھوڑی بہت شناخت ملی ہے، وہ کالم نگاری نے دی ہے۔ اس لئے یہ تعارف مجھے زیادہ عزیز ہے۔

س اپنی پہلی تحریر کے بارے میں بتایئے جس کے متعلق آپ کا خیال ہو کہ اسے کسی کو سنانا چاہئے یا چھپوانا چاہئے؟

ج میری پہلی تحریر ایک افسانہ تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ سول سروسز اکیڈمی میں بھی میں نے بعدازاں چند افسانے تحریر کئے۔ نوائے وقت میں ''ذرا ہٹ کے'' کے عنوان سے کالم نگاری بھی شروع کی مگر پھر لمبا بریک آ گیا۔ پھر 2006ء میں یہ سلسلہ شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔

س کہتے ہیں برگدے کے نیچے برگد پرورش نہیں پا سکتا۔ آپ کو بھی اپنی الگ پہچان بنانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا؟

ج جہاں عطاء الحق قاسمی کا بیٹا ہونا ایک اعزاز کی بات ہے، وہاں فنی میدان میں یہ نسبت اپنی پہچان بنانے میں مشکلات کا بھی سبب بنی۔ لوگ ہو سکتا ہے سوچتے ہوں کہ اس باعث اخبار میں جگہ آسانی سے مل گئی ہوگی مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوا۔ میر شکیل الرحمن نے میری تحریر میرے نام کے بغیر پڑھی۔ اسے پسند کیا اور بعدازاں قاسمی صاحب نے ان کو بتایا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں حسد کرنے والے لوگ بھی بہت سے ہیں جن سے کسی کی کامیابی برداشت نہیں ہوتی۔ ایسے ماحول میں ابتدائی سفر دشوار تھا مگر اللہ کا شکر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ چیزیں بہتر ہوتی چلی گئیں۔

س آپ کی ابتدائی تحریروں میں طنز ومزاح کا پہلو خاصا نمایاں تھا۔اب آپ کی تحریریں زیادہ سنجیدہ نظر آتی ہیں۔طنز تو پھر بھی موجود ہے مگر مزاح کا پہلو ناپید ہوتا جارہا ہے، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

ج اس کی وجہ ہمارے ملک کی صورت حال ہے۔جب میں نے لکھنا شروع کیا تو اس وقت ملک میں دہشت گردی اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی چند سالوں میں برپا ہوگئی ہے۔باقی پاکستانیوں کی طرح ظاہر ہے میں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔دہشت گردی کے خلاف جنگ میں جتنا ہوسکا، میں نے اپنا حصہ ڈالا۔جب اس طرح تشدد کا ماحول ہواور بے گناہ لوگ آپ کے اردگرد مر رہے ہوں تو ایسے ماحول میں مزاح لکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ مجھے یوں لگا کہ میں ناانصافی کروں گا۔معاشرے کے ساتھ اگر میں اسی طرح مزاح تحریر کروں۔بہرحال طنز کا سلسلہ جاری ہے۔

س جیسے آپ نے کہا آپ کا الیکٹرانک میڈیا سے بھی تعلق ہے، ہمارے ہاں جو بگاڑ کی صورت حال نظر آتی ہے کیا اس میں ٹی وی ٹاک شوز کا بھی کوئی کردار ہے؟

ج جی ہاں! ٹی وی ٹاک شوز کا بھی کردار ہے۔ایک دلچسپ بات ہے کہ عمومی طور پر جب یہ سوال کیا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کی صحافتی تربیت نہیں ہوئی اور وہ پیراشوٹ کے ذریعے میڈیا میں آئے ہیں۔بظاہر یہ بات صحیح لگتی ہے مگر اتنی صحیح بھی نہیں۔کیونکہ جتنے بھی لیڈنگ ٹاک شوز ہیں، ان کی زیادہ تر تعداد کو جید صحافی ہی چلاتے ہیں اور ان میں بھی یہ سب قابل اعتراض باتیں ہوتی ہیں۔جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے جن کو پیراشوٹ کے ذریعے اس شعبے میں اُترنے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔انہیں پیراشوٹ سے اترے بھی اب دس سال ہوگئے ہیں۔اس لئے اب گزارش ہے کہ یہ تنقید ختم کردیں۔

س شدت پسند تنظیموں پر جتنی کڑی تنقید آپ کرتے ہیں، اردو صحافت میں تو ایسی کڑی تنقید شاید کوئی بھی نہیں کرتا؟

ج زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ویسے بھی ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔زندگی میں کچھ نہ کچھ تو ایسا چھوٹا موٹا ہی سہی، ضرور کرلینا چاہئے جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ ہم نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔خطرہ تو سچ کی راہ میں بہرحال ہوتا ہی ہے۔

س آج کل ہمارے ہاں یہ بات بہت سننے میں آرہی ہے کہ اینکر پرسن اور کالم نگار کو

غیر جانبدار ہونا چاہیے، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ج غیر جانبداری بڑا دلچسپ لفظ ہے صحافت میں۔ اگر آپ رپورٹر ہیں اور کوئی واقعہ رپورٹ کر رہے ہیں تب تو غیر جانبداری اختیار کرنے کی سمجھ آتی ہے اور یہ ضروری بھی ہے لیکن جب کالم نگار سے غیر جانبدار ہونے کا تقاضا کیا جاتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ اس سے مضحکہ خیز بات ہو نہیں سکتی۔ اگر تو آپ کے پسند کے لیڈر اور حکمران کی تعریف کی جائے تب تو یہ ہو گی غیر جانبداری۔ اگر اس کے خلاف بات کی جائے یا پھر کسی دوسرے کی تعریف کر دی جائے تو پھر کالم نگار صرف جانبدار ہی نہیں بلکہ بکا ہوا بھی ہے۔

آپ کالم نگار، اینکر پرسن کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو اور وہ غیر جانبدار ہو۔ دانتے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''دوزخ میں سب سے اندھیری جگہ ان لوگوں کے لئے مختص ہے جنہوں نے اخلاقی بحران کے دوران اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی۔'' پاکستان کے اخلاقی بحران میں اگر کوئی شخص اپنی غیر جانبداری قائم رکھتا ہے تو اس سے زیادہ بدقسمتی کی کوئی بات نہیں ہے۔

س آپ کا اپنا پسندیدہ کالم نگار کون ہے؟

ج اس سوال کا ایک جواب تو ''بائی ڈیفالٹ'' ہے جو کہ آپ کو معلوم ہے مگر میں اس کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ ایک گلدستہ ہے کالم نگاروں کا جس میں آٹھ دس کالم نویس آتے ہیں۔ جو سبھی خوبصورت لکھتے ہیں۔ ان آٹھ دس کالم نگاروں کے نام لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہی آٹھ دس کالم نویس ہی ہیں جو اس ملک میں پڑھے جاتے ہیں۔ وہی میرے پسندیدہ بھی ہیں۔

س آپ نے افسانے بھی لکھے، افسانوں کا مجموعہ شائع کروانے کا ارادہ ہے؟

ج افسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں میری سستی آڑے آ جاتی ہے۔ کالم بھی میں اسی لئے لکھ لیتا ہوں کہ ایک طے شدہ مقررہ وقت تک مجھے تحریر کر کے بھیجنا ہوتا ہے۔ اگر افسانے کے سلسلے میں بھی وقت کی قید کوئی شخص مقرر کر دے تو میں لکھ دوں گا۔ بصورت دیگر یہ ممکن نہیں میرے لئے۔

س شعر کہنے کا خیال کبھی نہیں دل میں آیا؟

ج: شاعری کے اوزان کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ میری چائے کی پیالی نہیں ہے۔

س: ٹی وی ڈراموں کے موجودہ معیار سے مطمئن ہیں؟

ج: موجودہ ٹی وی ڈراموں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو آپ کو مجبور کر دیں کہ آپ بیٹھ کر انہیں دیکھیں، اس کی اگلی قسط کا انتظار کریں۔ اگر آپ پی ٹی وی کے سنہری دنوں کے ڈرامے جیسا ڈرامہ تلاش کریں تو ناسٹیلجیا کی وجہ سے بھی ویسا ڈرامہ نہیں ملے گا مگر آپ کو انہی میں سے کوئی خوبی تلاش کر کے آگے بڑھنا ہے جیسے پچھلے دنوں ترکی کے ڈراموں نے بہت پسندیدگی حاصل کی تھی۔ اگر ڈرامے میں کوئی خوبی کا جوہر ہوگا تو پھر میرے مطمئن ہونے یا نہ ہونے سے کچھ نہ ہوگا، وہ خود ہی اپنی مقبولیت تلاش کر لے گا۔

OOO

ڈاکٹر یونس احقر

ڈاکٹر یونس احقر بنیادی طور پر نارووال سے تعلق رکھتے ہیں۔گزشتہ ایک لمبے عرصے سے ایم اے او کالج میں پنجابی کے پروفیسر کی حیثیت سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔اب تک ''سوچ داسفر'' کے نام سے پنجابی غزلوں پر مشتمل ڈاکٹر صاحب کا ایک شعری مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے اور دوسرا پنجابی شعری مجموعہ ''رکھ اڈاری لگے'' جو غزلوں پر ہی مشتمل ہے، زیر ترتیب ہے۔ڈاکٹر صاحب کی شعری اہمیت کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایف اے پنجابی اور بی اے پنجابی کے شعری انتخاب میں ان کی غزلیں بھی شامل ہیں۔بقول نامور نقاد ڈاکٹر محمد اسلم رانا، یونس احقر پنجابی شاعروں کے برعکس غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔یونس احقر کی غزلیں سوچ فن اور زبان کا ایک خوبصورت مرقع ہیں جو فن کے ہر معیار پر پورا اترتی ہیں اور قاری کو اپنے ظاہری اور باطنی حسن سے متاثر کرتی ہیں۔

س شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج شاعری وہ میدان ہے جس کی طرف آدمی قصداً نہیں آتا بلکہ اس کا مزاج اسے اس طرف لے آتا ہے۔یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ اگر شاعرانہ احساس آدمی کے ذہن کا حصہ نہ ہو تو وہ صرف علم اور معلومات کے بل بوتے پر شاعر نہیں بن سکتا۔جب میں اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے بڑے واضح دلائل ملتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ شاعری کی طرف میرا رجحان فطرتاً ہی تھا۔بچپن میں اپنی طرف سے مصرعوں کو ترتیب دینے کی کوشش کرنا، ردھم میں چیزوں کو گنگنانا یا شاعرانہ فلو میں اشعار کو پڑھنا، یہ ساری چیزیں میرے مزاج کا حصہ تھیں۔1960-61ء کے لگ بھگ جب میں نویں دسویں جماعت میں تھا تو اس وقت باقاعدہ شعر کہنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوا۔میٹرک کے بعد مجھے حضرت علامہ اقبالؒ کا اردو کلام اور دائم اقبال دائم کی چند شہرت یافتہ کتابوں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔علامہ کے زیر اثر ان کی رواں دواں بحروں میں اردو میں لکھنا شروع کیا اور

دائم اقبال دائم کے زیر اثر وارث شاہی بحر میں پنجابی کلام لکھنا بھی میرا معمول بن گیا۔ یہ دونوں شخصیات مجھے شاعری کی طرف لانے کا اصل محرک بنیں۔

س آپ کا تعلق اردو کے نامور شاعر فیض احمد فیض کے آبائی ضلع نارووال سے ہے، اس حوالے سے فطری طور پر آپ کو بھی اردو شاعری کی طرف آنا چاہئے تھا لیکن اس کے برعکس آپ کی پہچان جدید پنجابی غزل گوئی کے حوالے سے ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

ج جہاں تک فیض احمد فیض کا تعلق ہے، وہ ہمارے علاقے سے متعلق ہیں اور اردو کے بڑے نامور شاعر ہوگزرے ہیں لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں نے ان کے بارے میں بہت کم پڑھا ہے اور وہ بھی بہت دیر سے پڑھا ہے اس لئے ان کا کسی بھی پہلو سے اثر قبول کرنا میری مجبوری نہ بن سکا۔ میں 63ء میں گاؤں چھوڑ کر لاہور آ گیا اور یہاں 1970ء تک میں اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں صرف اپنے شاعرانہ مزاج کی رہنمائی میں لکھتا رہا اور یہ سارا کلام کہیں شائع کرانے کا نہ خیال آیا اور نہ حوصلہ ہوا لیکن اس میدان میں جو بات میری حوصلہ افزائی کرتی رہی وہ چند قریبی باذوق دوستوں کی وہ حوصلہ افزاء باتیں تھیں جن کا اظہار وہ میرے اشعار سن کر دیا کرتے تھے۔ اکثر ایسے بھی ہوا کہ عام دوست احباب میں اپنا کلام علامہ اقبال اور دائم اقبال دائم کے نام پر سنا دیا کرتا۔ مجھے اس وقت بڑی خوشی میسر آتی اور حوصلہ ملتا جب میرے اشعار کو پذیرائی ملتی اور ان پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، میں خیال کر لیتا کہ اقبال اور دائم کے نام پر سنائے جانے والے اشعار اگر قبول کر لئے گئے ہیں تو ان میں یقینا کچھ نہ کچھ جان ہے لیکن یہ واضح رہے کہ اردو یا پنجابی کا سنایا جانے والا یہ کلام صرف دوستوں کی محفلوں تک محدود تھا، کسی پیشہ ور شاعر سے میرا رابطہ نہیں تھا اور ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

س واضح طور پر صرف پنجابی شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج لاہور میں میرا پہلا ادبی رابطہ پنجابی شاعروں سے ہوا، ان دنوں رؤف شیخ کو جدید پنجابی غزل اور ادبی سیاست کے حوالے سے خاصی شہرت اور اہمیت حاصل تھی۔ میرے ایک شاعر دوست جاذب بخاری نے میرا رابطہ رؤف شیخ سے کرایا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر تمہیں اس میدان میں کوئی شناخت پیدا کرنا ہے تو رؤف شیخ اس حوالے سے اچھے رہنما ثابت ہوں گے۔ رؤف شیخ سے پہلی ملاقات میں طے پا گیا کہ وہ شاعری کے حوالے سے بطور بھائی یا بیٹے کے میری ہر ممکن

رہنمائی کریں گے لیکن میں انہیں کہیں اپنا استاد نہیں کہہ سکوں گا۔ اس معاہدے پر 1975ء تک عمل ہوا۔ بفضل خدا اس پنجابی غزل کے حوالے سے میری ایک شناخت بننا شروع ہو چکی تھی۔

ان دنوں ہی مجھے ایم اے او کالج لاہور میں پنجابی لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ اس موقعہ کے حوالے سے منظور وزیر آبادی مرحوم اور سلیم کاشر نے رؤف شیخ کو مشورہ دیا کہ تمہارے شاگرد کو ملازمت کے حوالے سے جو اعزاز ملا ہے اس سلسلے میں کسی ادبی محفل کا انعقاد کریں۔ رؤف شیخ نے اس مشورے کو بخوشی قبول کرتے ہوئے میرے اعزاز میں ایک ہوٹل میں مشاعرے کا انعقاد کیا۔ میں نے اس شعری محفل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو اور پنجابی کے مشہور شاعروں اور کالم نگاروں کی موجودگی میں رؤف شیخ سے یہ تسلیم کروالیا کہ وہ میرے استاد ہیں۔ رؤف شیخ یا ان کے قریبی دوستوں میں وہی لوگ تھے جو پنجابی غزل کا روپ نکھارنے میں بڑی نیک نیتی سے مصروف تھے۔ ان کے زیر اثر میں نے بھی پنجابی غزل ہی کہنا شروع کی اور آہستہ آہستہ یہ صنف ادب میرے مزاج کا حصہ بن گئی۔ لکھنے کو تو تقریباً سبھی اصناف ادب میں لکھنے کا موقع ملا ہے لیکن میری واضح شناخت جدید پنجابی غزل ہی بنی۔

س آپ کے بارے میں ناقدین ادب کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ جدید پنجابی غزل کے حوالے سے آپ اپنے استاد رؤف شیخ سے بھی آگے نکل گئے ہیں، آپ اس بات سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

ج جدید پنجابی غزل کے حوالے سے رؤف شیخ کی پہلی کتاب ''بلدا شہر'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس وقت ان کا انداز میرے لئے ایک نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے بھرپور کوشش کی کہ میں بھی اسی انداز میں غزل کو نکھار دینے کی کوشش کروں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا آخر 97ء میں میری غزلوں کی پہلی کتاب ''سوچ دا سفر'' کے نام سے شائع ہوئی۔ حوصلہ افزائی تو مشاعروں میں بھی کافی ہوا کرتی تھی لیکن کتاب کے آنے پر نا صرف شاعر حضرات بلکہ ناقد حضرات نے بھی اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے اس کتاب کو خاصا پسند کیا گیا اور اس پر تبصرے بھی کئے گئے جو مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پنجابی غزل میں مجھے میرے استاد رؤف شیخ سے آگے نکلتا محسوس کیا جا رہا ہے، اس بارے میں میری دوٹوک اور واضح رائے رہی ہے کہ یہ تاثر قارئین کا ہو سکتا ہے، میں اسے تسلیم

نہیں کرتا۔ شاعری ایک ایسا میدان ہے کہ اس میں اچھا شعر کوئی بھی کہہ سکتا ہے لیکن اپنے مجموعی ادبی سفر کے حوالے سے کوئی مقام حاصل کرنا الگ بات ہے۔ میرے کئی اشعار نے اور کتاب نے بھی مجھے دوسرے شاعروں سے الگ میرے استاد سے بھی خصوصیت کے ساتھ داد دلائی ہے۔ نقاد حضرات نے اس بحث کو نہیں چھیڑا جس کی طرف آپ نے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ یہ سوال ادبی سیاست کے حوالے سے ان لوگوں نے اٹھایا جو کسی نہ کسی حوالے سے یا کوئی نہ کوئی مفاد ذہن میں رکھتے ہوئے رؤف شیخ کو بحیثیت شاعر محدود کرنے کے متمنی تھے۔ رہا میری ذات کا تعلق تو میں نے پہلے بھی ایک انٹرویو میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اب آپ کا آئیڈیل شاعر کون ہے، کہا تھا کہ رؤف شیخ میرے آئیڈیل شاعر رہے ہیں لیکن اب میرا آئیڈیل کوئی شاعر نہیں بلکہ اچھا شعر ہے، خواہ وہ کسی کا بھی ہو۔ اس پر ادبی سیاست کے حوالے سے رؤف مخالف لوگوں نے قیاس کیا کہ انٹرویو کا یہ جملہ رؤف شیخ اور یونس احقر میں تعلق ٹوٹنے کا باعث بنے گا مگر شیخ صاحب نے خندہ پیشانی سے نہ صرف اس جملے کو قبول کیا بلکہ پسند بھی کیا اور یہ کہتے ہوئے مخالفین کے منہ بند کر دیئے کہ پنجابی غزل کے حوالے سے یونس احقر کو اگر کوئی بلند مقام ملتا ہے تو میں یہی سمجھوں گا کہ یہ عزت مجھے ملی ہے۔

س پنجابی غزل اردو غزل کے مقابلے میں پیچھے کیوں ہے؟

ج پنجابی غزل کے آغاز کا تاریخی اعتبار سے تقریباً وہی دور بنتا ہے جو اردو غزل کا ہے لیکن پنجابی غزل اس تسلسل سے نہیں لکھی گئی جس تسلسل سے اردو غزل ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہے۔ پنجابی غزل کو اگر تسلسل ملا ہے تو وہ قیام پاکستان کے بعد کا دور ہے۔ اس وقت تک اردو غزل کو ایک واضح شناخت مل چکی تھی۔ پنجابی غزل نے اپنا جدید رنگ اردو سے ہی قبول کیا لیکن وہ چند لوگ جنہوں نے پنجابی غزل کو جدت کے حوالے سے ایک شناخت فراہم کی ہے، انہوں نے نا صرف اردو غزل کے معیار کو سامنے رکھا بلکہ پنجابی میں اپنی روایات اور کائناتی مسائل پر بھی نظر رکھی۔ زمین کے ایک خطے سے تعلق رکھنے والی زبان ہونے کے ناطے پنجابی میں وہ گہرائی اور گرفت موجود ہے کہ جہاں کہیں بھی اسے کسی زرخیز ذہن کے حوالے سے اچھا خیال میسر آیا ہے، اس میں ہونے والی شاعری نے اپنے تاثر کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ بعض اوقات اس موضوع سے متعلق اردو کا شعر وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکا۔ مجھے خود مشاعروں میں اردو کے نامور شاعر احمد ندیم

قاسمی صاحب کو یہ کہتے ہوئے سننے کا اتفاق ہوا ہے اور یہ بات ان کے قلم سے بھی نکل چکی ہے کہ پنجابی غزل کسی بھی طرح جدید اردو غزل سے پیچھے نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو اس کا قدم آگے بڑھتا محسوس ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کا یہ نقطہ نظر ہمارے لئے حوصلہ افزائی کا درجہ رکھتا ہے لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مجموعی طور پر پنجابی غزل اردو غزل کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تو یہ حقیقت ہے۔

س مشرقی پنجاب اور ہمارے ہاں تخلیق ہونے والے پنجابی ادب میں بنیادی فرق کیا ہے؟

ج مشرقی اور مغربی پنجاب ہر دو میں بنیادی ادب کی تخلیق اپنی اپنی فضا کے مطابق جاری ہے۔ جہاں تک فکشن کا تعلق ہے، مشرقی پنجاب میں اس کو مقداری حوالے سے اولیت حاصل ہے لیکن شاعری کے حوالے سے مغربی پنجاب میں تخلیق ہونے والا ادب فنی اور فکری ہر دو حوالوں سے مشرقی پنجاب کے مقابلے میں بہتر حالت میں ہے۔

س اکیسویں صدی غزل کی ہوگی یا نظم کی؟

ج پنجابی شعری اصناف کے حوالے سے غزل کو پنجابی کی قدیم اصناف میں شامل نہیں سمجھا جاتا۔ سترہویں صدی میں غزل کا آغاز پنجابی میں ہوا لیکن باقاعدہ پنجابی غزل 20ویں صدی کے نصف آخر میں لکھی گئی۔ بیسویں صدی کا پورا ادبی منظر نامہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب نظم اور غزل دونوں شانہ بشانہ لکھی جا رہی ہیں۔ مصروف دور نے تخلیق کاروں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنا اور قاری کا وقت بچانے کے لئے اپنی تخلیقات میں قارئین کی ضروریات کو مدنظر رکھیں۔ اکیسویں صدی میں صرف وہی اصناف ادب زندہ رہیں گی جو مختصر اور جامع ہیں اور چونکہ نظم اور غزل میں یہ خاصیت موجود ہے اس لئے یہ دونوں اصناف ادب زندہ رہیں گی۔

س فیض احمد فیض کی پنجابی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج پنجابی شاعری میں فیض احمد فیض وہ مقام پیدا نہیں کر سکے جو اردو شاعری میں ان کا خاصہ تھا۔

س سرکاری و غیر سرکاری سطح پر جو ادبی ایوارڈز دیئے جا رہے ہیں ان میں کہاں تک میرٹ کا خیال رکھا جاتا ہے؟

ج اس وقت پنجابی ادب کے حوالے سے جو اعزازات دیئے جا رہے ہیں ان میں کسی حد تک تو تخلیق کے معیار کو اہمیت حاصل ہے مگر مجموعی طور پر زیادہ اہمیت تعلقات کو دی جاتی ہے۔

س شاعری میں اصلاح کے عمل کو کس حد تک جائز سمجھتے ہیں؟

ج کسی سے اصلاح لینا کوئی جرم نہیں مگر ہمارے ہاں اصلاح کے نام پر ادب میں چور بازاری شروع ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں اصلاح کا عمل صرف فنی حوالوں تک ٹھیک ہے، فکری حوالوں سے نہیں۔

س آپ کا نیا مجموعہ کب تک متوقع ہے؟

ج غزلوں پر مشتمل میرا نیا شعری مجموعہ ''دکھ اڈاری لگے'' انشاء اللہ اس سال کے آخر تک یا اگلے سال کے شروع میں چھپ جائے گا۔

س نئے شاعروں کے لئے کوئی پیغام؟

ج شاعری وجدانی جذبہ ہے لیکن اس میں اصلاح اور مشورہ لینا یقینا نکھار پیدا کرتا ہے۔ نئی نسل کو سینئر سے مشورہ کرنا چاہیے اور جلد بازی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

OOO

عامر بن علی کا ادبی سفر

محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)

گزشتہ دس برسوں میں نوجوان شعراء کی جو نسل ابھر کر سامنے آئی ہے۔اس میں سے ایک اہم نام عامر بن علی کا ہے۔اس کی شاعری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ ثقہ اور معتبر ادبی حوالوں سے بھی لائق توجہ اور پسندیدہ ہے۔

(امجد اسلام امجدؔ)

ادب سے عامر بن علی کی کمٹمنٹ ہے اور یہی کمٹمنٹ اسے کچھ کر گزرنے کے عمل پر اکساتی رہتی ہے اور بے چین رکھتی ہے۔نفرت اور منافقت سے آلودہ موجودہ ادبی فضا میں ایسے شاعروں کا وجود غنیمت ہے جو نہ صرف شاعری میں محبت اور پیار کی بات کرتے ہیں بلکہ خود اسکی عملی تصویر بھی ہیں۔

(عطاء الحق قاسمی)

چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)

عامر بن علی کی غزلوں میں بھی ان کی ذہانت اور حساسیت جگہ جگہ نمایاں ہے مگر ان کا حقیقی تخلیقی جوہر ان کی نظموں میں اظہار پاتا ہے۔وہ جدید نسل کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کے کلام میں امکانات کے آفاق خاصے وسیع ہیں۔

(احمد ندیم قاسمی)

عامر بن علی کومل، معصوم اور سچے جذبوں کو سادگی اور سلاست کے ساتھ شعری پیکر عطا کرنے کے خوابیدہ عمل میں سرشار ہیں۔ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی لطافت اور نغمگی ہے جو قاری یا سامع کے دل و دماغ پر پھوار کی طرح برستی ہے۔پھر دھیمے دھیمے انداز میں سلگاتی چلی جاتی ہے۔

(اسلم کولسری)

سرگوشیاں (شعری مجموعہ)

عامر کی نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ"سرگوشیاں" اپنے عنوان کی طرح سبک، مدھم اور نرم ونازک جذبات وخیالات سے مزین ہے۔نظموں سے ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنے والی نوجوان نسل کو تلاش کرنے اور اسے سمجھنے اور پیار کرنے کی دعوت ملتی ہے۔

(منّو بھائی)

عامر بن علی زندگی کے غبار آلود راستے پر ہمہ وقت سفر کرنے والا ایک نوجوان ہے۔ انتھک، باعمل اور اچھے برے موسموں میں سر اٹھا کر چلنے والا نوجوان۔اس نے اس سفر میں آنے والے ہر چھوٹے بڑے مشاہدے اور تجربے کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب رہا ہے۔

(احمد عقیل روبیؔ)

یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)

یہ مجموعہ نئی نظموں کا نمونہ ہے۔اس کی نظم جدید نظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ن۔م راشد اور میراجی سے علیحدہ رجحان کا پتہ دے رہی ہیں۔بعض اوقات چونکا بھی دے رہی ہے۔

(شہرت بخاری)

گفتگو (انٹرویوز)

عامر بن علی اور ابرار ندیم کی انٹرویوز پر مشتمل کتاب میں آپ کو گہرائی اور گیرائی نظر آئے گی۔اس کی نظیر ان کے ہم عصروں میں بہت کم کم نظر آتی ہے۔

(عطاء الحق قاسمی)

گفتگو ایک اہم ادبی دستاویز ہے جو ادب کے قارئین کے لئے حوالے کی چیز ثابت ہوگی۔

(ڈاکٹر سلیم اختر)

محبت کے دو رنگ۔۔۔گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (تراجم)

عامر بن علی نے ایک طرف پابلو نرودا جیسے عظیم مزاحمت کار کی منتخب شاعری کا ترجمہ پیش کر دیا ہے وہاں نرودا کے سیاسی اور ادبی مسلک کے مدمقابل عالمی شہرت یافتہ گبریلا مسترال کے تراجم بھی پیش کر دیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ شعر و ادب میں دونوں غالب مگر مدمقابل رنگوں کو محبت کے ساتھ محسوس کیا جائے، یہ پہل عامر بن علی نے کی

ہےاور نام رکھا ہے محبت کے دو رنگ"

(ڈاکٹر انوار احمد)

آج کا جاپان (سفر نامہ)

''آج کا جاپان'' ایک تجربہ نامہ ہے۔ مصنف نے جاپانی معاشرے کو اس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خوب آزمایا۔ پھر ایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کو عمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔ اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسرے سفر ناموں سے منفرد ہے۔

(پروفیسر سو یامانے)

عامر بن علی کی اس تصنیف کو میں پاکستانی قوم کے لئے ایک تحفہ تصور کرتا ہوں۔ انہوں نے جاپان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو دیکھا، جانا اور پرکھا ہے اور پھر ان کی سچی، کھری اور بے لاگ تصویریں تیار کی ہیں۔ اس میں سفر نامے کا لطف بھی ہے اور قیام نامے کی گہرائی بھی۔

(خواجہ محمد زکریا)

جہاں گردی (سفر نامہ)

عامر بن علی نگر نگر گھومنے والا ایسا سیاح ہے جو ہر لمحہ ہر منظر کو لفظوں میں قید کر لیتا ہے۔ اس کی نظر سرسری نہیں ہوتی بلکہ بہت عمیق ہوتی ہے۔ جو صدیوں کو کھنگال لیتی ہے۔ عامر بن علی ان شاعروں اور ادیبوں میں شامل ہے جو صاحب مطالعہ ہیں۔ اس کی اضافی خوبی اس کا ہفت زبان ہونا ہے۔ ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں لوگ حیرت زدہ رہ گئے جب اس نے روانی کے ساتھ روسی زبان میں تقریر کی۔

(نیلما ناہید درانی)

نگر نگر اک نظر (سفر نامہ)

''نگر نگر اک نظر'' بہت ہی دلچسپ واقعات پر مبنی اور طرز تحریر انتہائی سہل اور خوبصوت ہے۔ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ مصنف کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ کہیں ادبی چاشنی تو کہیں صحافتی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ثقہ ادیب اور معتبر صحافی ہونے کے سبب زبان و بیان پر انہیں دسترس ہے مگر لکھنے کا انداز عام فہم اور سادہ ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وہ اپنی بات سمجھا سکیں۔ یہ سفر نامہ تحریر کر کے عامر بن علی نے پاکستان کی بلا شبہ خدمت کی ہے۔

(اسداللہ غالب)

مشرق کی طرف دیکھ (سفر نامہ)

جو چیز ہمیں لے بیٹھی وہ عامر کا جاپان کی تہذہب وثقافت پہ عبور ہے۔اپنی روانی میں وہ ہمیں مشرق کے اسرار بتاتے جاتے ہیں جیسے کوئی فلسفی بادام کے شگوفوں سے لدے درخت کے نیچے بیٹھا گیان بانٹ رہا ہو۔

(آمنہ مفتی)

(Sakura & Spice = A Pakistani's Journey Through Japan)

Amir Bin Ali is residing in Japan from last many years and a frequent international traveler. He is an optimistic writer.He realizes all the shortcomings of Pakistani society but also has a firm belief that Pakistan has all the resources and a talented workforce to make remarkable progress.

(Daily Times Book Review)

روبرو (انٹرویوز)

ماہنامہ ''ارژنگ'' دنیائے ادب میں اپنی الگ حیثیت سے جانا جاتا ہے۔جس میں عامر بن علی،حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر نے نابغہ،روزگار شخصیات کے خوبصورت انٹرویوز کا سلسلہ ایک عرصے سے شروع کر رکھا ہے۔''روبرو'' کے نام سے کتاب مرتب کی گئی ہے۔جو ان تینوں مدیران کے کئے گئے انٹرویوز پر مبنی ہے۔مشہور و معروف شخصیات کے نہایت عمدہ انٹرویوز شامل کئے گئے ہیں۔جن سے ان کے ذہن کے دریچوں میں جھانک کر ان کے خوبصورت خیالات واحساسات جاننے کا موقع ملتا ہے۔ان انٹرویوز میں مختلف شعبہ کے لوگ شامل ہیں۔شاعر،ادیب اور صحافی۔لہٰذا یکسانیت کا ماحول نہیں ہے۔بلکہ ایک رنگا رنگی ہے۔اپنے اپنے میدان کے شہ سواروں نے اپنی کامیابی اور سفر کی دلچسپ داستانیں بیان کی ہیں۔

(تبصرہ: بشکریہ روزنامہ ''جنگ'')

Amir Bin Ali is one of the finest poets from the Younger Generation that Have Emerged During the Last Decade

Express Tribune *Book Review*

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu poetry. He has always been a globetrotter filled with the passion for travelling. Wandering all around the globe in Search Of New Sights & Experiences. He has Written four poetry Books & Two Travelogues along with his Books Of Interviews With Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is Expert in Seven international Languages

Daily Times *Book Review*

عامر بن علی کا قلمی سفر

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ ۔ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوبِ جاپان (زیرِ طبع)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- محبت کے موسم (شعری مجموعہ)
- گردِ سفر (کالمز)
- روبرو (انٹرویوز)
- Selected Poems of Ami Bin Ali Избранные стихотворения Амир Бин Али
- جہاں گردی (سفرنامہ)
- نگر نگر اک نظر (سفرنامہ)
- مدیرِ اعلیٰ: ماہنامہ ارژنگ لاہور
- Sakura & Spice A Pakistani's Journey Through Japan
- مشرق کی طرف دیکھ

ISBN 978-969-544-234-0

9 789695 442340

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور

0300-4489310 - 0331-4489310

nastalique786@gmail.com